"رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا"

(البقرہ: ۱۸۵)

گویا یہ قرآن حکیم کے ساتھ ذہنی اور قلبی تعلق کی تجدید کا مہینہ ہے!

ان شاء اللہ العزیز ——— اس سال

جامع القرآن، قرآن اکیڈمی، ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں

نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کے فرائض

ڈاکٹر ا رار احمد

صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور، خود ادا کریں گے

محدود تعداد میں بیرونی حضرات کے لیے بھی بندوبست ہوگا۔

خواہشمند حضرات فوراً رابطہ فرمائیں

ناظم اعلیٰ، مرکزی انجمن خدّام القرآن، ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

(فون: 856003)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد: ۴۳
شمارہ: ۲
شعبان المعظم ۱۴۱۴ھ
فروری ۱۹۹۴ء
فی شمارہ ۷/-
سالانہ زرتعاون ۷۰/-

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۴۵ سعودی ریال یا ۱۲ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔	۱۶ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۲۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر	۹ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

○ ○ ○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

نیکیوں کے موسم بہار' ماہِ رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ رمضان نزولِ قرآن کا مہینہ ہے۔ "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔" یہ سرچشمۂ ایمان اور منبع یقین' قرآن حکیم کے ساتھ تجدیدِ تعلق کا مہینہ ہے۔ روزے کی عبادت کو اس ماہ کے ساتھ مخصوص کر کے اضافی افادیت کا سامان کیا گیا ہے کہ دن کے روزے کے بعد رات کا قیام ___ محض قیام نہیں' قیام بالقرآن ___ اپنی تاثیر اور افادے کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ روزہ کے ذریعے روحِ انسانی پر سے مادی وجود کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے اور پھر رات کو قرآن کے ساتھ قیام پیاسی روح کی سیرابی کا کام کرتا ہے۔ روحِ انسانی پر قرآن حکیم کا یہ "نزول" بے بہا خیر و برکت کا باعث بنتا ہے ___

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

یہی وجہ ہے کہ روزہ اور رمضان کی عظمت سے متعلق متعدد احادیث میں روزہ اور قرآن کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اور دن کے روزے کے ساتھ ہی رات کے قیام کا بھی باہتمام ذکر ہے۔ ان میں سے ایک حدیث تو واقعہ یاد کرنے کے لائق ہے۔

عن عبد اللہ بن عمرو ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: الصیام والقران یشفعان للعبد یقول الصیام: ای رب انی منعتہ الطعام والشھوات بالنھار فشفعنی فیہ' ویقول القراٰن: منعتہ النوم باللیل فشفعنی فیہ فیشفعان۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے۔ (یعنی اس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور کھڑے ہو کر قرآن مجید پڑھے گا یا سنے گا) روزہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں نے اس بندے کو دن میں کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تھا' آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا کہ: میں نے اس کو رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا' خداوندا آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندہ کے حق میں قبول کی جائے گی (اور اس کے لئے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا۔)

ماہ رمضان کی برکتوں اور سعادتوں سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے اور قرآن کے نور سے بیش از بیش استفادے کی خاطر امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے آج سے دس سال قبل قرآن اکیڈمی لاہور میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز کیا تھا۔ ماہِ رمضان کی راتوں کو زیادہ سے زیادہ قرآن حکیم کے ساتھ گزارنے اور قرآن کے متن کے ساتھ ساتھ اس کے ترجمے کو بیان کرنے یا سماعت

کرنے کا یہ پروگرام 'بحمد اللہ 'نہایت مفید ثابت ہوا۔ اس کے بعد کوئی سال ایسا نہیں گزرا جس میں امیر محترم نے ماہِ رمضان میں دورۂ ترجمۂ قرآن نہ کیا ہو۔ قرآن اکیڈمی لاہور کے علاوہ قرآن اکیڈمی کراچی' قرآن اکیڈمی ملتان یہاں تک کہ ابوظبی میں بھی امیر تنظیم کے دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام ہو چکے ہیں۔ قرآن اکیڈمی لاہور میں' جہاں سے اس خیر کا آغاز ہوا تھا' اس دورۂ ترجمۂ قرآن کو اب ایک روایت کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ ہر سال ماہِ رمضان میں قرآن حکیم کی معیت میں راتیں بسر کرنے کا یہ پروگرام اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے' اس کی تاثیر اور افادے کو عوام ہی نے نہیں' بہت سے خواص نے بھی محسوس کیا اور سراہا ہے' بالخصوص یہ بات تو قریباً ہر شریک پروگرام نے محسوس کی کہ اس انداز سے قرآن کا ترجمہ سامنے آنے سے ان بہت سے مشرکانہ عقائد و اوہام کی جڑ کٹ جاتی ہے جو آج بھی ہمارے معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔

اس بار یہ قرعۂ فال قرآن اکیڈمی لاہور کے نام نکلا ہے کہ امیر تنظیم دورۂ ترجمۂ قرآن یہاں کریں گے۔ اس کا قدرے مفصل اعلان "میثاق" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر شائع کر دیا گیا ہے۔ بیرون لاہور سے جو لوگ شریک ہونا چاہیں گے ان کے قیام کا انتظام بھی اکیڈمی میں کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

☆ ☆ ☆

پاکستان کے موجودالوقت حالات کسی بھی اعتبار سے اطمینان بخش نہیں ہیں۔ حالیہ انتخابات کے بعد ایک درجے میں یہ توقع پیدا ہوئی تھی کہ سیاسی اعتبار سے کچھ استحکام پیدا ہو گا لیکن یہ توقع بھی ایک امید موہوم ہی ثابت ہوئی۔ امیر تنظیم اسلامی نے ۲۱ جنوری کو اپنے خطاب جمعہ کے آخر میں ملکی حالات کے بارے میں مختصراً جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی تلخیص درج ذیل پریس ریلیز میں دیکھی جا سکتی ہے۔

لاہور - ۲۱ جنوری: "الیکشن ۹۳ء کے نتیجے میں ایک مستحکم سیاسی حکومت کے قیام کی امید تھی جس پر پانی پھرتا جا رہا ہے کیونکہ مختلف حلقوں کی طرف سے ڈھکے چھپے انداز میں بھی اور دو ٹوک الفاظ میں بھی مارشل لاء کی خبریں دی جانے لگی ہیں۔" یہ بات امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے موجودہ حکومت کی کارگزاری سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہی۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں اپنے خطاب جمعہ کے اختتامی حصے میں انہوں نے کہا کہ نئی حکومت کے سو دنوں کے اگرچہ گن گائے جائیں گے لیکن برسر اقتدار پارٹی خود بھی جانتی ہے کہ اس کے پاؤں زمین سے نہیں لگ سکے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ قانون سازی تو بالکل نہیں ہو سکی مگر آئے دن اسمبلیوں میں ہنگامہ آرائی دیکھنے سننے میں آتی ہے۔ محاذ آرائی کی ذمہ داری حزب اقتدار پر ہو یا حزب اختلاف پر تاہم یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ فاصلے ناقابل عبور ہوتے جا رہے ہیں۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ موجودہ حکومت کے عدم استحکام میں ایک بہت بڑا عامل یہ بھی ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کا ہاتھ بڑھ رہا ہے۔ نیا سامراج جس طرح دوسرے ملکوں پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتا ہے وہ انداز کسی بھی سیاسی حکومت کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا اور اس معاملے میں جو مسائل بے نظیر کو درپیش ہیں وہی نواز شریف کو بھی بے بس کر ڈالتے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہماری وزیر اعظم صاحبہ نے نیو ورلڈ آرڈر کی غلامی سے گلو خلاصی کے لئے چین اور شمالی کوریا تک کا چکر لگا لیا ہے لیکن کہیں سے بھی تقویت حاصل نہ ہو سکی کیونکہ درپیش صورت حال کا مقابلہ کوئی انقلابی حکومت ہی کر سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہزاروں جانیں دے کر ایرانیوں نے اپنے ملک میں جزوی سہی ایک انقلاب ضرور برپا کیا اور اسی کے سبب ایران اس قابل ہوا ہے کہ امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات

روزہ اور دعا

امیر تنظیم اسلامی' ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز خطاب

قرآن مجید کے ۲۳ویں رکوع میں جہاں روزے کا حکم وارد ہوا ہے' وہاں اس کی حکمت کا بیان بھی ہے اور روزے کے تفصیلی احکام بھی آئے ہیں۔ انہی کے ذیل میں یہ آیت مبارکہ وارد ہوئی ہے:

"وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ○"

"اور (اے نبی ﷺ) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو (انہیں بتا دیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں (کہیں دور نہیں ہوں)۔ میں جواب دیتا ہوں (اور قبول کرتا ہوں) ہر دعا کرنے والے کی دعا کا جب بھی وہ مجھے پکارے (جب بھی مجھ سے دعا کرے) تو چاہئے کہ وہ بھی میری پکار پر لبیک کہیں (یعنی میرے احکام کو مانیں اور تسلیم کریں) اور مجھ پر پختہ ایمان اور یقین رکھیں تاکہ وہ رشد و فوز سے ہمکنار ہوں۔"

بظاہر اس آیتِ مبارکہ میں نہ روزے کا ذکر ہے نہ رمضان کا' لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ہر باشعور ہستی کے کلام میں ربط کا ہونا ضروری ہے۔ غیر مربوط کلام کسی باشعور ہستی کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جس سے بڑھ کر باشعور اور حکیم ہستی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ کلام ربط سے خالی ہو! جن لوگوں نے ربط و تعلقِ آیات پر زیادہ توجہ صَرف نہیں کی' واقعہ یہ ہے کہ وہ حضرات قرآن مجید کی حکمت و معرفت کے ایک بہت اہم پہلو سے محروم رہ گئے۔ یقیناً قرآن کی ہر آیت اپنی جگہ پر علم و حکمت اور معرفت و عرفان کا ایک بیش قیمت موتی ہے' لیکن جیسے کسی ہار میں اگر موتیوں کو پرو دیا جائے تو اس کے نظم و ترتیب سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اسی طرح کا معاملہ قرآن حکیم کا بھی ہے۔ لہٰذا قرآن مجید پر غور و فکر کے ضمن میں ضروری ہے کہ انسان دو باتوں کو ملحوظ رکھے۔ ایک یہ کہ آیت کے الفاظ پر اپنی توجہات کو اس طرح مرتکز کر دے جیسے کسی نہایت لطیف اور خفیف ترین شے کے مشاہدے کے لئے مائیکروسکوپ کو فوکس (FOCUS) کر دیا جاتا ہے۔ آیت کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کا حق ادا کیا جائے اور ان کی تراکیب پر تدبر و تفکر کر کے انہیں خوب اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

☆ یہ خطاب اس سے قبل مئی ۸۸ء کے میثاق میں شائع ہوا تھا۔ اب اسے از سرِ نو مرتب کر کے ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔

پھر اس کا سیاق و سباق ملاحظہ کیا جائے اور اس ربط و تعلق سے آیت زیر غور میں جو نئے معنی اور نئی معرفت کا سراغ ملتا ہے اسے تلاش کیا جائے۔

سورۃ البقرہ کے ۲۳ویں رکوع میں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی آیت میں مجرد روزے کا حکم اور اس کی حکمت کا بیان ہے (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ) دوسری آیت میں ابتدائی احکام ہیں۔ تیسری آیت میں رمضان المبارک کا ذکر ہے اور اس پورے مہینے کے روزوں کی فرضیت کا بیان ہے (شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ۔ الخ) اس آیت کے بعد پھر یہ آیتِ مبارکہ وارد ہوتی ہے جو اس وقت زیر گفتگو ہے۔ پھر اس سے اگلی آیت میں جو اس رکوع کی طویل ترین آیت ہے' روزے کے تفصیلی احکام آتے ہیں۔ درمیان میں جو یہ موتی ٹکا ہوا ہے' اب ہم اپنی توجہات اس پر مرکوز کرتے ہیں۔

پہلے تو ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ اس آیتِ مبارکہ کا اصل مضمون کیا ہے! ..... اس میں در حقیقت دعا کی عظمت سامنے آرہی ہے اور ہر اس شخص کے لئے جس کے دل میں اللہ کی طرف توجہ اور انابت پیدا ہو جائے اور اس کے دل میں اپنے رب سے تقرب حاصل کرنے کا ایک جذبہ ابھرے' نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ ایسے شخص کو سب سے پہلے تو یہ خوشخبری دیجئے کہ تمہارا رب کہیں دور نہیں ہے۔ اس رب سے ہم کلام ہونے کے لئے کہیں جنگلوں میں جا کر دھونی رمانے' کہیں کسی پہاڑ کی کھوہ میں جا کر ڈیرا لگانے یا کہیں برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر تپسیائیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کے دوسرے تمام مذاہب میں بالعموم یہ تصور موجود رہا ہے کہ اللہ سے قرب حاصل کرنے کے لئے آبادیوں کو چھوڑنا' گھر گرہستی سے ترکِ تعلق اور تجرد کی زندگی اختیار کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا آبادیوں اور گھروں کی آسائشوں کو چھوڑو اور جنگلوں میں نکل جاؤ' کہیں غاروں میں خاص آسنوں کے ساتھ بیٹھ کر پرماتما سے لو لگاؤ' کہیں ہمالیہ کی کسی برفانی چوٹی پر جہاں سرد ہوائیں چل رہی ہوں' ننگے بدن بیٹھو یا کہیں کسی گڑھے میں اپنے آپ کو دفن کرو۔ یہ سو طرح کے جتن ہیں جو انسان اپنے تصورِ خدا کے مطابق اس سے قربِ حاصل کرنے کے لئے کرتا رہا ہے۔ بہر کیف انسان یہ ساری مشقتیں اپنی دانست میں کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے لئے جھیلتا ہے اور وہ مقصد ہے اپنے تصورِ خدا کے مطابق اپنے خدا کا قرب حاصل کرنا۔ یہ انسان کی ایک فطری اور طبعی خواہش ہے۔ چنانچہ خواہ وہ اپنے رب کو صحیح طور پر پہچان نہ پایا ہو اور اس کی توحید کا بھی اسے صحیح ادراک نہ ہو سکا ہو' لیکن فطرتِ انسانی میں اپنے رب کا قرب حاصل کرنے کا جذبہ طبعی اور فطری طور پر موجود ہے۔ جیسے انسان کو بھوک لگتی ہے' چاہے وہ جانتا نہ ہو کہ یہ بھوک کیا شے ہے

لیکن اسے اس کا احساس بہرحال ہوتا ہے۔ اس بھوک کا احساس نوزائیدہ بچے کو بھی ہوتا ہے جو بھوک کی وجہ سے روتا ہے اور جب روتا ہے تو ماں اسے دودھ پلاتی ہے۔ یہ اصل میں اس کی جبلت اور فطرت ہے۔

چنانچہ جس طریقے سے انسان میں اپنی مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تقاضوں کا شعور اس کے اندر سے ابھرتا ہے' ایسے ہی ایک روحانی پیاس بھی انسان کے اندر سے ابھرتی ہے۔ کسی میں یہ کم ابھرتی ہے اور کسی میں زیادہ۔ بہت سے لوگ اس دنیا میں اتنے مشغول ہو جاتے ہیں اور اپنے حیوانی تقاضوں کی تسکین و تکمیل میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی روح کی پکار سنائی نہیں دیتی' یا وہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔ لیکن کوئی انسان' انسان ہونے کے ناتے اس سے بالکل محروم نہیں ہے۔ یہ پیاس اندر سے ابھرتی ہے اور یہی پیاس ہے جو لوگوں کو جنگلوں میں لے جاتی ہے۔ یہی پیاس تھی جس نے گوتم بدھ کو اپنے محل سے نکال کر نہ معلوم کن کن جنگلوں کی خاک چھنوائی اور اسے کن کن منیوں اور رشیوں کے پاس لے گئی اور اس سے کس کس کی جوتیاں سیدھی کرائیں۔ اس نے یہ سب آخر کس لئے کیا؟ وہ کپل وستو کا راجکمار تھا۔ محل میں اسے تمام آسائشیں اور ہر طرح کا آرام حاصل تھا۔ لیکن اس کے دل میں مکتی کے حصول اور دکھ سکھ کی حقیقت جاننے اور اپنے تصور کے مطابق اپنے ایشور کا گیان دھیان حاصل کرنے کا ایک جذبہ ابھرا اور وہ اپنے محل' اپنی جوان بیوی اور شیر خوار بچے کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ فطرت کی ایک پیاس تھی جس نے اسے یہ سب کچھ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ یہ فطرت کی پکار ہی تھی جو حضرت سلمان فارسی ؓ کو ایران سے نکال کر شام کے مختلف علاقوں میں لے گئی' جہاں وہ مختلف راہبوں کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے دل میں اپنے رب کی معرفت کی ایک پیاس تھی' تو جس کے دل میں یہ چیز ایک سچی پیاس کی حیثیت سے ابھر آئے تو اسے اس وقت تک چین نہیں آسکتا جب تک اس کی اس پیاس کی سیری کا کوئی بندوبست نہ ہو جائے۔

اب آیئے کہ اس آیتِ مبارکہ کا رمضان اور اس کے روزوں کے حکم و فرضیت سے جو ربط و تعلق ہے' اسے واضح کر دیا جائے۔ روزے کی حکمت بیان فرمائی گئی "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" اور رمضان میں ان کی فرضیت کی دوسری اضافی حکمت بیان فرمائی "وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ"۔۔۔۔ اب غور کیجئے کہ ہمارے اندر جو ملکوتی روح ہے اور اس میں اپنے رب سے قرب کی جو پیاس ہے' وہ بالعموم ہمارے جسمانی و حیوانی اور جبلی تقاضوں کے تلے دبی رہتی ہے۔ ہم کاروبارِ دنیا میں منہمک رہتے ہیں۔ ہم دنیا کی آسائشوں اور کام و دہن کی لذتوں میں مستغرق رہتے ہیں۔ بھوک لگی تو کھانا کھالیا' پیاس لگی تو پانی پی لیا' جنسی جذبے نے جوش مارا تو جائز طریقے سے اس کی تسکین کرلی۔ ان

تقاضوں کو پورا کرنے میں انسان اس قدر منہمک رہتا ہے کہ روح کی پیاس اسے محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن رمضان کے روزوں کا پروگرام در حقیقت یہ ہے کہ پورے مہینے کے لئے معمولات کو الٹ دیا گیا ہے' دن میں بھوک اور پیاس برداشت کرو' جنسی خواہش کی تسکین پر قدغن لگاؤ۔ پھر رات کو جبکہ آرام و استراحت کا شدید ترین داعیہ ابھرتا ہے' حکم ہوتا ہے کہ قرآن کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ گویا نفس کے جتنے تقاضے ہیں اُن کی مخالفت ہو رہی ہے۔ صلوٰۃ العشاء کے بعد تاکید ہے کہ ہر مسلمان صلوٰۃ التراویح ادا کرے' جس کا اہلِ سنت کے تین فقہی مسالک میں بیس رکعات کا نصاب مقرر ہے۔ اور یہ تو کم سے کم نصاب ہے۔ ورنہ مطلوب یہ ہے کہ رمضان کی راتوں کا اکثر و بیشتر حصہ قرآن مجید کے ساتھ جاگ کر گزارا جائے۔ اگر ہمیں وہ شان نصیب نہیں ہوتی جو سورۃ المزمل میں نبی اکرم ﷺ کی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بیان کی گئی ہے کہ: "اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ" (کہ اے نبیؐ آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ دو تہائی یا نصف رات اپنے رب کے حضور کھڑے رہتے ہیں' نوافل میں قرآن پڑھتے ہیں اور صحابہ کی ایک جماعت بھی آپ کی پیروی میں راتوں کو قیام کرتی ہے)۔ تو اس کی کچھ مشابہت اور اس کا کوئی عکس تو ہمارے اندر رمضان المبارک کی راتوں میں آجائے۔ بہر حال نماز عشاء کے بعد گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی اضافی مشقت بھی اُس وقت ہے جب طبیعت پر کسل کا شدید ترین غلبہ طاری ہوتا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ اسے میں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ یہ "REVERSAL" ہے۔ گیارہ مہینے جو عمل متواتر جاری رہتا ہے اس میں گویا "REVERSE GEAR" ہے جو اس طور پر رمضان میں لگایا گیا ہے کہ اپنے نفس اور کام و دہن کے تقاضوں کو دباؤ۔ جب یہ دبتے ہیں تو اندر سے روح کو کچھ آزادی ملتی ہے اور اس کی پیاس ابھرتی ہے۔ جب یہ ابھرے تو پہلی خوشخبری دی گئی کہ جان لو کہ تمہارا رب تمہارے بالکل قریب ہے۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ

جن لوگوں نے یورپ کی تاریخ پڑھی ہے' وہ جانتے ہیں کہ انسانی حقوق کے لئے جو کشمکش وہاں ہوئی' انسان نے اپنے سیاسی حقوق حاصل کرنے اور مطلق العنان بادشاہوں کے چنگل اور جاگیرداروں کے شکنجے سے نجات پانے کے لئے وہاں جو جدوجہد کی ہے اور پاپائیت کے منحوس اور بدترین نظام سے رستگاری پانے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے جو قربانیاں دی ہیں ان کا شمار تاریخ انسانی کے اہم ترین واقعات میں ہوتا ہے۔ یہ وہ نشاناتِ راہ ہیں جن پر چل کر حقوقِ انسانی کا منشور وجود میں آیا ہے۔ جبکہ میرے نزدیک انسانی حقوق کا سب سے بڑا منشور (MAGNACHARTA) وہ ہے کہ جو اس آیت مبارکہ میں دیا گیا ہے کہ انسان کو یہ اطمینان

دلایا جائے کہ تمہارا رب تم سے دور نہیں ہے۔ تمہارے رب کے اور تمہارے درمیان کوئی پادری کوئی پنڈت کوئی پیر حائل نہیں ہے۔ بلکہ نقشہ یہ ہے کہ۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

یہ ہے بندے کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ ---- رب تو ہر دم' ہر آن مائل بہ کرم رہتا ہے۔ رب تو ہم سے غافل نہیں ہے۔ ہم ہی اس سے غافل اور غائب ہو جاتے ہیں۔ عربی کا یہ شعر میں نے بارہا اپنی تقاریر میں سنایا ہے کہ۔

اَغیبُ وَ ذُوَ اللّطائفِ لا یغیبُ
وَ اَرجُوہ رجاءً لا یَخیبُ!

کہ میں غائب ہو جاتا ہوں' وہ ہستی جو ذوالّلطائف ہے وہ تو غائب نہیں ہوتی۔ وہ تو ہر آن اور ہر جگہ موجود ہے۔ وہ تو منتظر رہتی ہے کہ میرا بندہ میری طرف متوجہ ہو۔ یہ تو ہم ہیں جو اس کی طرف رخ نہیں کرتے۔ ہم نے اس سے پیٹھ موڑی ہوئی ہے۔ ہم نے اس دنیا کو اپنا محبوب اور مطلوب بنالیا ہے اور دولت کے پجاری بن گئے ہیں۔ ہم ہیں جو اپنے نفس کی غلامی میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم اس ذوالّلطائف ہستی کی طرف رخ کب کرتے ہیں! حدیثِ قدسی میں یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ میرا بندہ اگر میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ میرا بندہ میری طرف بالشت بھر آتا ہے تو میں اس کی طرف ہاتھ بھر آتا ہوں۔ میرا بندہ اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں۔ میرا بندہ اگر میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو میں اس سے بہت اعلیٰ محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ یعنی ملائکہ مقربین کی محفل میں اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کا ذکر فرماتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اسی حقیقت کی ترجمانی جواب شکوہ میں اس طرح کی ہے کہ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں!

لیکن اگر بندے میں یہ پیاس ابھر آئے تو جب چاہے' جہاں چاہے اللہ سے ہم کلام ہو جائے۔ جہاں کوئی حاجب نہیں' کوئی دربان نہیں۔ اس کی بھی علامہ اقبال نے بہترین تعبیر کی ہے۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

یہ تو درحقیقت ہماری غفلت ہے' ہماری نادانی ہے کہ کچھ ہوشیار اور چالاک لوگ استھان بنا کر بیٹھ

جاتے ہیں کہ اگر تم کو اپنے رب سے ہم کلام ہونا ہے تو پہلے نذر و نیاز یہاں پیش کرو۔ ہماری مٹھیاں گرم کرو۔ ہم اس کے دربار کے حاجب اور دربان ہیں اور ہم جس بزرگ کی قبر کے مجاور بنے بیٹھے ہیں، ان بزرگ کی اللہ کے یہاں بڑی رسائی ہے۔ تمہاری درخواست اللہ کے یہاں ان کے ذریعہ سے پہنچ سکے گی اور ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہیں۔ پہلے ہمیں خوش کرو، ہماری مٹھی گرم کرو تو تمہارا کام بنے۔

یہ نہ سمجھئے کہ تمام لوٹ کھسوٹ اور جابرانہ استحصال صرف سیاسی سطح ہی پر ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا سب سے بڑا استحصال (EXPLOITATION) مذہب کے میدان میں ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو سورۃ التوبہ میں بالکل واشگاف کر دیا گیا ہے۔ فرمایا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (آیت ۳۴)

"اے اہلِ ایمان! اکثر علماء و مشائخ کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طور طریقوں سے کھا جاتے ہیں اور اللہ کی (توحید کی) راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں۔"

مذہب کے نام پر باطل اور ناجائز طریقوں سے لوگوں کے اموال ہڑپ کرنے کے لئے سارے نظام بنائے گئے ہیں کہ یہ دیوی دیوتا ہیں، یہ ان کے مندر اور استھان ہیں، یہ ان کے بت ہیں اور یہ ان کے پروہت ہیں، یہ ان کے پجاری ہیں، یہ پنڈت ہیں ___ یا یہ کہ کوئی پیر صاحب ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ان کی فلاں فلاں بزرگوں سے نسبت ہے ___ کہیں کوئی پادری یا پوپ صاحب ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے مسیحؑ کے چہیتے ہیں۔ ان کی خدمت کرو گے، ان کو راضی رکھو گے، ان کی ناز برداریاں اٹھاؤ گے، تب ہی ایشور تک رسائی ہو گی۔ ان کو خوش کرو گے تب ہی اللہ خوش ہو گا۔ ان کو راضی رکھو گے تب ابن اللہ تمہارے کام آئیں گے۔ عجیب اور حیران کن بات یہ ہے کہ مذہب کے نام پر جو استحصالی نظام اب تک قائم رہے ہیں وہاں یہ حرف "پ" آپ کو ضرور ملے گا۔ پنڈت، پروہت اور پیر حتیٰ کہ پادری کے لئے جو انگریزی لفظ "PRIEST" ہے وہاں بھی یہ "پ" موجود ہے۔ اسی "پ" کی گردان آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ عربی زبان میں "پ" ہے ہی نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ جو اللہ کا دین ہمیں دے کر تشریف لے گئے ہیں، اس نے اس تصور کی بالکلیہ نفی کر دی۔

جب بندے کے اندر اپنے رب سے ہم کلام ہونے کی سچی اور حقیقی پیاس پیدا ہوتی ہے اور اس کے قلب کی گہرائی سے واقعتاً اپنے رب سے مناجات کرنے اور اپنی غفلت پر پشیمان ہو کر توبہ و استغفار کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے تو ذرا سوچئے کہ یہ بات بندے کے لئے کس درجہ اطمینان کا

موجب بخشی ہے کہ اس کا رب اس سے دور نہیں' بالکل قریب ہے۔ اس کا در اس کی طرف رجوع کرنے والوں کے لئے ہمیشہ کھلا ہے۔ ایک حدیث شریف کے الفاظ ہیں۔ "اِنّ اللّٰہ یقبل توبۃَ العبدِ مالم یُغرغِر" ---- یقیناً اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک موت کا گھنگھرو نہ بولنے لگے۔ یعنی جب تک عالمِ نزع طاری نہ ہو جائے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے خواہ کسی کے کوہِ اُحد جتنے گناہ ہوں۔ اسی مفہوم کی سرمد نے بڑی ترجمانی کی ہے۔

باز آ' باز آ' ہر آنچہ ہستی باز آ   گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست   صد بار اگر توبہ شکستی' باز آ

کہ اگر اس سے پہلے تم سو بار بھی توبہ کر کے توڑ چکے ہو' تب بھی پروانہ کرو۔ آج اگر خلوص و اخلاص کے ساتھ پھر متوجہ ہو گے تو جان لو کہ یہ بارگاہ وہ ہے جو کبھی بند نہیں ہوتی۔ اس پر کوئی حاجب اور دربان نہیں۔ سچی پشیمانی اور خلوص کے ساتھ رجوع کرو' اس ارادہ کے ساتھ اللہ سے توبہ کرو کہ اے اللہ! میں شرمسار ہوں' پشیمان ہوں' تجھ سے مغفرت کا طلب گار ہوں۔ اے اللہ! اب تک جو زندگی غفلت میں گزری ہے' گناہوں میں بسر ہوئی ہے اسے تو معاف فرما دے۔ اب میں از سرِ نو تجھ سے عہد کر رہا ہوں' پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ' پورے عزم کے ساتھ کہ اے پروردگار! میں اب تیرے حکم کے خلاف نہیں چلوں گا اور تیری مرضی کے مطابق زندگی بسر کروں گا۔ تو نے جو کرنے کو فرمایا ہے' وہ کروں گا اور جس سے بچنے کا حکم دیا ہے اس سے بچوں گا۔ تجھ پر ایمان پختہ رکھوں گا' تو کوئی وجہ نہیں کہ بندے کی توبہ قبول نہ ہو' اللہ لازماً اپنی عنایات کے ساتھ ایسے بندے کی جانب متوجہ ہو گا' یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے۔

اس آیت کا اگلا حصہ نہایت قابلِ توجہ ہے۔ فرمایا: فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِی "انہیں بھی تو چاہئے کہ میرا کہنا مانیں" ---- یک طرفہ معاملہ نہیں چلے گا کہ تم مجھ سے اپنی منوانا چاہو اور میری مانو نہیں۔ مجھے اپنی احتیاجیں سنانا چاہو اور میری بات سن کر نہ دو' مجھ سے تم چاہو کہ میں تمہاری مدد کروں اور حال یہ ہو کہ تم میرے دشمنوں کے مددگار بنے ہوئے ہو' تم نے میرے باغیوں کے ساتھ وفاداریوں کا رشتہ استوار کر رکھا ہو اور میرے نافرمانوں کے نقشِ قدم کو اپنے لئے نشانِ راہ بنایا ہوا ہو۔ یہ نہیں ہو گا۔ اللہ اور بندے کا معاملہ دو طرفہ ہے' یکطرفہ بات نہیں چلے گی۔ اسی لئے فرمایا: فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ۔ "تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا۔" اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ "تم اللہ کی مدد کرو گے' اللہ تمہاری مدد کرے گا۔" اللہ کی مدد کیا ہے؟ اس کے دین کی خدمت! اس کے دین کی اقامت کے لئے تن من دھن لگانا! باقی اللہ ہم سے روزی نہیں چاہتا۔

سورۂ طٰہٰ میں نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے نوعِ انسان سے فرمایا گیا: لَا نَسْئَلُکَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُکَ "(اے نبیؐ) ہم آپ سے روزی طلب نہیں کرتے بلکہ ہم آپ کو رزق دیتے ہیں۔" سورۃ الذاریات (آیات ۵۶ تا ۵۸) میں یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ "O اور میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں (عبادت اور دعا کا باہم ربط و تعلق میں آگے قدرے تفصیل سے بیان کروں گا) "مَا اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ "O میں ان (جن و انس) سے رزق کا خواہاں نہیں ہوں اور نہ اس کا خواہاں ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں، پلائیں ـــ "اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ "O تحقیق اللہ تو خود ہی رزاق ہے، روزی رساں ہے، بڑی قوت والا ہے، بڑا زبردست ہے ـــ ہاں اس کے دین کا جھنڈا اٹھاؤ، اس کو سربلند کرنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگاؤ تو پھر جو دعا کرو گے اسے ہم قبول کریں گے، تمہاری جو پکار ہوگی اس پر تم ہمیں موجود پاؤ گے ـــ ایک حدیث شریف میں یہاں تک الفاظ آئے ہیں "تَجِدْهُ اَمَامَکَ" "تم اسے اپنے سامنے موجود پاؤ گے۔ وہ کہیں دور ہے ہی نہیں۔ جیسے سورۂ قٓ میں فرمایا: نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ O "ہم تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں" ـــ سورۃ الحدید میں فرمایا: هُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ "وہ (اللہ) تمہارے ساتھ موجود ہوتا ہے، جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو" ـــ یہ تو تمہاری بے التفاتی اور عدم توجہی ہے کہ تم ہماری طرف رخ نہیں کرتے۔ تمہارے دل کے سنگھاسن پر ہماری محبت کے بجائے دنیا اور اس کے مال و دولت کی محبت براجمان ہے، اگر دل کو ان محبتوں سے پاک کر کے میری محبت سے آباد کر لو تو جہاں تم ہو، وہاں میں ہوں۔ ایک حدیث قدسی میں یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ پھر ایک مقام وہ بھی آتا ہے کہ میں اپنے بندے کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ میں اپنے بندے کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ میں اپنے بندے کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ میں اپنے بندے کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔

استجابت کے معنی قبول کرنے کے بھی ہیں۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت نمبر ۴۷ میں یہ لفظ وارد ہوا ہے:

اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَا لَکُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ یَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَکُمْ مِّنْ نَّکِیْرٍ O (آیت ۴۷)

"اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو (اسے قبول کرو) اس سے پہلے پہلے کہ وہ دن اللہ کی طرف سے آن دھمکے کہ اس دن کو لوٹنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس دن نہ کوئی تمہارا پشت پناہ ہوگا اور

نہ ہی تمہاری طرف سے کوئی انکار کرنے والا ہو گا۔"

اور یہاں سورۃ البقرہ کی زیر گفتگو آیت میں فرمایا "فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ" کہ ان کو بھی تو چاہئے کہ میری پکار کو سنیں، میری بات کو قبول کریں۔

ہمارے رب کی پکار کیا ہے؟ اس کے ضمن میں تین چیزیں خاص طور پر گن لیجئے۔ پہلی پکار یا پہلا مطالبہ ہے: "اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ" کہ اپنے رب کی بندگی کرو۔ ہمہ تن اللہ کے بندے بن جاؤ اور پورے وجود کے ساتھ اس کے سامنے جھک جاؤ یعنی: "اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً" اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اسلام میں جزوی داخلہ اللہ کو قبول نہیں ہے۔ دوسرا مطالبہ ہے دین کی دعوت و تبلیغ کا جس کے لئے قرآن کی اصطلاح "شہادت علی الناس" کی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے دین کی دعوت و تبلیغ کا حق ادا کر دیا، اپنے قول سے ہی نہیں عمل سے بھی دین کی گواہی دی، آپؐ کے بعد یہ ذمہ داری امت کے کاندھوں پر آگئی کہ پوری نوع انسانی تک اسی طرح قرآن کے پیغام کو عام کریں اور دین کی دعوت و تبلیغ کا حق ادا کریں جیسے آپؐ نے کر کے دکھایا تھا۔ چنانچہ اس کے لئے محنت، کوشش، جدّوجہد امت کے ہر فرد پر لازم ہے۔ "وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ" یہ الفاظ سورۃ الحج میں اسی ضمن میں وارد ہوئے ہیں۔ اور تیسری پکار یا تیسرا مطالبہ ہے کہ اس دینِ حق کو قائم و نافذ کرنے کے لئے اپنے آپ کو لگاؤ، کھپاؤ اور اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طور پر صرف کرو!

یہی بات ہے جو آیت زیر گفتگو میں فرمائی جا رہی ہے۔ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ — انہیں بھی چاہئے کہ میرا کہنا مانیں، میری پکار پر لبیک کہیں۔ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ — اور مجھ پر پختہ یقین رکھیں۔ اس لئے کہ یہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے جو پونجی درکار ہے، وہ ایمان کی پونجی ہے۔ جس شخص کا اللہ پر ایمان و یقین اور توکل ہے اور اللہ کی مدد و نصرت پر بھروسہ ہے وہی اللہ کی پکار پر لبیک کہہ سکے گا اور اس کے احکام کی تعمیل کر سکے گا۔ اس آیتِ مبارکہ کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ پر "لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ٥" "تاکہ لوگ رشد و ہدایت کی راہ پر آجائیں۔ یعنی روزہ، اللہ کی تکبیر، اس کا شکر، اس سے تعلق، اس سے دعا اور مناجات، یہ تمام امور وہ ہیں کہ اگر ایک بندۂ مومن ان کا خلوص و اخلاص کے ساتھ اہتمام کرے تو وہ راہ ہدایت اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

بہرحال یہ ہے وہ آیت مبارکہ جس کے ذریعہ سے ہمارے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ دعا کا روزے اور رمضان کے دوگونہ پروگرام سے کیا تعلق ہے! میں رمضان کو اس لئے شامل کر رہا ہوں کہ روزہ تو دن کا ہے۔ اور رات کو در حقیقت رمضان کا خصوصی پروگرام ہے۔ رمضان کیا ہے! "شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ۔ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن

نازل کیا گیا ہے --- چنانچہ یہ رات کی تراویح' یہ رات کا قیام' یہ قرآن مجید کا سننا' سنانا اور اس کا سمجھنا' یہ اصل میں رمضان کا حق ہے۔ ورنہ جہاں تک روزے کا تعلق ہے تو خواہ وہ کسی بھی مہینے کے فرض ہو جاتے' ان کی برکات تو وہی رہتیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ دو آتشہ پروگرام بنایا کہ دن کا روزہ ہو اور رات کا قیام۔ تاکہ دونوں کا نتیجہ یہ نکلے کہ تمہاری روح کچھ بیدار ہو' تمہارے اندر اپنے رب کی جانب رجوع کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کی پیاس ابھرے' اللہ کے ساتھ محبت اور اس کی معرفت کا ایک جذبہ دل میں جوش مارے۔ اور جب یہ کیفیت ہو جائے تو اس روح کو کلام الٰہی کی صورت میں اعلیٰ ترین غذا مہیا ہو سکے اور یہ خوشخبری پا کر وہ جھوم جائے کہ میں قریب ہی ہوں اور ہر پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارے۔ دعا کی عظمت کے بیان میں سورۃ المومن کی ایک آیت جو عام طور پر خطبۂ اول کے اختتام پر پڑھی جاتی ہے' نہایت عظیم ہے۔ "وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ؀" (آیت ۶۰) اس اعتبار سے یہ بڑی جامع آیت ہے کہ اس میں دعا اور عبادت کا ہم معنی اور مترادف ہونا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اس آیت مبارکہ کے دو حصے ہیں اور ہمیں ان دونوں حصوں کے مابین جو ربط و تعلق ہے اسے بھی جاننا ہوگا۔ پہلے حصے میں فرمایا: "وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ" ("اور تمہارے رب نے یہ فرمایا کہ مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا"۔) ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے اس کی بڑی پیاری وضاحت فرمائی ہے کہ دنیا میں اگر کسی سے کچھ مانگا جائے تو بالعموم انسان کو ناگوار ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑے سخی کا حال بھی یہ ہوتا ہے کہ اس کے سامنے اگر کوئی بار بار دستِ سوال دراز کرے تو شروع میں تو شاید وہ ناگواری محسوس نہ کرے لیکن ایک حد پر آ کر اس کے ماتھے پر بھی ضرور بل پڑ جائیں گے۔ لیکن اللہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ مانگنے سے ہرگز ناراض نہیں ہوتا بلکہ اس سے جتنا مانگا جائے اتنا ہی وہ خوش ہوتا ہے' اور جتنا مانگا جائے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بے حساب دیتا ہے۔ آپ اللہ سے دعا کرتے ہیں' اس سے مانگتے ہیں تو اس لئے کہ آپ کو یقین ہوتا ہے کہ وہ آپ کی دعا سنتا ہے' آپ کی تکلیف کو رفع کر سکتا ہے' آپ کی احتیاج کو پورا کر سکتا ہے۔ اس طرح گویا آپ کی طرف سے اللہ کے سمیع ہونے اور اس کے عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہونے کے یقین کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہی چیزیں درحقیقت ایمان کا لبِّ لباب ہیں۔ اگر ہمارے اخلاقی تصور میں فساد پیدا ہو گیا ہو تو یہ بات دوسری ہے' ورنہ آپ سوچئے کہ اگر کوئی شریف آدمی کسی سے کوئی درخواست کرے کہ میرا یہ کام کر دیجئے اور وہ اس کام کو کر دے تو کیا اس کے دل میں اس شخص کے لئے احسان مندی کے جذبات پیدا نہیں ہوں گے' اور کیا وہ یہ نہیں سمجھے گا کہ اگر اس نے میری کوئی تکلیف رفع کی ہے یا آڑے

وقت میں میرا ساتھ دیا ہے تو مجھ پر بھی اس کا کوئی حق قائم ہو گیا ہے ـــــ ہر شریف اور با مروّت انسان کا یہ ردِّ عمل لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ اللہ سے دعا کریں گے، اس کی استعانت کے طالب ہوں گے تو اگر آپ کی شخصیت کج نہ ہو گئی ہو تو خود بخود آپ کے دل میں یہ جذبہ ابھرے گا کہ آپ اپنے محسن کے شکر گزار بنیں، اس کی عظمت کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر دیں۔ اسی کا نام عبدیت ہے۔ چونکہ آپ اس سے دعا کر رہے ہیں، اس سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی استدعا کر رہے ہیں، لہٰذا اس کا بالکل معقول، فطری اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ آپ اس کی بندگی اختیار کریں، اس کا ہر حکم بجا لائیں۔ چنانچہ اب دیکھئے کہ آیتِ مبارکہ کے اس حصہ کا دوسرے حصہ سے کتنا گہرا ربط و تعلق قائم ہو گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۝" ـــــ "اور تمہارے رب نے کہا ہے کہ تم مجھے پکارو (مجھ سے دعا کرو) میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا۔ یقیناً وہ لوگ جو میری عبادت سے استکبار کرتے ہیں (یعنی تکبر کی بنا پر میری بندگی سے منہ موڑتے ہیں) یہی لوگ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر" ـــــ آپ نے دیکھا کہ اس آیۂ مبارکہ میں دعا اور عبادت کس طرح ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر آئے ہیں۔

دعا درحقیقت اللہ تعالیٰ سے کلام اور مناجات کرنے کا نام ہے اور اس بات کی بھی دلیل ہے کہ آپ اللہ کو حاضر ناظر تسلیم کرتے ہیں، اسے القدیر سمجھتے ہیں، اسے السمیع اور البصیر جانتے ہیں، اسے مشکل کشا اور حاجت روا مانتے ہیں، اسے الرحمٰن الرحیم تسلیم کرتے ہیں، اسے فریاد رس اور عادل و منصف سمجھتے ہیں۔ علامہ اقبال کا چوتھا لیکچر "MEANING OF PRAYER" کے موضوع پر ہے۔ یعنی اسلام میں دعاء کا مفہوم کیا ہے! ان کے لیکچرز کی زبان خاصی مشکل ہے لیکن یہ لیکچر نسبتاً آسان ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دعا کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ہماری انائے صغیر اس انائے کبیر کے روبرو ہو جائے، ہم اللہ سے خطاب کر رہے ہوں ـــــ دیکھئے ایک ہے غائبانہ ذکر، جسے آپ "PASSIVE" ذکر بھی کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کا ورد کرنا۔ یہ بھی اللہ کا ذکر ہے لیکن اس میں اللہ سے خطاب نہیں ہے، اس میں مکالمہ اور مخاطبہ نہیں ہے۔ لیکن جب آپ کہتے ہیں: "إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ" کہ اے اللہ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے۔ تو اس میں ہم اللہ سے براہِ راست خطاب کرتے ہیں۔ یہاں ہماری انائے صغیر (FINITE EGO) روبرو آجاتی ہے انائے کبیر (INFINITE EGO) کے۔ یہ جو بالمشافہ بات ہو رہی ہے، یہ درحقیقت ذکر و فکر کی معراج ہے۔ یہ گویا "ACTIVE" ذکر ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے اس کو یاد کیا جا رہا ہے۔

دعا کے ضمن میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے رب سے کن چیزوں کی دعا کرنی چاہئے۔ اختصار سے عرض کرتا ہوں کہ اس کے بارے میں ایک طرف تو نبی اکرم ﷺ نے ہمیں یہاں تک تلقین فرمائی ہے کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی درکار ہو تو اللہ سے مانگو۔ یعنی یہ کہ حقیر سے حقیر شے بھی اسی سے مانگو۔ اس میں گویا تلقین فرمائی جارہی ہے کہ کسی اور سے کچھ نہ مانگو۔ تمہارے لئے اتنی بڑی بارگاہ کھلی ہوئی ہے' اس بارگاہ سے کیوں نہیں مانگتے؟ تمام انسانوں کے دل اس کی انگلیوں کے مابین ہیں۔ وہ تمہاری ضرورت جس کے ذریعے سے چاہے گا پوری کردے گا۔ تم کیوں اپنے جیسے انسان کے سامنے دستِ سوال دراز کرکے اپنی انسانیت کو رسوا کرتے ہو؟ کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلانا گویا اپنی عزتِ نفس کا دھیلا کرنا ہے۔ لہٰذا جو کچھ بھی مانگنا ہو اللہ سے مانگو۔ کوئی چیز اس کے دائرہ اختیار سے باہر نہیں ہے۔ سورۃ الکہف میں دو یتیم بچوں کے مکان کی دیوار کا ذکر آیا ہے جو بوسیدگی کی وجہ سے گر رہی تھی۔ ان کے والدین نیکوکار تھے۔ انہوں نے کچھ پونجی اپنے یتیم بچوں کے لئے اس دیوار کے نیچے گاڑی ہوئی تھی تاکہ بچے جب بڑے ہو جائیں تو ان کے کام آئے۔ وہ دیوار گرا چاہتی تھی کہ اس کو بچانے کے لئے حضرت خضر پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کے نظام میں اللہ کے احکام کی تنفیذ کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے محافظت کرنے والے نہ معلوم کہاں کہاں موجود ہیں ہم تو جانتے تک نہیں۔ "وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ" تیرے رب کے لشکروں کو کون جانتا ہے سوائے اس کے۔ وہ جس کے ذریعے سے چاہے گا تمہاری ضرورت کو پورا کرادے گا۔ لہٰذا کسی سے کچھ نہ مانگو اور جو کچھ مانگنا ہے اسی سے مانگو۔ لیکن جیسے معرفت اور ہدایت کے مختلف درجے ہیں اور یہ ایک ایسا مسلسل عمل ہے کہ آپ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب مجھے کُل ہدایت حاصل ہو گئی اسی طرح دعا کے بھی درجات ہیں۔ بلند ترین درجہ یہ ہے کہ اللہ سے کچھ نہ مانگو سوائے ہدایت اور استقامت کے ــــ دنیا کی کوئی شے اللہ سے نہ مانگو۔ اس لئے کہ تمہیں کیا پتہ کہ جو کچھ تم اللہ سے مانگ رہے ہو' وہ حقیقت میں تمہارے لئے خیر ہے یا شر ہے۔ وہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

"عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا
وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝" (البقرۃ:۲۱۶)

یعنی ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناپسند ہو اور تم اللہ سے اسے اپنے سے دور کر دینے کی دعا کرو حالانکہ اسی میں تمہارے لئے خیر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور اس کے حصول کے لئے اللہ کے حضور گڑگڑا کر اور باتھار گڑ کر دعا کرتے رہو اور حقیقت میں وہی چیز تمہارے لئے موجبِ شر ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا: "وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ

بِالشَّرِّ دُعَاءَہٗ بِالْخَیْرِ وَ کَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ○" (آیت ۱۱) کہ انسان بعض اوقات خیر مانگتے مانگتے اپنے لئے شر مانگ بیٹھتا ہے' اس لئے کہ انسان نہایت جلد باز ہے۔ انسان حقیقت کو نہیں دیکھتا جبکہ اللہ تعالیٰ حقیقت کو دیکھتا ہے۔ لہٰذا اس سے مانگنے کی اصل چیز ہے ہدایت۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ "اے اللہ' اے ہمارے رب' ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت عطا فرما"۔ اس ضمن میں یہ دعا نہایت عظیم ہے:

اَللّٰھُمَّ اھْدِنَا فِیْمَنْ ھَدَیْتَ' وَعَافِنَا فِیْمَنْ عَافَیْتَ' وَتَوَلَّنَا فِیْمَنْ تَوَلَّیْتَ' وَبَارِکْ لَنَا فِیْمَا اَعْطَیْتَ' وَقِنَا شَرَّ مَا قَضَیْتَ' فَاِنَّکَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی عَلَیْکَ' اِنَّہٗ لَا یَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ' وَلَا یَعِزُّ مَنْ عَادَیْتَ' تَبَارَکْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَیْتَ' نَسْتَغْفِرُکَ وَنَتُوْبُ اِلَیْکَ

"اے اللہ تو ہماری رہبری فرما ان لوگوں میں جن کی تو نے رہبری کی ہے اور ہمیں عافیت دے ان لوگوں میں جن کو تو نے عافیت دی ہے اور ہمیں دوست بنا لے ان لوگوں میں جن کو تو نے دوست بنالیا ہے اور ہمیں برکت دے اس چیز میں جو تو نے ہمیں عطا کی ہے اور ہمیں ہر اس برائی سے بچالے جو تو نے مقدر کر رکھی ہے۔ کیونکہ تو ہی فیصلہ کرتا ہے اور تیرے خلاف فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ بلاشبہ تیرا دوست ذلیل نہیں ہو سکتا اور تیرا دشمن عزیز نہیں ہو سکتا۔ اے ہمارے رب! تو برکت والا ہے اور بلند و برتر ہے۔ ہم تجھ سے مغفرت چاہتے ہیں اور ہم تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔"

پھر یہ کہ اللہ سے استقامت طلب کی جائے۔ "اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَقُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِکَ وَعَلٰی طَاعَتِکَ"۔ اے اللہ ہمارے قدموں کو اور ہمارے دلوں کو اپنے دین پر اور اپنی اطاعت پر جمادے۔ اسی طرح اللہ سے ہدایت میں افزونی اور علم میں اضافہ کی دعا کیجئے۔ سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو یہ دعا تلقین فرمائی ہے: "وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ○" (آیت ۱۱۴) اور (اے نبی!) کہا کیجئے کہ اے میرے رب' میرے علم میں اضافہ فرما ــــ اللہ سے علمِ نافع کی دعا کیجئے۔ سلام پھیرنے کے بعد حضور ﷺ جو دعائیں مانگا کرتے تھے اس میں یہ دعا بھی شامل ہوتی تھی۔ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَعَمَلًا مُتَقَبَّلًا وَرِزْقًا طَیِّبًا"۔ اے اللہ' میں تجھ سے سوال کرتا ہوں' نفع دینے والے علم اور مقبول ہونے والے عمل اور پاک اور حلال روزی کا۔ اللہ سے مانگنے کی ایک چیز فہم و فراست بھی ہے جیسے نبی اکرم ﷺ دعا مانگا کرتے تھے: "اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقِیْقَۃَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ" کہ اے اللہ' مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی کہ فی الواقع وہ ہیں۔ ظاہر تو سب ہی دیکھ رہے ہیں' لیکن مجھے ہر شے کی اصل حقیقت پر مطلع فرما! کسی شاعر نے کیا خوب

کہا ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

تو اللہ سے وہ نظر مانگئے جو اشیاء کی حقیقت تک پہنچے۔ اسی طرح یہ دعا بھی حرزِ جان بنانے کے لائق ہے: "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ" (آل عمران:۸) "اے رب ہمارے، نہ پھیر نا ہمارے دلوں کو جبکہ تو ہمیں ہدایت دے چکا اور ہم کو اپنے خاص خزانہ فضل سے رحمت عنایت فرما۔ بے شک تو ہی ہے سب کچھ دینے والا۔"

دعا کے باب میں چوٹی کی دعا وہ ہے جس کا نام دعائے استخارہ ہے، جس کے بارے میں صحابہ کرامؓ کا کہنا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں یہ دعا ایسے سکھائی اور اس طرح تلقین فرمائی جیسے قرآن مجید کی سورتیں سکھاتے اور تلقین فرماتے تھے۔ وہ دعا یہ ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَستَخِیرُکَ بِعِلمِکَ وَاَستَقدِرُکَ بِقُدرَتِکَ وَاَسْئَلُکَ مِن فَضلِکَ العَظِیمِ، فَاِنَّکَ تَقدِرُ وَلَا اَقدِرُ وَتَعلَمُ وَلَا اَعلَمُ وَاَنتَ عَلَّامُ الغُیُوبِ، اَللّٰھُمَّ اِن کُنتَ تَعلَمُ اَنَّ ھٰذَا الاَمرَ خَیرٌ لِّی فِی دِینِی وَمَعَاشِی وَعَاقِبَۃِ اَمرِی فَاقدُرہُ لِی وَیَسِّرہُ لِی ثُمَّ بَارِکْ لِی فِیہِ، وَاِن کُنتَ تَعلَمُ اَنَّ ھٰذَا الاَمرَ شَرٌّ لِّی فِی دِینِی وَمَعَاشِی وَعَاقِبَۃِ اَمرِی فَاصرِفہُ عَنِّی وَاصرِفنِی عَنہُ، وَاقدُرْ لِیَ الخَیرَ حَیثُ کَانَ ثُمَّ اَرضِنِی بِہٖ (صحیح بخاری)

"اے اللہ! میں تیرے علم کے ذریعہ سے بھلائی مانگتا ہوں اور تیری قدرت کے ذریعہ سے قدرت چاہتا ہوں اور مانگتا ہوں تیرے فضل عظیم سے۔ چونکہ تو ہی قادر ہے میں قادر نہیں ہوں اور تو ہی جانتا ہے اور میں نہیں جانتا۔ اور تو ہی علام الغیوب ہے۔ اے میرے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے دین، میری معاش اور انجام کار کے اعتبار سے میرے لئے اچھا ہے تو اسے تو میرے قابو میں کر دے اور اس کو میرے لئے آسان بنا دے۔ پھر اس میں میرے لئے برکت عطا فرما۔ اور اگر تیرے علم کامل میں یہ کام میرے لئے دین و دنیا اور انجام کار کے اعتبار سے برا ہے، شر ہے تو اس کام کو تو مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے لئے بھلائی مقرر فرما دے جہاں کہیں بھی وہ ہو اور پھر مجھے اس سے خوش فرما دے۔"

دعا کے ضمن میں اگرچہ اصولی بات تو یہی ہوگی کہ اگر مانگنا ہی ہے تو اللہ سے مانگو، یہاں تک کہ جوتی کا تسمہ تک اسی سے مانگو۔ لیکن اللہ سے مانگنے کی اعلیٰ وارفع چیزیں دوسری ہیں۔ توپ سے مکھیاں نہیں مارا کرتے۔ یہ دعا بہت بڑی توپ ہے۔ اس سے بڑی شے کا شکار کرو، اس کے ذریعے دنیا کی یہ حقیر اور چھوٹی چھوٹی چیزیں ہی کیوں مانگتے ہو۔ دعا تو اعلیٰ وارفع چیزوں کے لئے ہونی چاہئے۔ وہ ہدایت کے لئے، دین کے علم اور اس کے فہم کے حصول کے لئے، دین پر عمل پیرا ہونے اور اس پر استقامت و ثبات کے لئے ہونی چاہئے۔ ایک بندۂ مومن کو اللہ تبارک و تعالیٰ سے یہ توفیق طلب کرنی چاہئے کہ وہ اپنا تن من دھن اس کے دین کی سرفرازی و سربلندی کے لئے لگا سکے۔ اللہ سے اس کے دین کا جھنڈا سربلند کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کی ہمت طلب کیجئے۔ اللہ سے شہادت کی موت مانگئے۔ اس لئے کہ خود حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ آرزو کی ہے۔

"وَالَّذِی نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنْ اَغْزُوَ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ فَاُقْتَلَ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اَغْزُوَ فَاُقْتَلَ"

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے میری یہ تمنا اور خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کر دیا جاؤں اور پھر مجھے زندہ کیا جائے اور میں پھر اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کر دیا جاؤں۔"

حضور ﷺ کا ایک یہ ارشادِ گرامی بھی ہر مسلمان کے پیش نظر رہنا چاہئے کہ "جو (مسلمان) اس حال میں مرا کہ نہ تو اس نے (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ اس کے دل میں اس کی تمنا ہی پیدا ہوئی تو اس کی موت نفاق کے ایک شعبہ پر ہوئی۔" چنانچہ اللہ سے مانگنے کی چیزیں جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت ہیں۔ا

احادیثِ نبوی ؐ حکمت کا ایک عظیم خزانہ ہیں اور قرآن حکیم کے مطالب ہی کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہیں۔ حکمت کے بڑے عظیم خزانے پوشیدہ ہیں رسول اللہ ﷺ کے چھوٹے چھوٹے ارشادات اور فرمودات میں، بالکل ایسے جیسے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہو۔ دعا کے بارے میں آپ ؐ کے یہ الفاظ نہایت جامع ہیں: "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ" دعا عبادت کا مغز ہے۔ یہ

ا۔ صحیح بخاری میں منقول ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ طلبِ شہادت کے لئے کثرت سے مندرجہ ذیل دعا مانگا کرتے تھے جو قبول بھی ہوئی اور آپؓ مدینۃ النبی ﷺ میں ایک مجوسی غلام کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ "اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی شَھَادَۃً فِی سَبِیلِکَ وَاجْعَلْ مَوْتِی فِی بَلَدِ رَسُولِکَ" یعنی "اے اللہ! تو مجھے اپنے راستہ میں شہادت کی موت عطا فرما اور میری موت تیرے رسول ﷺ کے شہر میں واقع ہو"۔ (مرتب)

عبادت کا جوہر اور لبِّ لباب ہے۔ دوسری حدیث میں تو یہ پردہ بھی اٹھادیا، ارشاد فرمایا: "الدّعاءُ هو العبادة" دعا ہی تو اصل عبادت ہے۔ جس سے تم دعا کر رہے ہو وہی تمہارا معبود ہے۔ اگر اللہ کے سوا کسی اور کو پکارا ہے تو وہی آپ کا معبود ہے، چاہے آپ زبان سے کہہ رہے ہوں "لَا اِلٰہ الاّ اللّٰہ" کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کو معبود نہیں مانتے۔ اگر مشکل کشائی کے لئے آپ نے اللہ کے سوا کسی بھی اور ہستی کو پکارا خواہ وہ فرشتہ ہو، پیغمبر ہو یا ولی اللہ ہو، تو گویا آپ نے اللہ کو نہیں، اس ہستی کو اپنا معبود سمجھا ہے۔ توحید کا تقاضا یہی ہے کہ استدعا، استعانت، استمداد، استنصار، استغاثہ، یہ سب صرف اللہ کے ساتھ مخصوص رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنی دعاؤں کو صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات بابرکات کے لئے خالص کرلیں۔

آخر میں دعا کے ضمن میں ایک عملی بات بیان کرنا چاہوں گا۔ وہ عملی بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق کوئی دعا کبھی بیکار یا رائیگاں نہیں جاتی۔ دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے لیکن اس کی مقبولیت کی تین مختلف شکلیں ہیں۔ پہلی یہ کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے جو چیز مانگتا ہے وہ اگر اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں اس کے لئے خیر ہے تو وہ اسے وہی چیز عطا فرمادیتا ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اگر اللہ کے علم کامل میں یہ ہے کہ میرا بندہ لاعلمی میں مجھ سے ایسی چیز مانگ رہا ہے جو اس کے حق میں مفید نہیں ہے۔ (جیسے آپ کا بچہ آپ سے چاقو مانگے تو آپ اسے چاقو نہیں دیتے۔ آپ کو پتہ ہے کہ اسے اس کا استعمال نہیں آتا اور یہ نادانی میں اپنا ہاتھ کاٹ بیٹھے گا۔) تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں بندے کو وہ چیز عطا فرمادیتا ہے جو اس کے حق میں واقعتاً مفید ہو۔ تیسری شکل یہ ہے کہ اگر کوئی شے بھی اس وقت بندے کو دینا اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ میں نہیں ہے تو اللہ اس دعا کو بندے کے لئے توشہ آخرت بنالیتا ہے۔ آخرت میں وہ دعا اس بندے کے لئے اجر و ثواب کا ذریعہ بن جائے گی۔ اقول قولی هذا واستغفرالله لی ولکم ------ ○○

بقیہ : پریس ریلیز

کرسکے۔ نہیں بھی اگر ایک بار قار قومی زندگی کی خواہش ہے تو انقلاب بلکہ اسلامی انقلاب لانا ہوگا۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہمارے ملک میں تو انقلاب کیا کوئی معمولی تبدیلی بھی نہیں لائی جاسکی۔ ذوالفقار علی بھٹو چاہتے تو اس ملک کے ماؤزے تنگ بن سکتے تھے لیکن وہ جاگیرداری کے اپنے خول سے باہر نہ نکل سکے اور اسی طرح جنرل ضیاء الحق کو نظام مصطفیٰ کی تحریک نے ایسا ماحول مہیا کردیا تھا کہ تاریخ میں دوسرے عمر بن عبدالعزیزؒ بن کر نمودار ہوسکتے تھے مگر انہوں نے بھی اسلام سے صرف اپنے اقتدار کو طول دینے کا کام لیا۔ انہوں نے کہا کہ بظاہر امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی لیکن سیرت مطہرہ کا مطالعہ ہمارا حوصلہ بڑھاتا ہے جہاں مکہ کے بعد طائف سے بھی مکمل مایوسی کے بعد یثرب کی طرف کھڑکی کھل گئی تھی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پاکستان اور افغانستان سے خیر برآمد ہوگا۔ افغانستان کا جہاد "فساد" بن گیا ہے تو اس لئے کہ وہ راستہ اختیار نہیں کیا گیا تھا جس کی تعلیم نبی اکرم [illegible] آہم بہت سے بتائے ہیں جو خون بہائے، وہ ان شاء اللہ رنگ ضرور لائے گا۔ ○○

مسئلہ ملکیتِ زمین

ڈاکٹر اسرار احمد

یہ بات تو پاکستان کا ہر عاقل و بالغ شہری' اور ہر صاحبِ دانش و بینش انسان جانتا ہے کہ جب تک یہاں سے جاگیرداری اور بڑی زمینداری کا خاتمہ نہیں ہوتا نہ یہ ملک ترقی کر سکتا ہے' نہ یہاں عوامی فلاح و بہبود کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے' اور نہ ہی حقیقی معنی میں عوامی سیاست جڑ پکڑ سکتی ہے۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ جاگیرداروں سے ان کی جاگیریں اور بڑے زمینداروں سے ان کی فاضل زمینیں کس اصول کے تحت واپس لی جائیں؟ اس لئے کہ خواہ کسی اور معاملے میں یہاں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کا سوال نہ اٹھایا جاتا ہو' اور شریعتِ اسلامی کے اوامر و نواہی کو پوری شانِ استغناء کے ساتھ نظرانداز کر دیا جاتا ہو' جب بھی جاگیرداری اور زمینداری کا مسئلہ سامنے آتا ہے فوراً شریعت کی ڈھال سامنے کر دی جاتی ہے۔ اور اصولِ ملکیت اور اس کے جملہ لوازم کے ضمن میں اسلام کے خالص فقہی تصورات کی پناہ لے لی جاتی ہے۔

چنانچہ بعض لوگوں کو یہ تک کہنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اصل میں پاکستان بنایا ہی نوابوں' وڈیروں' جاگیرداروں' اور بڑے زمینداروں نے تھا' اور ان کے پیش نظر قیامِ پاکستان سے صرف اپنے مفادات اور اپنی مراعات کے تحفظ کا مقصد تھا جو تاحال باحسنِ وجوہ پورا ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ انڈین نیشنل کانگرس ایک جانب خود بھی عوامی جماعت تھی' اور دوسری جانب اس کی قیادت پر سوشلزم کے نظریات اور تصورات کا غلبہ تھا' جبکہ مسلم لیگ بنیادی طور پر نوابوں اور نواب زادوں' اور

"سرداں" اور خان بہادروں کی جماعت تھی، جنہوں نے اسلام کے نعرے کو صرف اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر استعمال کیا۔ چنانچہ نتیجہ بھی عملی طور پر یہی نکلا کہ بھارت میں زمینداری آزادی کے فوراً بعد ختم کر دی گئی جبکہ پاکستان میں فیوڈل لارڈز تاحال کوسِ لمنِ الملک بجا رہے ہیں۔

تو اگرچہ ان لوگوں کا یہ نظریہ تاحال تو "مطابقِ واقعہ" ہونے کی بنا پر بظاہر بہت درست نظر آتا ہے، لیکن اس کی جڑ ایک تو اس حقیقتِ واقعی سے کٹ جاتی ہے کہ نہ مصوّر و مفکر و مجوزِ پاکستان علامہ اقبال جاگیردار یا زمیندار تھے، نہ ہی بانی و معمار و مؤسسِ پاکستان محمد علی جناح اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، دوسرے ان شاء اللہ مستقبل ثابت کر دے گا کہ پاکستان کا قیام مشیتِ الٰہی میں پوری نوعِ انسانی کے سامنے اسلام کے سماجی انصاف، اور عدل و قسط پر مبنی اجتماعی نظام کا ایک نمونہ پیش کرنے کے لئے عمل میں آیا ہے، اور ان شاء اللہ جلد ہی اس "راہی" کو اپنی "بھولی ہوئی منزل" یاد آجائے گی اور یہ "بھٹکا ہوا آہو" بالآخر "سوئے حرم" روانہ ہو جائے گا! اللّٰھم آمین!

تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ سوال جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے پہلے بھی محض خیالی یا وہمی نہیں تھا بلکہ واقعی اور حقیقی تھا، اور ۱۹۹۰ء میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپیلیٹ بنچ نے جو فیصلہ قزلباش وقف وغیرہ بنام چیف لینڈ کمشنر پنجاب وغیرہ نامی اپیل میں دیا تھا، اس نے تو اس سوال کو ہزار گنا زیادہ اہم بنا دیا ہے اور اگر اس مشکل کا کوئی حل تلاش نہیں کیا جاتا تو اس سے آئندہ کسی بھی نوعیت کی ادنیٰ سے ادنیٰ زرعی اصلاحات کا راستہ بھی ہمیشہ کے لئے مسدود ہو جائے گا۔

تو اگرچہ اس سوال کا جواب دینے، اور اس مشکل کو حل کرنے کی اصل ذمہ داری سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ان نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے انتخابی منشوروں میں زمین کی ملکیت کو محدود کر دینا شامل کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ ان جماعتوں کی جانب سے تاحال اس سوال کا کوئی جواب، اور

اس مشکل کا کوئی حل پیش نہیں کیا گیا، جس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ اس معاملے میں ہرگز سنجیدہ نہیں ہیں، اور ان کے پیش نظر بھی سوائے سیاسی نعرہ بازی کے اور کچھ نہیں ہے! واللہ اعلم!!

بنابریں راقم الحروف اس بحث کا آغاز ان کالموں میں اس لئے کر رہا ہے کہ اس پر سنجیدہ غور و فکر اور گفت و شنید کا آغاز ہو، اور خصوصاً وہ اہلِ علم اور رجالِ دین اس پر پوری توجہ مرکوز کریں جو اس ملک میں نہ صرف واقعی طور پر اسلام کی سربلندی اور دین حق کے غلبہ و قیام کے آرزومند ہوں، بلکہ اس کے لئے اپنے ذہن و فکر اور سعی و عمل کی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر بھی آمادہ ہوں! بالخصوص ایسے اصحابِ علم و دانش آگے بڑھیں جو کتاب و سنت کے نصوص کی پابندی کے عزم مصمم کے ساتھ ساتھ صرف سلف کی اجتہادی آراء کے مقلّدِ جامد بن کر نہ رہ جائیں بلکہ شریعت کے اصل مقاصد و اہداف کو بھی پیش نظر رکھ سکیں، اور جُہد و جہاد کے جذبے سے سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ قیاس و اجتہاد اور اس کے ضمن میں مصالحِ مرسلہ اور مفادِ عامہ کو بھی ملحوظ رکھ سکیں۔ اس لئے کہ حکمتِ قرآنی کا جو اصل الاصول سورۃ الرعد کی آیت ۱۷ میں بیان ہوا ہے، اس کے مطابق دوام اور بقاء صرف ان ہی چیزوں کو حاصل ہوتا ہے "جو لوگوں کے لئے مفید ہوں!" اور اس کے بغیر تمام وعظ و نصیحت اور ساری سیاسی نعرہ بازی زبان کا پھاگ اور منہ کا جھاگ بن کر رہ جاتی ہے جس کا مقدر ہی "سوکھ کر ختم ہو جانا" ہے!

اس تمہید کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے اولین حقیقت جو پیش نظر رہنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ — اگرچہ قانونی اور فقہی سطح پر اسلام میں انسانی ملکیت کا تصور یقیناً موجود ہے، چنانچہ اسی پر وراثت، زکوٰۃ اور دوسرے صدقاتِ واجبہ و نافلہ وغیرہ کے جملہ فقہی احکام مترتب ہوتے ہیں، تاہم واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی اساسی اور ایمانی تعلیمات کے مطابق یہ حقِ ملکیت اتنا مطلق، اتنا مقدس، اور

۱۔ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ

عرفِ عام میں اتنا "گاڑھا" نہیں ہے جتنا کہ سرمایہ دارانہ معیشت کے علمبردار خیال کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی اصل حیثیت صرف "حق و منعِ تصرف" کی ہے۔ یعنی کسی شے کے استعمال کا حق کسی ایک شخصِ معیّن کو حاصل ہو اور باقی سب کے لئے ممنوع ہو جائے!

چنانچہ قرآن حکیم کی اساسی تعلیمات کے مطابق کوئی انسان کسی دوسری شے تو کیا خود اپنے جسم و جان کا بھی مالک نہیں ہے' بلکہ اس کے وجود سمیت کائنات کی ہر شے کا مالکِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور جسم و جان' زمین و مکان' مال و منال اور آل و اولاد سمیت ہر شے جو کسی بھی انسان کو حاصل ہوتی ہے اس کی ملکیت کی نہیں بلکہ اس کے پاس اللہ کی ایک مقدس امانت کی حیثیت رکھتی ہے۔ بقولِ شیخ سعدیؒ۔

این امانت چند روزہ نزدِ ماست
در حقیقت مالکِ ہر شے خدا ست!

لہٰذا اِن اشیاء کے استعمال کا حق اور ان میں تصرف کا اختیار تو انسان کو حاصل ہے لیکن صرف ان قوانین و قواعد کے مطابق' اور ان حدود و قیود کے اندر اندر جو مالکِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ نے معیّن فرما دیئے ہیں۔

جبکہ اس کے برعکس "سرمایہ دارانہ" ذہنیت کی مکمل عکاسی قرآن حکیم میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے لوگوں کے اس قول کی صورت میں کر دی گئی ہے: "اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا" "کہ ہم تصرف کریں اپنے اموال میں جیسے بھی ہم چاہیں!" (سورۂ ہود: آیت ۸۷)۔ بہرحال اسلام اس نوع کے مطلق اور مقدس حقِ ملکیت کا ہرگز قائل نہیں' اس کے نزدیک انسانوں کو جو حقِ ملکیت حاصل ہے وہ مقیّد اور محدود ہے۔

پھر خاص طور پر زمین کے ضمن میں یہ معاملہ ایک قدم مزید آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور...... اگرچہ "اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ" یعنی "یقیناً زمین اللہ ہی کی ملکیت ہے!" (سورۃ الاعراف: آیت ۱۲۸) اور "وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ" یعنی "زمین کو اس نے

بچھادیا تمام مخلوقات کے لئے!" (سورۃ الرحمٰن: آیت ۱۰) اور "هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا "یعنی "وہی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے سب کچھ جو زمین میں ہے!" (سورۃ البقرہ: آیت ۲۹) اور اس مضمون کی دوسری بے شمار آیات سے زمین کی ذاتی ملکیت کے خلاف کوئی قانونی اور فقہی دلیل تو نہیں اخذ کی جاسکتی' تاہم ایک رہنما اصول ضرور حاصل ہوتا ہے جس کی نہایت خوبصورت تعبیر کی ہے علامہ اقبال مرحوم نے 'یعنی:۔

"اِس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمین!"

اور۔

"دِہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں' تیری نہیں!
تیرے آباء کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں!"

اور۔

"رزقِ خود را از زمیں بردن رواست!
ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خدا ست!"

یہی وجہ ہے کہ زمین کے بارے میں یہ شرعی ضابطہ سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ اگر کسی قطعۂ زمین کا "مالک" اسے بے کار پڑا رہنے دے اور اس میں کاشت نہ کرے تو ایک معیّن عرصے کے بعد اس کا "حقِ ملکیت" خود بخود ختم ہو جائے گا اور زمین ضبط کرلی جائے گی۔

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر نہایت حسین و لطیف نکتہ وہ ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بیان فرمایا ہے کہ چونکہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ "میرے لئے پوری زمین کو مسجد بنادیا گیا ہے[۲]!" لہٰذا پوری زمین کو "وقف" کی حیثیت حاصل ہے' اس لئے کہ مسجد وقف ہوتی ہے۔ (چنانچہ جملہ اوقاف کے مانند مسجد کے بھی صرف "متولّی" ہوتے ہیں' مالک کوئی نہیں ہوتا!)

(۲۔ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تاہم ان تمام نکات سے صرف اصولی رہنمائی اخذ کی جاسکتی ہے، قطعی اور قانونی جزئیات کا استنباط نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ کم از کم ہم اہلِ پاکستان کی حد تک اس مشکل مسئلے کا مکمل حل امیرالمومنین اور "خلیفۂ خلیفۃِ الرّسول ﷺ" حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد میں موجود ہے جو آپؓ نے عراق، شام، ایران، اور مصر کے مفتوحہ ممالک کی اراضی کے بارے میں کیا تھا اور جس پر ابتدائی ردّو قدح، اور بحث و نزاع کے بعد "اِجماع" ہو گیا تھا۔ اور جس کی بنیاد پر شریعتِ اسلامی میں اراضی کی دو مستقل قسمیں قرار پاگئیں، یعنی (۱) عُشری جو انفرادی ملکیت میں ہوتی ہے اور جس کی پیداوار سے صرف عُشر یعنی دسواں حصہ یا نصفِ عشر یعنی بیسواں حصہ بیت المال میں داخل ہوتا ہے۔ اور (۲) خراجی جو مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت یا بالفاظِ دیگر بیت المال کی ملکیت ہوتی ہے۔ اور جس کی پیداوار میں سے کم و بیش نصف کی حد تک "خراج" کی صورت میں بیت المال میں داخل ہوتا ہے۔

یہ واقعہ قاضی ابو یوسفؒ نے اپنی مشہورِ زمانہ تالیف "کتاب الخراج" میں، جو انہوں نے عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش پر تالیف فرمائی تھی، نہایت عمدہ اور مفید تفاصیل کے ساتھ بیان فرمادیا ہے۔ ان مفتوحہ علاقوں کے بارے میں ایک رائے یہ تھی کہ ان کی تمام زمینیں جملہ باشندوں سمیت "مالِ غنیمت" کی حیثیت رکھتی ہیں جنہیں اس قانونِ غنیمت کے مطابق جو سورۃ الانفال میں بیان ہوا ہے (آیت ۴۱) مجاہدین میں تقسیم کر دیا جانا چاہئے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کا صرف پانچواں حصہ بیت المال کی ملکیت قرار پاتا اور باقی چار حصے مجاہدین میں تقسیم ہو جاتے اور اس طرح تمام اراضی انفرادی جاگیریں بن جاتیں اور اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ تاریخ انسانی کا

۲۔ قال النبی ﷺ: "جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طَهُوْرًا"۔۔۔ رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی والدارمی، عن علی بن ابی طالب و جابر ابن عبداللہ و عبداللہ بن عمرو و عبداللہ بن عباس و ابی ھریرۃ و حذیفۃ بن الیمان و انس بن مالک و ابی امامۃ و ابی ذر الغفاری (رضی اللہ عنہم)

عظیم ترین جاگیردارانہ نظام قائم ہو جاتا، بلکہ ان ممالک کے تمام باشندے مسلمانوں کے شخصی "غلام" بن جاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ذوقِ سلیم اور فہمِ عمیق نے اس صورت کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا، جس کی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: "حق عمرؓ کی زبان پر بولتا ہے[۳]" اور "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے![۴]" چنانچہ ان کے انقلابی و اجتہادی مزاج اور عمیق اور مجتہدانہ فہمِ قرآن نے فیصلہ کیا کہ اموالِ غنیمت کا اطلاق صرف ان اموالِ منقولہ پر کیا جائے جو عین موقعِ جنگ پر حاصل ہوں، جیسے ہتھیار، سامانِ رسد، اور گھوڑے اور اونٹ اور دوسرے مال مویشی وغیرہ جبکہ اراضی اور دیگر اموالِ غیر منقولہ کو مالِ "فَے" قرار دیا جائے جس کا حکم سورۃ الحشر کی آیات ۶ تا ۱۰ میں بیان ہوا ہے یعنی یہ سب مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار پائیں اور ان کی آمدنی عوام کی فلاح و بہبود پر بھی خرچ ہو اور دفاعِ ملی اور دیگر امورِ مملکت میں بھی صرف ہو۔ بہرصورت کسی کی بھی انفرادی ملکیت تصور نہ ہو!

اس پر شدید ردّ و قدح اور بحث و نزاع کا بازار گرم ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس رائے سے اختلاف کرنے والوں میں ابتداءً حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور ان کے بعض ساتھی تھے، لیکن پھر انہیں بعض کبارِ صحابہؓ یہاں تک کہ عشرہ مبشرہ میں سے بھی دو حضرات یعنی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ کی پرزور حمایت اور وکالت حاصل ہو گئی۔ جبکہ دوسری جانب بھی کبارِ صحابہؓ ہی کی ایک بڑی جماعت جس میں عشرہ مبشرہ میں سے بھی تین حضرات یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ حضرت عبداللہ

۳۔ عن ابی ذر الغفاری رضی اللہ عنہ قال: سمعتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: "اِنَّ اللّٰہَ وَضَعَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ، یَقُوْلُ بِہٖ" ... رواہ ابو داؤد فی الخراج والامارۃ

۴۔ عن عقبۃ بن عامر رضی اللہ عنہ قال قال رسولُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: "لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَکَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّاب" ... رواہ الترمذی، باب مناقب عمر بن الخطاب

ابن عمر رضی اللہ عنہما جیسے عالمانِ کتاب و سنت بھی شامل تھے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق رکھتی تھی۔ اور اس نزاع کا فیصلہ بالآخر اس طرح ہوا کہ انصارِ مدینہ میں سے اوس اور خزرج دونوں قبیلوں سے تعلق رکھنے والے پانچ پانچ اکابر صحابہؓ کی ایک مجلس تشکیل دی گئی جو زراعت کے معاملات میں واقفیت اور مہارتِ تامہ کے حامل تھے (گویا اصطلاحِ جدید میں زراعت اور بندوبستِ اراضی کے ماہرین کا ایک کمیشن مقرر کیا گیا) جنہوں نے "بالاتفاق" حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی تصویب کی۔ اور اس طرح گویا اس امر پر "اجماع" ہو گیا کہ جو ملک یا علاقے بزورِ شمشیر فتح ہوئے ہوں ان کی اراضی کسی کی "انفرادی ملکیت" نہیں ہوں گی' بلکہ بیت المال کی ملکیت یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار پائیں گی' جبکہ عشری یعنی انفرادی ملکیت میں داخل اراضی صرف ان علاقوں کی ہوں گی جہاں کے لوگ از خود لڑے بھڑے بغیر ایمان لے آئے ہوں' جیسے اہلِ یثرب' جو از خود یا محض دعوت و تبلیغ سے ایمان لائے تھے' اور پھر خود جا کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے یہاں لائے تھے۔ رضی اللہ عنہم و ارضاہم اجمعین!

اس ضمن میں "کتاب الخراج" کا حسب ذیل اقتباس بہت مفید ہے جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اوس و خزرج کے مذکورہ بالا دس اکابر و اشراف کی گفتگو نقل کی گئی ہے۔ وَ ھُوَ ھٰذا:

"جب یہ لوگ جمع ہو گئے تو آپؓ نے اللہ کی ایسی حمد و ثنا کی جس کا وہ مستحق ہے' اور پھر فرمایا:

"میں نے آپ حضرات کو صرف اس لئے تکلیف دی ہے کہ میرے کاندھوں پر آپ کے معاملات کی ذمہ داری ہے' اس میں آپ میرا ہاتھ بٹائیں۔ کیونکہ میں بھی آپ کی طرح ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات کو حق متعین کرنا ہو گا۔ بعض لوگوں نے مجھ سے اختلاف کیا ہے اور بعض نے اتفاق۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ حضرات بہر حال وہی رائے قبول کریں جو

میں نے اختیار کی ہے۔ آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے جو حق بات کہتی ہے۔ خدا کی قسم! اگر میں نے کوئی بات کہی ہے جس پر میں عمل کا ارادہ رکھتا ہوں تو اس سے میرا ارادہ سوائے اتباعِ حق کے کچھ اور نہیں"۔

ان لوگوں نے کہا:

"امیرالمومنین! آپ فرمائیے، ہم سنیں گے (اور غور کریں گے)"

تو آپؓ نے فرمایا:

"آپ حضرات نے ان لوگوں کی باتیں سن لی ہیں جن کا خیال ہے کہ میں ان کی حق تلفی کر رہا ہوں۔ میں ظلم کے ارتکاب سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، اگر میں نے کوئی ایسی چیز جو ان لوگوں کا حق تھی، ان کو نہ دی ہو اور دوسروں کو دی ہو، تو میں بڑا ہی بدبخت ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ کسریٰ کی سرزمین کے بعد اب کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے جو فتح ہو۔ اللہ نے ان کے اموال، زمینیں اور کاشتکار ہمیں بطورِ غنیمت عطا کر دیئے ہیں۔ ان لوگوں کو غنیمت سے جو مال ملا تھا اسے تو میں نے اس کے مستحقین میں تقسیم کر دیا ہے، اور پانچواں حصہ نکال کر اسے اس کے متعینہ مصارف میں تقسیم کر دیا ہے، بلکہ ابھی اس کی تقسیم میں مصروف ہوں۔ میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ زمینوں کو مع کاشتکاروں کے سرکاری ملکیت قرار دے دوں اور اس کے کاشتکاروں پر خراج عائد کر دوں اور ان پر فی کس جزیہ مقرر کر دوں جسے وہ ادا کرتے رہیں۔ اس طرح یہ جزیہ اور خراج مسلمانوں کے لئے (ایک مستقل) "فَے" کا کام کرے گا جس کی آمدنی میں فوجی، کم سن افراد اور آنے والی نسلیں حصہ دار ہوں گی۔ دیکھئے! ان سرحدوں کی حفاظت کے لئے بہرحال کچھ آدمی تعینات کرنے ہوں گے جو مستقلاً وہاں رہیں۔ یہ بڑے بڑے علاقے، جیسے شام، الجزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصر، ان میں فوجی چھاؤنیاں قائم رکھنا اور ان کو وظائف دیتے رہنا ناگزیر ہے۔ اب اگر یہ زمینیں اور ان پر محنت کرنے والے کاشتکار تقسیم کر دیئے جائیں گے تو ان لوگوں کو کہاں سے دیا جائے گا!"

یہ سن کر سب نے کہا کہ:

"آپ ہی کی رائے صحیح ہے۔ آپ نے جو فرمایا وہ خوب ہے' اور جو رائے قائم کی وہ بہت موزوں ہے۔ اگر ان شہروں اور سرحدوں میں افواج نہیں رکھی جائیں گی اور ان کے لئے بطور تنخواہ کچھ مقرر نہ کیا جائے گا تو اہلِ کفر اپنے شہروں پر پھر سے قابض ہو جائیں گے۔"

آخر میں آپؓ نے فرمایا: "اب مجھ پر معاملہ واضح ہو گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ کون ایسا ماہر اور دانشمند ہے جو ان زمینوں کا مناسب طور پر بندوبست کر دے اور کاشت کاروں پر ان کی برداشت کے مطابق خراج تجویز کر دے۔" لوگوں نے بالاتفاق عثمان بن حنیف کا نام پیش کیا اور کہا: "آپ ان کو اس کام کا ذمہ دار بنا کر بھیج سکتے ہیں کیونکہ یہ صاحبِ فہم و بصیرت اور تجربہ کار انسان ہیں۔"

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلا تاخیر ان کو علاقہ سواد کی پیمائش کے کام پر مقرر کر دیا۔ ("کتاب الخراج" ترجمہ: ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی)

خلافت، ملوکیت اور جاگیرداری

گزشتہ تین صحبتوں میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) اگرچہ انفرادی سطح پر جو بلند ترین نصب العین اسلام انسان کو عطا کرتا ہے وہ رضائے الٰہی اور فلاحِ اخروی کا حصول ہے، لیکن دنیا کی زندگی میں اجتماعی سطح پر اسلام کا بلند ترین مقصد یا ہدف، یا بالفاظِ دیگر نصب العین، سماجی انصاف اور نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام ہے!

(۲) سماجی انصاف کے ضمن میں اگرچہ اصولی طور پر معاشرتی سطح پر اولین اہمیت کامل انسانی مساوات اور باہمی اخوت کو حاصل ہے، اور سیاسی سطح پر یہی حیثیت حریت اور قانونی و دستوری برابری کو حاصل ہے، لیکن موجودہ دنیا میں سماجی انصاف کا اولین تقاضا جس پر باقی تمام امور کا کلی دارومدار ہے معاشی عدل اور کم از کم "مواقع" کے اعتبار سے کامل مساوات ہے!

(۳) اگرچہ عہد حاضر میں عالمی سطح پر تو معاشی ظلم و استحصال کا سب سے بڑا ذریعہ سرمایہ دارانہ معیشت کا وہ عالمگیر نظام ہے جس کی اساس "سرمایہ کے سود" پر قائم ہے، لیکن پاکستان چونکہ بنیادی طور پر زرعی معیشت کا حامل ملک ہے، لہٰذا یہاں معاشی جبر و استبداد، اور ظلم و استحصال کا سب سے بڑا مظہر "زمین کے سود" پر مبنی جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کا نظام ہے جس کی بیخ کنی کے بغیر یہاں سماجی انصاف کا کوئی تصور تک نہیں کیا جا سکتا!

(۴) دورِ خلافتِ راشدہ کا سیاسی نظام چونکہ اللہ کی حاکمیت کے تحت اس کے فرمانبردار بندوں کی "اجتماعی خلافت" کا نظام تھا جس کی اصل اساس عدل و قسط پر قائم تھی، لہٰذا اگرچہ اس کے دوران وہ نازک مرحلہ بھی آیا جس پر ذرا سی غفلت یا ڈھیل سے تاریخ انسانی کے عظیم ترین جاگیردارانہ نظام کی بنیاد قائم ہو جاتی لیکن ع "اللہ نے

بروقت کیا جس کو خبردار!" کے مصداق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اجتہادی بص
نے تمام مفتوحہ ممالک کی کُل اراضی کو خراجی یعنی تمام مسلمانوں کی "اجتماعی ملکیہ
قرار دے کر اس کا کامل سدِ باب کر دیا۔

لیکن افسوس کہ جیسے ہی خلافتِ راشدہ کا دور ختم ہوا' اور خلافت نے تد
ملوکیت کی صورت اختیار کرنی شروع کی اس معاملے میں بھی زوال کا آغاز ہو گیا او
دروازہ حضرت عمر رضی اللہ نے اپنی اجتہادی بصیرت اور بے مثال ہمت و جرأت سے
کیا تھا آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں جاگیرداری اور غیر حا
زمینداری نے عالمِ اسلام میں قدم جمانے شروع کر دیئے!

یہاں یہ عرض کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے کہ جاگیرداری اور ملوکیت کا چ
دامن کا ساتھ ہے' اور یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہو گا کہ جیسے بعض حشرات الارض (جیسے
کن کھجورا) کے سینکڑوں پاؤں ہوتے ہیں ایسے ہی جاگیردار اور "لینڈلارڈز" ملوکیہ
شہنشاہیت' اور "امپیریلزم" کے پاؤں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلکہ غالباً اس سے بھی
تر مثال برگد کے درخت کی اضافی جڑوں کی ہے کہ جیسے جیسے اس کا پھیلاؤ بڑھتا جاتا۔
اس کی شاخوں سے انسانی داڑھی کے سے انداز میں اضافی جڑیں نیچے اترنی شرو
ہو جاتی ہیں جو زمین تک پہنچ کر اور اس میں قدم جما کر نہ صرف اضافی جڑوں کا کام د
ہیں جن سے زمین کی غذائیت درخت کو حاصل ہوتی ہے بلکہ ستونوں کی صورت اختیا
کر کے اضافی سہارا بھی بن جاتی ہیں - بعینہ یہی معاملہ ملوکیت اور شہنشاہیت کا ہے کہ
جیسے جیسے پھیلنی اور پھیلنی شروع ہوتی ہے اپنے وفاداروں اور خدمت گزاروں کو جاگیر
داری کی مسندیں اور منصب عطا کر کے انہیں کاشتکاروں کے استحصال کے ذریعے او
اپنے اقتدار کے سہاروں کی حیثیت دے دیتی ہے!

چنانچہ یہی حادثہ خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد عالمِ اسلام کو پیش آیا۔ حضرت
سفینہ رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قولِ مبارک امام احمدؒ' امام ترمذیؒ اور اما
ابو داؤدؒ نے روایت کیا ہے کہ: "خلافت تیس برس تک رہے گی' اس کے بعد ملوکیت

کا آغاز ہو جائے گا[5]" اور امام احمدؒ نے آنحضور ﷺ کی ایک اور حدیث جو حضرت نعمان ابن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے' اس میں آپ ﷺ نے اس ملوکیت کے ساتھ "کاٹ کھانے والی" یعنی ظالم اور غاصب کی صفت کا اضافہ فرمایا ہے[6]۔ تو اگرچہ تاریخ اسلام میں خلافت کے پورے طور پر ملوکیت میں تبدیل ہونے میں تو لگ بھگ ایک صدی کا عرصہ لگا اس لئے کہ ملوکیت کے اصل ٹھاٹھ باٹھ پورے طور پر بنو عباسؓ کے دور میں شروع ہوئے تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کے آثار امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت ہی میں شروع ہو گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں اسلام کی تعلیمات کے ایک حصے پر پردے پڑنے کے اس عمل کا آغاز ہو گیا تھا جس کا تذکرہ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الٰہ آباد میں ان الفاظ میں کیا تھا کہ: "میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ تقدیر مبرم ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہو گی۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کے چہرے پر جو پردے عرب امپیریلزم کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اسلام کی اصل تعلیمات کی ایک عملی صورت دنیا کو دکھا سکیں!"

واضح رہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ اور خواہ اسے۔

"مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا!"

کے مصداق ہی قرار دیا جائے' بہرحال میری سوچی سمجھی اور پختہ رائے یہ ہے کہ ان کی

۵۔ عن سعید بن جمھان قال حدثنی سفینۃ (رضی اللہ عنہ) قال قال رسول اللہ ﷺ: "اَلخِلَافَۃُ فِیْ اُمَّتِیْ ثَلَاثُوْنَ سَنَۃً ثُمَّ مُلْکٌ بَعْدَ ذٰلِکَ"۔۔ ثم قال لی سفینۃ: اَمْسِکْ خلافۃ ابی بکر' ثم قال و خلافۃ عمر و خلافۃ عثمان' ثم قال امسک خلافۃ علی' فوجدناھا ثلاثین سنۃ۔ رواہ الترمذی فی الفتن' باب ما جاء فی الخلافۃ۔ و رواہ ابو داؤد فی السنۃ' باب فی الخلفاء

۶۔ حدیث کے الفاظ ہیں: "....ثُمَّ تکون مُلکًا عَاضًّا....."

نیت پر شک کرنا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر اپنے ایمان کو مشکوک بنانے ـ
مترادف ہے، اس لئے کہ اگرچہ وہ فتح مکہ کے دن ایمان لائے تھے تاہم اس کے بـ
پورے ڈھائی سال تک نہ صرف یہ کہ آنحضور ﷺ کی صحبت سے فیضیاب ہو ـ
بلکہ "کاتبِ وحی" کی اہم اور نازک ذمہ داری تک کے اہل قرار پائے ـ بنا بریں
گمان کہ ان کا تزکیۂ نفس اور تصحیحِ نیت نہیں ہو پائی تھی مزکیٔ اعظم ﷺ پر طعن
حیثیت رکھتا ہے..... تاہم دوسری جانب اس حقیقت سے صَرفِ نظر بھی نہ حقائق
واقعات کے اعتبار سے ممکن ہے، نہ نصوصِ حدیثِ نبوی ﷺ کی رُو سے درسـ
ہے کہ ان کا دورِ حکومت دورِ خلافتِ راشدہ میں شامل نہیں ہے ـ اور خواہ یہ خالـ
"حالات کے جبر" اور مصالحِ اُمت ہی کے تقاضوں کے تحت ہوا ہو، بہرحال واقعہ ـ
ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے ایک حصے کے پردے کے پیچھے چھپ جانے یا بالفاظِ د
اس سورج کو گہن لگ جانے کا عمل ان ہی کے دورِ حکومت سے شروع ہو گیا تھا ـ ا
کا سب سے بڑا ثبوت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے جسے امام بخاریؒ ـ
"کتاب العلم" میں روایت کیا ہے کہ:

"حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وِعَائَیْنِ، فَاَمَّا اَحَدُھُمَا فَبَثَثْتُہٗ فِیْکُمْ، وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُہٗ قُطِعَ ھٰذَا الْبُلْعُوْمُ"

"میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے (علم کے) دو برتن حاصل کئے ـ تو ان میں سے ایک کو تو میں نے تمہارے مابین خوب عام کر دیا ہے، لیکن اگر دوسرے کو عام کر دوں تو میری گردن کاٹ دی جائے گی!"

(واضح رہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۵۷ھ یا ۵۸ھ یا زیادہ سے زیا
۵۹ھ میں گویا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات سے ایک سال قبل ہو گئی تھی ـ)
اگرچہ اس قول میں یہ صراحت نہیں ہے کہ وہ دو برتن کون سے ہیں، تاہم یہ بات باد
تأمل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جس علم کے عام کئے جانے سے کسی کو کوئی گزند نہیں
سکتا تھا لہٰذا اس کے عام کرنے والے کو بھی کوئی اندیشہ لاحق نہیں ہو سکتا تھا وہ تھا نما

روزہ، زکوٰۃ اور حج، یعنی عبادات کے مسائل یا نکاح و طلاق وغیرہ کے مسائل کا علم
اور جس علم سے مراعات یافتہ طبقات کے مفادات پر آنچ آ سکتی تھی، چنانچہ اس
عام کرنے والے کی ذات کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا، وہ تھا نظامِ حکومت اور
حکومت، اور زمینداری اور جاگیرداری سے متعلق اصولی اور تفصیلی ہدایات کا علم

قصہ مختصر، جیسے ہی عالمِ اسلام میں ملوکیت نے جڑیں جمانی شروع کیں جاگیردا
کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد چالیس
سالوں کے دوران اس خباثت نے اپنی جڑیں جتنی کچھ پھیلالی ہوں گی اس کا اندا
ہرگز مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیثِ مبارک کے مطابق کہ

اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا ؂

"یقیناً اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے اولوالعزم لوگوں کو کھڑا کرتا رہے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو از سرِنو تازہ کر دیں گے!"

پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری صدی کے آغاز پر جو مجددِ اول (اور تا حا
اعظم بھی! اس لئے کہ وہ واحد مجدد تھے جو صاحبِ اختیار و اقتدار بھی تھے اور جن ۔
ذریعے صرف علمی و فکری تجدید اور عقائد و اخلاق کی اصلاح نہیں بلکہ نظامِ حکومت
اصلاح ہوئی!) یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پوتی کے صاحبزادے حضرت عمر بن عبد العز
(۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) "مبعوث" ہوئے، تو انہوں نے جہاں ایک جانب اپنی "نامزدگی" ۔
اظہارِ براءت کیا اور منصبِ حکومت صرف اُس وقت اختیار کیا جب لوگوں نے کہا
ہم اپنی آزادانہ مرضی سے آپ کی خلافت قبول کرتے ہیں، وہاں دوسری جانب جو اہ
ترین تجدیدی کارنامہ سرانجام دیا وہ یہی تھا کہ جاگیروں کے وثیقے اور دستاویزا
منگوا کر چاک کر دیں اور اس طرح کم از کم ایک بار تو پھر نظامِ اسلام کو "زمین کے سود

؂ عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ - اخرجہ ابو داؤد فی الملاحم، باب ما یذکر فی قرن المائۃ، واسنادہ صحیح، ورواہ ایضا الحاکم و صححہ ووافقہ الذھبی

سے پاک کر دیا!

محترم صاحبزادہ عبدالرسول صاحب نے اپنی تالیف "تاریخ اسلام" میں اس سلسلہ میں ایک مکالمہ نقل کیا ہے کہ: "یہ حالت دیکھ کر بنو امیہ سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے ہشام (بن عبدالملک جو خود بھی چند سال بعد حکمران بنا) کو اپنا نمائندہ بنا کر آپؒ کے پاس بھیجا۔ اس نے آپؒ سے کہا کہ آپ اپنے عہد میں جو چاہیں کریں لیکن جو کام پچھلے خلفاء کر گئے ہیں انہیں اپنی حالت پر رہنے دیں۔ آپؒ نے جواب دیا کہ اگر ایک ہی معاملے میں تمہارے سامنے دو دستاویزات ہوں' ایک امیر معاویہؓ کی اور دوسری عبدالملک کی' تو تم کس پر عمل کرو گے؟ اس نے کہا قدیم دستاویز پر! اس پر آپ نے فرمایا کہ میرے پاس قدیم دستاویز کتاب اللہ ہے' میں اس پر عمل پیرا ہوں!" ---- اور ظاہر ہے کہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا تھا جس کی رگوں میں' خواہ صرف والدہ ماجدہ ہی کی جانب سے سہی' کسی نہ کسی درجے میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا خون بھی دوڑ رہا تھا!

تاہم حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کا عہدِ خلافت ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود!" کی مثال تھا۔ ان کو زہر دے کر شہید کرنے کے بعد' بنو امیہ کے بقیہ تیس سالہ دورِ حکومت اور اس کے بعد دولتِ بنی عباسؓ کے دوران "عرب امپیریلزم" کے سائے میں جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کا شجرِ خبیثہ خوب پھلا پھولا۔ اور اگرچہ فقہ اسلامی کے دونوں سلسلوں یعنی اصحابِ حدیث اور اصحابِ رائے و قیاس کے "امامین اوّلین" یعنی امام اعظم ابو حنیفہؒ اور امام دارالہجرت مالک ابن انسؒ نے "مزارعت" کو حرامِ مطلق قرار دے کر اس شجرۂ خبیثہ کی جڑ پر بھرپور تیشہ چلایا اور کاری وار کیا' اور اس کے نتیجے میں قید و بند اور زد و کوب کی صعوبتیں برداشت کیں' لیکن جیسے جیسے ملوکیت اور جاگیرداری کی جڑیں زمین میں گہری اترتی گئیں حالات کے جبر' اور "نظریۂ ضرورت" کے عمل دخل کا ظہور ہوا اور امام ابو حنیفہؒ کے شاگردِ رشید قاضی ابو یوسفؒ نے جہاں "قاضی القضاۃ" کا وہ عہدہ بھی قبول فرما لیا جس کو قبول کرنے سے ان کے مربی اور استاذؒ نے سختی کے ساتھ انکار کر کے تشدد و تعذیب کو

ت دی تھی، وہاں انہوں نے امام صاحب کے دوسرے شاگرد امام محمدؒ کے اتفاق
ئے کے ساتھ مزارعت پر کچھ شرائط عائد کر کے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ بھی
ے دیا ---- بعد میں وہ شرائط تو طاقِ نسیاں کے حوالے ہو گئیں اور پورے عالمِ اسلام
"مزارعت" شیرِ مادر کی مانند حلال و طیب ہو گئی اور اس طرح شہنشاہیت اور
یرداری کو دوام و استحکام حاصل ہو گیا! (کچھ ایسا ہی معاملہ فقہِ اسلامی کی دوسری
یم شاخ یعنی اصحابِ حدیث کے ساتھ بھی پیش آیا۔ یعنی امام مالکؒ کے شاگرد امام
فعیؒ نے تو کھلے کھیت میں مزارعت کی حرمت کے فتوے کو برقرار رکھتے ہوئے صرف
غ کے تابع کھیت میں اس کے جواز کا فتویٰ دیا تھا، لیکن ان کے بعد امام احمدؒ اور امام
ریؒ وغیرہم نے اسے بالعموم جائز قرار دے دیا! گویا ع "متفق گردید رائے بوعلی
ائے من!" کے مصداق کم از کم جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کے معاملے میں
ونوں متحارب سلسلہ ہائے فقہ متفق ہو گئے۔)

کچھ اسی قسم کا معاملہ بزورِ شمشیر فتح ہونے والے علاقوں کی اراضی کو "بیت المال
ملکیت" میں برقرار رکھ کر ان سے حاصل شدہ خراج کو دفاع اور دیگر انتظامی
وریات اور سب سے بڑھ کر عامۃ المسلمین اور عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے
ف رکھنے کی بجائے منظورِ نظر اشخاص و افراد کو جاگیروں کی صورت میں دے کر ان
ذاتی ملکیت قرار دینے کے معاملے میں ہوا۔ جس کے لئے دلیل نبی اکرم ﷺ
اس معاملے سے لائی گئی جو آپؐ نے ۷ھ میں فتح خیبر کے بعد وہاں کے یہودیوں
ساتھ کیا تھا۔ حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو اقدام اپنے
رِ خلافت میں کیا وہ فتح خیبر کے کم و بیش دس سال بعد کا واقعہ ہے۔ اور جبکہ یہ معلوم
کہ ان کی رائے پر ردّ و قدح اور بحث و نزاع کا بازار پوری طرح گرم رہا تھا، جس کی
یل گزشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے، تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ جو حضرات
ذحہ اراضی کو مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم کرنے کے حق میں تھے انہوں نے آنحضور
ﷺ کے معاملۂ خیبر کو دلیل کے طور پر پیش نہ کیا ہو۔ اور اگرچہ ہمارے پاس اس رد

ح اور بحث و نزاع کا کوئی مفصل ریکارڈ محفوظ نہیں ہے' تاہم یہ بات تو اظہر من
س ہے کہ اس دلیل کا رد یقیناً کسی زیادہ وزنی دلیل ہی سے کیا گیا ہو گا۔ ورنہ کیسے
ن ہے کہ آنحضور ﷺ کے انتقال کے صرف چند سال بعد دورِ خلافتِ راشدہ ہی
آپ ﷺ کے طرزِ عمل کے برعکس معاملے پر اتفاق ہو جاتا۔ رہی یہ بات کہ وہ
ل کیا تھی تو قرائن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد اسی امرِ واقعی پر ہو گی کہ
ر کا معاملہ سود کی آخری اور قطعی حرمت والی آیات کے نزول کے لگ بھگ ڈھائی
ل قبل کا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حرمتِ ربٰوا کے حکم نے جملہ مالی معاملات اور
قصادی امور کے ضمن میں صورت حال کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ متعدد
ادیث اس پر گواہ ہیں کہ آپ ﷺ نے مزارعت کے معاملے کو بھی "ربٰوا" قرار
۔ اور چونکہ ان آیاتِ مبارکہ کے نزول کے بعد نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دنیوی
ت مختصر رہی لہٰذا حرمتِ ربٰوا کی زد کن کن معاملات پر پڑتی ہے اس کی پوری تفصیل
حابہ کرامؓ پر واضح نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ:

"اِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَتْ آيَةُ الرِّبَا ' وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قُبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْهَا لَنَا ' فَدَعُوا الرِّبَا وَالرِّيْبَةَ" [۵]

"قرآن میں جو آیات بالکل آخر میں نازل ہوئیں ان میں آیتِ ربا بھی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو گیا جبکہ ابھی آپ ﷺ نے اس آیت کی پوری تفسیر ہمیں نہیں سمجھائی تھی۔ پس نہ صرف ربا کو ترک کر دو' بلکہ جس معاملے میں ربا کا شک اور شائبہ بھی پیدا ہو جائے اسے بھی ترک کر دو!"

بہرحال یہ ہے وہ تاریخی پس منظر جس میں دورِ ملوکیت میں مرتب ہونے والی فقہ
کے مالی اور معاشی مسائل میں ایک جانب بیع مؤجل اور بیع مرابحہ کے جواز کے راستے
سے "سرمایہ کا سود" تو دبے پاؤں بالکل غیر محسوس انداز میں داخل ہو گیا (بیع مؤجل
ور بیع مرابحہ پر ان شاء اللہ آئندہ کبھی تفصیلی گفتگو ہو گی۔) رہا "زمین کا سود" تو وہ تو

---

۵ عن سعید بن المسیبؒ - رواہ ابن ماجہ فی التجارات' باب التغلیظ فی الربا' واسنادہ صحیح

حسبِ ذیل فتوے کی رُو سے پورے دھڑلے کے ساتھ پورے عالمِ اسلام میں رائج
ہو گیا کہ "پس حکمران کو اختیار ہے کہ چاہے تو مفتوحہ اراضی کو مالِ غنیمت کے طور پر
فاتحین میں تقسیم کر دے جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے خیبر کے معاملے میں کیا تھا یا چاہے
تو وہ معاملہ کرے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوادِ عراق کے ضمن میں کیا تھا" (المبسوط)
اس لئے کہ اس فتوے کے ذریعے جاگیرداری جائز ہو گئی جس کا سارا دارومدار ہی
مزارعت پر ہے، جو زمین کے ربوا کی حیثیت رکھتی ہے۔

اوپر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا جو قول "علم کے دو برتنوں" کے ضمن میں نقل
ہوا ہے اس کی حقیقت مزید اجاگر ہو جائے گی اگر یہ بات پیش نظر رہے کہ ایک مجلس کی
تین یا تین سے بھی زائد طلاقوں کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ جو ایک رعایت اور
نرمی فرمایا کرتے تھے اسے حضرت عمرؓ نے مصلحتِ اُمت کے پیش نظر اپنے ایک
اجتہادی فیصلہ سے ختم کر دیا تو اس پر تو اہلِ سنت کے چاروں مکاتبِ فقہ کا اس درجہ
عزم بالجزم کے ساتھ اصرار ہے کہ کسی بھی صورت میں نبی اکرم ﷺ کی رعایت کو
دوبارہ جاری کرنے پر آمادہ نہیں ہیں، لیکن جاگیرداری اور زمینداری کے مسئلے میں
حضرت عمرؓ کے اجتہاد اور اس پر اُس وقت کے "اِجماع" کو رد کر کے حضور ﷺ
کے معاملۂ خیبر پر عمل کرنے کے اختیار کو حاکمِ وقت کے لئے تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ
پھر "اجماع" کوئی خالص تصوراتی بلکہ وہمی شے نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی واقعی وجود
ممکن ہے تو وہ یا تو صرف دورِ خلافتِ راشدہ کا اجماع ہی ہو سکتا تھا جب پورا عالمِ اسلام
ایک سیاسی وحدت تھا، یا پھر قیامت کے قریب اُس وقت ممکن ہو گا جب آنحضور
ﷺ کی پیشینگوئی کے مطابق تمام روئے ارضی پر خلافت علیٰ منہاج النبوت یعنی
اسلام کے "جسٹ ورلڈ آرڈر" کا نظام قائم ہو جائے گا۔

تاہم میری ان معروضات کو نہ مفتیانِ کرام کی توہین پر محمول کیا جائے، نہ فقہائے
عظام کی تنقیص پر، بلکہ جیسے کہ سطورِ گزشتہ میں عرض کیا گیا تھا، مقصود صرف یہ ہے کہ
ان مسائل پر بحث و گفتگو کا آغاز ہو۔ اور مصالحِ مرسلہ اور مفادِ عامہ کو پیش نظر رکھتے

ہوئے افہام و تفہیم کے ذریعے آئندہ کے لئے راہیں معین کی جائیں۔

البتہ یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ اگر اُس دور میں جبکہ ابھی ملوکیت بھی جڑیں پکڑ ہی رہی تھی، اور "کسرائے عرب" یا "کسرائے اسلام" بھی ایک جلیل القدر صحابی (حضرت معاویہؓ) تھے، ایک دوسرے جلیل القدر صحابی (حضرت ابو ہریرہؓ) کو اپنی اس بشری کمزوری کے اعتراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل شدہ علم کے ایک برتن کا منہ جان کے خوف سے بند کر رکھا ہے، تو اس کے سوڈیڑھ سو برس بعد جبکہ ملوکیت بھی اپنی پوری شان اور کرّوفر کے ساتھ جلوہ گر ہو چکی تھی، اور "قرونٌ مشھودٌ لھا بالخیر" (یعنی وہ ادوار جن کے خیر کے حامل ہونے کی گواہی خود آنحضور ﷺ نے دی ہے) کا زمانہ بھی بیت چکا تھا، علمائے اسلام اور فقہائے کرام کا حالات کے جبر سے متأثر ہو جانا ہرگز نہ بعید از قیاس ہے نہ ان کے لئے موجبِ توہین!

بہرحال، جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کے ظالمانہ اور استحصالی نظام سے نجات پانے کی واحد شرعی راہ یہ ہے کہ شمشیرِ فاروقیؓ کو بے نیام کیا جائے۔ اور حضرت عمرؓ کے اجتہاد کے مطابق (جس پر کم از کم اُس وقت اجماع بھی ہو گیا تھا) تمام مفتوحہ ممالک کی اراضی کو "خراجی" یعنی بیت المال یا مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا جائے جو کسی کی انفرادی ملکیت میں ہیں ہی نہیں کہ وہ سارے مسائل پیدا ہوں جو سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بینچ کے فاضل جج صاحبان نے اپنے فاضلانہ فیصلوں میں اٹھائے ہیں۔ بنابریں اب تک مسلمان حکمرانوں یا غیر مسلم حاکموں نے جن جن لوگوں کو جاگیریں عطا کی تھیں ان سے جو استفادہ وہ اب تک کر چکے ہیں اس کو "فَلَهٗ مَا سَلَفَ" (سورۃ البقرہ: آیت ۲۷۵) کا مصداق قرار دے کر (یعنی: "جو گذر چکا وہ ان کو معاف ہے!") آئندہ ایک ایسے نئے بندوبستِ اراضی کا اہتمام کیا جائے جس سے سماجی انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوں، عوام کی عظیم اکثریت کی معاشی حالت بھی بہتر ہو، زمین کی پیداوار میں بھی اضافہ ہو، اور قوم اور ملک کو بھی استحکام حاصل ہو!

اس ضمن میں دو باتیں مزید انشراح کا ذریعہ بن سکتی ہیں:

(۱) ایک یہ کہ اس صدی یعنی بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک جو ممالک خلافتِ عثمانیہ کے زیرِ نگیں تھے، ان میں یہی بندوبستِ اراضی رائج تھا کہ تمام اراضی سرکاری ملکیت میں تھیں اور کاشتکاری بھی "موروثی مزارعت" کی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ ایک کاشتکار کے انتقال کے بعد اس کے وارثوں کو از سرِ نو پروانۂ کاشتکاری حاصل کرنا ہوتا تھا۔

(۲) دوسرے یہ کہ ہندوستان کے گزشتہ صدی کے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے نامور شیخ اور عظیم ترین مفسر، محدّث اور فقیہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (صاحبِ تفسیرِ مظہریؒ) نے اپنی مشہورِ زمانہ تالیف "مَالا بُدَّ مِنہ" میں صاف تحریر فرمایا ہے کہ "چونکہ اس ملک میں زمینیں عُشری نہیں (بلکہ خراجی) ہیں، لہٰذا اس کتاب میں عُشر اور عاشر (یعنی عشر وصول کرنے والے تحصیل داروں) کے احکام بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!" واضح رہے کہ یہ کتاب فقہ حنفی کے قاعدے یا پرائمر کی حیثیت سے تمام مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے۔

آخر میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت بینچ کے متذکرہ بالا فیصلے پر جو فاضلانہ تبصرہ ملک کے ایک ماہر قانون دان جناب سردار شیر عالم صاحب نے کیا ہے، جو پاکستان لاء جرنل کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۹۳ء میں "قراردادِ مقاصد اور عدلیہ کا کردار!" کے عنوان سے شائع ہوا ہے[۹] اس کے حسب ذیل دو افتتاحی اور اختتامی جملے ہدیۂ قارئین ہیں:

(1) "In Qazilbash Waqf case, the Land Regulation of 1972 and land Reforms Act of 1977 which fixed the ceiling for land holding were struck down on the basis of repugnency to Islam. The court broke through the protective stonewall

---

۹۔ مذکورہ بالا مضمون کی اہمیت کے پیش نظر اسے ماہنامہ میثاق میں بالاقساط شائع کیا جا رہا ہے۔ پہلی قسط جنوری ۹۴ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔

erected by Articales 253, 8(3), (24), 268(2), 269 and reinforced by Article 203B(c) of the Constitution."

(2) "Now the situation is that the judicial pronouncement of the Supreme Court has struck down the land reforms as un-Islamic and thus defeated the operation of so many constitutional provisions including 253(2). But it remains an open question even now as to which one should prevail, the effect of a constitutional provisions i.e. 253(2) or the effect of judicial pronouncement."

اش کہ سپریم کورٹ آف پاکستان اپنے اس فیصلے پر از خود نظرثانی کرنے کا فیصلہ
رے۔ اللہم آمین!

کاروآراء

"درتاب مشو جاناں در گفتہ خطا افتد"

ماہنامہ "المرشد" کے مدیر کے نام

مختار حسین فاروقی، ناظم حلقہ جنوبی پنجاب تنظیم اسلامی کی گزارشات

اسلام ایک دین ہے اور مکمل نظام زندگی، یعنی زندگی کے گوناگوں اور متنوع شعبوں
(Walks of Life) میں اپنی برتری اور نفاذ کا داعیہ رکھتا ہے۔ اسی لئے اس کی
ُمت کے بھی بے شمار محاذ سیکٹر (Sector) ہیں۔ جذبۂ صادق اور امتِ مسلمہ کا درد
تو ہر شعبہ میں ہونے والا کام دوسرے شعبہ کے افراد کے لئے مؤید اور معاون ہوگا اور
قسمتی سے سوء ظن اور تمسخرو استہزاء جگہ پالیں تو وہی توپیں جن کا رخ دشمنانِ اسلام اور
دین کے خلاف ہونا چاہئے وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کے خلاف آگ برسانا شروع کر
تی ہیں۔

تصوف کا شعبہ اور اس کے متوسلین میں ہمارے نزدیک بہت سے گوہرِ نایاب پوشیدہ
ں۔ عہد حاضر کی عام بیداری اور مسلم امت میں Fundamentalists کی
رگرمیوں کے نتیجے میں اسلامی انقلاب، حکومت الٰہیہ، نظامِ مصطفیٰ ﷺ، اور رب کی
ھرتی رب کا نظام کا غلغلہ اب حجروں اور محرابوں سے نکل کر گلی کوچوں تک آچکا ہے۔
سوف کے حلقے سے ذکر و مراقبہ سے بڑھ کر میدانِ عمل میں آکر باطل کو للکارنا اور
مربالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر کے فریضہ کا احساس و ادراک نہایت خوش آئند ہے،
شِم ماروشن، دلِ ماشاد۔

حالیہ دنوں میں محترم و مکرم جناب مولانا اللہ یار خان صاحب کے معروف سلسلہ سے
ندومی جناب مولانا محمد اکرم اعوان صاحب مدظلہٗ کا "الاخوان" کے نام سے حالیہ کاوشوں
ور "المرشد" میں جگہ پانے والی دیگر تحریروں کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں
کہ۔

آپ ہی طرزِ تغافل پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

کے مصداق تصوف کے دیگر اعاظم و اکابر بھی اسی میدان کو اپنی سعی و جہد کا میدان قرار دیں گے۔ ہم تو ان کی خدمت میں فیض لدھیانوی کا یہ شعر ہی پیش کر سکتے ہیں۔۔

آ چھوڑ کے میدان میں تسبیح و مصلیٰ
کچھ دن کے لئے طرزِ عبادت کو بدل ڈال

"الرشد" کے حالیہ شمارہ میں جناب مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کے خطاب میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بارے میں ایک خلاف واقعہ بات احاطۂ تحریر میں آگئی ہے کہ جناب طاہر القادری صاحب مدظلہٗ اور دیگر سیاسی جماعتوں اور اشخاص کی طرح ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہٗ بھی انتخابات کی سیاست میں آئے اور پٹ گئے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور ان کی جماعت تنظیم اسلامی نے کبھی رائج الوقت انتخابات کی سیاست میں قدم ہی نہیں رکھا اور ان کا کوئی رفیق (ممبر) الیکشن میں کھڑا ہونا تو دور کی بات ہے کسی کی انتخابی مہم میں حصہ بھی نہیں لے سکتا ہے۔

امید ہے کہ یہ واقعی تصحیح ہمارے درمیان مزید قرب اور تعاون کا ذریعہ بنے گی اور کیا عجب کہ دین کے خدمت گار آپس کی غلط فہمیاں اور شکر رنجیاں دور کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ امید ہے کہ "الرشد" بھی اس کو فراخ دلی سے قبول کرے گا اور اس کو تنقید اور عیب جوئی کا درجہ نہیں دے گا۔ بقول حافظ ؏

در تاب مشو جانا! در گفتہ خطا افتد!

○

ضرورت رشتہ

صوم و صلوٰۃ کی پابند دو تعلیم یافتہ لڑکیوں 'ایک ۱۷ گریڈ میں زیر ملازمت اور ایک ایم بی بی ایس کے آخری سال میں' کے رشتے دینی مزاج کے حامل 'اعلیٰ تعلیم یافتہ' برسر روزگار گھرانوں کے لڑکوں سے درکار ہیں۔ والد اعلیٰ عہدہ سے فارغ اور آج کل وفاقی حکومت سے وابستہ ہیں۔ زبان اور صوبے کی قید نہیں۔

برائے رابطہ: ا۔ن معرفت معتمد ذاتی امیر تنظیم اسلامی '۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور

○

رفتار کار

تنظیم اسلامی کے تحت

دو روزہ دعوتی و تربیتی پروگرام

(۱)

سیالکوٹ، منعقدہ ۶-۷ جنوری ۱۹۹۴ء

تنظیم اسلامی حلقہ لاہور کے زیر اہتمام دو روزہ دعوتی و تربیتی پروگرام محترم عبدالرزاق صاحب ناظم حلقہ لاہور کی زیر امارت سیالکوٹ کے لئے ترتیب دیا گیا۔ یہ پروگرام اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل تھا کہ اس میں تنظیم اسلامی لاہور جنوبی کے امیر جناب قمر سعید قریشی صاحب اور ناظم فیاض حکیم صاحب کے علاوہ تین نقباء اور تین ہی رفقاء بھی شامل تھے۔ یعنی کل ملا کر ۸ رفقاء صرف لاہور جنوبی سے شامل تھے، جبکہ لاہور کی دیگر تنظیموں سے مزید ۱۰ رفقاء بھی اس قافلہ حق میں شرکت کے لئے مرکز گڑھی شاہو پہنچ چکے تھے۔ حسب پروگرام نماز فجر کے بعد سامان وغیرہ کو دو گاڑیوں میں رکھنے کے بعد ٹھیک ۸ بجے صبح ۱۸ رفقاء پر مشتمل یہ قافلہ اپنے ہدف کی طرف عازم سفر ہوا۔

شہر کی ٹریفک کے شور سے نکلتے ہی محترم قمر سعید قریشی صاحب نے ساتھیوں کی توجہ دعائے سفر کی طرف مبذول کروائی اور جن کو یاد نہ تھی ان کو یاد کروائی۔ اس کے بعد راقم نے ۱۲ سیٹر ویگن میں موجود رفقاء کو سورۃ النور کی آیت ۵۵ حلقہ کا انداز اختیار کر کے یاد کروائی۔ اس طرح سفر کے وقت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ مند بنانے کی کوشش کی گئی جو الحمد للہ بہت کامیاب رہی۔

ڈسکہ کے مقام پر رفیق محترم مرزا ندیم بیگ بھی اس قافلہ میں شامل ہو گئے۔ تقریباً دس بج کر پندرہ منٹ پر ہم شہر سیالکوٹ میں داخل ہوئے جہاں محترم قمر سعید قریشی صاحب کی ذاتی کوششوں سے جامع مسجد چاہ جناں محلہ کریم آباد میں قیام کا انتظام پہلے ہی سے ہو چکا تھا۔ وہاں مقامی تنظیم کے رفقاء اس کارواں کی نصرت کے لئے موجود تھے۔

ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر امیر کارواں محترم عبدالرزاق صاحب نے دو دن کے پروگرام کی تفصیلات بیان کیں اور عمومی ہدایات دیں، جس کے مطابق دوپہر ۱۲ بجے سے ڈھائی بجے تک "فرائض دینی کے جامع تصور" کے زیر عنوان مذاکرہ ہوا۔ بعد ازاں عصر تک آرام کے لئے وقفہ ہوا۔ پروگرام کے مطابق تنظیم و تحریک کو متعارف کرانے کے لئے عصر تا مغرب بڑے بھرپور

انداز میں سیالکوٹ کے بارونق بازاروں میں ٹی بورڈ مہم چلائی گئی جس کے ناظم فیاض حکیم صاحب تھے۔ مہم کے دوران مرزا ندیم بیگ صاحب اور فیاض حکیم صاحب نے مختلف جگہوں پر کھڑے ہو کر اہل سیالکوٹ کو موجودہ تلخ حقائق کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے تحریک خلافت میں شمولیت کی دعوت دی۔

نماز مغرب کے متصلاً بعد محترم عبدالرزاق صاحب نے نظام خلافت کے موضوع پر مسجد ہی میں تقریر کی جو تقریباً پینتالیس منٹ جاری رہی۔ بعد ازاں رفقاء کے لئے تربیتی پروگرام عشاء تک جاری رہا۔ عشاء کے بعد محترم قمر سعید قریشی صاحب نے "کارکن کے اوصاف" کے موضوع پر بہت پر اثر اور جامع گفتگو کی جو انتہائی توجہ سے سنی گئی۔ اس ایمان افروز تقریر کی تاثیر کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ دو روزہ میں شریک اٹھارہ رفقاء میں سے گیارہ رفقاء نے جن میں قریشی صاحب خود بھی شامل تھے ہر ماہ دو روزہ لگانے کے لئے اپنے نام لکھوائے۔ اس پروگرام کے بعد رات دس بجے تک محترم فیاض حکیم صاحب نے رفقاء کی یاد دہانی کے لئے تنظیم اسلامی کے نظام العمل کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے اور فضائل تہجد پر گفتگو کی۔

اگلے دن تمام رفقاء صبح چار بجے بیدار ہو کر نماز فجر تک نوافل اور تلاوتِ کلام پاک میں مشغول رہے۔ نماز فجر کی خاص بات جمعہ کی مناسبت سے امام مسجد کی نماز کے دوران سورۃ السجدہ اور سورۃ الدھر کی تلاوت تھی۔ فی زمانہ یہ سنتِ نبوی ﷺ نہایت کمیاب ہے۔ نماز فجر کے بعد محترم عبدالرزاق صاحب نے سورۃ التوبہ کی آیات ۱۱۰ اور ۱۱۱ کا درس دیا۔ صبح ۹ بجے کا وقت خصوصی دعوت پر آنے والے احباب کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ مقامی ساتھیوں نے دوست احباب کو خصوصی دعوت پر اس پروگرام میں شرکت کے لئے بلایا تھا۔ ۲۳ نوجوان اس پروگرام میں شرکت کے لئے آئے۔ محترم عبدالرزاق صاحب نے تنظیم کے مختصر تعارف کے بعد محترم فیاض حکیم صاحب کو فرائض دینی کے جامع تصور پر خطاب کی دعوت دی۔ موصوف نے فرائض دینی کے جامع تصور کو نہایت عمدگی اور اختصار سے بیان کرنے کے بعد غلبۂ دین کے مراحل اور پھر خلافت تک کے موضوعات کو اس خوبصورتی سے جمع کیا کہ ۲۳ نوجوانوں میں سے گیارہ نے وہیں تحریک خلافت کے معاونت فارم پر کر دیئے جبکہ بقیہ نے بعد میں پُر کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ خطاب تقریباً ایک گھنٹہ کا تھا جس کے آخر میں تحریک کا دعوتی لٹریچر بھی تقسیم کیا گیا۔ جمعہ کے خطاب کی ذمہ داری بھی فیاض حکیم صاحب کے سپرد تھی، جبکہ جمعہ سے قبل عبدالرزاق صاحب خطبۂ نکاح کی خصوصی دعوت پر نوشہرہ ورکاں روانہ ہو گئے۔

نماز عصر تک کھانا اور آرام کا وقفہ ہوا۔ پھر بعد عصر تمام رفقاء کو جن میں مقامی ساتھی بھی شامل تھے، اس دو روزہ پروگرام کے بارے میں اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ رفقاء نے دو روزہ پروگراموں کو خوب تر بنانے کے لئے بہت مفید مشورے دیئے جن کو نوٹ کر لیا گیا۔ آخر میں اگر

میں اسرہ رحمان پورہ کے نقیب بھائی عباس اور بھائی عبدالغفار کا ذکر نہ کروں تو یہ رپورٹ ادھوری رہ جائے گی جنہوں نے کھانے پکانے وغیرہ کی ذمہ داریاں بہت عمدگی سے نبھائیں۔ مغرب کے وقت واپسی کا سفر شروع ہوا۔ دوران سفر راقم نے بھائی عبدالغفار کے تعاون سے رفقاء کو دو احادیث معہ متن یاد کروائیں اور یوں راہ حق کا یہ قافلہ ایمان کے ولولوں اور شکر کے جذبات کے ساتھ اپنے مستقر تک آپہنچا۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔ (آمین)

مرتب: فیاض اختر میاں

—(۲)—

کھاریاں، منعقدہ ۲۴-۲۵ دسمبر ۱۹۹۳ء

تنظیم اسلامی گجرات کے زیر اہتمام ماہ دسمبر ۹۳ء کا دو روزہ دعوتی و تربیتی پروگرام اس دفعہ گجرات کی تحصیل کھاریاں میں رکھا گیا۔ پروگرام کے مطابق ۲۳ دسمبر بروز جمعرات حلقہ گوجرانوالہ کی سطح پر گوجرانوالہ میں ہونے والے شب بسری کے پروگرام کے بعد اگلی صبح ساڑھے سات بجے چار رفقاء پر مشتمل قافلہ رفیق محترم جمشید علی صاحب کی امارت میں روانہ ہو کر ۱۰ بجے کھاریاں کی مشہور مدنی مسجد میں پہنچا۔ وہاں پہنچنے کے بعد مزید تین رفقاء ہمارے ساتھ آ ملے، جبکہ ایک رفیق نماز مغرب کے بعد تشریف لے آئے۔

وہاں سب سے پہلے تربیتی نشست میں تازہ ندائے خلافت میں شائع ہونے والے خواجہ محبوب الٰہی صاحب کے ایک طویل خط کا اجتماعی مطالعہ کیا گیا۔ اس کے بعد تحریک خلافت کے منشور کا اجتماعی مطالعہ کیا گیا اور اس پر باہمی تبصرہ ہوا۔ بعد ازاں جمعہ کے خطاب کا وقت ہو گیا۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد نمازیوں میں تحریک خلافت کا لٹریچر تقسیم کیا گیا۔ اس کے بعد مسجد کے خطیب جناب افضل ضیاء صاحب سے ملاقات کر کے انہیں تحریک کا لٹریچر پیش کیا گیا اور مسجد میں پروگرام کی اجازت دینے پر ان کا شکریہ ادا کیا گیا۔

نماز عصر کے بعد معروف مقامی دینی شخصیت ڈاکٹر جلال خاں صاحب سے تفصیلی تعارف ہوا جو درس کا اعلان سن کر خود ہی ملاقات کے لئے تشریف لے آئے تھے۔ بعد نماز مغرب راقم نے درس قرآن دیا جس میں اصل موضوع "فرائض دینی کا جامع تصور" تھا۔ درس کے بعد سوال و جواب کی مختصر نشست ہوئی۔ بعد نماز عشاء ڈاکٹر جلال خاں صاحب کے ہمراہ ایک دوسری مسجد کے خطیب مولانا زبیر ہاشمی صاحب سے ملاقات کی۔ انہیں تنظیم کا تعارف کروایا اور صبح بعد نماز فجر مسجد میں درس قرآن کے لئے اجازت حاصل کی۔ وہاں سے واپسی پر رات کے کھانے کے بعد تمام

رفقاء کے مابین ایک طویل تعارفی نشست ہوئی جس میں سب رفقاء نے اپنا تفصیلی تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ وہ تنظیم سے کس طرح منسلک ہوئے۔

دوسرے دن بعد نماز فجر پروفیسر اشرف ندیم صاحب نے جامع مسجد مدنی میں' جبکہ راقم نے جامع مسجد محمدیؐ میں درس قرآن دیا اور بعد ازاں مسجد کے خطیب زبیر ہاشمی صاحب سے تفصیلی تعارف حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں تنظیم کی دعوت بھی پہنچائی۔ ڈاکٹر جلال خاں صاحب کی پرزور دعوت پر تمام رفقاء نے ان کے گھر ناشتہ کیا۔ اس موقع پر ان کے سامنے تنظیم کی انقلابی دعوت کو تفصیل سے رکھا گیا۔ بعد ازاں مسجد میں آکر ادعیہ ماثورہ کی تذکیر کی گئی۔ ۱۱ بجے کے قریب اس پروگرام سے فارغ ہو کر دو رفقاء کو ڈاکٹر جلال صاحب کے پاس بھیجا گیا تاکہ وہ دیگر احباب کے ساتھ ہماری ملاقات کروا سکیں۔ انہوں نے ہمارے رفقاء کو جماعت اسلامی کے رکن مولانا احمد یار صاحب سے ملوایا جو وہاں پر جماعت کے زیر اہتمام مسجد اور مدرسہ کی تعمیر کا کام کروا رہے ہیں۔ ان سے ہمارے رفیق جمشید صاحب نے تفصیلی ملاقات کی۔ اس کے علاوہ ایک اور "مسجد کوثر" کی انتظامیہ سے درس کی اجازت بھی ڈاکٹر جلال صاحب کے توسط سے ملی جہاں راقم نے نماز ظہر کے بعد مختصر درس قرآن میں نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادوں کی وضاحت کی۔

اس کے بعد تمام رفقاء نے مسجد مدنی میں جمع ہو کر دو روزہ پروگرام کا مختصر جائزہ لیا اور دعا کے بعد اکٹھے نماز عصر ادا کر کے وہاں سے گھروں کی راہ لی۔

اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اپنی راہ میں ہماری اس محنت کو ہمارے لئے توشہ آخرت بنائیں گے اور کھاریاں کی سرزمین میں خلافت کی منادی کے لئے ہماری سعی کو نتیجہ خیز بنائیں گے۔

(مرتب عبد الرؤف)

ضرورت رشتہ

○

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت پیغمبر انقلاب (۲)

محبوب الحق عاجز

پچھلے دنوں ادارہ منہاج القرآن کے زیر اہتمام کُل پاکستان مقابلہ مضمون نویسی ہوا جس میں ملک بھر سے بڑی تعداد میں مختلف کالجوں کے طلبہ نے حصہ لیا۔ عنوان تھا: "آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت پیغمبر انقلاب"۔ اس مقابلے میں ایک نوجوان رفیق تنظیم محبوب الحق عاجز جو قرآن کالج کے سال دوم کے طالب علم ہیں' اول انعام کے مستحق قرار پائے۔ محبوب الحق قرآن کالج کے ایک ہونہار طالب علم ہیں' انہوں نے اپنے مضمون میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ تنظیم کے انقلابی فکر اور انقلاب نبوی کے اس منہاج کو سمو کر پیش کیا ہے جسے امیر تنظیم ایک عرصے سے اپنی تقاریر اور تحریروں کے ذریعے واضح فرمارہے ہیں۔

مصطفوی انقلاب کا مصطفوی طریق

انقلابِ مصطفوی ﷺ کے اساسی منہاج کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی تیئس سالہ زندگی پر طائرانہ نگاہ ڈالیں تاکہ حقائق اظہر من الشمس ہو جائیں اور پورا منہاجِ نبویؐ ہمارے سامنے آجائے۔

رسول کریم ﷺ کی زندگی کے دو دور ہیں' ایک مکی زندگی اور دوسرا مدنی زندگی۔ ان دونوں ادوار میں ہمیں نبی اکرم ﷺ کی زندگی کی بظاہر دو مختلف تصویریں نظر آتی ہیں' جو اصلاً دو نہیں بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ بعثتِ رسول ﷺ کے بعد جب بارگاہ خداوندی سے "یَاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ" کا حکم جاری ہوا آپؐ نے اپنی دعوتِ توحید کا آغاز کیا۔ بت پرستی چھوڑنے اور اس خدائے واحد کی بندگی

تعلیم شروع کی جو کُل کائنات کی طلسم بند اور تصویر خانہ موجودات کی مالک ہے، وہی بندگی اور عبادت کے لائق ہے۔ پہلے تین سال دعوت خفیہ تھی اور آپ ﷺ فرمان خداوندی "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ" کے تحت اپنے قریبی رشتہ داروں کو جہنم کی ہولناکیوں سے ڈراتے رہے۔ اس عرصے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپؐ کے غلام حضرت زید رضی اللہ عنہ آپؐ پر ایمان لائے کچھ ہی عرصہ بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح تین سالوں کے دوران جو لوگ آپؐ پر ایمان لائے آپؐ نے انہیں منظم کیا۔ اور ان کی ایک حزب اللہ تشکیل دی۔

نبوت و رسالت کے چوتھے سال "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" کے ساتھ اعلانیہ تبلیغ کا آغاز ہوا۔ آپؐ کوہِ صفا پر چڑھ گئے اور پکارا: اے قریش اِدھر دوڑو۔۔ لوگ آئے تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے عقب میں ایک لشکر جرار تمہاری گھات میں ہے تو کیا تم میری بات پر یقین کرو گے؟ سب بولے: ہاں، کیونکہ ہم نے ہمیشہ آپؐ کو سچ بولتے سنا ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر سخت عذاب نازل ہو گا۔ لوگوں نے کوئی توجہ نہ دی اور لعن طعن کرتے ہوئے چلے آئے۔ اب عام دعوت ہو گئی۔ آپ ﷺ حج کے اجتماعات اور مختلف تجارتی منڈیوں میں جاتے اور برابر اللہ کا پیغام لوگوں کو پہنچاتے اور بت پرستی سے منع کرتے۔ جہاں کہیں میلہ لگا ہوتا، آپؐ تشریف لے جاتے اور اسلام کی تبلیغ کرتے: "قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا" اب جو سلیم الفطرت افراد اس دعوت کو قبول کرتے وہ آپؐ کی حزب اللہ میں شامل ہو جاتے۔ آپ ﷺ ان کا تزکیہ کرتے (وَیُزَکِّیْهِمْ) ان کے اخلاق سنوارتے، تلاوت آیات کے ذریعے ان کے ایمان کو جلا بخشتے، ان کی تربیت کرتے، صبر اور نماز کے ذریعے ان کے اندرون کو طاقتور بناتے۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ مکی زندگی افراد سازی کا مرحلہ تھا۔ محمد مارماڈیوک پکھتال اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

The inspiration of the Prophet progressed from inmost things to outward things.

"محمدؐ کا الہام اندرونی چیزوں سے شروع ہو کر بیرونی چیزوں کی طرف آتا ہے"

اسی رسول ﷺ کی تربیت کے طفیل صحابہؓ "اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" کی صفات کے حامل افراد بنے۔ اب حضور ﷺ کی دعوتِ عام کے نتیجے میں مخالفت بھی شدید ہو گئی۔ چنانچہ اب آپؐ پر انگلیاں اٹھائی گئیں۔ آپؐ کو ساحر و مجنون کہا جانے لگا۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے جانے لگے۔ آپؐ نے مکہ میں قریش کو دعوت دی تو انہوں نے بھی آپؐ کی سخت مخالفت کی۔ طائف گئے تو وہاں پر عبدیالیل اور اس کے بھائیوں کی طرف سے نہایت ناروا رویہ روا رکھا گیا۔ آپ ﷺ کو واپسی پر غنڈوں نے لہولہان کر دیا۔ اس شدید مخالفت کے باوجود آپؐ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔

دعوتِ توحید کی مخالفت کی اصل وجہ یہ تھی کہ شرک محض ایک مذہبی عقیدہ ہی نہ تھا بلکہ اس پر پورے سیاسی نظام کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اسی کے ساتھ مشرکین مکہ اور قریش کے معاشی مفادات وابستہ تھے۔ دعوتِ توحید کو مان لینے میں انہیں اپنا اقتصادی خطرہ نظر آتا تھا۔ اسلام سے پہلے کعبہ بہت بڑا بت خانہ تھا، جس میں تمام مذاہب کے بت رکھے ہوئے تھے۔ اور عرب مختلف علاقوں سے کعبہ کی زیارت کے لئے آتے، نذر و نیاز کرتے، چڑھاوے چڑھاتے۔ چونکہ کعبہ کی تولیت قریش کے پاس تھی اس لئے ان سب کا معاشی فائدہ انہی کو پہنچتا تھا۔ اگر بتوں کو ہٹا کر توحید کا نظام آ جاتا تو قریش کی ساری دکانداری ٹھپ ہو جاتی۔ اس لئے انہوں نے دعوت توحید کی بھرپور مزاحمت کی۔ دعوت توحید کی مخالفت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ توحید کے عقیدے میں سماجی تقسیم اور طبقاتی امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے غلام اور محکوم طبقہ نے جب دیکھا کہ توحید کے زیر سایہ وہ مساوات اور انسانی عظمت کا مقام حاصل کر سکتے ہیں تو وہ آپؐ کی دعوت کی طرف لپکے۔ اور یوں حضور ﷺ کی دعوت غلام، مزدور اور پسے ہوئے طبقات میں زیادہ نفوذ کرنے لگی۔ یہ اسلامی مساوات اور اخوت و بھائی چارہ، فرعونیت، قارونیت اور ہامانیت کے علمبرداروں کو سخت ناپسند تھا۔ اس لئے کہ اس میں ان کی سرداری اور تھانیداری پر کاری ضرب پڑتی تھی۔ اس لئے خاندانی فخر و امارت کے نشے سے سرشار قریش اسلام کی برادری اور برابری کے دعوے کی سخت مخالفت پر اتر آئے۔ مغیرہ بن شعبہ فارس کے سپہ سالار رستم کے دربار میں گئے تو ان کی تقریر کا ایسا ہی ردِ عمل ہوا۔ ابن جریر کی روایت کے مطابق :

"نیچے کے لوگوں نے کہا خدا کی قسم! اس عربی نے سچ بات کہی۔ سرداروں نے کہا: خدا کی قسم اس نے ایسی بات کہی ہے کہ ہمارے سب غلام اس کی طرف چلے جائیں گے"۔

ان حالات میں قریش نے آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ بالخصوص غلاموں کو اپنا تختۂ ستم بنایا۔ انہیں شدید بدنی سزائیں دی گئیں، ان کی چھاتیوں پر بھاری پتھر رکھے گئے، لوہے کی سلاخوں کو گرم کر کے ان کے بدن کو داغا گیا، حضرت بلالؓ، عمارؓ، خبابؓ، یاسرؓ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) جیسی ہستیوں کو کڑی آزمائش میں ڈالا گیا۔ حتیٰ کہ ان پر "زِلزالًا شَدِیدًا" کی منزل آگئی۔ مگر آپؐ کے صحابہؓ ان تمام مصائب و مشکلات کو خندہ پیشانی سے جھیلتے رہے۔ کسی جانب سے کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس لئے کہ تحریک اسلامی کا قافلہ ابھی صبرِ محض کی منزل سے گزر رہا تھا۔ یہاں پر قتال کی اجازت نہ تھی بلکہ حکم تھا کہ "کُفُّوا اَیدِیَکُم"۔ ان تمام تر مشکلات کے باوجود حضور اکرم ﷺ مکہ میں تیرہ سال تک عزم بالجزم کے ساتھ دعوت و تربیت کا کام کرتے رہے۔

اس کے بعد ہجرت کے حکم کے ساتھ ہی پیغمبرِ انقلاب ﷺ اور آپؐ کے ساتھیؓ مدینہ ہجرت کرنے لگے۔ مدینہ میں "کُفُّوا اَیدِیَکُم" والی صورتحال نہ رہی بلکہ اب بارگاہِ خداوندی سے قتال کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ اب تحریک اسلامی صبر محض کے مرحلے سے نکل کر اقدام کی منزل پر آپہنچی۔ اگرچہ مولانا شبلی نعمانی نے اسلام کی جنگ کو مدافعتی جنگ قرار دیا ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مدافعت کی جنگ نہ تھی، بلکہ خود آگے بڑھ کر باطل کے خلاف مسلح اقدام تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ نے قریش کی تجارتی شاہراہوں پر اپنے فوجی دستے تعینات کئے جو قریش کے لئے مستقل خطرہ تھے اور بالواسطہ طور پر اقدام کا چیلنج بھی تھے۔ یہاں سے جنگوں کا آغاز ہوا۔ چنانچہ بدر و اُحد، خندق و خیبر، فتح مکہ و حنین کے عظیم الشان معرکے پیش آئے۔ اسی طرح دیگر ستائیس سرایا ہوئے، جن میں آپؐ کے تربیت یافتہ صحابہؓ نے اپنی جانیں نثار کر کے شجرِ اسلام کی آبیاری کی۔ اور یوں یہود کی عیاریاں، نصاریٰ کی چالبازیاں اور منافقین کی مکاریاں ملیامیٹ ہو گئیں۔ اور آخر کار ربِّ ذوالجلال کی مشیت سے فتح مکہ پر اظہار دین الحق کی منزل آن پہنچی۔ اور خدائے واحد

نے جو "لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد" ہے۔ اپنا وعدہ "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا" کی صورت میں پورا کر دکھلایا۔ اور تب مصطفوی انقلاب کی تکمیل ہوئی اور اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین پوری آب و تاب کے ساتھ بالفعل قائم و نافذ ہو گیا۔

مراحلِ انقلاب

حضور اکرم ﷺ کی حیاۃِ طیبہ میں آپ کے اس سارے عمل اور تمام تر جدوجہد پر ہم غور کریں تو آج ہمیں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے سیرۃِ رسول ؐ سے درج ذیل مراحل و مدارج کی راہنمائی ملتی ہے۔ دعوت و تبلیغ' تنظیم و تحریک' تزکیہ و تربیت' صبرو مصابرت' چیلنج اور مسلح اقدام۔

دعوت و تبلیغ

دنیا میں جتنے بھی انقلابات آئے ہیں ان میں سب سے بنیادی کام انقلابی نظریہ کی اشاعت ہے۔ کوئی بھی داعی جو لوگوں کو انقلاب کے لئے پکارتا ہے اسے سب سے پہلے یہ بتانا ہوتا ہے کہ وہ انقلاب کیوں لانا چاہتا ہے؟ اس کے پیش نظر انقلاب کی ماہیت و نوعیت کیا ہے؟ اس انقلاب سے افراد کی زندگیوں میں کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اور یہ کہ اس کی اس ساری جدوجہد کا منتہائے مقصود کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہی وہ پہلا مرحلہ ہے جس سے انقلابی جماعت اپنی انقلابی جدوجہد کا آغاز کرتی ہے۔ اب اگر انقلابی جماعت اشتراکی ہے تو وہ اپنے نقطۂ نظر سے اپنے اشتراکی نظریئے کی اشاعت کرے گی۔ یا نسلی شہنشاہیت (Kingdom) کے خاتمے کے لئے جمہوری پارٹی ہے تو وہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اپنے نظریے کا پرچار کرے گی۔ اسی طرح اسلامی انقلاب کا داعی بھی سب سے پہلے اپنے نظریۂ انقلاب یعنی توحید کی دعوت دے گا۔ نظریۂ توحید کہ جس کا اساسی نعرہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" ہے۔ اس "لَا اِلٰہ" سے مراد یہ ہے کہ ہر قسم کے مادی اور نظریاتی بتوں کا انکار اور "اِلَّا اللّٰہ" سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ خالقیت' مالکیت' ربوبیت اور حاکیت اور دیگر

جملہ صفات کا اقرار۔ یعنی انسان کا خالق و مالک اور رب خدا تعالیٰ ہے۔ وہی معبود ہے، حاجت روا و مشکل کشا ہے، علیم و حکیم ہے، خبیر و بصیر ہے، اسی کا حکم انسانی زندگی کے جملہ انفرادی اور اجتماعی شعبوں پر چلتا ہے، وہی حاکم مطلق اور مختارِ کُل ہے۔ انسانی زندگی میں عقیدۂ توحید کا مظہر یہ ہے کہ وہ ایمان رکھے کہ خدا صرف ایک ہے، وہی کُل کارخانۂ قدرت کا خالق و مالک ہے۔ اس خدا نے ہمیں زندگی بسر کرنے کے لئے قرآن حکیم کی صورت میں ایک مکمل و اتم ہدایت نامہ دے دیا ہے، اس کے احکامات کے مطابق ہمیں انفرادی زندگی میں بھی چلنا ہے اور زندگی کے اجتماعی گوشوں میں بھی اسی حاکم مطلق کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا ہے، خواہ اس کا تعلق سیاست سے ہو، معیشت سے ہو یا معاشرت سے، کیونکہ حکم کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، کسی فردِ واحد کو یا افراد کے اجتماع کی صورت میں کسی پارلیمنٹ کو قانون سازی کا اختیار نہیں البتہ اللہ تعالیٰ کی حدود کے اندر اندر رتبہ سب اس لئے کہ "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ" حکم کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ جب انسان یہ عقیدہ رکھے گا، تب ہی اس کا ایمان مکمل ہوتا ہے۔ اسی عقیدہ کا پرچار حضور اکرم ﷺ نے کیا تھا۔ اور آج بھی اسلامی انقلاب کے داعی کو سب سے پہلے عقیدۂ توحید کا پرچار کرنا ہوگا۔

تنظیم و تحریک

دعوتِ توحید کے نتیجے میں جب کچھ لوگ داعی کی پکار پر لبیک کہیں، اور دعوت توحید کو قبول کرلیں، تو اب داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے نظریاتی کارکنوں کو ایک نظم میں پرونے کے لئے ایک تنظیم قائم کرے۔ ایک جماعت بنائے، جس کی بنیاد "السمع والطاعة فی المعروف" کے نبویؐ طریقے پر ہو۔ اگرچہ بیعت کے نظام پر آج بعض لوگ اعتراضات کر رہے ہیں لیکن نبویؐ طریق یہی ہے۔

تزکیہ و تربیت

اسلامی انقلاب کے لئے تیسرا مرحلہ تزکیہ و تربیت کا مرحلہ ہے۔ چنانچہ قرآن میں رسولؐ کی پہلی ذمہ داری تلاوتِ آیات یعنی دعوت کے ساتھ تزکیہ کا بھی بیان آیا ہے۔

جیسے ارشاد ہوتا ہے "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ"۔ تزکیہ کے معنی ہیں پاک کرنا۔ یعنی داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کارکنوں کو گناہ و عیوب سے پاک کرے' ان کے اخلاق سنوارے' حبِ دنیا اور حبِ عاجلہ سے بچنے کی تعلیم دے' انہیں خواہشاتِ نفس کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں لائے' تاکہ وہ خواہشات' جذبات اور احساسات سے بالاتر ہو کر صرف اللہ تعالیٰ ہی کے حکموں پر چلیں۔ اسی طرح ان میں اطاعتِ امیر کا جذبہ بیدار کرے' اخوت و بھائی چارے' محبت و مروت' انسانی ہمدردی اور غمگساری کی صفاتِ حمیدہ کی تعلیم دے' تاکہ اس کے کارکن صحیح معنوں میں "أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کی عملی تصویر بن سکیں۔

صبرِ محض

تزکیہ و تربیت کے بعد انقلابِ اسلامی کے لئے چوتھا مرحلہ صبر و مصابرت کا ہے۔ دعوت کے عام ہوتے ہی حق کی جمعیت کے نتیجے میں باطل کے ایوانوں میں لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس لئے حق کی صدا کو کچلنے کے لئے باطل کی طرف سے ہر ممکنہ کوشش کی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے تمام وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طریقے سے حق کی آواز کو اس کے آغاز ہی میں کچل دیا جائے۔ چنانچہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کو طرح طرح کی ایذائیں دی جاتی ہیں۔ ان پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ داعئ تحریک پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ اس کی ذاتی شخصیت کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسے ساحر و مجنون کہا جاتا ہے۔ چنانچہ پیغمبرِ انقلاب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی تیرہ سالہ مکی زندگی تمام کی تمام' مصائب و مشکلات سے عبارت ہے۔ آپؐ کی شخصیت کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ آپؐ کے ساتھیوں کو تپتی ریت پر لٹایا گیا' ان کے جسموں پر لوہے کی کنگھیاں پھیری گئیں' ان کے سینوں پر پتھر رکھے گئے۔ مگر توحید کے پروانوں کو کوئی چیز بھی راہ خدا سے نہیں ہٹا سکی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی بھی حق کی تحریک کو ان مشکلات کا سامنا کرنا ناگزیر عمل ہے۔ فرعون و کلیمؑ' نمرود و ابراہیمؑ اور چراغِ مصطفویؐ اور شرارِ بولہبی کی یہ کشمکش

ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ اس لئے اسلامی تحریک کے داعی کو اور کارکنوں کو بھی کبھی اس بات سے نہیں گھبرانا چاہئے کہ معاشرے کی جانب سے ان کی مخالفت کی جارہی ہے۔ بلکہ اس مرحلے پر مقابلے کے لئے اندرونی قوت صبر اور نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے استعانت طلب کی جائے (وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ) اور کسی قسم کی مزاحمتی کارروائی نہ کی جائے۔ اور اس مرحلے پر نبی ﷺ کی مکی زندگی کی سنت "كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ" پر عمل کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ مرحلہ ہی صبر واستقامت اور مطلوبہ افراد کی تیاری کا ہے۔

چیلنج

تحریک اسلامی کا پانچواں مرحلہ چیلنج کا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تحریک کے پاس معتد بہ تربیت یافتہ افراد تیار ہو جاتے ہیں، جو باطل نظام سے ٹکرلے سکیں اور اپنی جان تک کو راہ خدا میں قربان کرنے کے لئے تیار کھڑے ہوں۔ اس مقام پر اسلامی تحریک حکومتِ وقت سے مطالبہ کرتی ہے کہ مروّجہ نظامِ حکومت، سیاست، معیشت و معاشرت (جو کہ اللہ تعالیٰ کے نظام حیات اسلام سے سراسر متصادم ہے) کو ختم کردیا جائے۔ ورنہ ہم بزورِ بازو اس کا قلع قمع کردیں گے۔ یہ مطالبہ موجودہ دور میں پارلیمنٹ کا گھیراؤ کرکے بھی منوایا جاسکتا ہے۔ جیسے کہ ضیاء الحق کے دور میں شیعوں نے پارلیمنٹ کا گھیراؤ کرکے خود زکوٰۃ سے چھوٹ حاصل کرلی تھی۔ اس مرحلہ پر حکومتِ وقت تحریک اسلامی کے مطالبات اور عوامی طاقت کے بل بوتے پر گھٹنے ٹیک دیتی ہے اور زندگی کے جملہ شعبوں سیاست، معیشت اور معاشرت اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق تشکیل دیتی ہے تو اسلامی انقلاب کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ یا دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت وقت تحریک اسلامی کے مطالبات کو ٹھکرا دیتی ہے۔

مسلح اقدام

اسلامی انقلابی جماعت کے مطالبۂ اسلام کے نفاذ کے انکار کی صورت میں تحریک اسلامی

صبر و مصابرت اور چیلنج کے مرحلے سے گزر کر مسلح اقدام کے مرحلے میں اب وہ باطل حکومت سے ٹکر لیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں دو ہی نتائج متوقع نکلتے ہیں، تختہ یا تخت۔۔ یعنی یا تو تحریک اسلامی اقتدار حاصل کر کے انقلاب اسلامی کی تکمیل کر دیتی ہے۔ یا پھر غیر اسلامی حکومت اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لا کر تحریک اسلامی کو مکمل طور پر کچل دیتی ہے۔ اور تحریک کے کارکن راہ خدا میں جان دے کر جام شہادت نوش کر لیتے ہیں۔ یاد رہے کہ مؤخر الذکر صورت میں بھی تحریک اسلامی کی جدوجہد کو کسی اعتبار سے بھی ناکامی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس کے کارکنوں کا منتہائے مقصود کرسئ اقتدار پر پہنچ کر اسلامی نظام کا نفاذ نہیں ہوتا، بلکہ رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد دونوں صورتوں میں حاصل ہو جاتا ہے۔ مسلح تصادم یا اقدام کے ضمن میں یہ بات یاد رہے کہ از روئے شریعت اسلامی مسلمان حکمران کے خلاف بھی اقدام جائز ہے۔ اگرچہ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان حکمران کے خلاف اقدام کیا جائے، لیکن امام ابو حنیفہؒ نے اسے جائز قرار دیا ہے، اگرچہ اس کی شرائط بھی بڑی سخت ہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان حکمران کھلے عام کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر رہا ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تحریک اسلامی کے پاس سرفروش مجاہدین کی اتنی نفری موجود ہو کہ بحالاتِ ظاہر یہ امید واثق ہو جائے کہ سربکف مجاہدین غلط نظام کو تبدیل کر لیں گے۔

دورِ حاضر میں انسانی تمدن نے بہت ترقی کی ہے۔ تمدنی ارتقاء کی بدولت آج جہاں دیگر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہاں ایک تبدیلی یہ آئی ہے کہ قرونِ اولیٰ میں حکومت کے پاس تنخواہ دار فوج (standing armies) نہیں ہوتی تھی۔ اسی طرح اُس دور میں جس نوع کا اسلحہ حکومت کے پاس ہوتا تھا عوام کے پاس بھی وہی اسلحہ ہوتا تھا۔ اس میں (quantity) کا فرق تو ہو سکتا تھا، لیکن (quality) کا کوئی فرق نہ تھا۔ حکومت کے پاس بھی وہی تلواریں، نیزے اور تیر وغیرہ تھے اور عوام بھی انہیں سے مسلح تھے۔ لیکن آج صورت بالکل اس کے برعکس ہے۔ آج حکومت کے پاس تمام وسائل ہوتے ہیں۔ اس کے پاس ایک تنخواہ دار فوج ہوتی ہے جو انتہائی طاقتور اسلحہ سے لیس ہوتی ہے۔ اور اس

طرح حکومت ایک مضبوط ترین ادارہ بن چکی ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں عوام بالکل نہتے ہیں۔ یہ فرق و تفاوت اتنا زیادہ ہے کہ حکومت اور عوام کی طاقت کے مابین کوئی نسبت و تناسب ہی نہیں۔ چنانچہ موجودہ دور میں انقلاب اسلامی کے چھٹے مرحلے (Armed Conflict) یعنی پہلے سے قائم شدہ نظام سے مسلح تصادم کا مرحلہ ناممکن نظر آتا ہے۔ اس کا متبادل بھی تمدنی ارتقاء نے ہمیں دے دیا ہے اور وہ ہے خاموش مظاہرے، احتجاجی جلوس وغیرہ، کیونکہ آج کے دور میں عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اگر کسی حکومت یا نظامِ حکومت کو ناپسند کرتے ہیں تو اس کو ہٹا کر اپنی پسند کی حکومت لا سکتے ہیں۔ آج تحریک اسلامی یہی طریقہ اختیار کرے گی، وہ خاموش مظاہرے کرے گی، احتجاجی جلوس نکالے گی۔ کسی بھی امر غیر شرعی کے آگے تحریک کے کارکن سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں گے، اور یہ مطالبہ کریں گے کہ اس غلط نظام کو ختم کر دیا جائے، ہم اس نظام کو جو شریعتِ الٰہی سے متصادم ہے ہرگز نہیں چلنے دیں گے، خواہ اس کے لئے ہمیں اپنی جانوں ہی کا نذرانہ کیوں نہ دینا پڑے۔ اس مرحلے پر حکومتی مشینری حرکت میں آجائے گی، اسلامی تحریک کے کارکنوں کو ہٹانے کے لئے تمام وسائل بروئے کار لائے گی، مسلح افواج کی مدد لی جائے گی، مسلح افواج تحریک اسلامی کے کارکنوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گی، مگر اسلامی تحریک کی تربیت یافتہ فوج بالکل مزاحمت نہیں کرے گی۔ تحریک اسلامی کے کارکن اپنی جانیں قربان کر دیں گے لیکن اپنے موقف سے ذرا پیچھے نہ ہٹیں گے۔ ان کا مطالبہ اسلامی حکومت یا شہادت ہو گا۔ اب یا تو تحریک کو مکمل طور پر کچل دیا جائے گا یا پھر افواج اتنے بڑے پیمانہ پر انسانی جان کے قتل کے بعد ہتھیار ڈال دے گی۔ جیسے کہ ایران میں ہوا ہے، اور اب سر بکف مجاہدین کے خون سے شجرِ اسلام کی آبیاری ہو گی۔ اور پھر بقول اقبال۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

انقلاب کے نبویؐ منہاج کو اپنانے کی ضرورت

اقامتِ دین یعنی اسلامی نظام کا نفاذ ہر مسلمان کا بنیادی فریضہ ہے۔ اسی فریضہ کی ادائیگی کے

لئے اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک میں اسلامی تحریکیں بر سرپیکار ہیں۔ ہر طرف سے اسلامی بیداری اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے آواز بلند کی جا رہی ہے۔ مگر ان تمام مساعی کے باوجود پچھلے تین سو سالوں سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا بلکہ ہماری جدوجہد کا الٹا نتیجہ بر آمد ہو رہا ہے۔ ہماری اس زبوں حالی پر بائبل کے وہ الفاظ پورے اترتے ہیں جو اس نے یہود کے بارے میں کہے تھے۔

"اور تمہارا بیج بونا فضول ہو گا کیونکہ تمہارے دشمن اس کی فصل کھائیں گے اور جن کو تم سے عداوت ہے وہی تم پر حکمرانی کریں گے اور تمہاری قوت بے فائدہ صرف ہو گی کیونکہ تمہاری زمین سے کچھ بھی پیدا نہ ہو گا۔" (باب اخبار ۲۶)

چنانچہ ہم نے خلافت اسلامی اور اتحاد عالم اسلامی کے لئے زوردار تحریکیں چلائی اور بے شمار قربانیاں دیں مگر جب نتیجہ نکلا تو پوری ملت اسلامیہ بہت سے ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی۔ ہم نے مصر میں اسلام کے لئے تحریک چلائی مگر جب نتیجہ نکلا تو مصر کی زمام کار اسلام پسندوں کی بجائے فوج کے ہاتھ آ گئی۔ ہم نے اسلام کے نام پر حصول پاکستان کی تحریک چلائی مگر جب اسلامیان ہند کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا تو حصول پاکستان کے بعد یہاں کا اقتدار غیر اسلامی مغرب زدہ ٹولے کے ہاتھ لگ گیا۔ ہم نے افغان جہاد میں اسلام کی آبیاری کے لئے تیرہ لاکھ جانوں کا نذرانہ پیش کیا مگر روس کی شکست اور افغانستان کی فتح کے بعد ہم نفاذ اسلام کی بجائے خود ہی باہم بر سرپیکار ہو گئے۔

ہماری جدوجہد اور مساعی ثمر آور کیوں ثابت نہیں ہو رہی؟ جواب ہے "منہج انقلاب نبویؐ سے انحراف"۔ ہم اسلام کا مثالی نظام واپس لانا چاہتے ہیں، مگر اس کے لئے حضور اکرم ﷺ کے اسوہ اور منہاج کو اختیار نہیں کرتے۔ کیا ہم جو کا بیج بو کر گندم کی امید رکھ سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر حضور اکرم ﷺ کے طریق انقلاب کو چھوڑ کر کسی اور طریقے سے انقلاب نہیں لا سکتے۔ کوئی شخص یہ تو کر سکتا ہے کہ اپنے ذہن میں خوش خیالیوں کی ایک دنیا بسا کر اس میں جیتا رہے لیکن مستقبل کا مؤرخ ہماری خوش خیالیوں کی تصدیق کی بجائے کتاب زندگی میں ہمارا تذکرہ تک بھی نہ کرے گا۔ ع ـــ

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

اگر آج ہم اپنی سابقہ ناکامیوں اور نامرادیوں سے بچنا چاہتے ہیں اور صحیح معنوں میں دین حق کو تمام نظام ہائے باطلہ پر غالب دیکھنا چاہتے ہیں تو اس مقصد کے لئے ہمیں انتخابی کھیل سے اپنے آپ کو باہر رکھنا ہو گا اور نبی ﷺ کا بتایا ہوا انقلابی طریقہ اختیار کرنا ہو گا۔ کیونکہ انتخابات کے راستے سے اسلامی نظام حیات کی منزل مزید دور ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ وطن عزیز کے حوالے سے اس کا بیّن ثبوت دینی جماعتوں کی کارکردگی ہے جس کا گراف آئے روز نیچے گر رہا ہے۔ ویسے بھی انتخابی جمہوریت کے راستے سے جاگیردار' سرمایہ دار اور وڈیرے ہی اسمبلیوں تک پہنچتے ہیں۔ کیونکہ فیوڈل ازم کے تسلط کی وجہ سے دیہی علاقوں کا بہت بڑا ووٹ بینک جاگیردار کو ملتا ہے۔ اور چونکہ اس جمہوری نظام میں امیدواروں کے سابقہ کردار' ان کی اسلام دوستی اور جذبۂ حب الوطنی کو بھی پرکھا نہیں جاتا بلکہ ووٹوں کی گنتی کی جاتی ہے اسلئے اکثر و بیشتر یہی اسلام بیزار طبقہ کرسئ اقتدار کو حاصل کر لیتا ہے اور اسلام پسند' ذہین ترین' نیک سیرت و کردار اور اہل علم افراد انتخابات میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ جمہوری نظام کی اسی بڑی خرابی کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

جمہوریت اِک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گِنا کرتے ہیں' تولا نہیں کرتے

اب اقامتِ دین کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے آپ ﷺ کے انقلابی راستے کے ذریعے اعلائے کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین حق کا قیام۔ یعنی آج دین کے ایک داعی کو چاہئے کہ وہ انقلاب اسلامی کے لئے سب سے پہلے فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد پر ایک وسیع علمی و فکری تحریک چلائے' پورے دین کی دعوت دے' نہ کہ چند مراسمِ عبودیت کی۔ اب جو لوگ اس دعوتِ حق کو قبول کر لیں انہیں منظم کرے' انہیں "وَاسْمَعُوا وَاَطِيْعُوا" کا خوگر بنائے' یادِ الٰہی کی آبیاری کے لئے ان کا تزکیہ کرے' ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کرے' انہیں اخلاقِ رزیلہ سے بچائے اور اخلاقِ فاضلہ سے مزین کرے' نبی اکرم ﷺ سے عشق و محبت اور آپ ﷺ سے قلبی اور روحانی رشتہ کے استحکام کے لئے تگ و دو کرے۔ تحریک اسلامی اپنے کارکنوں کو وقت کے

فرعونوں' ہامانوں' قارونوں اور نمرودوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے صبر اور نماز کے ذریعے ان میں اندرونی طاقت پیدا کرے تاکہ وہ صحیح معنوں میں "اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" کی قوت سے لیس ہو کر باطل سے مقابلہ کے لئے پوری طرح تیار ہو جائیں۔ اسلامی تحریک کے لئے ایسے ہی افراد مطلوب ہیں جو خدا کے لئے تڑپیں' جو حق اور سچائی کو صدقِ دل سے تسلیم کریں' جو آخرت کی خاطر اپنی دنیا قربان کر سکیں' جو اپنی خواہشوں کو بالاتر نصب العین کے تابع کر دیں۔ جب ایسے صالح افراد معتد بہ تعداد میں ہاتھ آجائیں تو اب باطل نظامِ حکومت کے خلاف اقدام کیا جائے۔ اسلامی انقلاب کا یہی نبویؐ طریق ہے' اسی نبویؐ طریق پر چلتے ہوئے تنظیم اسلامی پاکستان کا قافلہ پچھلے اٹھارہ سالوں سے رواں ہے اور ہمارا یہ سفر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک خدا کی بادشاہی اس زمین پر قائم نہیں ہو جاتی۔ ہم اس سفر میں ہر اس مسلمان کو شرکت کی دعوت دیتے ہیں جس کے سینے میں ایمان کی کچھ رمق بھی باقی ہے۔

ایمان کے علمبردارو! اٹھو اور تمام باطل' طاغوتی' اور استحصالی قوتوں کے خلاف ہماری جدّوجہد میں شریک ہو جاؤ۔ ملّتِ اسلامیہ کی امیدیں تمہی سے وابستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر کامیابی کا پختہ یقین لے کر نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ اپنی زندگی کو اسلامی انقلاب کے لئے وقف کر دو۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات' کشمکشِ انقلاب!!

عَنِ الحَارِثِ الاَشعَرِی، قَالَ، قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ:

"اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ

بِالجَمَاعَةِ وَالسَّمعِ وَالطَّاعَةِ وَالهِجرَةِ وَالجِهَادِ فِی سَبِيلِ اللهِ"

(مشکوٰۃ المصابیح [illegible] له مسند احمد [illegible] ترمذی)

legislature is the real test. To determine intent of the legislature Brinda prescribes consideration of the language used, object to be accomplished, the surrounding circumstances, which obviously means circumstances of a provision's adoption. If there is still ambiguity reference may also be made to extrinsic circumstances. Out of all elements held useful for interpreting a constitutional provision three deserve particular attention. These are: (a) the language of the provision, (b) the surrounding circumstances, (c) and object to be accomplished. Brindra's extract quoted above clearly points to the extreme relevance of mischief rule as laid down in the rule of Heyden's case. The analysis of this article is also similar and analogous to that of Brindra's extract in almost all respect. Thus it is clear that Article 2-A can be taken as declaratory of the general rule of validity explained above and there is no problem regarding its executability.

(To be continued)

Supreme Court in Hakim Khan's case is beyond comprehension. We will see hereinafter that it is in total support of the line of argument and analysis of this article. The extract clearly contemplates a distinction between two kinds of constitutional provisions. First category consists of laws to which most of the extract is devoted, that grain rights or impose duties and these may or may not be backed up by ancillary or supplemental legislation. But even in case of constitutional provision of the above kind, quite apart from ancillary legislation in certain cases its self executing nature may be adjudged from the language of that constitutional provision itself. The second category consists of constitutional provisions that simply and merely declare law. Following words of the extract in this context are extremely revealing and significant. Apparently they have escaped the attention of the Supreme Court. "A constitutional provision which is merely declaratory of the common law is necessarily self-executing. A constitutional provision designed to remove an existing mischief should never be construed as dependent for its efficacy and operation on legislature". Here the provision which is declaratory of common law is being set up as a distinct second category by Brindra and unusual importance of mischief rule has been greatly stressed in this behalf.

This leaves no doubt that Brindra too had two categories of laws in mind. The distinction established by Brindra is quite similar and analogous to the distinction which is the basis of this article's analysis. It needs to be reminded that in this article's analysis, a distinction has been set up between provisions that deal with powers, rights and obligations on one hand and a particular provision which is not merely declaratory of common law but instead declares a general rule of validity for all law actions and decisions. This being a source of all legality is immediately and ipso facto effective and stands on a much higher pedestal.

The extract has gone on to emphasise that intention of

manifest intention that they should go into immediate effect and no ancillary legislation is necessary to the enjoyment of a right given or the enforcement of a duty imposed. That a right granted by a constitutional provision may be better and further protected by supplementary legislation does not itself prevent the provisions in question from being self executing, nor does the self executing character of the constitutional provision necessarily preclude legislation for the protection of the rights secured. A constitutional provision which is merely declaratory of the common law is necessarily self executing. A constitutional provision designed to remove an existing mischief should never be construed as dependent for its efficacy and operation on legislature.

constitutional provisions are not self executing if they merely indicate a line of policy or principle without applying the means by which such policy of principle are to be carried into effect, or if the language of the constitution is directed to the legislature, or it appears from the language and circumstances of its adoption that subsequent legislation was comtemplated to carry into effect. Provisions of this character are numerous in all constitutions and treat of a variety of subject. They remain inoperative until rendered effective by supplemental legislation. The failure of the legislating to make suitable provision for rendering a clause effective is no argument in favour of self executing constructions of the clause. Self executing provisions are exceptional.

The question whether a constitutional provision is self executing is always one of intention and to determine intent the general rule is that courts will consider the language used, the object to be accomplished, by the provision and surrounding circumstances. Extrinsic matters may be resorted to where the language of the constitution itself is ambiguous."

How this extract helps the line of reasoning of the

a constitutional law in matters not covered by Article 8, 14 and 203 D with some Federal law. To meet a situation like this there is supremacy clause in Article 6 of American Constitution, whereby constitutional provisions are declared superior over all other laws. But in contrast to this, strange as it may seem there is no express provision in our constitution or anywhere else which could apply to this kind of situation. However, constitution being the organic law of the country that is a source and authority for all other laws will undoubtedly have to be treated as higher law. Here supremacy is derived from the content and subject matter on the principle of res ipsa loquitur-the thing speaks for itself. Same logic applies to Article 2-A. It is the source and authority for all other laws including constitution and also lays down the rule of validity for all laws, therefore it must have preeminent and paramount status. This is necessary also because as we have proved earlier in this article that if we do not accept this position, we are inextricably lost in the morass of confusion and absurd consequences in the actual working of the Constitution.

The court has heavily relied on an extract from Brindra's authoritative treatise on interpretation of statutes. The extract is so important that it is worth reproducing in full:

"A constitutional provision is self executing if it supplies a sufficient rule by means of which the right which it grants may be enjoyed and protected, or duty it imposes may be enforced without the aid of a legislative enactment. It is within the power of those who adopt a constitution to make some of its provisions self-executing, with the object of putting it beyond the powers of legislature to render such provisions nugatory by refusing to pass laws to carry them into effect. Where the matter with which a given section of the constitution deals is divisible, one clause thereof may be self executing and another clause may not be self executing. Constitutional provisions are self executing where there

Whatever violates it is ipso facto, abinitio, void and a nullity, and all organs of State including judiciary is bound to treat it as void and nullity. It may be noted that repugnancy is a negative formulation, it says if a particular provisions has certain elements and features, it is not law. On the other hand, the rule of validity is a positive formulation. It says if a particular provision has certain elements and features, it is law. The rule of validity is of general application. Each and every legal provision must conform to it if it is to be valid law. The rule of repugnancy by its very nature is not so general. Of necessity its applicability has to be confined to a limited number of provision only that are found repugnant. A further difference is that the effect of repugnancy rule is prospective only and not ab-initio. In view of this analysis it is obvious that for the enforceability of Article 2-A, neither any ancillary or supplemental legislation nor any repugnancy clause is needed. Similarly it is unnecessary to designate specifically any individual authority or institution for the application of this test for clearly the determination of validity falls in the province and purview of the judicial organ of the State.

In our discussion related to non-amendability of certain constitutional provisions and the application of Heyden's rule it was established that in certain cases, the contents and subject matter of legal provisions itself without any express words can provide indication for superior weight and status. This proposition is further borne out by the following fact. We know that provisions relating to fundamental rights in Chapter 2 of para 1 of the Constitution have superior effect over all other legal provisions and this is ensured by Article 8 of the Constitution. It is also clear that injunctions of Islam have superior effect due to Article 203 D read with Article 203 A. Similarly we know that Federal Law which includes constitution also because it is also a kind of Federal Statute has superior effect over all provincial laws and this is ensured by Article 143 of the Constitution. Now the question arises that what will happen when there is a conflict between

its judgment in Hakim Khan's case has itself recognised th fact [24]that, all the three limbs of the State can exercis delegated functions of the divine sovereignty within the respective spheres. Obviously this derivation of authorit from the divine sovereign is based on Article 2-A. But take in this form this Statement having been selectively pulled ou of its context represents a dangerously misleading half-trut which has caused the whole confusion. The Supreme Cou has quite inexplicably omitted to mention the conditions an limits which are integrally and inseparably related a essential requirement to the exercise of above mentione functions in every sphere. According to Article 2-A th exercise of these functions, in fact anything done by anybod in the State of Pakistan must be subject to conditior contained in Article 2-A and their validity has to be teste on the basis of these limits and conditions. This is the stag where it is appropriate to come back again to the judgmer of the Supreme Court in Hakim Khan's case. In that case th Supreme Court has raised the objection that Article 2-A not self-executory. In order to make it enforceable suitabl supplemental or ancillary relegislation is essentia Furthermore the court has objected that no where in th constitution a test of repugnancy has been laid down th could enable the court to declare laws, action and decision a void.

All these objections disappear and loose force when w recognise that Article 2-A provides something better an more fundamental than what the courts expect of it. Instea of the test of repugnancy it provides a general rule of validit for all laws actions and decisions in that it requires that a these in order to be valid must conform to limits an conditions laid down by Article 2-A. The impact of Article 2 A is direct and operates at the very source and inceptio

24 P.L.D. 1992 S.C 595 at 619 para marked "F" See at p. 619 para "G" too, whe after quoting a passage from Maulana Amin Ahsan Islahi's "Taddabar-u Quran", the conclusion has been drawn that "this shows that judiciary too ca exercise delegated divine function".

either deal with the question of powers or the question of rights and obligations. Therefore it is true to say that Article 2-A stands apart as a distinct provision from anything else in the constitution. As soon as we keep this aspect of Article 2-A in mind at once every thing falls in proper perspective and true understanding of the whole matter becomes a simple affair. It is evident that all powers derive their origin and force from some authority. As such, they presuppose some authority without which they are meaningless. Similarly rights and obligations need some authority to sanction, guarantee, and enforce them. As such the question of powers, right, and obligations is subsidiary and secondary to the question of authority. The language of Article 2-A itself leaves no doubt that the authority contemplated by it is not merely notional or theoretical. It is meant to be given effect to, in the manner and extent and subject to limits and conditions mentioned in Article 2-A.

Now this kind of authority to which all powers, rights and obligations owe their existence in a State, is evidently a matter of supreme and unrivalled significance. If the exercise of this authority is made subject to limits and conditions, then these limits and conditions become applicable by the very nature of things to each and every thing that pertains to the State in which this authority is reposed. Thus all powers, rights and obligations are inevitably subject to limits and conditions placed on the exercise of this authority. It is true to say, therefore, that whenever any right or power or obligation transgresses or contravenes the above mentioned limits and conditions, they are cut-off from the very source of their validity and existence. As such we cannot escape the conclusion that the limits and conditions of authority mentioned in Article 2-A constitute a general rule of validity that the authority delegated by the divine sovereign to the Islamic Republic of Pakistan must be exercised in accordance with divine commands.

It is interesting to note here that the Supreme Court in

recognised and approved somewhat similar interpretation of objectives resolution. Therein after quoting the clause-I of the objectives resolution in full, the Supreme Court has asserted that "The above declaration epitomises the belief of every Muslim regarding the true nature of the polity with regard to the extent of power exercisable by them in their State as also the mode in which these powers shall be exercised". In other words objectives resolution determines the extent and mode of power that can be exercised by any one in the polity that is Pakistan within the limits prescribed by Allah. This lays down the limit of authority. In general philosophical terms it may be remembered here in passing, that the approach to law and State apitomised in Article 2-A is not without precedent or rationale in the history of Western thought. The State according to Hegal is a corporate organic existence. It has a personality by its own right and through it reason is manifested as the collective folk-spirit (Universal Will) and where the subjective individual wills are merged and identified. Sovereignty therefore belongs to the State and not the people. The State is called and designed to fill a mission of culture, and it is meant to serve a definite cultural ideal. In the case of Pakistan, the mission for State is not merely to serve any cultural ideal but to serve ideals, values and system of Islam.

Article 2-A is a self-subsistent, self-contained and exhaustive provision, because it says, whatever could be said on the question of authority. This is evident from the fact that it designates the source of authority, the modality of the constitution of this authority, the limits and conditions of its exercise. This kind of exhaustiveness itself be speaks that this provision was meant to be applied practically. I have already explained at great length and detail above that Article 2-A is not and could not be merely declaratory in nature. Furthermore a careful study of the constitution as a whole, would reveal that Article 2-A is the only substantive constitutional provision that defines the authority and mode of its coming into being from which every thing else in the constitution is derived. All other constitutional provisions

nd get combined operation. The consequence is that this ıct alone would put Article 2 - A in a paramount position ecause this combined operation will have application on the ntire spectrum of executive and legislative powers.

ARTICLE 2-A DEALS WITH QUESTION OF AUTHORITY:

Constitutions represent the consensus and commitment of a nation regarding its ideals and aspirations which keeping in mind history, culture and peculiarities its ideals and aspirations which keeping in mind history, culture and peculiarities of socioeconomic evolution of that nation are meant to give form to its different institutions and shape its life in general. Pakistan is the first State in modern times which was created with the openly declared purpose that herein Islam injunctions would be implemented. Thus creation of Pakistan was a unique event and it is only natural hat this consequence be reflected in a constitution also. Perhaps the only provision that is significant from this point of view is Article 2-A. Article 2-A possesses many unique eatures which are not found in the constitution of any other ountry. The first unique feature is that it declares that overeignty belongs to Almighty Allah alone. Thus it rejects he generally held modern view that sovereignty belongs to people. Second feature is that the state of Pakistan is not egarded sovereign or delegated sovereign, only authority is lelegated to it by Almighty Allah. Furthermore Article 2-A provides for mode (or means) of delegation of authority to he state of Pakistan, i.e. through chosen representatives of he people. After this 1 Article 2-A lays down two conditions or the exercise of the authority. First condition is that the uthority shall be exercised as a sacred trust. This condition s meant to dispel arbitrariness and ensure due process of aw. Second condition is that the authority shall be exercised within limits prescribed by Allah. All authority is thus made onditional. It is a matter of unusual significance that even n [23]Hakim Khan's case itself, the Supreme Court has

---

Hamim Khan's case P.L.J 1992 S.C. 591.

This indicates the fact that the two provisions bear an integral relationship. This is all the more strongly reinforced when we find that the two provisions are coextensive also having the same object in view. All the above-mentioned oaths contain the following undertaking; "that I will strive to preserve the Islamic Ideology which is the basis for the creation of Pakistan". It is obvious that this covers absolutely the same ground with the same object as the requirements of in Article 2 - A that all authority will be exercised as a sacred trust" within the limits prescribed by Allah".

This being the case, there is no doubt that if Article 45 and Article 2 - A are repugnant any action taken by the President under Article 45 would be at the same time repugnant to his oath under Schedule 3. In these circumstances, the result is that if action under Article 45 is taken and left undisturbed, it would involve not only the violation of Article 2 - A but also the violation of the oath of persons authorised to take action in this behalf. Furthermore, as it happens all the legislatures of every description in this country also similarly undertake by their oaths to "strive to preserve the ideology of Islam which is the basis of creation of Pakistan". Therefore, they also cannot be presumed to intend the violation of their oaths as well as the violation of Article 2 - A of the constitution. To allow such a presumption would be absolutely fantastic and totally subversive of the legislative and executive institutions of the State. This would mean that responsible people and leaders of the nation who are delegatees of the divine sovereign according to the constitution and who are the exercise authority on Allah Almighty's behalf as a scared trust can play ducks and drakes with their respective oaths, although authority is vested in them by virtue of these very oaths.

The only conclusion that follows from the above analysis is that since Article 2 - A and the new forms of oaths under schedule 3 are co-extensive and co-instanti having same object in view, the two provisions must reinforce each other

not necessarily needed to indicate their superiority. The combined effect of these two conclusions is that provision like Article 2 - A due to extraordinary nature of its contents must be given a paramount status and overriding legal potency. In this context still further strength may be drawn from a statement of law contained in Vol.[16] of the corpus juris secundum. According to it, we must keep in mind the main purpose sought to be accomplished by the Constitution and to so construe the same as to effectuate rather than destroy that purpose. The main purpose of the adoption of constitution in Pakistan is undoubtedly the implementation of Islamic injunctions and ideology and this is a permanent and inviolable obligation. This is further supported by an observation of Justice A.S Salam in his judgment in [22]Hakim Khan's case itself which contained the pith of the matter. It is stated therein, "A constitution is an organic whole. All its articles have to be interpreted in a manner that its soul or spirit is given effect to by harmonising various provisions". In other words according to A.S Salam J. giving effect to the soul or spirit of the constitution is the most important consideration. This is the main purpose contemplated by Corpus Juris Secondom. There can be no doubt that Article 2 - A is the soul and spirit of our constitution and therefore deserves higher regard.

VIOLATION OF ARTICLE 2-A INVOLVES VIOLATION OF DIFFERENT OATHS UNDER SCHEDULE 3 OF THE CONSTITUTION:

It is interesting to note that Article 2 - A and new form of oath for legislators of every description and chief repositories of the executive powers of the State were introduced into the constitution on the same day by means of the same piece of legislation i.e. P.O.14 of 1985. Thus the two provisions are coeval and co-instanti and as will be shown they are co-extensive also.

---

22 P.L.D. 1992 S.C. 595 at 636 para marked "p"lines 4 to 6.

representing the final view of the Supreme Court of Pakistan. The mischief was that though this finding was technically unexceptionable yet it did not reflect the over-powering and consistent consensus representing the "Ijma" of Islamic Ummah of Pakistan. Originally there may have been some reason for countenancing this defect due to resistance of the vocal non-Muslim representation most of which came from East Pakistan or due to the fact that it was considered in the fitness of things to wait for appropriate time when the Pakistani society would have reached a suitable stage of evolution. Nonetheless it is significant that this defect had gone totally unnoticed until the verdict in Zia-ur-Rehman's case. It can be seen from the later judgment in Nusrat Bhutto's case even the Supreme Court continued to believe notwithstanding its verdict in Zia-ur-Rehman's case that Pakistan is an ideological state and that the ideology of Pakistan is firmly rooted in objectives resolution with an emphasis on Islamic Laws and concept of morality.

In this background it is evident that verdict in Zia-ur-Rehman's case led to retrogressive consequences. In fact as we have pointed out even objectives resolution in the words of Liaqat Ali Khan have been adopted as a first step towards implementation of Islamic Ideology and injunctions in Pakistan. This was the situation which brought to fore the mischief or defect in the mode of drafting of the constitution. It, therefore, urgently called for a remedy which was provided in the form of Article 2 - A. The reason for remedy was that all obstacles in the way of implementing the original urge and consensus that was the basis and raison-detre of Pakistan should be removed.

In this view of the matter it is altogether unwarranted to conclude that insertion of Article 2 - A was an exercise in futility and that it was meant to achieve no practical effect, change, or purpose. We have already shown that legal provisions can derive their weight and status from their contents and subject matter also and that express words are

In circumstances, where a particular provision covers the same ground with the same object the principle becomes all the more applicable. This aspect of the matter has already been discussed and explained in the article at page 37. The upshot is that Article 2 - A became a constitutional provision in 1985 which is much later than Article 45, or provisions of Chapter 3.A or most of other constitutional provisions found place in the constitution. As such Article 2 - A is entitled to weight and priority on the principle outlined and explained above also.

RULE OF HEYDEN'S CASE:

Laws derive their significance and meaning from the context, the purposes, and circumstances which necessitated them and became the reason of their origin. Extremely relevant in this behalf is the principle that was laid down in an ancient case called [20]Heyden's case (1584)3. Co Rep 7b. This principle in modern times was quoted with approval and relied upon by Lord Denning in [21]Seaford Court Estates Ltd.V. Asher (1949) 2.K.B.481. This principle the courts should direct meticulous and careful attention to the following four things:-

1. What was the common law before the making of the Act?
2. What was the mischief or defect for which the common law did not provide?
3. What remedy the parliament hath resolved and appointed to cure the disease of the commonwealth?
4. The true reason of the remedy?

Applying this principle to question in present reference we find that immediately before the insertion of Article 2 - A into the constitution the verdict in Zia-ur-Rehman case was the authoritative understanding of the constitution

20 Heyden's Case. (1584)3.Co.Rep 7b.
21 Seaford Court Estates. V.Asher. (1949)2. K.B.481.

historian and thinker of modern times, [18]Arnold Toynbee, that, "there is no hope for modern civilization unless the entire super-structure of the secular is put back firmly on religious foundation".

ARTICLE 2 - A AS A SUBSEQUENT PROVISION:

While interpreting and enforcing the law the courts are often confronted with a situation of conflict between two or more provisions of different statutes. In the situation under discussion, there is a situation of conflict between two or more provisions of the same statute i.e. the Constitution of Pakistan. What is the court to do in a situation like this? The fact is that it is the duty of the courts to decide the law which applies to a given situation and to discover and discern the course prescribed by law. Now it is universally accepted that while interpreting the law, the main and all important consideration before the court is ascertainment of the intention of legislature. Another important principle is that while enacting a particular provision as law, the legislature is presumed to have kept in mind all other provisions of law that already exist and bear on the same subject. Therefore the last provision of law in point of time is taken to be the latest expression of legislative intention and will. This is the philosophy and rationale behind the principle that later law is presumed to have repealed or modified the earlier law by implication. Following statement is an illuminating exposition of the subject in hand and is contained in an English [19]authority. It reads "Every Act is made either for the purpose of making a change in law, or for the purpose of better declaring the law and its operation is not to be impeded by the mere fact that it is inconsistent with some previous enactment". In other words the principle that should govern in this situation is later law prevails over the earlier law; Legis posteriores, priorus contrarius abrogant.

---

18 Arnold Toynbee, "Civilisation on Trial" Page 39.

19 [1932] I.K.B.733.

chooser, whether for instance he favours capitalism or socialism, religion or secularism or whether his general attitude is idealist or positivist. The school of thought which was most concerned with the shunning of ideology was positivism of Austin and Bentham. Law according to them is command depending not on reason but on authority. Its validity according to them is in no way dependent on morality or theology. Yet to make such a system tolerable and humane, many principles, such as (aequm et bonum) equitable and the good have to be employed to distil or infuse moral content in the legal order.

How difficult it is to avoid ideology may be seen from the fact that even beneath most narrowly technical rules there might lurk deeply held social and political philosophy. For instance, take the very innocent looking doctrine of "caveat emptor" (مشتری ہوشیار باش) the rule that it is for the purchaser to take the risk whether he has made a good or bad bargain. It is certainly not mere legalistic technicality but involves the whole philosophy of laisser faire, which has played such an influential part in the classical theory both of the common law and the civil law of property and contract.

In this frame of reference, the real function of Article 2 - A can now be properly understood. Instead of leaving it to the individual whims and inconsistent application of different and at time heterogeneous ideologies, Article 2 - A ensure that one ideology is consistently and consciously applied to the entire fabric of nation's life, which happens to be the ideology for which this country was brought into being. This can only be done by it having a pre-eminent position in the constitutional scheme. Furthermore the only way to do so is to make ideology a general rule of validity. In a state which is ideological both in idea and fact everything has to be guided and controlled by values and injunctions derived from ideology and all its decisions have to be made with reference to it. Later in this article it will be shown that Article 2 - A is aimed at performing precisely this function. This is also in line with the conclusion drawn by a great

Article 2 - A, it will appear that the legislature itself conferred overwhelming position on the Law of Allah and made man-made law subordinate to it. If that be so, can any judge refuse to follow that position, as he is under oath to preserve, protect and defend the constitution? If the Article 2 - A is effective and enforceable, the sovereignty belongs not to the people or the parliament but Allah, Can then Article 2 - A be violated, defied or defeated? It must be appreciated that Article 270 - A does equalise all the Articles of the constitution as regards their existence and enforceability and insists that they all being valid will co-exist with each other but with their own weight and importance. In that situation the application of Article 268 (6) will pose no problem". With incisive insight the High Court has explained that in a sense there is an equality between all Articles of the Constitution, because all of them have been made a part of the constitution and declared enforceable. But there is an all-important distinction, in that although and articles being valid co-exist with each other, they do so with their own weight and importance. Therefore, if the objectives Resolution has been embodied in the constitution as Article 2 - A, it has come with its own pervasive and overwhelming weight and importance.

In deed Article 2 - A is superior not only to other constitutional provisions that are amendable, but in fact to all other constitutional provisions. As explained above Article 2 - A represents a third step in the history of our legal evolution, whereby a conscious decision had been taken to enforce and implement the ideology of Islam. This was dictated not only by the logic of creation of Pakistan but also the realisation that is impossible to avoid ideology of some kind. To have no ideology is to be without rudder and compass in the sea of life. Law in action is an integral whole of three dimensions of ideas, facts and values. Law in action cannot be (in weber's language) wertfrei or neutral by avoiding evaluation. Law involves choice, and choices will inevitably be influenced by the ideology or attitude of the

the Objectives Resolution. Significantly these two things, insertion of Article 2 - A and laying down of the new form of oaths was done on the same day through the same act of legislation i.e. P.O.14 of 1985 which was adopted by the parliament through Constitution (8th Amendment) Act, 1985. the major change introduced by Article 2 - A is that it has brought the Ideology contained in the objectives resolution to the full potency which inherently belongs to it. Prior to this, it had been given only declaratory recognition. Secondly it has made laws previously excluded subject to judicial review on the basis of Quran and Sunnah. Thirdly it has been made effective as a positive over-riding law, the general rule of validity which is contained in the Objectives Resolution. This last point will be explained at length later in this article.

From the analysis given above it is clear that Article 2 - A is an irreversible step dictated by the logic of the creation of Pakistan and also in the direction indicated and envisaged from the very beginning. It embodies values, norms and principles without which it is impossible to conceive of any ideology of Pakistan. Perhaps, these are even more vital for Pakistan than liberty of the individual is to countries espousing liberal philosophy. In this view of the matter Article 2 - A eminently qualifies to be non-amendable on the criterion laid down by Indian Supreme Court and also recognized by Pakistan's higher judiciary. Now the stage is set to ask the question, can Article 2 - A which is non-amendable be equal in weight and status to other constitutional provisions which do not satisfy the criterion of non-amendability? In view of the analysis given above there is hardly any doubt what the answer should be. In this regard the conclusion reached by Lahore High Court is unexceptionable. It states the Kernel of the matter with remarkable perspicacity, terseness and at the same time comprehensively. The Lahore High Court through judgment written by Sheikh Riaz Ahmed, J and Malik Muhammad Qayyum, J. has thus spelt out its conclusion. "If we look at

observations of the Supreme Court in Nusrat Bhutto's case quoted above lend firm authority to this view. On ontological level, this aspect of the matter is of primary importance and purely formal legality has secondary status. This is because Ideology both preceded and also engendered the state of Pakistan and the constitution recognizes this fact. To take up the metaphor used somewhere above, Ideology particularly in an ideological state is the living Spirit, and state is just a mere body animated and enlivened by it.

To discover truth one must see things in their true perspective. Therefore in this connection. I would request that a particular attention be focussed on the following words of Khan Liaqat Ali Khan which he addressed to the First Constituent Assembly at the historic moment when Objectives Resolution was passed. He said, "The Objectives resolution is the first step in the direction of the creation of an environment which will again awaken the nation". He obviously meant that the Objectives Resolution is the first step towards Islamic renaissance in Pakistan. This was unavoidable because the Islamic injunctions for centuries had existed only as an ideal rather than as code in actual practice as a law of any country. There was a backlog of centuries and therefore Islamization could not be accomplished in one go. I will submit that establishment of the Shariat Courts by P.O.No. 3 of 1979 which could test all laws barring some specifically excluded from their jurisdiction on the touchstone of the Quran and Sunnah of the Holy Prophet, represented the second step in the direction defined by the objectives resolution. In the same perspective we must see the insertion of Article 2 - A into the constitution and new form of oaths in the third Schedule by which all legislators of every description and the chief repositories of the executive power of the state of Pakistan undertake to uphold not only the constitution but also over and above this the Ideology of Islam which is the basis of creation of Pakistan. This an my submission represented the third step in the pre-ordained vital direction envisaged by

THE ROLE OF JUDICIARY AND THE OBJECTIVES RESOLUTION

By Sardar Sher Alam Khan, Advocate, Lahore

(Part II)

As we already know that Article 2 - A was incorporated only in order to make the objectives Resolution a substantive part of the constitution and thus remove the technical flaw pointed out by Supreme Court in Zia-ur-Rehman's case. There has never been any doubt at any stage that the objectives resolution represented an authoritative goal defining commitment that articulated ideals and aspirations of Islamic Ummah in Indian environment which must be translated into concrete reality in any future dispensation of Pakistan. Nor can there be any doubt that Pakistan is an Ideological state, which is abundantly borne out by the historical background and the very scheme and general tenor of the Constitution as outlined above. It is also borne out by the following words of justice Malik Muhammad Akram which he wrote in his judgment in [17]Nusrat Bhutto case while concurring with Chief Justice Anwar-ul-Haq "Moreover, as observed by my Lord, the Chief Justice ours in an Ideological Republic of Pakistan. Its Ideology is firmly rooted in the Objectives Resolution with emphasis on Islamic Laws and concept of morality". What merits particular attention is the fact that this statement was spelt out in 1977, four years after the verdict of Supreme Court in Zia-ur-Rehman case and also the fact that this was done much before insertion of Article 2 - A in the Constitution in 1985. Together these two facts go to show that the objection of the Supreme Court in Zia-ur-Rehman case was purely technical. It had left undisturbed the fundamental ideological and socio-political rea' underlying the State of Pakistan on the level of consensus and "Ijma" of the nation as a who'

12. P.L.D. 1977 S.C. 657 at 733

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۴۳
شمارہ: ۳
رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
مارچ ۱۹۹۴ء
فی شمارہ -/۷
سالانہ زرتعاون -/۷۰

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۴۵ سعودی ریال یا ۱۲ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔	۱۶ امریکی ڈالر
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۲۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر	۹ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰۔ فون: ۰۳-۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض احوال

زیرِ نظر شمارہ جب تک قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا ماہ رمضان المبارک کی مبارک ساعات میں سے دو تہائی گزر چکی ہوں گی اور اس کے آخری عشرے کا آغاز ہو چکا ہو گا۔ یوں تو یہ پورا مہینہ ہی خیر و برکت کے اعتبار سے سال کے تمام مہینوں میں امتیازی مقام کا حامل ہے اور اسی اعتبار سے اسے نیکیوں کا موسم بہار قرار دیا جاتا ہے'۔۔۔۔۔۔ چنانچہ اس ماہ کی سعادتوں اور برکتوں سے محروم رہ جانے والے شخص کے لئے ایک حدیث میں بڑے سخت کلمات وارد ہوئے ہیں' یہ حدیث بہت مشہور ہے اور متعدد کتب احادیث میں وارد ہوئی ہے کہ ایک بار حضور ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمانے کے لئے منبر کے پہلے درجے پر قدم رکھا تو خلاف معمول آپ کی زبان سے نکلا' آمین۔ پھر دوسرے اور تیسرے درجہ پر قدم مبارک رکھنے پر یہی الفاظ آپ کی زبان پر آئے۔ بعد میں صحابہ کرامؓ کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ جبرئیلؑ میرے سامنے آئے تھے' جب میں نے پہلے درجے پر قدم رکھا تو انہوں نے کہا "ہلاک ہو جائے وہ شخص جس نے رمضان کا مبارک مہینہ پایا اور پھر بھی اس کی مغفرت نہیں ہوئی (یعنی وہ اپنی مغفرت کا سامان نہ کر سکا)" اس پر حضور ﷺ نے فرمایا آمین' اسی طرح دو اور بد بخت افراد کے لئے حضرت جبرئیلؑ نے بد دعا دی اور آپؐ نے ہر بار فرمایا' آمین۔۔۔۔۔۔ لیکن اس ماہ مبارک کے آخری عشرہ کو تو بالخصوص سعادتوں اور برکتوں کے اعتبار سے پورے ماہ کا نقطہ عروج قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی میں وہ مبارک شب بھی ہے جسے قرآن حکیم نے لیلۃ القدر کا نام دیا ہے اور جس میں عبادت کو ایک ہزار ماہ کی عبادت سے افضل قرار دیا ہے۔ (لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ) اس آخری عشرے میں نیکیوں کی دولت سمیٹنے میں کوتاہی کرنا یقیناً بہت بڑی محرومی ہے۔ آں حضور ﷺ خود اس آخری عشرے کے لئے کس درجے اہتمام فرماتے تھے اس کا کسی قدر اندازہ اس حدیث مبارکہ سے ہوتا ہے جو صرف بخاری اور مسلم ہی میں نہیں صحاح کی قریباً تمام کتابوں میں مذکور ہے:

عن عائشۃؓ قالت کان النبیُّ ﷺ اذا دخل العشرُ شَدَّ مِئزرہٗ واَحیا لَیلہٗ واَیقظ اھلَہٗ

ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ جب (ماہ رمضان کا آخری) عشرہ شروع ہوتا تو نبی اکرم ﷺ اپنی کمر کس لیتے تھے (گویا عبادت و ریاضت کے لئے کمر بستہ ہو جاتے تھے) پوری رات جاگا کرتے اور اپنے گھر والوں کو بھی (عبادت کے لئے) جگایا کرتے تھے۔

یہاں اس امر کا تذکرہ بھی بے موقع نہ ہو گا کہ بحمد اللہ جامع القرآن' قرآن اکیڈمی لاہور میں امیر تنظیم کا دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام نہایت عمدہ طریقہ پر ہو رہا ہے۔ شرکاء کی تعداد اور ان کے رجوع کے اعتبار سے یہ سابقہ تمام پروگراموں سے زیادہ کامیاب اور بھرپور ہے۔ اس پروگرام کا دورانیہ کم و بیش چھ گھنٹے بنتا ہے' نماز عشاء ساڑھے آٹھ بجے شب ادا کی جاتی ہے اور فارغ ہوتے بالعموم اڑھائی بج جاتے ہیں۔ قرآن حکیم کے ساتھ تجدید تعلق کی اس سعادت سے جو لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس میں شریک تمام افراد کی اس محنت کو شرف قبول عطا فرمائے' آمین۔

☆ ☆ ☆

ایک اہم وضاحت

گزشتہ دو سالوں کے دوران "میثاق" میں "کبائر" کے نام سے ایک نہایت معلومات افزا سلسلہ مضمون بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے جس میں کبیرہ گناہوں اور ان کی شناعت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس مضمون کے مؤلف ہمارے ایک دوست جناب مولانا شبیر نورانی صاحب ہیں جو آجکل سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ یہ سلسلۂ مضمون ابھی پندرہ کبیرہ گناہوں کے تذکرے تک پہنچا تھا کہ مؤلف نے اسے وقتی طور پر موقوف کر دیا۔ ان کے پیش نظر غالباً ابو داؤد کی کوئی طویل روایت ہے جس میں ستر کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے اور وہ اسی ترتیب سے اپنی کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ ان کا خیال بنا سردست پندرہ کبیرہ گناہوں کے ذکر پر مشتمل کتاب کی جلد اول شائع کر دی جائے' چنانچہ انہوں نے ایک اشاعتی ادارے (اسلامک پبلیکیشنز) سے معاملہ طے کیا اور کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آگئی۔

اس اشاعتی ادارے سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے کتاب کے ٹائٹل پر جلد اول نہیں لکھا اور کتاب کے مؤلف نے بھی دیباچے میں اس نوع کی کوئی صراحت نہیں کی۔ کتاب پر اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اس میں زنا کو کبیرہ گناہوں میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ اس کتاب کے حوالے سے ایک طبقہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کر رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب زنا جیسے جرم کو کبیرہ گناہ نہیں سمجھتے۔ یہ الزام بالکل غلط ہے۔ اولاً نہ تو یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کا تحریر کردہ ہے اور نہ یہ کتاب ان کے ادارے نے شائع کی ہے' ثانیاً حقیقت واقعہ یہ ہے کہ زنا کو محترم ڈاکٹر صاحب کبائر میں ہی نہیں "اکبر الکبائر" میں شامل کرتے ہیں۔ وہ اس کی جس شدومد سے مذمت کرتے ہیں اور الفاظ قرآنی "وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا" کے حوالے سے جس اہمیت کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں وہ ان کے رفقاء و احباب سے مخفی نہیں...... مذکورہ کتاب کے حوالے سے مؤلف کی جانب سے بھی اس وضاحت کا شائع کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ مطبوعہ کتاب اصل کتاب کی جلد اول کی حیثیت رکھتی ہے' زنا کا ذکر دوسری جلد میں آئے گا۔ مؤلف کے نزدیک بھی زنا یقینی طور پر کبیرہ گناہوں میں شامل ہے۔ OO

پریس ریلیز

ملک ایک بار پھر مہیب خطرات سے دوچار ہے!

پاکستان کی داخلی و خارجی صورتحال کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی کا تجزیہ

لاہور ـ ۲۵ فروری: امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ ریاستی راز کے افشاء پر بے نظیر بھٹو کو قومی مجرم گردانا جائے تو یہ اپنی جگہ حق ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر ہمارے لئے اس شر میں سے ایک خیر ضرور برآمد کر دیا ہے' کیونکہ خالصتان کی تحریک کی کامیابی کسی بھی طرح پاکستان کے مفاد میں نہ تھی۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں اجتماع جمعہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایک سکھ لیڈر کے اس بیان سے ہمیں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے' جس میں انہوں نے پیپلز پارٹی کی قیادت سے شکوہ کرتے ہوئے جتایا ہے کہ سکھوں نے پاکستان سے تو ایک مربع انچ زمین بھی نہیں مانگی تھی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اس یقین کا اظہار کیا کہ آزاد خالصتان کے قیام کے بعد سکھوں کی نظروں کا ہمارے پنجاب پر اٹھنا یقینی امر تھا کیونکہ ان کے مقدس ترین مقامات پاکستان میں واقع ہیں اور ان کے قول و عمل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوؤں کا آلہ کار بن کر سکھوں نے ۱۹۴۷ء میں کیا مسلمانوں کے ساتھ درندگی نہیں کی تھی؟۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ میاں نواز شریف کے اس سوال کا جواب تاحال وزیر اعظم کی طرف سے نہیں آیا کہ راجیو گاندھی کو سکھوں کے خلاف کیا مدد دی گئی تھی اور جب تک اس کی نوعیت معلوم نہ ہو کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا' لیکن اگر وہ نہ بتائیں تو ظاہر ہے کہ لوگوں کو قیاس سے کام لینے کا حق ہے' جو یہ ہے کہ آزادی کے لئے لڑنے والے سکھوں کی فہرستیں راجیو گاندھی کو مہیا کر دی گئی تھیں جنہیں چن چن کر مار دیا گیا اور خالصتان کی تحریک دم توڑ گئی۔ اس خیال پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اگر ہماری پچھلی حکومتیں اعلانیہ انکار کے باوجود سکھوں کی اخلاقی مدد سے بڑھ کر کوئی عملی مدد بھی کر رہی تھیں تو یہ ہمارے اخلاقی و دینی اصولوں اور بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی تھی' لیکن اس کے باوجود بے نظیر نے فہرستیں بھارتی حکومت کے حوالے کر کے ایک سنگین قومی جرم کیا جس پر گرفت ہونی چاہئے۔ ملک میں ایسا کوئی ادارہ موجود ہے' جس کے دائرہ کار میں یہ اختیار آتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ ریاستی راز کو دشمن تک پہنچانے کے جرم کی قرار واقعی سزا دے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے ان بحرانوں کا ذکر کرتے ہوئے جو بین الاقوامی سطح پر ملک کو درپیش ہیں خاص طور پر مسئلہ کشمیر اور افغانستان کا حوالہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ خود بھارتی دانشوروں کی تحریروں سے اس امید کی کلی ذرا کھلی تھی کہ کشمیر کے معاملے میں بھارتی قیادت اب عقل کے ناخن لے گی لیکن معلوم ہوا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے اور بھارت نے بھی زمانے بھر کی باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا بلکہ ہمارے

لئے یہ بات بھی فکر مندی کی ہے کہ اس دفعہ اپنے دورے میں وزیر اعظم مسئلہ کشمیر پر چین سے پاکستان کے حق میں کوئی واضح اور زور دار بات نہیں کہلوا سکیں۔ چین کی اپنی مشکلات اور اپنے مسائل ہیں اور وہ امریکہ اور بھارت کی خوشنودی کو اب زیادہ اہمیت دینے لگا ہے جنہیں اصل استعمار یعنی صیہونیت کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے افغانستان میں جہاد کے فساد میں بدل جانے پر عمومی تشویش کے اظہار کے ساتھ ان تازہ واقعات کی نزاکت پر خاص زور دیا جو پشاور سے بچوں کی بس کے اغواء کے بعد افغان ہائی جیکروں کے مارے جانے پر سامنے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کابل میں پاکستانی سفارت خانے اور طورخم میں پاکستانی چوکی پر حملے ہمیں خوفناک سگنل دے رہے ہیں کیونکہ لاکھوں افغانیوں کی ہمارے ملک میں موجودگی جن میں سے بہت سے مسلح اور تربیت یافتہ بھی ہیں ' ہماری قومی سلامتی کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔

ملک کو درپیش داخلی بحرانوں میں ڈاکٹر اسرار احمد نے حزب اختلاف اور حکومت کے درمیان لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی محاذ آرائی کو سرفہرست رکھا اور قوم کو خبردار کیا کہ میاں نواز شریف لوگوں کو سڑکوں پر لانے کی جو باتیں کر رہے ہیں ان میں وزن موجود ہے۔ انہوں نے کہا کہ احتجاجی تحریکیں شہروں سے ہی اٹھتی ہیں اور وہیں زور پکڑتی ہیں اور امر واقعہ یہ ہے کہ بڑے شہر' ان کے تاجر اور متوسط طبقات اپوزیشن کے ہاتھ میں ہیں' چنانچہ وہ اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں' لیکن اس کا نتیجہ کچھ اسی طرح کا ہو گا جیسا ہمیشہ نکلتا آیا ہے کہ بھاری بوٹوں کی چاپ سارے شور و شغب پر غالب آ جائے یا پھر وہ ہو گا جس کی طرف جنرل مرزا اسلم بیگ اشارے کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے شمال کی جانب صوبہ سرحد میں پیش آنے والے ہماری پارلیمانی تاریخ کے بد ترین واقعات کی مذمت کی جس نے عدالتی' دستوری اور پارلیمانی ہر سطح پر بحران کو جنم دیا ہے اور خبردار کیا کہ ولی خان کی باتوں سے خون کی بو آتی ہے۔ انہوں نے جنوب میں سندھ کی صورت حال کو بھی بحرانی قرار دیا جہاں از کار رفتہ بوڑھے جی ایم سید کو ایک بار پھر اونچی آواز میں ہانک لگانے کی ہمت ہو گئی ہے۔ افہام و تفہیم میں دل و دماغ کی صلاحیتیں آزمانے کی بجائے پیپلز پارٹی نے ان کے ایک ممبر صوبائی اسمبلی کو وزیر بنا کر ایم کیو ایم میں بھی نقب لگا دی اور وہاں سے بھی ایک لوٹا بر آمد کر لیا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے ان سب بحرانوں کا حل تجویز کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت کے حصول کی کوشش کی جانی چاہئے جس کے لئے توبہ شرط لازم ہے جبکہ اجتماعی سطح پر تو کیا ہم انفرادی سطح پر بھی توبہ نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک میں کتاب و سنت کی مکمل بالادستی کے لئے ایک عوامی تحریک چلائی جانی چاہئے جسے چلانے والوں نے اپنے آپ پر بھی کتاب و سنت کے احکام کو عملاً نافذ کر لیا ہو۔ پھر یہ اعلان بھی ضروری ہے کہ اس تحریک کا کشمکش اقتدار سے ہرگز کوئی تعلق نہیں اور اسے چلانے والے کسی کے سیاسی حریف یا حلیف نہیں ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنے میں بھی مزید تاخیر نہیں کرنی چاہئے کہ پارلیمانی نظام ہمیں بالکل راس نہیں آ رہا۔ اس نظام حکومت کی لعنتیں کھل کر سامنے آ گئی ہیں جس کے بعد واضح ہو گیا ہے کہ ہمارے لئے صدارتی نظام ہی موزوں ہے جو نظام خلافت

(باقی صفحہ ۹۶ پر)

تذکرہ وتبصرہ

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ میں تدریج اور اس کے تقاضے

—— ڈاکٹر اسرار احمد ——

سب جانتے ہیں کہ یہ "معجزہ" تو پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی بار رونما ہوا تھا کہ ایک ہی فرد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے دعوت کا آغاز بھی فرمایا' ابلاغ و تبلیغ اور نشرو اشاعت کے جملہ تقاضے بھی پورے کئے' پھر جن لوگوں نے دعوت کو قبول کیا انہیں نہ صرف جمع کیا بلکہ ایک نہایت مضبوط و محکم تنظیمی سلسلے میں منسلک کیا' پھران کا تزکیۂ نفس بھی کیا اور تعلیم و تربیت کے تمام تقاضے بھی پورے کئے' پھر اولاً عدم تشدد اور صبر محض' پھر اقدام اور چیلنج' اور بالآخر مسلح تصادم کے مراحل سے بھی گزارا' اور ہر مرحلے پر بنفسِ نفیس خود ہی قیادت اور رہنمائی فرمائی' حتیٰ کہ سپہ سالاری کے جملہ فرائض بھی ادا کئے'---اور کُل بیس برس کے عرصے میں یہ سارے مراحل طے کر کے لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہوئے ملک میں انقلاب کی تکمیل فرمادی اور اللہ کے دین کو غالب کر دیا! (فصلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم)

اب ایک جانب تو اس حقیقت کو سامنے رکھئے' اور دوسری جانب اس امر کو کہ قرآن حکیم کے صغریٰ کبریٰ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے' اور احادیثِ نبویہؐ میں تو صراحت کے ساتھ اس کی خبر دی گئی ہے کہ قیامت سے قبل ایک بار پھر اللہ کا دین اللہ کی زمین پر اسی شان کے ساتھ غالب ہو گا جس شان سے اب سے چودہ سو سال قبل ہوا تھا---اور اس بار یہ غلبۂ دین پورے کرۂ ارضی کو محیط ہو گا اور پورا عالمِ انسانی توحید کے نور سے بالفعل منور ہو جائے گا---بقول اقبال۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی!
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!!

چنانچہ "مسند احمد بن حنبل" میں حضرت نعمان بن بشیر ﷛ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے اپنے مبارک زمانے سے قیامِ قیامت تک پانچ ادوار کا ذکر فرمایا ----یعنی (i) دورِ نبوت (ii) دورِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ (iii) ظالم ملوکیت کا دور (iv) مجبوری والی بادشاہت (یعنی غلامی) کا دور ----اور (v) دوبارہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور! ان میں سے چوتھے دور سے مراد غالباً مغربی امپیریلزم کا دور ہے جو براہ راست حکومت کے اعتبار سے تو ختم ہو چکا ہے مگر تاحال بالواسطہ اقتدار یعنی سیاسی و معاشی تسلط اور تہذیبی و ثقافتی غلبے کی صورت میں جاری ہے --- اس طرح اس وقت گویا نوعِ انسانی آنحضور ﷺ کے بیان کردہ ادوار کے اعتبار سے چوتھے اور پانچویں کے درمیان عبوری دور اور برزخی مرحلے میں ہے!

ادھر قرآن حکیم میں تین بار تو یہ فرمایا گیا کہ:

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کرے اسے کُل دین یا تمام ادیان پر[۱]"

---

[۱] سورۃ التوبہ: ۳۳' سورۃ الفتح: ۲۸' سورۃ الصف: ۹

ویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد "غلبۂ دینِ حق" ہے----اور دوسری
رف مختلف اسلوبوں سے تین ہی بار یہ فرمایا کہ آپؐ کی بعثت تمام نوعِ انسانی کے
لئے ہے۔ جیسے مثلاً سورۂ سبا کی آیت ۲۸ میں فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا

"ہم نے نہیں بھیجا ہے آپؐ کو مگر تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر!"

ب ان دونوں کو یعنی منطق کی اصطلاح میں "صغریٰ اور کبریٰ" کو جمع کرلیں تو صریح
نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ اب جب بھی دوبارہ "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کا دور دنیا میں
ئے گا تو یہ خلافت عالمی اور آفاقی اور پورے عالمِ انسانی اور کرۂ ارضی کو محیط ہوگی۔

مزید بر آں اس کی صریح پیشینگوئیاں بھی صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ چنانچہ

(i) مسند احمد بن حنبلؒ ہی میں حضرت مقداد بن اسود ؓ سے روایت ہے کہ
آنحضور ﷺ نے فرمایا:

"لَا یَبقی علیٰ ظھرِ الارضِ بیتُ مدرٍ وَلا وَبرٍ اِلّا اَدخلہ اللّٰہُ
کلمۃَ الاسلامِ، بعزّ عزیزٍ و ذُلّ ذلیلٍ، اِمّا یُعزّھم اللّٰہ فیجعلھم
مِن اھلھا او یُذلّھم فیدینون لھا" قلتُ: "فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ
لِلّٰہِ"

"روئے ارضی پر کوئی ایک گھر بھی ایسا نہیں بچے گا، خواہ وہ اینٹ گارے کا بنا
ہوا ہو خواہ کمبلوں کے خیمے کی صورت میں ہو، جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل
نہ کر دے، خواہ کسی عزت والے کے اعزاز کے ساتھ، خواہ کسی پست ہمت
کے ضعف کے ذریعے" (یعنی یا تو گھر والا خود ایمان لے آئے گا یا اسے اسلام
کی بالادستی قبول کرنی ہوگی!) اس پر حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے
دل میں کہا: "تب تو وہی بات پوری ہو جائے گی کہ ---- کُل دین اللہ ہی کے
لئے ہو جائے!" (اشارہ ہے سورۃ الانفال کی آیت ۳۹ کی جانب)

(ii) حضرت ثوبان ؓ سے "صحیح مسلم" میں روایت ہے کہ آنحضور ﷺ

نے ارشاد فرمایا:

اِنّ اللّٰہ زَوٰی لی الارضَ فراَیتُ مشارقَھا و مغاربَھا، و انّ امّتی سیبلغ ملکُھا ما زُوِیَ لی منھا

"اللہ تعالیٰ نے میرے لئے کل زمین کو لپیٹ دیا (یا سکیڑ دیا)۔ چنانچہ میں نے اس کے سب مشرق بھی دیکھ لئے اور تمام مغرب بھی۔ اور سن رکھو! کہ میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر یا سکیڑ کر دکھا دیئے گئے!"

لہٰذا قرآن پر ایمان اور صحیح احادیث پر یقین رکھنے والے کسی انسان کو ہرگز شک نہیں ہو سکتا کہ قیامت سے قبل پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ بالکل اسی طرح ہو گا جس طرح آنحضور ﷺ کے دورِ مبارک میں ہوا تھا---- لیکن اس امر میں بھی ہرگز کسی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ وہ "معجزہ" دوبارہ ہرگز رونما نہیں ہو سکتا کہ یہ مرحلہ کسی ایک ہی داعی کی دعوت اور انقلابی جدوجہد سے طے ہو جائے۔ اس لئے کہ اس معاملے میں "امتناعِ نظیر" یعنی آنحضور ﷺ کا بے مثل اور بے مثال ہونا آپ ﷺ کی ختم نبوت اور تکمیلِ رسالت کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے---- لہٰذا اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، یعنی یہ کہ یہ مہم مرحلہ وار سر ہو اور پے بہ پے اور یکے بعد دیگرے ایسی "تحریکیں" اٹھیں جو اس کام کو درجہ بدرجہ بالکل اسی طرح آگے بڑھائیں جس طرح کا نقشہ سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۹ میں سامنے آتا ہے، یعنی: "لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" ("تم لازماً ترقی کرو گے درجہ بدرجہ یا ایک ایک سیڑھی کر کے!" اور جس کی عام فہم تمثیل اولمپک ٹارچ سے دی جا سکتی ہے جسے ایک کھلاڑی لے کر دوڑتا ہے اور کچھ فاصلہ طے کر کے دوسرے کو تھما دیتا ہے، جو اسے کچھ دور اور لے کر تیسرے کے حوالے کر دیتا ہے---- اور اس طرح شمع آگے بڑھتی رہتی ہے!--- گو وہ کام جو اس طرح چودہ سو سال قبل محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں اور جاں نثاروں رضی اللہ عنہم نے صرف ایک انسانی زندگی کے مختصر عرصہ میں

لھایا تھا اب دوبارہ چار یا پانچ نسلوں میں بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو بہت بڑی کامیابی
دگی!

اب اگر یہ بات درست ہے' اور یقیناً درست ہے' تو اس کے کچھ لازمی اور منطقی
ائج بھی ہیں جن کو اچھی طرح سمجھ بھی لینا چاہئے اور ذہنی اعتبار سے قبول بھی کر لینا
اہئے' ورنہ شدید بددلی اور مایوسی کا سامنا ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہیں کہ:

(۱) اولین اور اہم ترین بات یہ کہ اس آخری داعی سے قبل جس کے ہاتھوں یہ
کام پایۂ تکمیل کو پہنچے گا' جتنے بھی ابتدائی یا درمیانی داعی آئیں گے ان کے فکر و فہم اور
ضورات میں بھی کسی نہ کسی اعتبار سے نقص یا محدودیت ہو سکتی ہے' اور ان کے عزم
عزیمت' صبر و مصابرت اور ہمت و استقامت میں بھی مختلف پہلوؤں سے ضعف یا کمی
ہو سکتی ہے۔ تب ہی تو وہ آخری کامیابی سے قبل ہی کسی مقام تک پہنچ کر بے دم اور
بے حال ہو کر رہ جائیں گے یا "عجلت پسندی" کے باعث کسی "شارٹ کٹ" کے
"دامِ ہمرنگِ زمین" میں پھنس کر رہ جائیں گے ---- لیکن ظاہر ہے کہ اگر وہ ع "میرا
سب کچھ مرے خدا کا ہے!" کے مصداق اور "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا"
یعنی "اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں ٹھہرائے گا مگر اس کی وسعت کے مطابق" (سورۃ البقرہ:
۲۸۶ اور چار مزید مقامات) کے قانونِ الٰہی کے مطابق اپنا سب کچھ اس کام میں لگا اور
کھپا دیں گے تو چاہے دنیوی اعتبار سے بالفعل آخری منزلِ مراد یعنی غلبۂ دین تک نہ
پہنچ پائیں عند اللہ سرخرو ہوں گے اور اخروی نجات و فلاح کے حقدار ہوں گے!

(۲) ان درمیانی یا عبوری "داعیوں" کے ساتھیوں اور اعوان و انصار میں سے
بھی جہاں بہت سے لوگ ان داعیوں کی کم ہمتی کے باعث یا ع "کہ امیرِ کارواں میں
نہیں خوئے دل نوازی!" کی شکایت کی بنا پر علیحدگی اختیار کریں گے وہاں بہت سے خود
اپنی کم ہمتی اور کم کوشی یا ذاتی تکبر اور حسد کی بنا پر بھی علیحدہ ہوں گے ---- اور پھر ان
میں سے بھی بعض تو صرف عملی پسپائی کی راہ اختیار کرنے ہی پر اکتفاء کریں گے اور
بعض زیادہ ذہین اور چالاک لوگ اپنی کم ہمتی کو چھپانے یا اپنے خبثِ باطن پر پردہ ڈالنے

کے لئے فکری اعتبار سے بھی "رجعتِ قہقری" کا مظاہرہ کریں گے اور "انگور کھٹے ہیں" کی طرح اس انقلابی فکر ہی کو ناقابل اعتبار قرار دیں گے جس کی اساس پر جدّوجہد شروع کی گئی تھی۔ جبکہ اس کے بر عکس حقیقت پسندی اور اولوالعزمی کا تقاضا یہ ہو گا کہ ان جملہ حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور "گندم اگر بہم نہ شود بھس غنیمت است!" پر عمل کرتے ہوئے سفر کو جاری رکھا جائے اور اس پر تو غور و خوض مسلسل جاری رکھا جائے کہ ہم کسی غلطی کا ارتکاب تو نہیں کر رہے، یا ہم کہیں کوئی غلط موڑ تو نہیں مڑ آئے، لیکن صرف اپنی یا اپنے ساتھیوں کی "کم کوشی" کے باعث "مایوس" ہو کر کام سے دست کش نہ ہوا جائے (بقول اقبال۔ "مایوس نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ۔ کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی!") --- تاکہ حضرت یحییٰؑ کے ان الفاظ کے مطابق جو انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہے تھے کہ: "میں آنے والے کی راہ صاف کرنے والا ہوں!" ہر درمیانی داعی اور اس کے ساتھی اپنے بعد آنے والے کے لئے راہ بھی صاف تر کر دیں اور اس کے لئے کچھ نہ کچھ سازوسامان فراہم کر کے جائیں تاکہ اسے دوبارہ سارا کام از سرِ نو ہی نہ شروع کرنا پڑے!

ان اصولی باتوں کو ذہن میں مستحضر رکھتے ہوئے اب حالیہ تاریخ پر نظر ڈالیے تو صاف نظر آ جائے گا کہ بیسویں صدی عیسوی "احیائے اسلام" کی جدّوجہد کی صدی ہے۔ چنانچہ اس کے آغاز کے ساتھ ہی وہ عمل بھی شروع ہو گیا تھا جسے اسلام اور امتِ مسلمہ کے "ہمہ جہتی احیائی عمل" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جو اس صدی کے رُبعِ اول کے خاتمے کے بعد تو پوری شدت اختیار کر گیا تھا۔ اس "ہمہ جہتی احیائی عمل" کے دو محاذ نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے بالکل جدا تھے بلکہ ان کے تقاضے بعض اعتبارات سے ایک دوسرے سے متضاد بھی تھے ---- یعنی (۱) قومی اور عوامی محاذ ---- جس پر مغربی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لئے آزادی کی تحریکیں بر سر عمل تھیں اور (۲) خالص احیائی محاذ ---- جس پر "تجدید و احیائے دین" کا معرکہ گرم تھا۔

برِّعظیم پاک وہند میں اول الذکر محاذ مسلم لیگ نے سنبھالا جس کی تاسیس ۱۹۰۶ء
ں ہوئی اور کُل اکتالیس برس کی جدوجہد کے ذریعے اس نے پاکستان قائم کر کے
عظیم پاک وہند کے کم از کم دو تہائی مسلمانوں کو بیک وقت انگریزوں اور ہندوؤں
نوں کی غلامی سے نجات دلوا دی ---- جبکہ دوسرے محاذ پر پہلے "الہلال" اور
البلاغ" والے ابوالکلام آزاد اٹھے جنہوں نے ۱۹۱۳ء میں "حزب اللہ" قائم کی اور
حکومتِ الٰہیہ" کے قیام کی زوردار اذان دی لیکن ابھی لوگ جمع ہو ہی رہے تھے کہ
ہرذاتی "امامت" منعقد نہ ہونے کے باعث اور در حقیقت ان اسباب کی بناء پر جن
ذکر اوپر ہو چکا ہے پوری بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی ---- اس کے کچھ عرصے بعد مولانا
ر ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم "تجدید واحیائے دین" کے داعیے اور "الجہاد فی
سلام" کے ولولے کے ساتھ سامنے آئے (واضح رہے کہ یہ دونوں مولانا کی دو شہرۂ
اق تالیفات کے نام ہیں!) اور اس زوردار دعوت کے ساتھ "جماعت اسلامی" بھی
مَ کردی اور اس میں اپنی "امامت وامارت" بھی نصب کردی اور اس میں کوئی شک
ں کہ اس "احیائی محاذ" پر گرانقدر کامیابیاں حاصل کیں اور نمایاں پیشقدمی کا
اہرہ کیا ---- لیکن ان سطور کے راقم کے نزدیک جماعت اسلامی بھی قیام پاکستان کے
ت "راہ یسیر" یعنی شارٹ کٹ کی بھول بھلیوں میں گم اور ملکی سیاست کی دلدل میں
س اور دھنس کر رہ گئی ---- اور اب ایک بار پھر ایسے باہمت لوگوں کی ضرورت ہے
اس شمع کو تیسری نسل میں بھی نہ صرف یہ کہ روشن رکھیں بلکہ احیاء اسلام کی اس
وجہد کو اور آگے بڑھانے کے لئے تن من دھن وقف کردیں۔ اور یہ طرزِ عمل
یار کریں کہ (بقول فیض)۔

یہ فصل امیدوں کی ہمدم 'اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی 'اب کے بھی اکارت جائے گی
دھرتی کے کونوں کھدروں میں ' پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو!
پھر مٹی سینچو اشکوں سے ' پھر اگلی رُت کی فکر کرو!

پھر اگلی رُت کی فکر کرو، جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اِک فصل پکی تو بھر پایا، تب تک تو یہی کچھ کرنا ہے!!

تقریباً پون صدی پر پھیلی ہوئی اس تاریخ میں اہم ترین اور جامع ترین شخصیت علامہ اقبال کی ہے۔ ان کے بارے میں جس قدر غور کیا جائے حیرت بڑھتی چلی جاتی ہے کہ ع "ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی!" چنانچہ ان کی یہ "جامعیت" حیرت انگیز ہے کہ وہ واحد رہنما ہیں جو بیک وقت قومی اور احیائی دونوں محاذوں پر اس درجہ سرگرم عمل رہے کہ اگر ایک جانب وہ فکرِ اسلامی کے "مجدد" ہیں ("الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید" ان کے خطبات کا عنوان ہے) تو دوسری جانب تصور پاکستان کے "خالق" اور نظریۂ پاکستان کے "موجد" بھی ہیں۔ اسی طرح وہ داعی الی القرآن بھی ہیں اور حکیم الاسلام بھی، اور اگرچہ "دعوت الی القرآن" کے میدان میں، اس کے باوجود کہ اس کا آغاز کرنے والے وہی تھے، بعد میں کچھ عرصہ زیادہ گھن گرج مولانا ابوالکلام کی سنائی دیتی رہی تھی ---- تاہم جہاں تک قرآن کے فلسفہ و حکمت کے بحرِ عمیق میں غواصی کا تعلق ہے تو اس میدان میں تو وہ بالکل تنہا ہیں اور ان کا کوئی دوسرا شریک یا مثیل ہے ہی نہیں!

مزید بر آں جس طرح ڈیڑھ دو صدی قبل شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی نگاہِ دور رس نے "ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی" کے لئے احمد شاہ ابدالی کا انتخاب کیا تھا اور اسے ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی، صرف اسی طرح نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر حضرت علامہ کی عقابی نگاہ نے ایک جانب لندن میں جا بسنے والے محمد علی جناح کو "قومی ناخدا" کی حیثیت سے معین کیا، اور خود انہیں اس پہلو سے "خود شناسی" کا جوہر عطا کیا، اور دوسری جانب حیدر آباد (دکن) میں مقیم ابوالاعلیٰ مودودی کو "متکلمِ اسلام" ہونے کا اہل سمجھا اور انہیں اس خطے میں منتقل ہونے کی دعوت دی جس کے بارے میں ان کی چشم باطن اور نگاہِ دوربین دیکھ چکی تھی کہ وہاں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام "تقدیرِ الٰہی" ہے۔ (۱۹۳۰ء کا خطبۂ الٰہ آباد)

تاہم امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہی کی طرح علامہ اقبال بھی بنیادی طور پر صرف
فکر اور "مصور" تھے اور عملی جدوجہد کے میدان میں اتر کر جماعت بنانے اور تحریک
پا کرنے کو ان کے مزاج سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے عملی کام جو بھی
ھوڑا بہت کیا وہ صرف قومی محاذ پر کیا (اور وہ بھی ثانوی حیثیت میں!) --- احیائی
یدان میں عملی طور پر یا خیری برادران اور علامہ مشرقی اترے یا مولانا آزاد اور مولانا
ودودی۔ ان میں سے بھی پہلے تین تو تاریخ کے اوراق اور ماضی کے دھندلکوں میں
م ہو چکے ہیں' البتہ مولانا مودودی اس اعتبار سے زندہ ہیں کہ پاکستان اور بھارت ہی
یں بنگلہ دیش اور کشمیر میں بھی ان کی قائم کردہ جماعت قائم اور موجود ہی نہیں فعال
ر متحرک بھی ہے۔ باقی رہیں ان کی تصانیف اور تالیفات تو ان کا شہرہ تو پورے عالم
سلامی ہی نہیں پوری دنیا میں ہے!

اس وقت ہمیں اس امر سے بحث نہیں ہے کہ پاکستان یا بھارت میں مولانا
ودودی کی قائم کردہ جماعت ۔ "کونسی وادی میں ہے' کونسی منزل میں ہے۔ عشقِ
خیز کا قافلۂ سخت جاں!" کے مصداق کہاں کہاں سے ہوتی ہوئی اب کس مقام پر ہے
۔ صرف اس امرِ واقعی کا تذکرہ مقصود ہے کہ اس عرصے کے دوران جو لوگ اس
فلے سے علیحدہ ہوئے یا خارج کردئے گئے ان میں سے اکثر تو جمود اور تعطل کا شکار
گئے یا کسی صرف علمی یا تعلیمی سرگرمی تک محدود ہو کر رہ گئے۔ بقیہ میں سے بھی
ض تو وہ ہیں جو اس کے بنیادی انقلابی فکر کو حرزِ جاں بنائے ہوئے اپنے فہم اور
ستعداد کے مطابق عملی جدّوجہد میں مصروف و مشغول ہیں جن میں سے ایک ان سطور
راقم بھی ہے' ---- لیکن بعض وہ بھی ہیں جو اب اس بنیادی انقلابی فکر ہی کو غلط قرار
ے رہے ہیں --- ان میں سے ایک نمایاں شخص بھارت میں ہیں یعنی مولانا وحید الدین
ان' جو بھارت کے سرکاری حلقوں اور بالخصوص بی جے پی اور آر ایس ایس کے
ظورِ نظر ہیں' اور ایک پاکستان میں ہیں یعنی علامہ جاوید احمد غامدی جن کا خصوصی ہدف
س وقت یہ خاکسار اور اس کے نظریات ہیں۔

○ ○

بقیہ : پریس ریلیز

سے بھی قریب تر ہے۔ صدر کو پانچ سال کے لئے منتخب کر کے کام کا پورا موقع دے دیا جاتا ہے اور پھر مینڈکوں کے پھدک کر ایک پلڑے سے دوسرے پلڑے میں جانے سے صدر کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انہوں نے کہا کہ ایک اور تدبیر کئے بغیر بھی اب کوئی چارہ نہیں رہا جو صوبوں کی نئی حد بندی سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اب تو ایک سیاستدان نے بھی، جو قابل ذکر دانشور ہیں، اس تجویز کی حمایت کر دی ہے کہ ملک کو نئے صوبے بنا کر چھوٹے انتظامی یونٹوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ کوئی بڑا صوبہ ہی باقی نہ رہے جس سے چھوٹے صوبوں کو کوئی خوف ہو ----OO

نشری تقریر
ڈاکٹر اسرار احمد

اسلام کی دو سالانہ عیدیں

عید الفطر و عید الاضحیٰ

اور فقراء و مساکین کا لحاظ

عید الفطر اور عید الاضحیٰ دونوں عیدیں دو عظیم عبادات اور اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے دو اہم ارکان کے ساتھ ملحق ہیں۔ یعنی عید الفطر صومِ رمضان کے ساتھ اور عید الاضحیٰ حج بیت اللہ کے ساتھ ـــــ اور ان دونوں میں ایک طرف دوگانہ شکرانہ مع اضافی تکبیرات اور نماز کے لیے جاتے اور آتے ہوئے غلغلۂ تکبیر بلند کرتے رہنا مشترک ہیں، جس کا حکم قرآن میں بھی موجود ہے، چنانچہ سورۃ البقرۃ میں صومِ رمضان سے متعلق آیت کا اختتام بھی اِن الفاظِ مبارکہ پر ہوا کہ :ـــــ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ "اور تاکہ تم پوری کر و تعداد اور تکبیر کرو اللہ کی اُس ہدایت پر جو اُس نے تم کو دی اور تاکہ تم شکر کرو! ـــــ اور سورۃ الحج میں فرمایا: كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ "اور اس طرح اس نے ان قربانی کے جانوروں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا، تاکہ تم اللہ کی تکبیر کرو اس ہدایت پر جو اُس نے تمہیں عطا فرمائی اور (اے نبی) بشارت سنا دیجئے احسان کی رَوش اختیار کرنے والوں کو! ـــــ اسی طرح دونوں عیدوں کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے غرباء و فقراء اور محتاجوں اور مسکینوں کے لیے خاص اہتمام رکھا ہے۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر تو ظاہر ہے کہ یہ ضرورت قربانی کے گوشت کے ذریعے پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج میں دو بار فرمایا کہ اس میں سے خود بھی کھاؤ اور غرباء و مساکین کو بھی کھلاؤ، چنانچہ پہلے فرمایا: فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ

"کھاؤ اس میں سے خود بھی اور کھلاؤ فاقہ کش فقیروں کو بھی" اور دوبارہ پھر فرمایا: "فَكُلُوا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ" یعنی کھاؤ اس میں سے خود بھی اور کھلاؤ ان قانع لوگوں کو بھی جو صاحبِ احتیاج ہونے کے باوجود صبر و قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں ـــــ اور ان کو بھی جو بے تاب ہو کر دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

عید الفطر کے موقع پر اسی غرض کے تحت اسلام میں صدقۂ فطر کا حکم دیا گیا ہے تاکہ عید کی خوشیوں میں صاحبِ استطاعت لوگوں کے ساتھ غربا و مساکین بھی شامل ہو جائیں۔ یہ صدقہ ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو صاحبِ نصاب ہو، اور پھر اس کو وسعت یہ دی گئی ہے کہ ایسا شخص صرف اپنی ہی طرف سے یہ صدقہ نہ کرے بلکہ اپنے زیرِ کفالت ہر ذی نفس کی جانب سے ادا کرے۔ یہاں تک کہ ایک بچہ اگر عین عید کی صبح کو تولد ہوا ہو تو اس کی جانب سے بھی صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے۔ صدقۂ فطر کا ذکر اگرچہ قرآن میں تو موجود نہیں ہے تاہم متعدد احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اس کا ذکر نہایت وضاحت اور غایت درجہ تاکید کے ساتھ آیا ہے مثلاً بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قال: فَرَضَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللہ علیہ وسلم زَكٰوۃَ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ اَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى وَالصَّغِيْرِ وَالْكَبِيْرِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاَمَرَ بِهَا اَنْ تُؤَدّٰى قَبْلَ خُرُوْجِ النَّاسِ اِلَى الصَّلٰوۃِ۔"

"حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپؓ نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں سے ہر غلام اور آزاد اور ہر مرد اور عورت اور ہر چھوٹے اور بڑے پر صدقۂ فطر ـــــ ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو لازم کیا ہے، اور حکم دیا ہے کہ یہ صدقہ نمازِ عید کے لیے جانے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔"

اس حدیث میں اگرچہ اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ یہ صدقۂ فطر صرف صاحبِ نصاب پر واجب ہے لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے اور عقلِ سلیم کے لیے اس کا ماننا کچھ مشکل

یں' اس لیے اِس کی صراحت نہیں کی گئی۔

کھجوروں اور جَو کی وضاحت اس لیے کی گئی کہ یہی اہلِ مدینہ کی عام خوراک تھی۔ اور ایک
اع کھجور یا ایک صاع جَو سے ایک متوسّط افراد پر مشتمل کنبے کی ایک دن کی غذائی ضروریات
کفالت ہو جاتی تھی۔ گویا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک صاحبِ نصاب شخص کے گھر میں اگر کُل افراد
ں ہیں تو اُس کے صدقۂ فطر سے غریب مسلمانوں کے دس گھرانوں کی ایک دِن کی خوراک کا پورا
نظام ہو گیا۔ صاع کے تعیّن میں کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک وہ ہمارے
زان کے اعتبار سے ساڑھے تین سیر کے لگ بھگ ہوتا ہے اور بعض کے نزدیک اس
سے نصف' یعنی پونے دو سیر کے لگ بھگ۔ اِس کے تعیّن کے لیے لوگوں کو اپنے اپنے
سمد علیہ علماء کی طرف رجوع کرنا چاہیے' اور چونکہ ہمارے یہاں کی عام خوراک گندم ہے لہٰذا ساڑھے
ن سیر یا پونے دو سیر گندم کی جو قیمت بازار میں ہو اُس کے حساب سے ہر ہر فردِ خانہ کی جانب
سے صدقۂ فطر ادا کرنا چاہیے۔

صدقۂ فطر کی نمازِ عید کے لیے گھر سے روانگی سے قبل ادائیگی کی تاکید کی مصلحت بھی واضح
ہے کہ اِس کا اصل مقصود ہی یہ ہے کہ غُرباء و مساکین بھی عید کی خوشیوں میں آسودگی کے ساتھ شریک
سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مسلمان آبادی میں لوگ عید کی خوشیاں منا رہے ہوں جبکہ اسی آبادی میں
ئی مسلمان گھرانہ فاقے سے ہو! صدقۂ فطر کی اس حکمت کو اس روایت میں بیان کیا گیا ہے
سننِ ابی داؤد میں وارد ہوئی ہے ـــــــ یعنی:

عَنِ ابْنِ عبّاس رضی الله عنهما قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى الله عليه وسلم زَكٰوةَ الْفِطْرِ طُهْرًا لِلصِّيَامِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَ طُعْمَةً لِلْمَسَاكِينِ؛

"حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' آپؓ نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر اس لیے واجب اور لازم کیا ہے کہ لوگوں کے روزے اگر فضول اور لایعنی گفتگو یا کسی فحش بات کے باعث آلودہ ہو گئے ہوں تو اس سے پاک ہو جائیں اور ساتھ ہی محتاجوں اور مسکینوں کے کھانے کا بندوبست ہو جائے۔!"

ان دونوں احادیث میں صدقہ فطر کے لیے "زکوٰۃ الفطر" کے الفاظ وارد ہوئے جس میں اصل اشارہ اسی جانب ہے کہ جس طرح فرض زکوٰۃ کا اصل حاصل بھی یہی ہے کہ دلوں سے مال کی محبت کی نجاست کو دُور کر دے تاکہ لوگوں کی سیرتوں اور شخصیتوں کی تعمیر ان خطوط پر ہو سکے جو اُن کے خالق و مالک کو پسند ہیں، اسی طرح یہ "زکوٰۃ الفطر" درحقیقت روزے کو معصیت کی آلودگی سے پاک کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ البتہ جس طرح فرض زکوٰۃ اسلام کے معاشی نظامِ عدل و انصاف کا اہم رکن ہے اور اس کے ذریعے معاشرے کے ان لوگوں کی مدد ہوتی ہے جو کسی سبب سے معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہوں اور اپنے پاؤں پر نہ کھڑے ہو سکتے ہوں، اسی طرح زکوٰۃ الفطر سے عید کے روز مسلمانوں کی عام خوشی میں پسماندہ لوگوں کی شرکت و شمولیت کا مقصد بھی پُورا ہو جاتا ہے۔

اللہ ہمیں اوّلاً ماہِ صیام کی برکتوں سے کماحقّہٗ مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اس مبارک مہینے کے اختتام پر عید کے روز صدقہ فطر ادا کرنے کی توفیق بھی دے تاکہ ہمارے غریب بھائی بھی عید کی خوشیوں میں ہمارے ساتھ شریک ہو سکیں۔ آمین ثم آمین۔

اسلام کے دو معاشی نظام

ڈاکٹر اسرار احمد

سماجی انصاف کے ضمن میں عہدِ حاضر میں معاشی عدل کی اہمیت اور اس سلسلے میں
خاص طور پر پاکستانی معاشرے سے جاگیرداری 'غیر حاضر زمینداری اور مزارعت کے
خاتمے کی بحث چھڑ گئی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معاشی اور اقتصادی معاملات کے
بارے میں شریعتِ اسلامی کے احکام کی پشت پر جو بنیادی اصول کار فرما ہیں انہیں اچھی
طرح سمجھ لیا جائے' تاکہ ان کے پس منظر میں شریعت کے احکام کی حکمتیں سامنے
آسکیں اور ذہن و قلب میں انشراح پیدا ہو سکے۔

اسلام نے معاشی اور اقتصادی معاملات میں عدل و قسط کا جو مقام متعین کیا ہے'
اس میں اس نے مساوات اور آزادی ایسی بظاہر متضاد اقدار کو نہایت خوبصورتی اور
توازن سے سمو دیا ہے اس کے بارے میں یہ بات شاید اکثر لوگوں کو چونکا دے (اور یہی
میں چاہتا ہوں تاکہ ذہن بیدار ہو جائیں) وہ یہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام ایک نہیں دو
ہیں۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ از ابتدا تا انتہا مکمل ہیں۔ چنانچہ دونوں کا اپنا اپنا فلسفہ
ہے' دونوں کا مختلف نظریۂ ملکیت' نظریۂ حقوق اور نظریۂ قدرِ زائد
(Surplus Value) ہے اور ظاہر ہے کہ یہی چیزیں کسی معاشی نظام میں بنیادی
اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ جملہ امور ان دونوں میں بالکل جدا جدا ہیں۔

اسلام کے ان دونوں معاشی نظاموں کو کوئی چاہے تو یوں کہہ لے کہ یہ دونوں
ایک ہی نظام کے دو رخ ہیں لیکن بہرحال ان کے علیحدہ علیحدہ وجود سے انکار ممکن

ہیں۔ البتہ یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے Interconnected (مربوط) بھی ہیں اور بہت حد تک Interdependent بھی۔ اور اسلام کی ا' برکات اور اس کے جملہ ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اجتماع اور اتصال ہی سے سکتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اگر ان دونوں میں سے ایک پہلو نگاہ سے اوجھل ہو جائے اور توجہ صرف دوسرے پر مرکوز ہو جائے تو اس سے جو تصو سامنے آئے گی وہ اصل حقیقت سے بہت دور ہو گی۔ ان میں سے ایک اسلام کا روحا واخلاقی نظام ہے اور دوسرا قانونی و فقہی نظام۔ اور ان دونوں کے تقاضے بسا او قا مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں۔ تاہم ان دونوں کے امتزاج سے اسلام کا کامل نظ وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو "دعویٰ" (Thesis) او "جوابِ دعویٰ" (Anti-Thesis) سے تعبیر فرمالیں اور اسلام کے مجمو اقتصادی نظام کو ان دونوں کا امتزاج (synthesis) قرار دے لیں۔

اسلام کی قانونی اور اخلاقی تعلیمات کے مابین جو فرق و تفاوت بہت سے معاملات میں موجود ہے' وہ ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے واضح ہو جائے گا۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص آپ کے ایک تھپڑ مار دے تو اگر آپ بالکل ہی عاجز و کمزور ہوں تو اس صورت میں تو ظاہر ہے کہ "قہرِ درویش بر جانِ درویش" کے سوا اور کوئی صورت قابلِ عمل ہے ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہوں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہوں گے: ایک یہ کہ آپ بدلہ لے لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اس صورت میں ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام ہے جو بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے: "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ" یعنی "اے ہوشمندو! تمہارے لئے قصاص ہی میں زندگی ہے!" (البقرہ: ۱۷۹) لیکن دوسری طرف اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام ہے جو عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے۔ یعنی اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے۔ چنانچہ کہیں تو شوق اور رغبت دلانے کے انداز میں فرمایا جاتا ہے:

"وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ "یعنی "وہ لوگ جو غصہ کو پی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں۔" (آل عمران: ۱۳۴) اور کہیں اس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں ترغیب دی جاتی ہے کہ "وَاِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ "یعنی "اگر تم معاف کر دیا کرو، اور چشم پوشی سے کام لو، اور خطائیں بخش دیا کرو تو یقیناً اللہ بھی غفور اور رحیم ہے!" (التغابن: ۱۴) — دیکھ لیجئے کہ عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان دونوں میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر لازم و ناگزیر ہیں اور حسنِ معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اس پر قیاس کر کے سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں، چنانچہ ایک جانب قانونی اور فقہی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ ایک نوع کی محدود (Controlled) اور داخلی طور پر منضبط (Internally managed) سرمایہ داری (Capitalism) ہے، اس لئے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے، اگرچہ اسے "سرمایہ دارانہ نظام" بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دوسری طرف اسلام کا روحانی و اخلاقی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں میں پورے انشراحِ صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (Spiritual Socialism) ہے اور ایک ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس سے بلند تر سوشلزم کا تصور ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت کا اثبات موجود ہے، اگرچہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی، لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں "ایمانی تعلیم" کی رُو سے انسانی ملکیت کی کلی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں کہ "لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "یعنی "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کا مالک صرف اللہ

ہے"۔ چنانچہ انسان کسی اور شے کا مالک تو کیا ہو گا' خواہ وہ زمین ہو یا مکان' او
سازوسامان ہو یا روپیہ پیسہ' وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں' اس کے ہاتھ
پاؤں' اعضاء و جوارح اور جسم و جان اور اس کی کُل صلاحیتیں اور توانائیاں سب اللہ
کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں۔ بقول شیخ
سعدیؒ ۔

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
حقیقت مالکِ ہر شے خداست

یا بقول علامہ اقبال مرحوم ۔

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست

اس اعتبار سے ہمارے ہاں بڑا کنفیوژن پایا جاتا ہے۔ سوشلسٹ ذہن رکھنے والے اہلِ قلم متذکرہ بالا مضمون کی آیات اور احادیث کو اکٹھا کر کے ہر شے کی ملکیت کی بھی کامل نفی کرتے رہے ہیں اور ضرورت سے زائد اپنے پاس رکھنے کی بھی' کہ جب "قُلِ الْعَفْوَ" فرمادیا گیا یعنی جتنا ضرورت سے زائد ہے اللہ کی راہ میں دے ڈالو (البقرہ: ۲۱۹) تو زائد چیز جبراً بھی وصول کرلی جائے گی۔ اس طرح وہ ایک کامل اسلامی سوشلزم کا نقشہ پیش کرتے رہے جب کہ وہ دوسرے پہلو کو بالکل نظرانداز کرتے رہے۔ حالانکہ قانونِ وراثت بھی اسی قرآن میں موجود ہے' اور حضور اکرم ﷺ نے جو نظام برپا کیا تھا اس میں کہیں جبری مساوات دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ اس کے برعکس آزاد معیشت کے مواقع دیئے گئے تھے' کہ محنت کرو اور جائز ذرائع سے کماؤ' اور ان ذرائع سے تم جو کچھ کماؤ گے اس پر تمہارا حقِ تصرف یہاں تک تسلیم کیا جائے گا کہ اس کو وراثت میں منتقل بھی کیا جاسکے۔ دوسری طرف ہمارے ہاں بعض مفکرین اور اصحابِ قلم نے صرف اس قانونی نظام کو اتنا نمایاں کیا ہے کہ دوسرا پہلو دب کر رہ گیا ہے۔ یعنی "قُلِ الْعَفْوَ" کی آیت ان کی تقریر و تحریر میں آتی ہی نہیں!

یاد رہے کہ یہ کنفیوژن (الجھن) پورے خلوص کے ساتھ محض غلط فہمی کی بنیاد پر بھی ہو سکتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہ غلط فہمی ہمارے دورِ اول یعنی خلافتِ راشدہ کے دوران بھی پیدا ہو گئی تھی' چنانچہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے غلبۂ زہد کے باعث یہ رائے قائم کرلی تھی کہ ضرورت سے زائد اشیائے صرف اور کسی بھی مقدار میں سونا اور چاندی اپنے پاس رکھنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ گویا آپؓ نے آیۂ کنز یعنی سورۃ التوبہ کی آیت ۳۴:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

"جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے!"

کو بالکل اس کے ظاہری الفاظ پر محمول کیا۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے اس نظام میں جس پر تمام اُمت جمع تھی' اس رائے کو ایک انتہا پسندانہ موقف قرار دیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انہیں مدینہ منورہ سے باہر چلے جانے کی ہدایت بھی کی گئی۔ لہٰذا انھوں نے ایک بیابان میں جھونپڑا ڈالا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے احساس کی شدت کا یہ عالم تھا کہ وفات کے قریب آپؓ نے اپنی زوجہ محترمہ سے فرمایا کہ "میرے خلیل (یعنی نبی اکرم ﷺ) نے فرمایا تھا کہ مسلمانو تم اپنے اردگرد سانپ بچھو (یعنی سامانِ تعیش) جمع کرلو گے۔ افسوس کہ ہم نے بھی سانپ اور بچھو اپنے گرد جمع کر لیے ہیں۔" تو انھوں نے کہا کہ کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو؟ تو آپؓ نے معمولی چیزوں جیسے توا' چمٹا اور دیگچی کا حوالہ دے کر کہا: یہ نہیں پڑے ہوئے میرے گرد! حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اسی غلبۂ زہد کی وجہ سے آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ "تم میں سے جو چاہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا زہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اسے چاہئے کہ وہ میرے دوست ابوذرؓ کو دیکھ لے"۔ بہرحال یہ نظام اسلامی کا وہ روحانی پہلو ہے جس کی طرف اسلام انسانوں کو ترغیب تو دینا چاہتا ہے کہ یہی وہ

راستہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے تزکیہ اور روحانی مراتب کے حصول
آگے بڑھ سکتا ہے، مگر اس کو قانونی درجہ دے دینا ایک مغالطہ تھا جو حضرت
غفاری رضی اللہ عنہ کو پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ لاحق ہوا۔ لیکن عہدِ حا
یہ مغالطہ جان بوجھ کر اور بدنیتی کے ساتھ دیا جا رہا ہے کیونکہ آج تو خلافتِ ر
نظام پورے کا پورا ہمارے علم میں موجود ہے اور امت کے اس اجماعی فیصلے
بدنیتی کے نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

بہرحال اسلام کے اس روحانی معاشی نظام کے چار اصول ذہن میں اچھی
مرتب اور مستحضر کر لئے جائیں:

۱) انسانی ملکیت کی کُلی نفی۔

۲) یہ یقین کہ انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے اس کی کمائی نہیں اللہ
ہے۔ گو دکان پر وہ بیٹھا ہے، کھیت میں ہل اس نے چلایا ہے، محنت اس نے کی
لیکن ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہے اس کو اللہ کا عطیہ اور اس کا فضل سمجھو
اسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھو گے تو اس پر اپنا حقِ ملکیت جتاؤ گے اور اس کا منطقی نتیجہ
گا کہ تم بھی وہی سمجھو گے جو قومِ شعیبؑ نے سمجھا تھا کہ: "اَنْ نَّفْعَلَ فِیْ اَمْوَالِ
نَشٰٓؤُا "یعنی یہ کہ ہمیں اختیار ہونا چاہئے کہ اپنے مال میں جیسے چاہیں تصرف کریں
۸۷) لیکن اگر اللہ کا فضل سمجھو گے تو اس میں تصرف بھی اصل مالک اور عطا کنندہ
مرضی کے مطابق کرو گے۔

۳) اللہ کے اس "فضل" میں سے انسان کا جائز حق صِرف اس کی ضرور
کے بقدر ہے، اور ان بنیادی انسانی ضرورتوں کو بھی بعض احادیث میں متعین کر
ہے۔ یعنی:

الف : اگر دو وقت کھانے کے لئے مل گیا ہے۔

ب : سر چھپانے کے لئے اگر کوئی چھت موجود ہے۔

ج پہننے کے لئے اگر دو جوڑے کپڑوں کے موجود ہیں۔ اور

د : اپنے کردار' اخلاق اور عفت کی حفاظت کے لئے اگر ایک بیوی بھی موجود ہے۔
تو تمہارا بنیادی حق تمہیں مل گیا۔

۴) اس بنیادی ضرورت سے زائد جو کچھ ہے اس کے بارے میں اخلاقی روحانی سطح پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ خواہ قانونی اعتبار سے تمہارا ہو' حقیقت کے اعتبار سے تمہارا نہیں' دوسروں کا حق ہے۔ اس کو ان لوگوں تک پہنچادو جن کے پاس بنیادی ضرورت کے بقدر بھی موجود نہیں ہے اور پھر سمجھو کہ تم غریبوں کی اس امانت کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے جو تمہارے امتحان کی غرض سے تمہارے مال میں شامل کردی گئی تھی۔

الغرض' یہ ہے وہ مقام جہاں "قُلِ الْعَفْوَ "کافلسفہ بندۂ مومن کو پہنچانا چاہتا ہے' یعنی یہ کہ تمہارے پاس جو بھی "قدرِ زائد" ہے اس کو مزید کمائی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ تمہاری ضرورت پوری ہو گئی تو تمہارا حق مکمل ہو گیا' اب جو زائد تمہارے پاس ہے وہ خواہ قانوناً تمہارا ہو مگر حقیقتاً تمہارا نہیں ہے۔

بہرحال یہ ایک مکمل معاشی نظام ہے۔ اس میں ملکیت اور قدر زائد کا اپنا جداگانہ تصور ہے' اور اس قدر زائد کا مصرف بھی طے شدہ ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے خود اسی نظام کے مطابق زندگی بسر کی تھی۔ چنانچہ یہ بات بہت سے لوگوں کے لئے جنہوں نے اس سے قبل ان معاملات پر غور نہ کیا ہو بہت حیران کن ہو گی کہ نبی اکرم ﷺ نے تمام عمر "زکوٰۃ" ادا نہیں کی۔ اس لئے کہ زکوٰۃ تو ظاہر ہے کہ صرف صاحبِ نصاب پر عائد ہوتی ہے اور آپ ؐ نے کبھی کوئی درہم و دینار اپنے پاس رکھا ہی نہیں کہ اس کی نوبت آسکتی۔ لیکن یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اس نظام کی ساری خوبی اور اس کا کُل حسن اس کے "رضاکارانہ" (Voluntary) ہونے میں مضمر ہے۔ اسے کسی ادنیٰ درجہ میں بھی بالجبر نافذ کرنے کی کوشش کی جائے گی تو نتیجہ وہی نکلے گا جو کمیونزم کے حشر کی صورت میں سامنے آچکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ہمیں دونوں طرح کے حضرات نظر آتے

ہیں۔ وہ بھی جنہیں عرفِ عام میں فقراء صحابہ کہا جاتا ہے جنہوں نے اسی "اختیاری فقر" کے نظام کو عملاً اختیار کیا جن کے سرخیل حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ تھے، اور وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنا عام چلن تو اسلام کے قانونی اور فقہی نظام کے مطابق رکھا جس سے ان کے پاس سرمایہ جمع بھی ہوا لیکن جب بھی جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کے لئے ضرورت پیش آئی انہوں نے اپنا مال حاضر کر دیا۔ دورِ صحابہؓ کے بعد اسی "اختیاری فقر" اور "رضاکارانہ سوشلزم" پر صوفیائے کرام کا عمل رہا۔ اور کون نہیں جانتا کہ دورِ صحابہؓ کے بعد اسلام کی تبلیغ و توسیع کا سارا معاملہ ان ہی حضرات کی مساعی کا مرہونِ منت ہے۔

قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایمانی اور روحانی سطح پر قرآن کی معاشی تعلیمات پر غور و فکر کے ضمن میں سورۃ الروم کی آیت ۳۹ بہت توجہ اور غور کے قابل ہے جس میں "ربا" (سود) کا ذکر بمقابلہ صدقات آیا ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝

"اور جو تم دیتے ہو سود پر کہ بڑھتا رہے لوگوں کے مال میں سو وہ نہیں بڑھتا اللہ کے یہاں، اور جو دیتے ہو زکوٰۃ سے اللہ کی رضامندی چاہتے ہوئے سو یہ وہی ہیں جو (اپنے مال کو) بڑھانے والے ہیں۔"

گویا دین کی روحانی تعلیم کے اعتبار سے "ربا" درحقیقت صدقہ اور خیرات کے بالمقابل ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کہیں ملازم ہے اور اس کو ماہانہ تنخواہ ملتی ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں لیکن کچھ اضافی سرمایہ اس کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اس فاضل سرمایہ کے دو مصرف ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کو کسی اور کے کاروبار میں لگا کر اس کی محنت کے بل بوتے پر اس سرمایہ کو بڑھائے (وہ خود تو محنت نہیں کرے گا کیونکہ وہ تو کسی اور جگہ ملازم ہے) تو اگرچہ یہ قانونی اور فقہی سطح پر جائز

اور درست ہے لیکن روحانی سطح پر یہ بھی "ربا" ہی قرار پائے گا کیونکہ اس روحانی اور اخلاقی سطح پر اس فاضل سرمائے کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اول تو اس کا مالک ہی محتاجوں اور غریبوں کو بنا دیا جائے یعنی ایسے لوگوں کو دے دیا جائے جو محروم ہیں یا جن کے پاس کاروبار کے لئے بنیادی سرمایہ موجود نہیں ہے یا بدرجۂ آخر "قرضِ حسن" کی صورت میں دے دیا جائے تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنا کاروبار چلا کر اسے واپس لوٹا دیں۔ اس سے آگے بڑھ کر فاضل سرمائے کو مزید آمدنی کا ذریعہ بنانا قانونی سطح پر تو جائز ہو سکتا ہے مگر روحانی اور اخلاقی سطح پر یہ چیز بھی ممنوعات کی فہرست میں داخل ہے۔

اسلام کا قانونی نظام معیشت

اخلاقی اور روحانی' یا قرآن و حدیث کی مخصوص اصطلاح میں ایمانی اور احسانی سطح پر اسلام کی معاشی تعلیمات کے ضمن میں دو امور تو اس سے قبل واضح کئے جا چکے ہیں' یعنی:

(ا) ایک یہ کہ یہ ایک مکمل معاشی نظریہ اور نظام ہے جس کے چار بنیادی اصول یہ ہیں کہ (i) اس پوری کائنات میں ملکیت کا کامل اور مطلق حق صرف اللہ کو حاصل ہے' انسان کو یہ حق نہ انفرادی سطح پر حاصل ہے نہ اجتماعی یا قومی سطح پر' بلکہ انسان کو صرف حقِ "امانت" حاصل ہے۔ (ii) اس دنیا میں کسی انسان کو جو کچھ ملتا ہے' خواہ اس کے لئے اس نے خود شدید محنت کی ہو اور مشقت جھیلی ہو' وہ اس کی "کمائی" نہیں بلکہ اللہ کا "فضل" ہے۔ (iii) اس فضلِ خداوندی میں سے انسان کا جائز حق صرف اس کی "ضروریات" کی حد تک ہے۔ (iv) اس سے زائد جو کچھ ہے وہ اس کا نہیں' بلکہ حقیقت میں فقراء اور مساکین یا سائلین اور محرومین کا حق ہے جو اس کے مال میں صرف اس امتحان کی غرض سے شامل کر دیا گیا ہے کہ دیکھیں کہ آیا وہ پوری امانتداری کے ساتھ اصل حقداروں کو ان کا حق پہنچا کر سبکدوش اور سرخرو ہو جاتا ہے [illegible] "قرضِ حسنہ" [illegible]

ترفع سے محروم کرلیتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ نبی اکرم ﷺ اور بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس "اختیاری فقر" کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ اور دورِ صحابہؓ کے بعد اولیاء اللہ اور صوفیائے کرامؒ نے بھی ع "مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے!" کے مصداق اسی سطح پر زندگیاں بسر کیں۔ البتہ یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ معاملہ خالص اختیاری (VOLUNTARY) ہے۔ اور اس میں قانونی یا ریاستی جبر کا ادنیٰ شائبہ بھی شامل ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کا اصل "حسن" ختم ہو جائے گا بلکہ اس کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔

ان دو امور پر ایک تیسری حقیقت کا اضافہ کرلیا جائے۔ اور وہ یہ کہ اگرچہ اس سطح پر زندگی بسر کرنا بلاشبہ ایک نہایت اقلِ قلیل اقلیت ہی کے لئے ممکن ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی معاشرے میں لاکھوں میں سے ایک شخص بھی اس سطح پر زندگی گزار رہا ہو تو ایسے لوگ اس معاشرے میں اخلاقی اور روحانی اقدار کے زندہ اور برقرار رکھنے کا مؤثر ذریعہ بن جاتے ہیں اور انہیں گویا اس معاشرے میں ایک قسم کے اخلاقی و روحانی "PACE-MAKERS" کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ عوام الناس میں ہردلعزیزی اور مقبولیت انہیں حاصل ہوتی ہے نہ کہ اصحابِ دولت اور اربابِ اقتدار کو۔ اور حقیقی معنی میں تعظیم اور تکریم ان کی ہوتی ہے نہ کہ صاحبانِ تخت و تاج اور اصحابِ دولت و ثروت کی۔ بلکہ بسا اوقات بڑے بڑے شہنشاہ اور کج کلاہ ان خرقہ پوش اور بوریانشین فقیروں کے در پر حاضری کو اپنے لئے موجبِ سعادت سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ بالکل صحیح فرمایا علامہ اقبال نے کہ۔

یقیں پیدا کر اے ناداں، یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

چنانچہ نہایت مشہور واقعہ ہے کہ حج کے موقع پر لوگوں کا رجوعِ عام اور خلقت کا اژدہام ایک صاحب علم و فضل کے گرد دیکھ کر ہارون الرشید جیسے عظیم حکمران نے

ی محبوب بیگم ملکہ زبیدہ نے کہاتھا: "اصل حکومت تو ان کی ہے' نہ کہ تمہاری!"
پھر چند سو سال بعد کا واقعہ ہے کہ برِعظیم ہند کے پایۂ تخت دہلی میں طویل عرصے
دو متوازی حکومتیں قائم رہیں' ایک سیاسی اور عسکری حکومت' اور دوسری
ں اور روحانی حکومت' اور مؤخر الذکر حکومت کے ایک "تاجدار" سلطان الہند
ت نظام الدین اولیاءؒ کے "عہدِ حکومت" کے دوران چھ یا سات بادشاہ سیاسی اور
ی حکومت کے تخت پر بیٹھے' لیکن نہ صرف یہ کہ حضرت نظام الدینؒ نے کبھی کسی
ہ کے دربار میں حاضری نہیں دی' بلکہ بعض کی شدید خواہش کے باوجود انہیں
یہاں حاضر ہونے کی اجازت بھی مرحمت نہیں فرمائی! — اور یہ تو بالکل ماضی
، کا واقعہ ہے کہ گزشتہ صدی کے دوران سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے بزرگ
ت شاہ غلام علیؒ نے ریاست ٹونک کے والی نواب امیر خان کی جانب سے خانقاہ کے
ف کے لئے ایک جاگیر کا وثیقہ اس کی پشت پر یہ شعر لکھ کر واپس کر دیا تھا کہ۔

ما آبروئے فقر و قناعت نہ باختیم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

'ہم یہ جاگیر قبول کر کے اپنے فقر اور درویشی کی عزت و آبرو کا سودا کرنے کو تیار
ہیں۔ امیر خان سے کہہ دیا جائے کہ ہماری روزی ہمارے پروردگار کی جانب سے
ہے!"

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ آج ہم قومی سطح پر اخلاق کے جس خوفناک زوال' اور
انیت کے جس شدید فقدان سے دوچار ہیں اس کا ایک اہم سبب یہی ہے کہ آج
ں کیا کروڑوں میں بھی کوئی ایک انسان اس سطح پر زندگی گزارتا نظر نہیں آتا۔
یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عزت و احترام کی بنیاد صرف دولت و ثروت اور
ت و اقتدار بن کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ لوگوں کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولت
ا ور ناجائز ذرائع سے کمائی گئی ہے' اور یہ اقتدار بھی "دھن' دھونس' اور
...

اور اب آیئے قانونی اور فقہی سطح پر اسلام کی معاشی تعلیمات کی جانب! جیسا
اس سے قبل عرض کیا جاچکا ہے' قانونی سطح پر اسلام کا معاشی نظام ایک محدود او
(CONTROLLED) اور اندرونی طور پر منضبط TERNALLY
MANAGED) سرمایہ دارانہ معیشت (CAPITALISM) کی ح
رکھتا ہے۔

تو آیئے کہ سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ یہ "کیپیٹلزم" سے کیوں اور کیسے
ہے؟ یہ بنیادی طور پر کیپیٹلزم سے اس لئے مشابہ ہے کہ اس میں وہ چاروں بنی
اوصاف موجود ہیں جو مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں بھی موجود ہیں۔ او
حقیقت ان ہی کی بنیاد پر اسے کمیونزم پر وہ فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی ہے جس کا جشن
پوری مغربی دنیا اور خصوصاً اس کے امام اور قائد امریکہ میں جوش و خروش کے س
منایا جارہا ہے۔ اس لئے کہ ان اوصاف کے ذریعے ایک جانب انسان کی بعض ج
جبلتوں کو بھرپور تسکین حاصل ہو جاتی ہے تو دوسری جانب ایک مسلسل مقابلے
مسابقت کا بازار گرم رہتا ہے' جس کے باعث معاشی میدان میں تیز رفتاری اور حر
پیدا ہو جاتی ہے اور ہر نوع کی پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ چار بنیادی اوص
حسب ذیل ہیں:

(۱) جملہ عملی اور قانونی تقاضوں کے اعتبار سے ذاتی اور نجی ملک
(PRIVATE OWNERSHIP) کا اثبات' جو صرف اشیائے صَرف
استعمال کی چیزوں ہی پر نہیں' جملہ ذرائع پیداوار' جیسے کھیت' دکان اور کارخانہ' پر
حاوی ہے۔

(۲) ذاتی منفعت اور شخصی مفاد کے باعث اضافی محنت و مشقت' اور زیادہ
مار کر کام کرنے کا جذبہ' یعنی ذاتی حوصلہ من
(PERSONAL INCENTIVE) جس سے پیداوار میں اضافہ ہوتا
پھر اس پر مستزاد کھلا مقابلہ اور آزادانہ مسابق

(OPEN COMPETITION) جس سے نفع کی شرح خود بخود کم ہو جاتی ہے اور صارفین کو فائدہ پہنچتا ہے۔

(۳) اشیاء کی قیمتوں کے تعین میں کسی مصنوعی کنٹرول کی بجائے طلب (DEMAND) اور رسد (SUPPLY) کے عوامل کا آزادانہ بروئے کار آنا' یعنی "منڈی کی معیشت" (MARKET ECONOMY) کا اصول!

(۴) اسی طرح آجری اور مستاجری یعنی کارکنوں کی مزدوری اور ملازمت کے معاملات میں بھی مصنوعی پابندیوں اور قدغنوں سے اجتناب۔ اور ملازم رکھنے والوں (EMPLOYERS) کے لئے "رکھنے یا فارغ کر دینے" کی کھلی آزادی' یعنی "HIRE AND FIRE" کا آزادانہ اختیار۔ (بشرطیکہ اس کے ساتھ "بے روزگار" لوگوں کے لئے ریاستی کفالت کی ضمانت موجود ہو!)

جیسے کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے' ان چاروں چیزوں کا نہایت گہرا تعلق انسان کی حیوانی جبلتوں کے ساتھ ہے۔ اور یہ انسانی سرشت کے ساتھ کامل مطابقت رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان ہی کو نظرانداز کر کے کمیونزم نے گویا اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودی ہے۔ اور ان ہی کے باعث مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو وہ فتح حاصل ہوئی ہے جس پر وہ بغلیں بجا رہا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض دوسرے اعتبارات سے مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت نہایت ظالمانہ اور حد درجہ استحصالی مزاج کی حامل ہے۔ چنانچہ کمیونزم کا ظہور بذاتِ خود سرمایہ دارانہ نظام کے اسی ظلم اور استحصال کے خلاف "ردِّ عمل" کی حیثیت رکھتا تھا جو ؎ "انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات!" کے مصداق ردِّ عمل کی طبعی و فطری انتہاپسندی کی بنا پر شکست کھا گیا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی اس انتہاپسندی کے باعث انسان کی حیوانی جبلتوں کو نظرانداز کر دیا۔

بہرحال اسلام کے قانونی نظام معیشت میں یہ چاروں اصول بہ تمام و کمال موجود ہیں جن کی بناء پر اسے مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت کے ساتھ ایک گونہ مماثلت حاصل ہے!

اب ہماری اصل گفتگو تو شریعتِ اسلامی کے ان احکام اور اقدامات کے بارے میں ہوگی جن کی بنا پر ہم اسلام کے قانونی نظام معیشت کو "محدود اور مقید" سرمایہ دارانہ معیشت قرار دیتے ہیں اور جن کا اصل مصرف اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ معیشت کے میدان میں "سرمایہ کاری" کی فضا تو بھرپور طور پر برقرار رہے، لیکن "سرمایہ" استحصال کا آلہ نہ بن جائے، اور "سرمایہ داری" آکاش بیل کی صورت اختیار کر کے پوری معیشت کا خون نہ چوس لے۔ لیکن مناسب ہے کہ پہلے اس دوسرے پہلو پر غور کر لیا جائے جو بنیادی طور پر تو اسلام کے قانونی نظام معیشت اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں قدر مشترک کے طور پر موجود ہے، تاہم متعدد اعتبارات سے ان کے مابین "چہ نسبت خاک را باعالمِ پاک" والا معاملہ ہے۔ اور وہ ہے سرمایہ دارانہ نظام کا داخلی انضباط!

اس کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ جہاں بھی شخصی ملکیت، ذاتی حوصلہ مندی، اور آزادانہ مسابقت کا معاملہ ہو گا، لوگوں کے مابین ذہانت و صلاحیت اور محنت و مشقت کے طبعی فرق و تفاوت کے باعث معاشی اونچ نیچ پیدا ہو کر رہے گی، جسے ایک حد کے اندر اندر رکھنا معاشرے کی مجموعی صحت اور زندگی کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ خلیج زیادہ بڑھ جائے تو معاشرے میں "مترفین" یعنی "HAVES" اور "محرومین" یعنی "HAVE NOTS" کے طبقات پیدا ہو جائیں گے، جو طبقاتی کشمکش کا باعث بنیں گے اور اس سے معاشرہ شکست و ریخت کا شکار ہو جائے گا۔ چنانچہ اسی ضرورت کے تحت مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے کہیں "بے روزگاری الاؤنس" کے نام سے (جیسے برطانیہ میں ہے) اور کہیں "ویلفیئر" کے نام سے (جیسے امریکہ اور بعض یورپی ممالک میں ہے) سرمایہ دارانہ نظام کے "اندرونی انضباط" کی کوشش کی ہے، جس کی سطح کے اعتبار سے اس اصول کے تحت کہ "شیطان کو بھی اس کا جائز حق ضرور دیا جائے" یہ تسلیم کیا جانا چاہئے کہ بعض یورپی ممالک، جیسے سویڈن، ناروے اور ڈنمارک، ایک بار تو ناقابل یقین بلندی کی حدوں تک پہنچ گئے تھے، تاہم

چونکہ یہ معاملہ غیر فطری اور غیر طبعی تھا لہٰذا اب کسی قدر نیچے اترنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

شریعتِ اسلامی نے یہی ضرورت زکوٰۃ کے نظام کے ذریعے پوری کی ہے' جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا نہایت حکیمانہ قول ہے کہ: "تُؤْخَذُ مِن اَغنِیَائِھِم فَتُرَدُّ اِلٰی فُقَرَائِھِم" (صحیح بخاری' عن ابن عباسؓ) یعنی "وہ مسلمانوں کے مالدار لوگوں سے وصول کی جاتی ہے اور غرباء میں تقسیم کر دی جاتی ہے!" اور اس سے نہ صرف یہ کہ آزاد معیشت کے "داخلی انضباط" کا وہ مقصد بہ تمام و کمال حاصل ہو جاتا ہے جس کی وضاحت اوپر کی گئی ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست فی الحقیقت ایک ویلفیئر اسٹیٹ کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو "کفالتِ عامہ" کی ذمہ داری جس حد تک قبول کرتی ہے اس کا کسی قدر اندازہ حضرت عمرؓ کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ "اگر دجلہ و فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے روز عمرؓ ذمہ دار ہو گا!"

زکوٰۃ کے نظام کی دوسری خصوصیت جو اسے مغرب کے ویلفیئر نظام سے مشابہ کرتی ہے' یہ کہ اصولی اعتبار سے زکوٰۃ کی ادائیگی دوسرے صدقاتِ نافلہ کے برعکس افراد کی صوابدید پر نہیں چھوڑی گئی بلکہ یہ ایک خالص ریاستی معاملہ ہے۔ لہٰذا یہ صاحب نصاب لوگوں سے جبراً اور پورے حساب کتاب کے ساتھ وصول کی جاتی ہے۔ تاہم یہ معاملہ مصلحتِ عامہ کے پیش نظر صرف "اموالِ ظاہرہ" یعنی اموال تجارت وغیرہ کی حد تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اور "اموالِ باطنہ" جیسے وہ زیورات یا نقدی وغیرہ جو گھروں میں رکھی گئی ہو ان کی زکوٰۃ کی ادائیگی کو لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ چاہیں تو حکومت کے حوالے کر دیں اور چاہیں تو خود ادا کر دیں۔ (چنانچہ ایسے ہی اموال کی زکوٰۃ تھی جس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ دور خلافتِ راشدہ میں لوگ اسے لے کر پھرا کرتے تھے اور اس کا قبول کرنے والا نہیں ملتا تھا!)

بہرحال ان دو جزوی اور سطحی مشابہتوں کے علاوہ شریعت اسلامی کا نظامِ زکوٰۃ

مغرب کے ویلفیئر کے نظام سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے، جس کے چند پہلو حسب ذیل ہیں:

(i) زکوٰۃ عبادت ہے ٹیکس نہیں، لہٰذا جس شخص کے دل میں ذرا بھی ایمان ہو گا وہ زکوٰۃ پوری پوری ادا کرے گا، جبکہ ٹیکس سے بچنے کی کوشش ایک قاعدہ کلیہ اور متفق علیہ معاملہ ہے۔ چنانچہ بالکل نماز کی طرح جس کی فرضیت قرآن کی جانب سے ہوئی اور اس کے اوقات و رکعات کا نظام نبی اکرم ﷺ نے عطا فرمایا، زکوٰۃ کی بھی فرضیت قرآن کے ذریعے ہوئی، اور اس کے نصاب اور شرح کا نظام آنحضور ﷺ نے متعین فرمایا۔ اور جو لوگ اس نظام میں ردوبدل کے جواز کے قائل ہیں وہ اپنی ناسمجھی میں زکوٰۃ کو "عبادت" کی بجائے "ٹیکس" کی صورت دے کر اس کی اصل روح کو ختم کر دینے کے درپے ہیں!

(ii) نظامِ زکوٰۃ کے اعتبار سے "اغنیاء" اور "فقراء" کا تعین عرفِ عام پر نہیں چھوڑ دیا گیا کہ مالدار وہی سمجھا جائے جو لکھ پتی یا کروڑ پتی ہو، اور فقیر وہی قرار دیا جائے جسے فاقے آ رہے ہوں یا جو بھیک مانگتا پھر رہا ہو، بلکہ "نصاب" کی ایک لائن کھینچ دی گئی ہے کہ جو شخص بھی اس سے اوپر ہے وہ "غنی" یعنی زکوٰۃ کا ادا کنندہ (DONOR) ہے، اور جو اس سے نیچے ہے وہ زکوٰۃ کا وصول کنندہ (RECIPIENT) ہے۔ چنانچہ اس اصول کی بنیاد پر ایک مکمل سوشل انشورنس کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے جس سے معاشرے میں HAVES اور HAVE-NOTS کے مابین ایک حسین توازن قائم ہو جائے!

(iii) مغربی ممالک میں سوشل انشورنس کا اصل نظام لوگوں کی اپنی ادائیگی یعنی CONTRIBUTION کی بنیاد پر قائم ہے۔ ورنہ خالص اور اصل ویلفیئر کی سطح تو بہت ہی کم یعنی صرف SUBSISTENCE LEVEL پر ہے۔ جبکہ زکوٰۃ کے نظام میں اس کے حق داروں اور وصول کنندگان کی جانب سے کسی CONTRIBUTION کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ہر وہ شخص اس کا حق دار

ہے جس کی اپنی مالی حیثیت کسی بھی سبب سے "نصاب" سے کم تر ہو!

(iv) تاہم شریعت اسلامی نے زکوٰۃ کے نظام میں ایک حسین توازن ایسے پیدا کر دیا ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کو "اَوْسَاخُ النَّاس" یعنی لوگوں کا میل کچیل قرار دے کر نہ صرف لوگوں کو ترغیب دی ہے' بلکہ ان کی غیرت کو جھنجوڑا ہے کہ اپنے ہاتھوں کی محنت سے معاش حاصل کر کے خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو' اور لوگوں کے میل کچیل سے اپنے پیٹ مت بھرو!

چنانچہ اسی معاملے میں مزید زور پیدا کرنے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لئے زکوٰۃ اور صدقات کو حرام قرار دے دیا۔ تاہم عام لوگوں کے اعتبار سے یہ بھی صرف ایک اخلاقی تعلیم ہے' قانون نہیں! البتہ اس سے اس اندیشے کا سدِّباب ہو جاتا ہے جس کے باعث سویڈن جیسے ملکوں کو ویلفیئر کی سطح کو نیچے لانا پڑ رہا ہے۔ یعنی جب بغیر محنت کئے بھی گزر بسر ہو جائے تو۔

"زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہگزر یاد آیا!"

کے مصداق خواہ مخواہ زیادہ محنت اور مشقت کیوں برداشت کی جائے! کیوں نہ ویلفیئر کو شیرِ مادر کی طرح ہضم کیا جائے!

قصہ مختصر' زکات کا نظام اسلام کے قانونی نظام معیشت کا اہم ستون ہے جس سے اس کی "آزاد معیشت" سے پیدا شدہ معاشی ناہمواری کا "داخلی انتظام و انضباط" بطریق احسن ہو جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ صدیوں سے تو مسلمانوں نے اسے ذاتی خیرات کا معاملہ بنا رکھا تھا' حال ہی میں جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اسے بڑی آن بان اور شان کے ساتھ نافذ کیا تو اس طور سے کہ بس ایک منظم بھکاری پن (ORGANIZED BEGGARY) کی صورت پیدا ہو گئی اور "بدنام کنندگانِ نکو نامے چندا" کے مصداق زکوٰۃ کے نظام ہی کو بدنام کر کے رکھ دیا!

اب آئندہ صفحات میں شریعتِ اسلامی کے ان احکام اور اقدامات پر گفتگو ہو گی

جن کے ذریعے آزاد معیشت کے اسلامی نظام میں "سرمایہ کاری" کی فضا کو بھرپور طور پر برقرار رکھتے ہوئے "سرمایہ داری" کی لعنت کو وجود میں آنے سے روکا گیا ہے، جن میں سرفہرست سود کی حرمت ہے!

سود اور جوئے کی حرمت کی حکمت

الحمدللہ کہ اس سے قبل حسب ذیل امور کی کسی قدر وضاحت ہو چکی ہے کہ:

(۱) ایمان اور احسان کی سطح پر اسلام کی تعلیمات کا نقطۂ عروج "اختیاری فقر" ہے جو گویا روحانی سوشلزم کی بلند ترین صورت ہے۔

(۲) عمومی اور قانونی سطح پر اسلام کا معاشی نظام مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام سے اس بنا پر بھی مشابہ ہے کہ اس میں نجی ملکیت، انفرادی حوصلہ مندی، آزادانہ مسابقت، منڈی کی معیشت، اور ملازم رکھنے اور فارغ کر دینے کے اختیار کے وہ جملہ اصول موجود ہیں جن کو ردّ یا نظرانداز کرنے کی بنا پر کمیونزم کی موت واقع ہوئی اور اس کے مقابلے میں مغرب کے اس سرمایہ دارانہ نظام کو فتح حاصل ہوئی جس نے ان اصولوں کو اختیار کیا! اگرچہ وہ اپنی جگہ ایک نہایت ظالمانہ اور استحصالی نظام ہے۔

(۳) مزید برآں، یہ مشابہت اس پہلو سے بھی ہے کہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام نے اندرونی اور داخلی انضباط کی جس ضرورت کو بے روزگاری الاؤنس یا ویلفیئر یا اجتماعی انشورنس کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی اسے اسلام نے اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع اور زیادہ متوازن اور قابل عمل صورت میں زکوٰۃ کے نظام کے ذریعے باحسن وجوہ پورا کر دیا۔

اب آیئے کہ ہدایتِ خداوندی اور آسمانی شریعتوں یعنی شریعتِ موسویؑ اور شریعتِ محمدیؐ کے ان احکام پر غور کریں جن کے ذریعے خالص عقل انسانی کے اعتبار سے یہ ناممکن الحصول مقصد حاصل ہو جاتا ہے کہ "سرمایہ کاری" کی فضا کو بھرپور طور پر برقرار رکھنے کے باوجود "سرمایہ داری" کی لعنت پیدا نہ ہونے پائے۔ یعنی دولت کا

ارتکاز ایک محدود حلقے میں نہ ہو بلکہ وہ پورے معاشرے میں توازن اور ہمواری کے ساتھ گردش کرے۔

قرآن حکیم نے اس بنیادی مقصد کو سورۃ الحشر کی ساتویں آیت کے ان مختصر ترین الفاظ میں بیان کیا ہے کہ : "کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ" یعنی "تا کہ وہ (سرمایہ) تمہارے امیر لوگوں ہی کے مابین گردش میں نہ رہے!"۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے خالص عقلِ انسانی کی رسائی کی آخری منزل یا "معراج" یقیناً مارکس کا فلسفہ اور کمیونزم کا نظام ہی تھا لیکن وہ حقائق و واقعات کی تجربہ گاہ میں ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ ۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے' منزل نہیں ہے!

عقل کی کوتاہی اور درماندگی کو تسلیم کر لیا جائے اور ہدایتِ آسمانی کی جانب رجوع کیا جائے۔

آسمانی شریعتوں نے اس مقصدِ عظیم کو چند مالی معاملات کو حرام اور ممنوع قرار دے کر حاصل کیا ہے جن میں سے MASTER-STROKE کی حیثیت سود اور جوئے کی حرمت کو حاصل ہے۔ چنانچہ ان دونوں ہی کو قرآن حکیم نے شیطانِ لعین کی جانب منسوب کیا ہے۔ جیسے کہ سود کے بارے میں سورۃ البقرہ کی آیت ۲۷۵ میں فرمایا: "اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ" یعنی "جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے روز) نہیں اٹھیں گے مگر ان لوگوں کے مانند جنہیں شیطان نے اپنی چھوت کے ذریعے پاگل بنا دیا ہو!" اور سورۃ المائدہ کی آیات ۹۰ اور ۹۱ میں شراب وغیرہ کے ساتھ ساتھ جوئے کو بھی ان "ناپاک شیطانی کاموں" (رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ) میں شمار کیا گیا ہے جن کے ذریعے شیطان انسانوں میں "عداوت اور بغض" پیدا کرنا چاہتا ہے!

تو اگرچہ ایک بندۂ مومن کے لئے تو حِلّت اور حرمت کے معاملے میں صرف اللہ اور رسولؐ کا حکم ہی آخری، قطعی اور حتمی بات ہے جس پر مستزاد کسی عقلی اور منطقی دلیل کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے جب کچھ لوگوں نے یہ اعتراض وارد کیا کہ: "اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا" یعنی "بیع بھی تو ربا کے مثل ہی ہے" (البقرہ: ۲۷۵) تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بیع اور ربا کے مابین فرق و تفاوت کو کسی عقلی اور منطقی دلیل کے ذریعے واضح نہیں فرمایا بلکہ زجر اور ملامت کے انداز میں فرمایا: "وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" یعنی "حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام!" (اگرچہ اس کا ایک لطیف سبب یہ بھی ہے کہ سود کے گھناؤنے پن کو حرمتِ ربا کے آخری حکم کے نزول سے لگ بھگ پندرہ سال قبل سورۃ الروم کی ایک آیت میں "عاقلاں را اشارہ کافی است!" کے مطابق لطیف ترین اور مختصر ترین انداز میں واضح کر دیا گیا تھا، جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا!) تاہم چونکہ عہدِ حاضر میں عام طور پر لوگ عقلیت پسند سے بھی آگے بڑھ کر "عقلیت پرست" بن گئے ہیں، لہٰذا سود اور جوئے کی حرمت کی حکمت و علت کی کسی قدر عقلی وضاحت مناسب ہے۔

اس سلسلے میں یہ خالص فلسفیانہ بحث کہ اصل عاملِ پیداوار محنت ہے یا سرمایہ، جہاں ایک روزنامے کے کالموں کی حدود سے متجاوز ہے، وہاں انڈا پہلے تھا یا مرغی کے سوال کے مانند لایعنی اور لاحاصل بھی ہے۔ اسی طرح کسی منفعت بخش پیداواری عمل میں کس قدر حصہ سرمائے کا ہے اور کتنا محنت کا، اس کا یقینی اور حتمی تجزیہ بھی قطعاً ناممکن ہے۔ اصل مسئلے کے فہم کے لئے اس سادہ ترین بنیادی حقیقت کو سامنے رکھ لینا کافی ہے کہ ہر قابلِ لحاظ پیداواری عمل میں دو عوامل تو اساسی اور بنیادی طور پر لازماً شامل ہوتے ہیں، یعنی محنت اور سرمایہ اور ایک تیسرا عامل بھی خواہ ثانوی درجہ ہی میں سہی بہرحال کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود ہوتا ہے، یعنی "موقع" یا چانس۔ اور مالی معاملات میں شریعتِ الٰہی میں حلت اور حرمت کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ زور بھی انسانی محنت پر دیا گیا ہے اور زیادہ سے زیادہ تحفظ بھی اسی کو فراہم کیا

ا ہے' جبکہ سرمایہ کو بروئے کار آنے کی اجازت تو دی گئی ہے لیکن حضرت سلیمانؑ
، "مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ" جنّات کے مانند کسی قدر پابندِ سلاسل کر کے تاکہ یہ
اداری عمل میں مناسب حصہ تو ادا کرے لیکن نہ محنت کا استحصال کر سکے' نہ محنت
، بغیر محض موقع یا چانس کے رِسک کے ذریعے افزائش و افزودگی حاصل کرنے کی
شش کر سکے۔ اس لئے کہ انہی دو ذرائع کی بنا پر سرمایہ پوری معیشت پر آکاش بیل
طرح مسلط ہو جاتا ہے۔

ان میں سے جہاں تک مؤخر الذکر معاملے کا تعلق ہے اس کی حکمت و علّت تو اظہر
الشمس ہے۔ یعنی سرمایہ جب بغیر محنت کے محض موقع اور چانس کے رِسک یعنی
او" کے ذریعے کمائی کی کوشش کرتا ہے تو اس سے زیریں اور انفرادی سطح پر تو
ت و مشقت سے فرار اور حقائق سے گریز کا وہ رجحان پیدا ہوتا ہے جو۔

"مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے"

مصداق نشہ آور چیزوں کے استعمال کی اصل غرض و غایت ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ
ان حکیم نے جوئے کو سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱۹ اور سورۃ المائدہ کی آیات ۹۰۔۹۱
"خَمر" یعنی شراب کے ساتھ بریکٹ کیا ہے!) اور معیشت کی اجتماعی اور بالائی سطح پر
ائے صَرف کی قیمتوں میں بے جواز اضافے' اور ان میں اچانک کمی بیشی کے ذریعے
ی کے عدم استحکام کے مہلک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے
جانب جوئے' سٹے اور لاٹری کے قبیل کی جملہ چیزوں کو حرام مطلق قرار دیا' اور
سری جانب مستقبل کے سودوں کے ضمن میں سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ چنانچہ بیع
راء یعنی خرید و فروخت کی بہترین اور پسندیدہ صورت تو یہ قرار دی کہ صرف حاضر
موجود مال کا سودا ہو تاکہ مبادلہ دست بدست ہو جائے' لیکن اگر کسی سماجی
ورت کے تحت کوئی مستقبل کا سودا کیا جائے تو کُل طے شدہ قیمت کا کوئی حصہ یعنی
یا بیس فی صد نہیں بلکہ کُل کی کُل قیمت فوری طور پر ادا کر دی جائے تاکہ سرمایہ کو

اپنی اصل قدر اور مالیت سے زیادہ کا کاروبار کرنے یعنی OVER-TRADING
موقع نہ مل سکے۔ (اسے فقہ اسلامی میں "بیع سَلَم" کہتے ہیں!)

البتہ سود کی حرمت کا معاملہ ذرا زیادہ قابلِ غور ہے۔ اس کی حکمت و علّت کو سو
الروم کی آیت ۳۹ میں حد درجہ اختصار اور غایت درجہ فصاحت و بلاغت کے سا
بیان کر دیا گیا ہے، یعنی یہ کہ اصل حقیقت کے اعتبار سے سود یا رِبا یہ ہے کہ کسی شخص
سرمایہ کسی دوسرے شخص کے مال میں نشوونما پائے اور افزائش و افزودگی حا
کرے۔ ("لِیَرْبُوَ فِیۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ!") اور یقیناً یہی سبب ہے کہ نبی اک
ﷺ نے سود کو "زنا" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لئے کہ زنا کی صورت میں بھی
مرد کا نطفہ اپنی منکوحہ بیوی کی بجائے ناجائز طور پر کسی دوسری عورت کے رحم
پرورش پاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک شریف انسان زنا کا تو لفظ بھی زبان
لانے سے ہچکچاتا ہے، جب کہ سود کو عام طور پر ماں کے دودھ کے مانند مباح بنا لیا
ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ زنا کے برے اثرات زیادہ تر انفرادی یا معاشرے
زیریں سطح تک محدود رہتے ہیں جب کہ سود کے ذریعے "سرمایہ داری" کی لع
پورے معاشرے پر آکاش بیل کی طرح چھا جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحض
ﷺ نے سود کو زنا سے سینکڑوں گنا زیادہ قبیح قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہر
رضی اللہ عنہ سے مروی سنن ابن ماجہ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَلرِّبَا سَبعونَ جُزءً ا اَیسَرُ ھا اَن یَنکِحَ الرَّجلُ اُمَّہٗ

"ربا کے گناہ کے ستر حصے ہیں۔ جن میں سے سب سے چھوٹا اور حقیر حصہ اس
کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے!"

اور اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں سود پر اپنی اور اپنے رسول ؐ کی جانب سے اعلا
جنگ کی وعید بایں الفاظ سنائی ہے:

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ (البقرہ:۲۷۹)

"پھر اگر تم یہ نہ کرو (یعنی سود سے باز نہ آؤ) تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے

جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ!"

اس معاملے کو سادہ ترین انداز میں یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے
تی سرمائے سے کاروبار کر رہا ہو اور اس میں محنت بھی یا صِرف اس کی اپنی ہو یا
سرے انسانوں سے معیّن روزانہ اجرت یا ماہانہ تنخواہ کے عوض' تو اس معاملے میں
کوئی معاشی یا مالیاتی پیچیدگی ہے نہ شرعی قدغن۔ اسی طرح اگر بہت سے لوگ اپنا
رمایہ بھی جمع کر لیں اور سب مل جل کر کام بھی کریں اور نفع و نقصان میں شریک
جائیں تو یہ "شراکت" بھی ہر اعتبار سے حلال و طیب ہے اور اس کی اساس پر بڑے
، بڑے پیمانے پر تجارت اور صنعت کا کام کیا جا سکتا ہے۔ اصل مسئلہ وہاں پیدا ہوتا
، جہاں محنت کسی اور کی ہو اور سرمایہ کسی اور کا۔ چنانچہ اس معاملے میں اکبر الٰہ
ادی کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود' لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
شریعت' عقل' منطق سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

ں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اپنی ابتدائی صورت میں تو بڑی "معصوم" نظر آتی
، لیکن ان کے نتیجے میں معاشرے میں طبقاتی تقسیم پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ظلم' جبر اور
صال کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔

پیچیدگیوں کے ضمن میں شریعتِ اسلامی کا اصل الاصول تو یہ ہے کہ اس کے نزدیک
مایہ کو AS SUCH یعنی محض سرمائے کی حیثیت سے "کماؤ" یعنی
EARNING AGEN تسلیم کیا جانا "ناپسند" ہے۔ چنانچہ اس کی ایک انتہائی
رت کو تو اس نے سود یا ربا قرار دے کر صرف حرامِ مطلق ہی نہیں بلکہ اتنا حرام قرار
ہے کہ سوائے شرکِ جلی کے کوئی اور عمل اتنا حرام نہیں ہے۔ اور ایک صورت کو
ں ضرورت کے پیشِ نظر جائز قرار دیا ہے تو اس میں سرمائے کے لئے رِسک کو اتنا
مادیا ہے کہ محض منفعت کا طالب سرمایہ کبھی اس کی جانب رخ ہی نہیں کرے گا۔
چنانچہ سود یا ربا تو یہ ہے کہ سرمایہ محض سرمائے کی حیثیت میں منفعت کا طالب ہو'

نقصان کا رِسک بالکل قبول نہ کرے 'اور منفعت بھی ایک معین شرح پر طلب
یہ معاملہ خواہ نجی ضرورتوں کے سلسلے میں 'یعنی USURY کی صورت میں
کسی تجارتی یا صنعتی معاملے میں 'یعنی MMERCIAL INTEREST
صورت میں ہو 'یکساں طور پر حرامِ مطلق 'اپنی شناعت اور خباثت میں ماں ۔
بدکاری سے سینکڑوں گنا زیادہ 'اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سا
کے مترادف ہے! اس لئے کہ اس صورت میں سرمایہ دار کا سرمایہ دوسرے لو
مال میں شامل ہو کر 'ان کی محنت اور مشقت کے طفیل افزائش اور افزودگی حا
ہے اور اس طرح گویا پیسہ بغیر محنت اور نقصان کے رِسک کے محض پیسے کی حیثی
پیسے کو کھینچتا چلا جاتا ہے 'جس سے ارتکازِ زر کی صورت پیدا ہوتی ہے اور دو
سرمایہ چند ہاتھوں میں جمع ہوتا چلا جاتا ہے 'اور اس کے نتیجے میں اجتماعی
معاشرے میں محبت اور اخوت کی بجائے نفرت و عداوت کا بازار گرم ہو جاتا
تعاضد و تعاون کی بجائے کشاکش اور تصادم کی صورت پیدا ہو جاتی ہے 'اور
اعتبار سے سود خور انسان درندوں اور خون چوسنے والی چمگادڑوں کی صورت
کر لیتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال۔

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!
کس نداند لذّتِ قرضِ حسن
از ربا جاں تیرہ' دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

یعنی سود جیسی ام الخبائث کے بطن سے آخر فتنوں کے سوا اور کیا چیز جنم لے
افسوس کہ لوگوں کو قرضِ حسنہ (یعنی ایسا قرض جس میں صرف اصل زر ہی کی
وعدہ ہو 'بغیر کسی اضافے کے!) کی لذت کا احساس و ادراک حاصل نہیں ہے۔
ہے کہ سود سے انسان کا باطن تاریک اور دل اینٹ پتھر کے مانند سخت ہو جاتا
انسان درندوں کی طرح کے پنجوں اور دانتوں کے بغیر فی الواقع درندہ بن جاتا۔

سرمایہ کے محض سرمائے کی حیثیت سے نفع کے مستحق ہونے کی جس صورت کو شریعتِ اسلامی نے بدرجۂ آخر اور کراہت کے ساتھ (اس کی وضاحت بعد میں کسی موقع پر آئے گی) جائز قرار دیا ہے وہ "مضاربت" کا معاملہ ہے، جس میں سرمایہ کسی اور (رب المال) کا ہوتا ہے اور محنت کوئی اور (مضارب عامل) کرتا ہے۔ اس صورت میں اگر نفع ہو تو وہ ان دونوں کے مابین پہلے سے طے شدہ شرح کے مطابق تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس طرح گویا اس معاملے میں سرمایہ کو محض سرمائے کی حیثیت سے "کماؤ" (EARNING AGENT) تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ MASTER STROKE بھی صرف حکمتِ الٰہی اور حکمتِ نبوی ﷺ ہی کے لئے ممکن تھا کہ اس "شر" کی تلافی اس طرح کر دی گئی کہ اگر نقصان ہو جائے تو وہ سارے کا سارا رب المال یعنی سرمایہ دار برداشت کرے گا، مضارب عامل پر کسی قسم کے نقصان کی کوئی ذمہ داری یا تاوان عائد نہیں کیا جائے گا! لہٰذا سود خورانہ ذہنیت کے حامل شائیلاک اس صورت کی جانب کبھی رجوع ہی نہیں کر سکتے بلکہ یہ صورت صرف ایسے لوگ ہی اختیار کر سکتے ہیں جن میں ذاتی جلبِ منفعت کے ساتھ ساتھ اور کم از کم اس کے مساوی اور برابر اپنے کسی بھائی کی مدد کا جذبہ بھی موجود ہو!

مضاربت کے اصول پر کوئی شخص اپنا سرمایہ کسی دوسرے شخص (عامل) کے حوالے، ظاہر ہے کہ، صرف دو صورتوں میں کر سکتا ہے : ایک یہ کہ وہ خود کام کرنے سے معذور ہو، اور دوسرے یہ کہ وہ خود کسی اور کام جیسے مثلاً ملازمت وغیرہ میں مشغول و مصروف ہو اور اس کے پاس "بچت" کی صورت میں کچھ فاضل سرمایہ جمع ہو جائے۔ پہلی صورت میں ایک غیور اور خوددار شخص لازماً یہ چاہے گا کہ بجائے اس کے کہ جو تھوڑی بہت پونجی اس کے پاس ہو اسے کھا کر ختم کر دے اور اس کے بعد "یقینی" طور پر زکوٰۃ و صدقات کے مستحق لوگوں میں شامل ہو جائے کیوں نہ اپنی پونجی کو مضاربت کے اصول پر کسی قابلِ اعتماد شخص یا ادارے کے حوالے کر دے تاکہ اللہ کو منظور ہو تو اس کی گذر بسر زکوٰۃ و صدقات کے بغیر ہوتی رہے! رہی دوسری صورت

تو یہ فاضل سرمایہ ہی اصل میں اسلامی معاشیات کی وہ "قدرِ زائد" ہے جس کے
میں 'اسلام کی ایمانی و احسانی' اور فقہی و قانونی تعلیمات کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو
کے حامل کے سامنے چار راستے کھلے ہیں : (i) بلند ترین تو یہ ہے کہ اس "عفو
غرباء اور مساکین کو دے کر خود فارغ اور سرخرو ہو جائے اور اپنے لئے روحانی تر
سامان فراہم کر لے۔ (ii) اس سے کم تر درجے میں یہ کہ اسے "قرضِ حسن
صورت میں اپنے کسی ایسے بھائی کو دیدے جو کام تو کر سکتا ہو لیکن سرمایہ سے محرو
تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنی معاشی گاڑی کو سٹارٹ کر کے اس کی اصل رقم بغیر
اضافے کے اسے لوٹا دے (یا اگر کوئی اضافہ کرے تو خالص اختیاری طور پر اپنی
مرضی بلکہ خواہش سے 'یعنی بطور ہدیہ!)۔ (iii) اس سے بھی فروتر درجہ یہ ہے
اپنی رقم مضاربت کے اصول پر کسی عامل کے حوالے کر دے' نقصان ہو تو پور
برداشت کرے اور اگر نفع ہو تو اس میں سے ایک حصہ وصول کر لے۔ یہ جا
آخری حد ہے جو اوپر کی دونوں پسندیدہ اور مطلوبہ سطحوں سے فروتر ہونے کے با
ان کے مقابلے میں "مکروہ" شمار ہو گی! — (iv) اور آخری اور بدترین اور را
ترین یہ کہ یہ سرمایہ بغیر نقصان کا رسک لئے نفع کی معین شرح پر دوسروں کے حو
کر دیا جائے — یہ سود اور ربا ہے — ماں کے ساتھ بدکاری سے سینکڑوں گنا
— اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ!

عَنِ الحَارِثِ الاَشعَرِی، قَالَ، قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ و

"اٰمُرُکُم بِخَمسٍ

بِالجَمَاعَۃِ وَالسَّمعِ وَالطَّاعَۃِ وَالھِجرَۃِ وَالجِھَادِ فِی سَبِیلِ ا

(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد، جامع ترمذی)

آداب معاشرت

مولانا مفتی عبد الرؤف صاحب

عید کے موقع پر مصافحہ اور معانقہ

ہمارے ہاں عیدین پر "عید ملنے" کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور اس موقع پر باہم گلے ملنا لازم خیال کیا جاتا ہے مفتی عبد الرؤف صاحب نے اس "رسم دنیا" کی شرعی حیثیت پر قلم اٹھایا ہے اور اس بارے میں علمائے اہل سنت کا موقف بیان کیا ہے۔ ہم ان کا یہ مضمون جامعہ اشرفیہ سکھر و کراچی کے ترجمان جریدہ "الاشرف" کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

عید الفطر کا دن مسلمانوں کے لئے بڑی مسرت اور خوشی کا دن ہے اور یہ خوشی اس بنا پر ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے رمضان شریف کے روزے رکھنے کی توفیق بخشی اور شب میں تراویح ادا کرنے اور اس میں کلام الٰہی پڑھنے اور سننے کی سعادت عطا فرمائی حق تعالیٰ کے نزدیک عید کا دن اور عید کی رات دونوں ہی بہت مبارک اور بڑی فضیلت والے دن ہیں جس کا اندازہ آپ کو اس حدیث سے ہوگا۔

عید اور شب عید کی خاص فضیلت

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جنت کو رمضان شریف کے لئے خوشبوؤں کی دھونی دی جاتی ہے اور شروع سال سے آخر سال تک رمضان کی خاطر آراستہ کیا جاتا ہے پس جب رمضان المبارک کی پہلی رات آتی ہے تو عرش کے نیچے سے ایک ہوا چلتی ہے جس کا نام مثیرہ ہے (جس کے جھونکوں کی وجہ سے جنت

کے درختوں کے پتے اور کواڑوں کے حلقے بجنے لگتے ہیں جس سے ایسی دل آویز سُریلی آواز نکلتی ہے کہ سننے والوں نے اس سے اچھی آواز کبھی نہیں سنی۔ پس خوشنما آنکھوں والی حوریں اپنے مکانوں سے نکل کر جنت کے بالاخانوں کے درمیان کھڑے ہو کر آواز دیتی ہیں کہ کوئی ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہم سے منگنی کرنے والا تاکہ حق تعالیٰ شانہ' اس کو ہم سے جوڑ دیں پھر وہی حوریں جنت کے داروغہ رضوان سے پوچھتی ہیں کہ یہ کیسی رات ہے وہ لبیک کہہ کر جواب دیتے ہیں کہ رمضان المبارک کی پہلی رات ہے جنت کے دروازے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے لئے آج کھول دیئے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ' رضوان سے فرما دیتے ہیں کہ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے روزہ داروں پر جہنم کے دروازے بند کر دیئے جائیں اور جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ زمین پر جاؤ اور سرکش شیاطین کو قید کرو اور گلے میں طوق ڈال کر دریا میں پھینک دو کہ میرے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے روزوں کو خراب نہ کریں ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ' رمضان کی ہر رات میں ایک منادی کو حکم فرماتے ہیں کہ تین مرتبہ یہ آواز دے کہ ہے کوئی مانگنے والا جس کو میں عطا کروں ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں۔ کوئی ہے مغفرت چاہنے والا کہ میں اس کی مغفرت کروں۔ کون ہے جو غنی کو قرض کر دے۔ ایسا غنی جو نادار نہیں۔ ایسا پورا پورا ادا کرنے والا جو ذرا بھی کمی نہیں کرتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ' رمضان شریف میں روزانہ افطار کے وقت ایسے دس لاکھ آدمیوں کو جہنم سے خلاصی مرحمت فرماتے ہیں جو جہنم کے مستحق ہو چکے تھے اور جب رمضان شریف کا آخری دن ہوتا ہے تو یکم رمضان سے آج تک جس قدر لوگ جہنم سے آزاد ہو کر گئے تھے ان کے برابر اس ایک دن میں آزاد فرماتے ہیں

اور جس رات شب قدر ہوتی ہے تو حق تعالیٰ شانہ' حضرت جبرئیل کو حکم فرماتے ہیں وہ فرشتوں کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں ان کے ساتھ ایک سبز جھنڈا ہوتا ہے جس کو کعبے کے اوپر کھڑا کرتے ہیں اور حضرت جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سو بازو ہیں جن میں سے دو بازوؤں کو صرف اسی رات میں کھولتے ہیں جن کو مشرق سے مغرب تک پھیلا دیتے ہیں پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کو تقاضا فرماتے ہیں کہ جو مسلمان آج کی رات میں کھڑا ہو یا بیٹھا ہو نماز پڑھ رہا ہو یا ذکر کر رہا ہو اس کو سلام کریں اور مصافحہ کریں ان کی دعاؤں پر آمین کہیں۔ صبح تک یہی حال رہتی ہے جب صبح ہو جاتی ہے تو جبرئیل علیہ السلام آواز دیتے ہیں کہ اے فرشتوں کی جماعت اب کوچ کرو اور چلو۔ فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مومنوں کی حاجتوں اور ضرورتوں میں کیا معاملہ فرمایا۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر توجہ فرمائی اور چار شخصیتوں کے علاوہ سب کو معاف فرما دیا۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ چار شخص

کون ہیں۔ ؟ارشاد ہوا کہ۔

- ایک وہ شخص جو شراب کا عادی ہو۔
- دوسرا وہ شخص جو والدین کی نافرمانی کرنے والا ہو۔
- تیسرا وہ شخص جو قطع رحمی کرنے والا اور ناطہ توڑنے والا ہو۔
- چوتھا وہ شخص جو کینہ رکھنے والا ہو اور آپس میں قطع تعلق کرنے والا ہو۔

پھر جب عید الفطر کی رات ہوتی ہے تو اس کا نام آسمانوں پر لیلۃ الجائزہ (انعام کی رات) سے لیا جاتا ہے اور جب عید کی صبح ہوتی ہے تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں کو تمام شہروں میں بھیجتے ہیں وہ زمین پر اتر کر تمام گلیوں راستوں کے سروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایسی آواز سے جس کو جنات اور انسان کے سوا ہر مخلوق سنتی ہے پکارتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اس کریم رب کی درگاہ کی طرف چلو جو بہت زیادہ عطا فرمانے والا ہے اور بڑے سے بڑے قصور کو معاف کرنے والا ہے۔ پھر جب لوگ عید گاہ کی طرف نکلتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں سے دریافت فرماتے ہیں کیا بدلہ ہے اس مزدور کا جو اپنا کام پورا کر چکا ہو وہ عرض کرتے ہیں کہ ہمارے معبود اور ہمارے مالک اس کا بدلہ یہی ہے کہ اس کی مزدوری پوری پوری دے دی جائے تو حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ اے فرشتو میں تمہیں گواہ بناتا ہوں میں نے ان کو رمضان کے روزوں اور تراویح کے بدلہ میں اپنی رضا اور مغفرت عطا کر دی اور بندوں سے خطاب فرما کر ارشاد ہوتا ہے کہ اے میرے بندو مجھ سے مانگو، میری عزت کی قسم میرے جلال کی قسم آج کے دن اپنے اس اجتماع میں مجھ سے اپنی آخرت کے بارے میں جو سوال کرو گے عطا کروں گا اور دنیا کے بارے میں جو سوال کرو گے اس میں تمہاری مصلحت پر نظر کروں گا میری عزت کی قسم کہ جب تک تم میرا خیال رکھو گے میں تمہاری لغزشوں پر ستاری کرتا رہوں گا (اور ان کو چھپاتا رہوں گا) میری عزت کی قسم اور میرے جلال کی قسم میں تمہیں مجرموں (اور کافروں) کے سامنے رسوا اور فضیحت نہ کروں گا بس اب بخشے بخشائے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ تم نے مجھے راضی کیا اور میں تم سے راضی ہو گیا بس فرشتے اس اجر و ثواب کو دیکھ کر جو اس امت کو افطار کے دن ملتا ہے خوشیاں مناتے ہیں اور کھل جاتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔ (فضائل رمضان)

حق تعالیٰ کی اس ذرہ نوازی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم ان کے اور زیادہ فرمانبردار اور اطاعت شعار بندے بنتے تاکہ اور زیادہ ان کی رحمتوں اور برکتوں کے حقدار ہوتے لیکن افسوس ہلال عید نظر آتے ہی ہم نے ایسا رخ پکڑا اور ایسے بہکے اور نظریں پھیریں کہ پیچھے مڑ کر ہی نہ دیکھا اور اتنی دور نکل گئے کہ مرکز ہی کو بھول گئے۔ اور ایسے ایسے کاموں کا ارتکاب کیا کہ جن سے بجائے مورد رحمت بننے کے حق تعالیٰ کی ناراضگی غصہ اور

عذاب کا مورد بننے لگے عید الفطر کی شب اور اس کا دن انعامات الٰہی کی وصولی اور خوشنودی حاصل ہونے کا مبارک دن ہے ہم نے اس کو ان کی ناراضگی کا سبب بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور تعجب یہ ہے کہ ہم ایسی باتوں کو گناہ بھی نہیں سمجھتے جو اور بھی خطرناک بات ہے یہاں ذیل میں کچھ ایسی ہی چند باتیں عرض کرتا ہوں صرف اس امید پر کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ توجہ سے ان باتوں کو پڑھے اور اسے توفیق عمل ہو جائے۔ حق تعالیٰ ہم سب کو ان منکرات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین

مصافحہ ملاقات کے وقت ہے

سب سے پہلے مصافحہ اور معانقہ کے تعلق کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔

حدیث حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا یقیناً جب ایک بندۂ مومن کسی دوسرے بندۂ مومن سے ملاقات کرتا ہے تو ان دونوں کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جس طرح درخت کے پتے (موسم خزاں میں خشک ہو کر) گر جاتے ہیں۔ (الترغیب والترهیب ص ۴۳۳ ج ۳)

حدیث حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب دو مسلمان باہم ملاقات کرتے ہیں (اور) پھر باہم مصافحہ کرتے ہیں تو ایک دوسرے سے جدا ہونے سے پہلے پہلے ان کی مغفرت ہو جاتی ہے۔

رواہ ابوداؤد والترمذی (الترغیب والترهیب ج ۳ ص ۴۳۳)

مصافحہ سلام کا تکملہ ہے

حدیث حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے آپس میں سلام کی تکمیل (سلام کے بعد) مصافحہ کرنا ہے۔

(رواہ الترمذی مشکوٰۃ ص ۴۰۲)

حدیث حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا سلام کی تکمیل ہاتھ پکڑنا ہے۔ (یعنی مصافحہ کرنا ہے)

(رواہ الترمذی ص ۱۱۵ ج ۲)

معانقہ سفر سے آنے پر ہے

حدیث حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ (کسی سفر سے) مدینہ منورہ آئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر تشریف فرما تھے وہ آپ سے ملاقات کے لئے آئے۔ اور دروازہ کھٹکھٹایا چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے آنے کی خوشی میں کھلے بدن کے ساتھ (جب کہ ستر چھپا ہوا تھا) ایک چادر اپنے بدن پر ڈالتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بخدا میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں کسی کا استقبال کرتے ہوئے نہ کبھی اس سے پہلے دیکھا اور نہ کبھی اس کے بعد۔ پھر آپ نے زید بن حارثہ سے معانقہ کیا اور بوسہ لیا۔

رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ص۴۰۲)

حدیث حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ان کے حبشہ سے واپسی کے قصہ میں منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم حبشہ سے نکلے یہاں تک کہ مدینہ منورہ پہنچ گئے پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے معانقہ فرمایا......

رواہ فی شرح السنۃ .... (مشکوٰۃ ص۴۰۲)

مصافحہ اور معانقہ میں صحابہ کرامؓ کا عمل

حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جب آپس میں ملاقات کرتے تو مصافحہ کرتے اور جب کسی سفر سے واپس لوٹتے تو معانقہ کیا کرتے تھے۔

رواہ الطبرانی۔ (الترغیب والترہیب ص۴۳۳ ج۳)

چنانچہ مذکورہ بالا احادیث کے تحت مرقات شرح مشکوٰۃ میں محدث کبیر حضرت ملا علی قاریؒ رحمۃ اللہ علیہ نے فرض نمازوں کے بعد مصافحہ کرنے کی تردید میں جو کچھ فرمایا ہے ملاحظہ ہو:

"بیشک مشروع مصافحہ کا محل ملاقات کے شروع میں ہے بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ بغیر مصافحہ کے ملتے ہیں اور دیر تک ادھر ادھر کی اور علم وغیرہ کی باتیں کرتے رہتے ہیں پھر جب نماز پڑھ

لیتے ہیں تو مصافحہ کرنے لگتے ہیں یہ کہاں کی سنت ہے؟ اسی لئے ہمارے علماء نے صراحۃً لکھدیا ہے کہ یہ طریقہ مکروہ ہے اور بدعت مذمومہ ہے:

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص ۔۔ ج ۹

تشریح ان کے زمانہ میں عصر و فجر کی نماز کے بعد مصافحہ کا رواج تھا جیسا کہ آج بھی اس کا رواج ہے اس لئے اسی سے منع فرمایا ورنہ جمعہ و عیدین سب نمازوں کے بعد مصافحہ کے التزام کا ایک ہی حکم ہے چنانچہ شیخ ابوالحسن بکری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عصر و فجر کی نماز کے بعد مصافحہ کرنے کی قید اس بناء پر ہے کہ اُن کے زمانہ میں اُسی کی عادت تھی ورنہ جملہ نمازوں کے بعد مصافحہ کرنا ایسا ہی ممنوع ہے جیسا فجر و عصر کے بعد۔

(شامی ص ۲۴۴ ج ۵)

فقیہ اعظم علامہ شامی کی تحقیق

فقہاء متاخرین میں علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور و معروف کتاب شامی میں مصافحہ کے متعلق تفصیل سے بحث فرمائی ہے اس کے آخر میں علامہ نے جو تحقیق تلمبند کی ہے وہ نہایت واضح اور بے غبار ہے چنانچہ بعد کے تمام علماء و فقہا کی تحقیق کا مرجع یہی ہے ملاحظہ ہو۔

"نماز کے بعد مصافحہ کرنا مکروہ ہے کیونکہ صحابہؓ کرام نماز کے بعد مصافحہ نہیں کرتے تھے اور یہ مصافحہ اس لئے بھی مکروہ ہے کہ یہ روافض کا طریقہ ہے اور علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہ بڑی مکروہ بدعت ہے شریعت محمدی میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، اس کے کرنے والے کو پہلی دفعہ تنبیہ کی جائے، نہ مانے تو دوسری دفعہ اس کو سزا دی جائے اور ابن الحاج مالکی مدخل میں تحریر فرماتے ہیں، یہ بھی ایک بدعت ہے، شریعت میں مصافحہ کرنے کا وہ وقت بتایا گیا ہے جب مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کرے نہ کہ نمازوں کے بعد لہذا جہاں شریعت نے مصافحہ رکھا ہے وہیں مصافحہ کرے اور اس کے علاوہ دوسرے اوقات میں مثلاً نمازوں کے بعد) مصافحہ کرنے سے منع کیا جائے اور کرنے والے کو جو سنت کے خلاف عمل کر رہا ہے سختی سے روکا جائے۔ (شامی ص ۲۴۴، ج ۵)

تشریح ان احادیث سے اور ان جیسی دیگر احادیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مصافحہ اور معانقہ کرنے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقہ یہ تھا کہ جب آپس میں ملاقات ہوتی تو پہلے سلام کرتے اور سلام کے بعد مصافحہ کرتے اور جب سفر سے آتے تو معانقہ

کہ تے۔ مصافحہ اور معانقہ کا کوئی خاص وقت یا دن مقرر نہ تھا بس اسی طرح بالکل اسی تفصیل سے مصافحہ اور معانقہ کرنا مسنون و مستحب ہے اور کارِ ثواب ہے۔ اسی پر عمل کرنا چاہیئے اسے نہ کوئی روک سکتا ہے نہ کسی کی مجال ہے چنانچہ اگر کوئی مصافحہ اور معانقہ کو عیدین کے دن خاص عید کی وجہ سے لازم اور ضروری نہ سمجھے اور عیدین کے علاوہ سال کے باقی ایام میں بھی سنت سمجھ کر اس کا پورا اہتمام کرے اور اپنا دائمی عمل بنائے اور پھر عید کے دن اپنے سابقہ معمول کے مطابق بوقت ملاقات سلام کر کے مصافحہ کرے تو کوئی مضائقہ نہیں یا جو عزیز رشتہ دار یا دوست عید کے دن سفر سے آئے اور سفر سے آنے کی بناء پر اس سے گلے ملے تو بھی نہ صرف جائز بلکہ سنت ہے۔ رہا فرض نمازوں اور عیدین کی نماز کے بعد کا مروجہ مصافحہ اور معانقہ سو ان احادیث اور دیگر صحیح احادیث میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرض نمازوں اور عیدین کے روز التزاماً مصافحہ اور معانقہ کیا کرتے تھے، لوگوں نے اپنی طرف سے ایجاد کر لیا ہے اور سنت بنا لیا ہے بلکہ فرض و واجب کی طرح اس کی پابندی کی جاتی ہے اور اس کو ایسا ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے بغیر عید ہی نہیں ہوتی اور جو اس پر عمل نہ کرے اس کو طرح طرح کے طعنے دیئے جاتے ہیں حالانکہ مصافحہ و معانقہ نہ عیدین کی سنت ہے اور نہ اس کے فرائض و واجبات میں ہے تو جو چیز نہ سنتِ عیدین ہے اور نہ فرض و واجب ہے اس کو سنت قرار دینا یا فرض یا واجب کا درجہ دینا کیا اپنی طرف سے اضافہ کرنا نہیں؟ پھر اس مصافحہ و معانقہ کی شکل بھی بدل گئی ہے وہ اس طرح کہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ ملاقات کے وقت کریں، یہاں یہ صورت ہے کہ عیدین کے روز گھر سے ایک ساتھ نکلے راستہ میں ملاقات رہی ایک ساتھ عید گاہ گئے ساتھ بیٹھے ساتھ نماز پڑھی پھر جب نماز اور خطبہ سے فارغ ہوتے ہیں تو مصافحہ اور معانقہ شروع ہو جاتا ہے اور اس پر غضب یہ ہے کہ اکثر سلام بھی نہیں کرتے بس گلے ملے اور سلام کی جگہ عید مبارک کہہ کر فارغ ہو نے اور اسی کو کافی سمجھتے ہیں غور کیجئے! کیا یہ دین کو بدلنا نہیں ہے اس لئے اس سے منع کیا جاتا ہے۔

محدثِ کبیر حضرت مُلّا علی قاریؒ کی تحقیق

بہر حال چونکہ عیدین اور فرض نمازوں کے بعد اس مروجہ مصافحہ معانقہ کا کوئی ثبوت نہیں ہے اس لئے فقہاء و محدثین رحمہم اللہ نے اپنے اپنے زمانہ میں اس کی تردید فرمائی ہے اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

اور معانقہ کے متعلق "المدخل" میں تصریح ہے۔

"فرماتے ہیں ہمارا عیدین کا معانقہ سو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے اور حضرت ابن عیینہ رح نے کچھ دن کے بعد ملاقات ہونے پر معانقہ کی اجازت دی ہے لیکن جو شخص پہلے سے ساتھ عید کے دن نمازِ عید میں حاضر ہے اس سے معانقہ کرنے کی اجازت نہیں (ص ۲۹، ج ۲)

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ شاید کسی صاحبِ علم کو علماء سلف کے ان بعض اقوال سے شبہ ہو جن میں انہوں نے فرض نمازوں کے بعد مصافحہ کے رواج کو بدعتِ مباحہ قرار دیا ہے لہٰذا جائز ہے۔

واضح رہے کہ اوّل تو بدعتِ مباحہ کہنے سے اتنی بات خود ہی واضح ہوگئی کہ اس موقع پر ہونے والا مصافحہ ان کے نزدیک بھی سنت نہیں ہے اور سنت ہو بھی کیسے سکتا ہے جب ثابت ہی نہیں اور ایک امتی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقہ چاہیئے کیونکہ آپ کا راستہ ہی راہِ ہدایت ہے دوسرے یہ کہ علماء محققین رح نے ان اقوال کو اختیار نہیں کیا بلکہ صراحۃً ان کی تردید فرمادی جیسا کہ ابھی اوپر حافظ ابن حجر رح اور علامہ شامی کی تحقیق سے ثابت ہوا نیز ہند و پاک کے محقق علماء، فقہا نے بھی انہیں قبول نہیں کیا جیسا کہ عنقریب آرہا ہے۔ لہٰذا ان سے استدلال کرنا درست نہیں۔

ہند و پاک کے علماء کے فتاویٰ

اب ہند و پاک کے اکابر علماء اور مفتیوں کے فتاویٰ ملاحظہ ہوں سب اس پر متفق ہیں کہ عیدین کی نماز کے بعد اور فرض نمازوں کے بعد جو مصافحہ اور معانقہ رائج الوقت ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

عیدین میں مصافحہ و معانقہ بدعت ہے

سوال، معانقہ کرنا بالخصوص عیدین کے روز کس درجہ کا گناہ ہے۔ مکروہ ہے یا حرام؟

جواب، معانقہ و مصافحہ بوجہ تخصیص کے کہ اس روز میں اس کو موجبِ سرور اور باعثِ مودت اور ایام سے زیادہ مثل ضروری کے جانتے ہیں بدعت ہے اور مکروہ تحریمی ہے اور علی الاطلاق ہر روز مصافحہ کرنا سنت ہے ایسا ہی بشرائط خود یوم العید کے ہے اور علیٰ ہٰذا معانقہ حسب الشرائط خود دیگر

ایام میں ہے ویسا ہی یوم عید کہ سب کوئی تخصیص اپنی رائے سے کرنا بدعت ضلالہ ہے فقط واللہ اعلم
رشید احمد عفی عنہ،

(فتاوی رشیدیہ کامل ص ۱۰۲)

سوال: عیدین میں معانقہ کرنا اور بغلگیر ہونا کیسا ہے للہ ان مسئلوں کو زیب قلم فرما کر مزین بمہر فرما دیں فقط
جواب: عیدین میں معانقہ کرنا بدعت ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم کتبہ احقر بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ
الجواب صحیح محمد عبداللطیف عفی عنہ۔

(فتاوی رشیدیہ کامل ص ۱۴۰)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کا فتویٰ

نماز عیدین کے بعد مصافحہ و معانقہ بدعت ہے۔

سوال: عیدین میں مصافحہ و معانقہ روا ہے یا نہیں؟
جواب: قاعدہ کلیہ ہے کہ عبادات میں حضرت شارع علیہ السلام نے جو ہیئت و کیفیت معین فرما دی ہے اس میں تغیر و تبدل جائز نہیں اور مصافحہ چونکہ سنت ہے اس لئے عبادات میں سے ہے تو حسب قاعدہ مذکورہ اس میں ہیئت و کیفیت منقولہ سے تجاوز جائز نہ ہوگا اور شارع علیہ السلام سے صرف اول لقاء کے وقت بالاجماع یا وداع کے وقت بھی علی الاختلاف منقول ہے پس اب اس کے لئے ان دو وقتوں کے سوا اور کوئی محل و موقع تجویز کرنا تغییر عبادت کرنا ہے جو ممنوع ہے لہٰذا مصافحہ بعد عیدین یا بعد نماز پنجگانہ مکروہ و بدعت ہے شامی میں اس کی تصریح موجود ہے۔ فقط واللہ اعلم

(امداد الفتاوی جلد اول ص ۴۵۶)

حضرت مفتی عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

نماز عیدین کے بعد مصافحہ مکروہ ہے

سوال: نماز عیدین کے بعد مصافحہ و معانقہ آپس میں کرنا سنت سے ثابت ہے یا نہیں ثابت ہے؟
جواب: نماز عیدین یا دیگر نمازوں کے بعد تخصیص مصافحہ کی کرنا اور اسی وقت خاص میں اس کو سنت جاننا اور معمول بہ ٹھہرانا بعض فقہاء نے منع لکھا ہے اور ترجمین الکلام میں اس کو سوء انفس کے طریقہ سے لکھا اور مکروہ فرمایا ہے۔

رفتار کار

سہ روزہ علاقائی اجتماع حلقہ سندھ و بلوچستان

تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع میں یہ طے ہوا تھا کہ آئندہ سال مختلف حلقوں میں سہ رو علاقائی اجتماعات منعقد کئے جائیں گے۔ اس فیصلے کی روشنی میں پہلا سہ روزہ علاقائی اجتماع حا سندھ و بلوچستان ۱۴ تا ۱۶ جنوری قرآن اکیڈمی کراچی میں منعقد ہوا۔ اس کے ساتھ ہی چار رو ملتزم و مبتدی تربیت گاہ بھی رکھی گئی تاکہ جو رفقاء ملتزم یا مبتدی تربیت گاہ میں شریک ہونا چا انہیں الگ سے سفر نہ کرنا پڑے۔ حلقوں کے علاقائی اجتماعات کی افادیت مسلم ہے، اس لئے ایک حلقہ کے لوگوں کا آپس میں مل بیٹھنا اور ایک ساتھ اجتماعی پروگراموں میں شرکت کرنا، ا دوسرے کو قریب سے دیکھنا اور ان سے تعارف حاصل کرنا سالانہ اجتماع کے مقابلے میں ز آسان ہے۔ تنظیم کی طرف سے ہر رفیق کو مہینے میں دو یوم فارغ کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ یہ یوم اپنے حلقے میں دعوتی پروگرام میں صرف ہوں تو اس اجتماع کا یہ فائدہ بھی ہو گا کہ اس : شرکت سے رفقاء کا تعارف وسیع پیمانے پر ہو گا اور جب بھی وہ کسی علاقے میں دعوتی پروگر کے لئے جائیں گے تو اجنبیت کا احساس نہ ہو گا اور وہ محسوس کریں گے کہ وہ اپنے ہی لوگوں پاس ہیں۔ ہر علاقے کے ناظم کو بھی اپنے رفقاء کی قوت کار کا اندازہ ہو جائیگا اور آئندہ پروگر بنانے میں وہ اس کو پیش نظر رکھے گا۔ پھر ناظم حلقہ کا ہر رفیق سے ذاتی تعارف ہو گا۔ غرضیکہ اعتبار سے اس کی افادیت مسلم ہے۔

حلقہ سندھ و بلوچستان کا یہ اجتماع جمعہ ۱۴ جنوری بعد نماز فجر منعقد ہو رہا تھا، اس لئے دور در کے رفقاء تو ۱۳ جنوری کی شام ہی کو پہنچنا شروع ہو گئے۔ یہ سلسلہ رات دیر تک جاری رہا۔ جنوری کو امیر محترم کی آمد تھی، آپ عمرہ ادا کر کے تشریف لا رہے تھے، لہٰذا تنظیم کی مجلس عاملہ میٹنگ بھی اسی دن رکھی گئی تھی۔ عاملہ کے ارکان تشریف لا چکے تھے۔ امیر محترم بعض وجوہ وقت پر نہ پہنچ سکے، اس لئے مجلس عاملہ کی صدارت ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر عبد الخا صاحب نے کی۔ قرآن اکیڈمی کے دروازے سے متصل استقبالیہ تھا جہاں رفقاء اپنی آ اندراج کراتے تھے۔ وہیں مکتبہ بھی لگایا گیا تھا۔ حلقہ کی طرف سے رفقاء کو بیج فراہم کیا جاتا ا ایک سہ ورقہ بھی جس میں ناظم حلقہ کی طرف سے خوش آمدید کہا گیا تھا اور پورے پروگرام تفصیل درج تھی۔ آخری صفحہ پر "گزارش" کے عنوان سے اختتام اجتماع پر آراء اور تجا دینے کی درخواست کی گئی تھی۔

جمعہ ۱۴ جنوری بعد نماز فجر اس علاقائی اجتماع کا افتتاح کرتے ہوئے جناب نسیم الدین صاحب ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان نے رفقاء کو خوش آمدید کہا' نیز بعض اہم باتیں ان کے گوش گزار کیں۔ اس کے فوری بعد جناب حافظ عاکف سعید صاحب نے درس حدیث دیا۔ درس کے اختتام پر اعلان ہوا کہ اب آپ لوگ اکیڈمی کے لان میں تشریف لائیں جہاں جسمانی ورزش کا پروگرام تھا' جس کا دورانیہ صرف ۲۰ منٹ تھا۔ تنظیم اسلامی کے رفقاء کے لئے یہ نئی بات تھی' چنانچہ سبھی ایک خوشگوار حیرت سے دوچار تھے۔ رفقاء قطار در قطار کھڑے ہو گئے' جناب شمس الحق اعوان صاحب نے اس کی اہمیت پر مختصر اظہار خیال کیا اور ہلکی پھلکی پی ٹی کی تربیت دی۔ یہ بھی تربیت کا ایک حصہ تھا۔ تنظیم اسلامی جو کام لے کر اٹھی ہے وہ علمی و فکری کے ساتھ عملی اور جسمانی بھی ہے۔ ہمارے پروگرام میں مظاہرے بھی شامل ہیں اور اس کے لئے مشقت کی تربیت بھی ضروری ہے۔ دعوت کے ساتھ جسمانی اعتبار سے بھی اپنے کو تیار کرنا حضور ﷺ کی ایک بڑی سنت ہے۔ کسی بھی تحریک کے لئے برداشت ذہنی اور برداشت جسمانی دونوں اہم ہیں' بیعت کے نظام میں ہم نے برداشت کا عہد بھی کیا ہے۔ یہ برداشت تزکیہ نفس کے لئے تریاق ہے اور اجتماعیت کی کامیابی کی کلید ہے۔

صبح ۹ بجے جناب رحمت اللہ بٹر صاحب نے فرائض دینی کے جامع تصور پر گفتگو کی۔ یہ تصور ہی تو ہے جو انسان میں حرکت و عمل پیدا کرتا ہے یا اسے جمود کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ جب سے دین و دنیا کی تقسیم ہوئی اور مذہب کے نام سے ایک خاص شکل وجود میں آئی حرکت و عمل سرد پڑ گیا اور عبادت ایک محدود دائرے میں مقید ہو گئی۔ صدیوں کے انحطاط نے اسے ایسا پختہ کر دیا کہ اب دین کا انقلابی تصور اجنبی بن گیا' جہاد قصہ پارینہ ہو گیا' غزوات قصہ کہانیاں بن گئیں۔ اس چیز کو صرف تاریخ کا حصہ سمجھ لیا گیا اور امت کی رہنمائی سے خارج کر دیا گیا۔ ظلم پر ظلم یہ ہوا کہ کتاب اللہ بھی محض تلاوت و برکت کی کتاب بن گئی' دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کو فرائض کے خانے سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ اب اس کے لئے کون کوشش کرے؟ صرف یہی نہیں ہوا بلکہ اب تو اس کو سنت کی حیثیت بھی نہیں دی جاتی۔ تمام سنتیں بیان کی جاتی ہیں مگر اس اہم سنت کو کوئی سنت نہیں سمجھتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ فرض صرف اسی دور کے لئے تھا۔ صرف حضور ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں پر دین کا قیام فرض کیا گیا تھا' جہاد و قتال کی آیتیں اسی دور کے لئے کار آمد تھیں۔ حدود کا نفاذ بھی چند سالوں کے لئے تھا۔ اسلامی احکام کی تفصیلات کیا محض زیب داستان کے لئے اتری ہیں یا کوئی دوسری مخلوق آئے گی جو اس پر عمل کرے گی؟۔

اس دور میں ایک بڑے دانشور نے فلسفہ "اعراض" پیش کیا ہے۔ صلح حدیبیہ ہی ان کا "ماڈل" ہے جبکہ حضور کی پوری سیرت "ماڈل" بننی چاہئے۔ دین کے قیام کی جدوجہد کے راستے

میں صلح حدیبیہ کا مقام بھی یقیناً آئے گا مگر یہ منزل نہیں ہے ' یہ تو راستے کا ایک نشان ہے۔ اس دانشور کو یہ نظر نہیں آیا کہ اسی صلح حدیبیہ کی تجدید کیوں مسترد کر دی گئی۔ اگر یہی سب کچھ تھا تو اس کی تجدید مزید کی جاتی۔ اس فلسفہ "اعراض" نے ہمارے بہت سے دینی ذہن رکھنے والے افراد کو متاثر کیا ہے۔ کام نہ کرنے کے لئے گوشہ عافیت کی یہ ایک دوسری شکل ہے۔ فلسفہ "اعراض" دراصل دین سے اعراض کا فلسفہ ہے۔ یہ تو میں کچھ اپنی بات کر بیٹھا' جناب رحمت اللہ بٹر صاحب نے قرآن حکیم کی محکم آیات سے استدلال کرتے ہوئے اس مضمون کو بہت عمدہ انداز میں بیان کیا جو مختصر بھی تھا اور جامع بھی۔

جمعہ کے خطبہ کے لئے جب امیر محترم تشریف لائے تو مسجد کا ہال بھر چکا تھا۔ رفقاء کے علاوہ دور و نزدیک سے آنے والے حضرات آپ کو سننے کے منتظر تھے۔ آپ کے خطاب میں دعوت' انذار و تبشیر اور آخر میں حالات حاضرہ پر ایک مبسوط تبصرہ ہوتا ہے۔ دعوت کے ضمن میں آپ نے فرمایا کہ اسلام ایک مکمل دین ہے 'ایک مکمل نظام حیات ہے' وہ اپنی مکمل بالادستی چاہتا ہے۔ اپنے ماننے والوں سے اس کا مطالبہ ہے کہ وہ اس کے لئے تن 'من' دھن لگا دیں۔ اپنی ذات تک محدود رکھنے والا تقویٰ' تقویٰ نہیں ہے۔ تقویٰ کا تقاضا ہے کہ وہ اس ہدف کی طرف بڑھے جسے دین نے مقرر کیا ہے 'یعنی اعلائے کلمۃ اللہ یا دوسرے لفظوں میں اقامت دین۔ وہ باہمت لوگ جو اسے قبول کرتے ہیں وہ ہر قسم کے موانع کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ کم ہمت لوگ دعوت حق کو قبول کرنے کے بعد پسپائی اختیار کرتے ہیں جسے ارتداد معنوی کہا جا سکتا ہے۔ راہ حق کے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس راستے پر چلنے والے باہم محبت و اخوت کے رشتے میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں نرم خو اور دشمن کے لئے سخت تر ہوتے ہیں۔ اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ نے ان لوگوں کو چن لیا ہے 'انہیں بھی چاہئے کہ اس توفیق کی ناقدری نہ کریں۔ اس توفیق کی جتنی قدر کرو گے اسی قدر مزید توفیق ملے گی۔ حالات حاضرہ کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے سابقہ اور موجودہ امت مسلمہ کا تقابل کیا' اور آنے والے سخت ترین عذاب' جس کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں' کے بارے میں متنبہ کیا کہ اب بھی وقت ہے 'اگر یہ امت اجتماعی توبہ کرے تو اللہ پھر ان پر نظر کرم کر سکتا ہے۔

بعد عصر ناظم اعلیٰ جناب ڈاکٹر عبد الخالق صاحب نے تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے تاریخ اسلام کا مختصر جائزہ پیش کیا۔ بعد مغرب جناب نوید احمد صاحب نے درس قرآن دیا۔ سورۃ العصر' جسے منتخب نصاب کی بسم اللہ کی حیثیت حاصل ہے 'اس کی تشریح فرمائی اور کرنے کے اصل کام کی طرف متوجہ کیا۔ بعد نماز عشاء جناب اعجاز لطیف صاحب نے سیرت صحابہؓ میں سے زید بن حارثہؓ اور مصعب بن عمیرؓ کا ذکر کیا اور ان کے حالات سے سامعین کے قلوب کو

...رایا۔ ہمارے لئے ان حضرات کے ذکر سے عزم و عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ لوگ یقیناً
...شنی کے مینار تھے اور رہتی دنیا تک ان کی روشنی نشان منزل کا پتہ بتاتی رہے گی۔
دوسرے دن کے اہم پروگراموں میں توسیعی مشاورت کا انعقاد تھا۔ یہ علاقائی توسیعی
...اورت تھی جس کے حدود کار کا تعارف ناظم اعلیٰ نے کرایا۔ اس مشاورت کے اصل سامع امیر
...ظم کے علاوہ جملہ ارکان عاملہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو کسی بھی پہلو سے اپنے اندر شکوک و
...ہات رکھتے ہیں وہ انہیں بلا کسی جھجک کے بیان کرتے ہیں، خواہ امیر محترم کی ذات سے متعلق
...ی قسم کا کوئی سوال ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح تنظیم کے طریقہ کار اور اس کی پالیسی کے متعلق جو
...وضاحت مطلوب ہوتی ہے اس مجلس میں بے دھڑک بیان کی جاتی ہے۔ یہ انداز صرف تنظیم
...لامی نے اختیار کیا ہے جسے فیڈ بیک کا نظام کہا جاتا ہے۔ رفقاء کی آراء معلوم ہوتی ہیں، ان کی
...ح کے رخ کا پتہ چلتا ہے، تنظیم کے اندر کس قسم کی باتیں نفوذ کر رہی ہیں اس کی نشاندہی ہوتی
...ے۔ پھر اشکالات کھل کر سامنے آتے ہیں، غلط فہمیوں کی گرہیں کھلتی ہیں۔ رفقاء میں سے ۱۲
...یوں نے مختلف پہلوؤں کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا۔ مشترک باتوں میں دین کے باطنی پہلو پر
...ر اور تنظیم میں نظم کو مزید بہتر بنانے کے لئے بعض تجاویز شامل ہیں۔ ہر سطح پر کام کرنے کے
...ے پروگراموں کے انعقاد کی ضرورت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی۔ مزید برآں جذبہ انفاق کو
...ارنے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا گیا۔ رفقاء نے جب اپنی بات مکمل کر لی تو امیر محترم نے
...یا کہ علاقائی اجتماع کے انتظام کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے اور اطمینان بھی۔ اس اجتماع کے
...قاد پر محنت کی گئی ہے اور خاص طور سے جناب نسیم الدین صاحب ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان
...ے بھرپور محنت کی ہے جو قابل مبارکباد ہے۔ اس حوصلہ افزائی پر ہم امیر محترم کے ممنون ہیں،
...فقاء کراچی کی محنت یقیناً بار آور ہوئی ہے اور ان شاء اللہ اس سے دعوت کے کام کو آگے بڑھنے
...مدد ملے گی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ مشورہ میری ضرورت ہے، اور مشورہ کا حکم بھی دیا گیا ہے۔
...کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اپنے قریبی رفقاء سے مشورہ کرتا ہوں، اس ٹیم کا نام مجلس عاملہ
...ے۔ پھر مجلس مشاورت میں اس مسئلے کو رکھتا ہوں اور ان تمام افراد کی رائے سے مستفید ہوتا
...ں۔ اسی طرح یہ توسیعی مشاورت بڑے پیمانے پر رفقاء کی رائے سے آگاہ ہونے کے لئے ہے۔
...ں تک باطنی پہلو کا تعلق ہے تو ہمارا نظام تزکیہ 'تزکیہ بالقرآن' ہے۔ قرآن مجید کو اپنے اندر
...نے سے ہی وہ جذبہ پیدا ہو گا جو انسان کو صراط مستقیم پر قائم رکھ سکے گا اور اقامت دین کے
...ستے کی کٹھنائیوں میں سہارا بنے گا۔ یہ نشست صبح ۹ بجے سے دوپہر ایک بجے تک رہی۔
بعد نماز عصر جناب مختار حسین فاروقی صاحب نے درس قرآن مجید دیا۔ آپ نے سورۃ الحج
...حوالے سے جہاد بالقرآن کی وضاحت کی۔

اخباری اعلان کے مطابق بعد مغرب امیر محترم کو موجودہ اور سابقہ مسلمان امتو
ماضی' حال اور مستقبل پر تقریر کرنی تھی۔ رفقاء کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس خطاب
کے لئے تشریف لائے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس موضوع پر میں متعدد خطاب کر چکا ہوں۔
تاریخ میں دو ہی مسلمان امتیں رہی ہیں' ایک سابقہ مسلمان امت بنی اسرائیل اور دو
موجودہ امت مسلمہ یعنی امت محمد ﷺ۔ ان دونوں امتوں کی تاریخ میں حیرتناک م
مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس مشابہت کو حضور ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں بیان فرمایا۔
جس طرح جوتے کی جوڑی باہم مشابہ ہوتی ہے اسی طرح ان دونوں میں مشابہت ہے۔ آپ
تاریخ بنی اسرائیل اور تاریخ امت محمدیہ کا ایک تقابلی مطالعہ لوگوں کے سامنے رکھا۔ اس
عبرت کے جتنے پہلو بھی ہو سکتے ہیں بیان فرمائے۔ آپ نے فرمایا کہ دراصل کتابیں تو دو ہی
ان دو امتوں کو دی گئیں یعنی تورات اور قرآن جن میں شریعت کے تفصیلی احکام ہیں۔ ا
وعظ و نصیحت پر مشتمل کتاب تھی اور زبور کی حیثیت ایک ترانہ حمد کی تھی۔ موجودہ حالات
رخ پر جا رہے ہیں اس کی ہولناکی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ عربوں پر عذاب آیا ہی چاہتا
انہیں اللہ کی کتاب سے بے اعتنائی کی سزا مل رہی ہے۔ اسی طرح دوسرے نمبر پر اہل پا
ہیں۔ اگر اہل پاکستان نے اجتماعی توبہ نہ کی تو یہ بھی عذاب سے نہ بچ سکیں گے۔ اس کے بعد
جنگ برپا ہوگی جس کی خبر احادیث میں دی گئی ہے۔ یہی وہ وقت ہے ہو گا جب بنی اسرا
عذاب استیصال آئے گا اور اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم توبہ کی منادی کریں کیونکہ اللہ کی طرف سے انہی لوگ
نجات کا وعدہ ہے جنہوں نے برائی کو ہاتھ یا زبان سے روکنے کی کوشش کی ہوگی۔ امیر محتر
بات سب کے لئے ایک انتباہ ہے لیکن ہم بحیثیت قوم اپنی دنیا بنانے میں مگن ہیں۔ آپ
سے ان باتوں کا ذکر کریں تو اس کا پہلا ردعمل لاپرواہی اور نظرانداز کرنے کا ہو گا' پھر
والے کو ملامت بھری نظروں سے دیکھے گا کہ اس احمق کو کیا پڑی ہے جو ہمیں نصیحت کر رہا
وہ گردن گھما کر دوسری سمت چل دے گا۔ واقعہ "سبت" میں ہمیں یہ نقشہ ملتا ہے کہ ایک
برائی میں منہمک تھا' دوسرا گروہ برائی کرنے والوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے برائی سے با
کی تلقین کرتا تھا' اور تیسرا گروہ جو بظاہر غیر جانبدار تھا' دوسرے گروہ سے کہتا تھا کہ تم خو
اپنا وقت ضائع کر رہے ہو' یہ لوگ نصیحت پکڑنے والے نہیں ہیں۔ لیکن جب اللہ کا عذاب
وہ گروہ بچا لیا گیا جس نے اپنی حد تک برائی کو روکنے کی کوشش کی تھی اور بقیہ دو گروہ ہلا
دیئے گئے۔ قرآن مجید نے یہ واقعہ زیب داستان کے لئے نہیں بیان کیا ہے' اس میں قیام
کے لئے رہنمائی ہے۔

اجتماع کے تیسرے اور آخری دن معمول کے پروگرام کے علاوہ امیر محترم کی ایک تقریر اور سوال و جواب کی ایک نشست تھی۔ تقریر ایک حدیث کی توضیح و تشریح پر مشتمل تھی جسے حدیث جبریل کہا جاتا ہے اور جس میں اسلام' ایمان اور احسان کی تعلیم دی گئی ہے۔ آپ نے اس پر دو گھنٹے سیر حاصل گفتگو فرمائی اور حقیقت اسلام' حقیقت ایمان اور حقیقت احسان کی وضاحت فرمائی۔ تنظیم اسلامی کا دعوت کا جو طریقہ کار ہے وہ منہج انقلاب نبوی ؐ سے اخذ کیا گیا ہے' اس راستے کے پیچ و خم کا استحضار اور اس کا شعور بیدار رکھنے کے لئے ان اجتماعات میں اس کا اعادہ ضروری ہے۔ اس موضوع پر جناب شمس الحق اعوان صاحب نے تقریر فرمائی۔ بعد مغرب سوال جواب کی بھرپور نشست ہوئی۔

عشاء کے بعد نئے رفقاء سے بیعت لی گئی۔ یہ قول و قرار کا منظر بھی خوب ہوتا ہے۔ اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے قول و قرار' اس کے راستے میں مال و جان کھپانے کا قول و قرار۔ اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر اس سے زیادہ مہتم بالشان قول و قرار کوئی نہیں۔ قول و قرار لینے والے کو خوب معلوم ہے کہ وہ کس بات کا اقرار لے رہا ہے' کیونکہ اس کے سر پر ایک ایک فرد کی ذمہ داری ہے۔ جو اقرار کر رہے ہیں انہیں بھی جان لینا چاہئے کہ آج سے ان کی دنیا بدل گئی ہے' ان کے اہداف بدل گئے ہیں' ان کے صبح و شام بدل گئے ہیں' وہ عام آدمی نہیں رہے بلکہ ایک مقصد کے علم بردار بن گئے ہیں۔ اس روئے زمین پر خیر کو برپا کرنا اب ان کا مقصد زندگی بن گیا ہے۔ دنیا میں اگر کوئی کشش ہے بھی تو وہ آخرت کے لئے ہے۔ آخرت جو یقینی ہے' حتمی ہے' بدنی ہے' آکر رہے گی' ہماری تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کی سرمایہ کاری اسی کے لئے ہے۔ انہیں جان لینا چاہئے کہ وہ آج سے سمع و طاعت فی المعروف کے نظم میں پرو دیئے گئے ہیں۔ اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اگر جذبات میں طلاطم ہے تو وہ بہت مبارک ہے۔ اس دھڑکنے والے دل کی ایک ایک دھڑکن توشہ آخرت بن رہی ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس راہ کی موجوں کو جھیلنے کے لئے میدان کارزار میں مردانہ وار اتر گئے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ۔

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موج دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

اس سہ روزہ اجتماع میں شریک ہونے والوں کے لئے تنظیم اسلامی حلقہ سندھ و بلوچستان کی طرف سے نئے سال کی ایک خوبصورت ڈائری تحفہ کے طور پر پیش کی گئی۔ اس اجتماع میں شرکاء کی تعداد تقریباً ۷۰۰ تھی۔

(مرتب : نجیب صدیقی)

carnate of the nation. It is expected of it that it may not
ven seem to be arbitrary, capricious or inconsistent.

This is a situation which can hardly be described as atisfactory, because it is fraught with confusion, perplexity, nd quizzical ungainliness. The fact is that we find here nmistakable symptoms of something deeper. I would enture to say that the root of the problem lies in the lurking nd at times diplomatically unexpressed fears, doubts, nisgivings, and mental reservations regarding relevance of slam to the modern context. There is a feeling, it appears hat if Islamic Shariah is applied not partially and selectively ut as a whole it might lead to disruptive if not disastrous onsequences. It is, therefore, true to say unless these doubts nd fears are convincingly dispelled and assuaged the ituation that presently prevails will continue to persist. In his respect I am somewhat handicapped because constraints mposed by the topic under discussion do not allow adequate nalysis of Islamic law, which is a vast subject. However, ortunately it so happens, that here even brief cursory and hus inevitably superficial description of the fundamentals of slamic law can serve the purpose to a great extent. Such a escription can establish that in view of the unusual in-built daptability of the Islamic law, all above-mentioned fears nd doubts are quite misconceived and unfounded. In fact it vould become clear that the entire blame can be laid at the oor of inadequate understanding and insufficient amiliarity of the Islamic law and principles.

*

---

the enforceability of Article 2-A would not make any difference. For instance all the political and financial questions which according to the court are difficult to be handled by the court are already within their jurisdiction without Article 2-A, e.g. Political Parties Act, laws relating to election matters, laws relating to all financial and fiscal matters (after expiry of exemption period fixed by the constitution) belongs to sub-constitutional field, and very much open to challenge on the basis of repugnancy to Islam or even repugnancy to fundamental rights. To take one example, perhaps the most intricate and brain teasing questions of the type mentioned above relates to banking interest and interest on loan in general. It is already being scrutinized by the courts without involving any application of Article 2-A. The jurisdiction available to courts under Article 203 D is extremely wide. On the strength of it as we have found in Qazalbash Waqf case, a long row of constitutional articles including Article 253 can be rendered nugatory and this task was accomplished not by Federal Shariat Court but by the Supreme Court itself.

It is interesting to note that on an earlier occasion the Supreme Court had already expressed an opinion on these concepts which is diametrically and dramatically different from the one in Hakim Khan's case. In [39]B.Z. Kaikaus case, the Supreme Court expounded the following view: "Principles of Islam are neither hidden nor complicated nor involved nor impracticable. Islamic law is capable of being enforced, practiced, applied and adopted at all times and places, only if understood and interpreted in its true spirit keeping in view environment and circumstances of situation at a relevant time". It is easy to see that the view in Hakim Khan's case regarding these concepts represents a change of 180 degrees from the view in Kaikaus case but it has not been supported therein by any reasoning or analysis whatsoever. Supreme Court is the reason and conscience

---

39 B.Z Kalikaus V. The President of Pakistan. P.L.D. 1980 S.C.160

expressed his considered opinion that outwards form and function of an Islamic State need not necessarily correspond to any "Historical precedent". According to him all that is required is that an Islamic State in its constitution and practice must embody certain clear cut unambiguous ordinances of Islam. But he says "those ordinances are very few and are very precisely formulated and they are invariably of such a nature as to allow the widest possible latitude to the needs of any particular time and social conditions."

The second cause of anxiety for the Supreme Court is that the enforceability of Article 2-A would require application of concepts that are rather vague, general, flexible, concepts which are capable of different interpretation at different times, which would make the constitution unstable and uncertain. At another occasion the court has described these concepts as nebulous, undefined, controversial concepts of the Islamic Fiqah. The court has gone on to opine that the ascertainment of principles of Islamic Law on political and financial questions requires detailed study and thorough research and meaningful debate before acquiring concrete shape so as to be adopted as a test of repugnancy of the constitutional provision. It cannot be summarily done. Such an exercise can more properly be undertaken under the control and supervision of the or legislature expert bodies like the Islamic Advisory Council and Islamic Research Institute.

It is difficult to see how all this is relevant and applicable to the enforceability of Article 2-A. As we have explained already above, most of the main features of the Pakistan's constitution have been authoritatively settled by the Objectives Resolution itself. As regards the rest, we have also explained above the constitutional theory and practice of Islam. Islam allows unusual degree of flexibility and there can be hardly any problem due to this factor, what remains after this, is already subject to the scrutiny of the courts under Article 203 D read with Article 203 B(c) and as such

consistent "Ijma" of both Ulema and Islamic Umma of Pakistan, it is hard to understand how and when any occasion would arise for changing any provision of the present constitution due to Article 2-A which is itself based on objectives resolution. A sword can be used against other swords and objects but it cannot be used against itself. Furthermore it needs to be remembered that there is an unusual degree of flexibility in the constitution principles of Islam which enables them to be adjusted according to the dictates of different times and circumstances. This is amply borne out by the fact that in the case of first four Caliphs, who are designated rightly guided Caliphs of Islamic history, four different methods were used for choosing them. Islam has taken on the whole an extremely pragmatic view of the ruler's functions and the structure of the State. It is significant that the Prophet (S.A.W.) who spoke of so many things - down to smallest detail of everyday life, had little to say on government as such and showed no interest in political theorising. As far as the Holy Quran is concerned, only a small proportion of it deals with legal matters, commands and prohibitions. There is next to nothing which can be relevant to constitutional questions involved here. Thus we find that in Islamic system of law, there is deliberate and well-planned fluidity regarding these matters. We can see here another evidence of Divine wisdom and far sight. As such wide scope has been left for change and adaptations to requirements of different times till eternity. This being the case there is hardly and justification for entertaining any kind of fear or doubt relating to repugnancy of present constitutional arrangement in Pakistan with principles and Injunctions of Islam.

That there is hardly any cause for concern on this account has been eloquently and trenchantly explained by Mr. Justice Dr. Nasim Hasan Shah himself in his Article entitled "[38]Concept of an Islamic State". Therein he has

---

38 Mr. Justice Dr. Nasim Hasan Shah, "Concept of an Islamic State" P.L.D. 1989 Journal 135.

Clause 6 and 9 together safe-guard the legitimate interests and freedom to practice religion and develop their culture to minorities, and backward and depressed classes.

Clause 7 prescribed federal form of Government alongwith provincial autonomy. This extremely modern idea of a complex form of State has been solemnly adopted with all the details and complications which it necessarily entails.

Clause 8 guarantees, a wide spectrum of fundamental rights that are a hall mark and a pride of any advanced modern liberal democracy.

Clause 10 ensures full implementation of independence of judiciary. We have already noted that according to objectives resolution authority is to be exercised through assemblies of elected people. It is implied therein that these assemblies will produce the executive head of the State alongwith his cabinet and also that it will conduct the business of law making for the nation. This fact coupled with independent judiciary indicates although in an embryonic form the idea of trichotomy of powers or at least the fact that the idea of trichotomy of powers can easily be accommodated in this frame work.

Clause 12 enjoins the making of full contribution towards international peace and progress and happiness of humanity. Thus the State of Pakistan is required to play its due role amongst the comity of nations in the conditions prevailing in the modern international milieu.

Within the structure of ideas and institutions prescribed by above provisions, clause 4 makes it absolutely certain that the State of Pakistan will be fully democratic republic even in the modern sense. Of course, there are some characteristic peculiarities of the Islamic system but they are bound to be there in the case of every nation and culture. These peculiarities are dictated by the ideology of each nation. However, in view of the features discussed above which are a part and parcel of the objectives resolution and as such already settled by the solemn and conclusively

non-sequitur. In my humble view the whole matter turns on one question. The question is if the legislative body can limit its own legislative powers by means of a constitution of its own creation, and confer the power on judiciary to see that these limits are observed; why cannot it impose on itself the no limits prescribed by Allah the divine and actual sovereign, and confer the power on judiciary to see that these limits are also observed?. In fact, this is what the legislature has purported to do through insertion of Article 2-A in the constitution.

OBJECTIVES RESOLUTION AND CHALLENGE TO CONSTITUTION:

In Hakim Khan's case the Supreme Court has reinforced its main argument with certain ancillary and supporting arguments. One of these arguments is that if the Article 2-A is given effect to almost all constitutional provisions would become challengeable and thus the entire constitution may have to be re-written. Article 2-A would open the flood gates that the fear expressed by the Supreme Court has no foundation in fact or reality. For this purpose a minute examination of objectives resolution as incorporated in the Annex of Article 2-A would have to be undertaken. In pursuance of this, a clause by clause analysis is given as follows.

Clause 2 indicates that the state of Pakistan will be run according to a written constitution which is to be framed by a constituent assembly. Thus we can see that the modern idea of a constituent assembly implies the principle of law-making through representative institutions within limits prescribed by Allah. Constitutionalism implies that affairs of the state will be controlled by pre-defined chosen principles and orderly procedures.

Clause 3 refers to chosen representatives of the people, which implies the idea of assemblies in the modern sense and provides scope for election in the modern sense.

sovereignty within its own sphere and according to the Supreme Court the reference the Holy Quran to the obedience of ulul-amar is equally applicable to the members of judiciary[37].

We must not forget that according to objectives resolution authority resolution authority and not sovereignty is delegated and that too to the State of Pakistan only. People through its chosen representatives who form the legislative bodies are only intermediaries means or stages through which authority is channelized and finally vested in the State. The assemblies come into existence through elections; the other two organs come into being through constitutional law of the country. But this is only a matter of modalities and technicalities through which various institutions necessary for conducting the affairs of the nation are brought into being. Three types of institution are now regarded essential for all nations, each of which takes care separately and exclusively of law making, running the administration and adjudication. Therefore all three of them together constitute the State. Anyone of these three organs cannot therefore, be exclusively termed as "State". here it is important to realise that State in this Islamic conception is nothing but an agency for enforcing Quranic principle and injunctions and that Judiciary as an integral part and organ of State has vital function to perform in this connection. In this conception, therefore, it is altogether unrealistic to consider Judiciary as something separate and distinct from "State".

However, even if we accept the position that the legislative body is the exclusive repository of the divine sovereignty as claimed in the argument above still the conclusion sought to be drawn from it does not follow. It is a

37 P.L.D. 1992 S.C. 595 at 619 in para marked F See also at P 169 in para marked "G" where after quoting a passage from Maulana Amin Ahsan Islahi's (مولانا امین احسن اصلاحی) Taddabar-ul-Quran (تدبر قرآن), the conclusion has been drawn that "this shows that the judiciary too can exercise the delegated divine sovereignty".

judiciary. The matter can be sorted out through legislative review rather than judicial review.

Here every thing depends on what we mean by the term "State". The question is what does the term "State" mean? Furthermore does it mean parliament only? The only definition of State is found in Article 7 of the Constitution. But Article 7 was introduced keeping in view the enforcement of fundamental rights and principles of policy. The Article 7 itself specifically indicates that the definition of State therein includes Federal Government and the authority competent to make laws to levy taxes which implies legislative bodies of every description. Judiciary is not included in this definition. This is obviously because only the executive and the legislative body can possibly make transgressions of a fundamental right and principle of policies. The fundamental rights were being guaranteed against these two institutions of the State. Judiciary's role is different from these two organs, because its job is to ensure and enforce the fundamental rights. It is significant that Article 7 itself contains a general rider clause to the effect the unless the context otherwise requires". In other words there is no fixed and exhaustive definition of the State in the constitution and the constitution itself requires that the term "State" will take meanings according to the context and circumstances of each case. In other definition of the State contained in Article 7 of the Constitution is merely functional and adhoc, and not definitive, comprehensive or exhaustive.

In all systems of law and government particularly in federal system judiciary is regarded one of the three organs of State which are equal and co-ordinate. The idea of federation itself implies necessarily the imposition of limits on all authorities and all kind of institutions. This by itself ensures pre-eminent rather than equal status for judiciary. In fact it is recognized even in the judgment of the Supreme Court itself that judiciary is one of the three limbs of the State which exercises the delegated functions of the divine

from the opposite and contradictory direction. Thus a situation of constitutional deadlock comes into being. The task for the court in a situation like this is to see whether some value or principle in the constitution itself can be found which might add decisive weight to one of the repugnant provision. In such circumstances the court itself can take the necessary remedial step in order to cope with the situation of repugnancy and the matter need not be consigned to the parliament. As far as Article 2-A is concerned, we have already established by means of a variety of considerations and detailed analysis that it is the most fundamental and the most weighty provision of our constitution. But for the sake of arguments even if we do not consider the content and subject matter as a ground of superiority directly, the Article 2-A must nonetheless be given the precedence due to the folioing fact. The fact is that if it is not done it would involve as a necessary result and incident the violation of oaths in the spheres of both legislative and executive organs of the State. If we are ready to tolerate even this consequence such an attitude can only be described as perverse and degenerating from the stand point of legality and proprietary.

LEGISLATIVE BODIES AS EXCLUSIVE REPOSITORIES OF SOVEREIGNTY:

There is another and alternative line of reasoning which has received the stamp of approbation from the Supreme Court. This argument focusses on the language of the Objectives Resolution itself and contends that according to objectives resolution sovereignty has been delegated to the State. The idea of State has been linked with the chosen representatives of the people which in its turn is linked with the idea of people As such the legislative body is the exclusive repository of the sovereignty. Therefore, in case there is internal conflict of the constitution of the kind involved in Hakim Khan's case, the resolution of the conflict lies within the competence of the legislature rather than

means a judge or an arbitrator. The command is therefore clear from All Almighty and directly addressed to all judges in an Islamic State that they must perform their judicial functions in accordance with what has been revealed by Allah Almighty. What an extraordinary situation we have here! The Divine and actual sovereign Almighty Allah and His delegatee the legislature of Pakistan gave spoken with one voice. Both have addressed the judges directly in very clear, unmistakable and insistent terms. What they have said enjoys passionate support of the people of Pakistan which is borne out by their participation in the struggle for Pakistan and various powerful movements for Islamic causes in the subsequent history of Pakistan. But believe it or not whatever all of them join together to demand and lay down cannot be made enforceable in Pakistan. Such is the power of judiciary. One is reminded here of a remark of Justice Harlan Stone, to the effect that [36]"The only check on our own exercise of power is our sense of self-restraint".

CONFLICT RESOLUTION:

This is the stage where we can take up a basic misconception regarding the function of the court involved in the context of Hakim Khan's case. This misconception has to be dispelled, because it is at the root of all confusion. In the context of Hakim Khan's, it is wrong to speak of striking down a constitutional provision. The true function involved here is of conflict-resolution in the light of some discoverable principle or value or latent meanings within the ambit of constitution itself. We have noted already that whenever there are two or more repugnant provisions in the constitution, all of them cannot stand together in the constitution at the same time. This is a necessary consequence and inherently involved in the logic of repugnancy because whenever one of these provisions is attracted, the other repugnant provision is also attracted

---

36 United States v. Bulber 297 V.S.I (1936) 78 - 79.

"To thee we sent the scriptures in truth confessing the scriptures that came before it, and regarding it in safety! So judge between them by what God hath revealed and follow not their vain desires, diverging from the truth that hath come that hath come to thee."

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ
(المائدہ:۴۹)

"And this (He commands) judge between them by what God hath revealed and follow not their vain desires".

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ:۴۸)

"اب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے اس کتاب کے مطابق کرو اور ایسے حقائق مل جانے کے بعد لوگوں کے خیالات و خواہشات کے پیچھے پیچھے مت چلو"۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا
(الانعام:۱۱۵)

"(ان سے پوچھو) کیا میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق تمہارے معاملات کے فیصلے کرنے لگ جاؤں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح اور نکھرا ہوا ضابطہ قانون بھیجا ہے"۔

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝ (الکہف:۲۶)
"اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔"
یعنی اس کے قانون کے ساتھ کسی اور قانون کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔

It can be noticed that practically the same contents with a change of only one word at the end have been revealed in the form of first three verses quoted above. This is an eloquent indication of the emphasis intended by Allah Almighty. It is significant that only one and the same word is used and repeated in all three verses. The verb is (A) يحكم which means to judge or to adjudicate. The word (B) حكم is a derivative from the same root and

one should prevail, the effect of a constitutional provisions i.e. 253 (2) or the effect of judicial pronouncement. The true position is that Article 253 (2) having been triggered into action by law relating to land reforms, its effect is still very much operative because to stop its effect a constitutional amendment is needed.

The words "shall be given effect to accordingly" occurring in Article 2-A are rather significant. These words can not have been aimed at the parliament, because parliament after it has passed the law can only amend, modify, repeal or annual that law, but it cannot do anything to give effect to it. The constitution - makers have obviously addressed these words to the courts in the main. These words have been brushed aside due to reasons and legal propositions set out in the judgment of the Supreme Court But Allah Almighty whom the constitution recognizes as the only sovereign from whom all institutions individuals and organs of state derive legal and constitutional authority has also spoken on the subject making a direct address to the judges in the following verses of the Holy Quran:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○
(المائدہ : ۴۴)

"If any do fail to judge by what God hath reveled, they are no better than non-believers."

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○(المائدہ:۴۵)

"If any do fail to judge by what God has revealed, they are no better than wrong doers."

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ○(المائدہ:۴۷)

"If any do fail to judge by what God hath revealed, they are no better than those rebel."

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ
مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا
جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ(المائدہ:۴۸)

conveniently disregarded, firstly that the laws under challenge were inseparably integrated into Article 253. Therefore, in a case like this even an indirect effect that completely and totally negates a constitutional provision can never be legally valid nor can it be treated as merely indirect consequence. Secondly, as soon as the impugned laws came into effect, they had triggered into action, the negative operation of article 253 (2) through invalidity clause contained therein remains very much operative,. even now. The negative operation of Article 253 (2) cannot be arrested short of amendment in the constitution. It is strange that what the legislature could not achieve directly because it has not power to pass any legislation that contravened article 253 (2) it could achieve indirectly by a clever tour-de-force of providing an opening to the courts. It could create a new and special jurisdiction under provisions of Chap. 3A of Part 7 of the Constitution and the court under these provisions could give a judicial verdict which could nonetheless destroy the effect of Article 253 (2). The whole argument rests on a facile assumption that judicial pronouncements cannot be termed as "law" within the meanings of Article 253 (2) and Article 253 it so happens places its embargo on "law" only. In this connection one question is altogether disregarded. The question is how can the legislature empower the courts to do something what under the Constitution the legislature itself has no power to do i.e. destroying the operation of Article 253 (2). A well known principle applies here by analogy. No one can pass on better title than he himself has. The question is if the legislature is debarred from passing any law on the subject, including the laws to vest the required power in the courts to act in the matter, from what other source the court can have derived the power to adjudicate and deliver its judgement in this matter. Now the situation is that the judicial pronouncement of the Supreme Court has struck down the land reforms as un-Islamic and thus defeated the operation of so many constitutional provisions including 253 (2). But it remains an open question even now as to which

any stage notwithstanding its technical and formalistic finding in Zia-ur-Rehman's case. In sharp contrast to this, we find many examples of extra-ordinary judicial activism in respect of rather mundane matters.

Judicial activism was resorted to in [32]Dosso's case on the basis of Han's Kalsen theory, in [33]Saifullah's case on the basis of "National Interest" in [34]Nusrat Bhutto' case on the basis of doctrine of necessity. In the last mentioned case the court was amenable to pressure of necessity to such an extent that a single individual, that is, a Chief of Army Staff who had designated himself a Chief Martial Law Administrator was given an unqualified power to amend the Constitution. He was given this power although amendments in the constitution were not needed by any conceivable logic for the purpose of holding of election which was the declared basis of necessity. More recently in [35]Qazil bash Waqf's case the judicial power of the court has been strained to the maximum if not beyond it. This will be clear from the details given below.

In Qazilbash Waqf case, the Land Regulation of 1972 and Land Reforms Act of 1977 which fixed the ceiling for land holding were struck down on the basis of repugnancy to Islam. The court broke through the protective stonewall erected by Articles 253, 8(3), (24), 268(2), 269 and reinforced by Article 203B (c) of the Constitution. The court admitted that Article 253 would be affected, which in fact was the main and real consequence of the court's decision. It nevertheless went ahead on the ground that any of the constitutional provisions mentioned above, were not under direct challenge. The embargo of the word "law" in Article 253 (2) was circumvented by means of a truly erudite and ingenious argument. Furthermore in this process it is

---

32 P.L.D. 1958 S.c. (Pak) 533
33 P.L.D 1989 S.C. 170.
34 P.L.D. 1977 S.C.47.
35 [illegible] 1989 S.C.600.

articulates the ideals and higher principles of the nation, and also as a pronouncer and guardian of values. It can also be seen what a tremendous blow is dealt to the very essence and structure of the state, whenever the ideology or higher principle or values on which a nation is based is not given by higher judiciary the place which rightfully and by all logic of history belongs to it. When other organs of the state deviate, depart or disregard ideology the damage is curable but when the same is done by the higher judiciary the damage is almost irreparable. It must be pointed out here that although our higher judiciary has recognised the fact with remarkable consistency that Pakistan is an ideological state, it has not adopted the outlook that must necessarily go with it. This is due to hand-over of long tutelage under British rule which inculcated positivist tradition of law. It is vitally important to appreciate that as soon as we became an ideological state, its necessary consequence was an immense qualitative change, a complete break with the past. Thus relevance of positivist approach in such circumstances can lead to nothing but error and confusion. In an ideological state ideology is the paramount factor. Everything must be subordinated to ideology in an ideological state, or else it would not be an ideological state. Failure to adjust the mental gears to this fact is causing all the problems in appreciating the true meanings and scope of Article 2-A.

JDICIAL ACTIVISM:

In respect of Article 2-A the court's attitude of judicial sitancy, exaggerated caution and bashfulness is somewhat markable, particularly when we remember that the preme Court has consistently stuck to the position that e objectives resolution contains the most fundamental inciple, the grund-norms and ideology of Pakistan. Indeed e Supreme Court has not departed from this position at

In view of this situation, [31]J. Allen Smith observed "while professing to be controlled by the constitution the Supreme Court does as a matter of fact control it, since the exclusive right to interpret necessarily involves the power to change its substance. This virtually gives to the aristocratic branch of our government the power to amend the constitution, though that power, is as we have seen practically denied to the people".

In the light of the above discussion the conclusion is inescapable that law is what the Supreme Court says it is. This is in line with Justice Marshal's pronouncement that the judges have inherent obligation to say what the law is because it is inherent in the nature of the act of judging itself. We have already noted above that this view of Justice Marshal was approved and further developed in 1958 in Cooper vs. Aaron case.

This has led modern American Jurists to conclude that law is created not by direct commands of the Government but by the direct pronouncements of the court. Law consists of "rules recognized and acted on the courts of justice" Indeed the authority of the state or the sovereign as the ultimate or final source of law is not denied. But the idea is to emphasise following three facts:-

1. That an act passed by the legislature is not law but "a law" which is really noting but material source of law
2. That a rule is law because courts of Justice would apply and enforce it in deciding cases rather than courts of Justice would apply or enforce it because it is law.
3. That we should turn to the courts of Justice to discover the true nature and origin of law. In this framework it is self-evident how vital is the role of judiciary as an institution that shelters, nourishes and

31 J.Allen Smith. The Spirit of American Government [Cambridge: Balknap Press: 1965] Pp 97-98.

that nation. According to [27]Alexander Bickel the judges as the pronouncers and guardians of our values". The nt shapes policy also. During Chief Justice Earl Warren's ure no one could doubt that the court shapes policy and re often Leads rather follow the public opinion. It has n said that the court possesses the best judgment of the ion. The court's grandest function is to think and reason h the polity on the best application of nation's highest nciples, and in that process to discern afresh, articulate l develop them. At the same time, as Alexander Hamilto alized, the court also acts as the bulwark of the limited ernment and watchdog over all constitutional infractions.

But the most profound function is the one for the first ie claimed for judiciary by Justice Marshal in the case of larbury Vs. Medison. Therein he propounded the position that, "It is emphatically the province and duty of judicial department to say what the law is'. In 1958 this trine was approved and further developed in [29]Cooper Aarons's case. In that case, it was categorically claimed it judiciary has supremacy over the ultimate meaning of constitutional text. In a sense the court is the final erpreter of the constitution, and in that capacity, the court the final and supreme authority on all matters of istitutional nature. This position is re-enforced by two tors. Firstly, although the court's verdict is subject to ersal by means of amendment in the constitution, this endment itself is subject to the interpretation of the irt. Secondly, the legislature cannot keep pace with the irt. As [30]Sam Erwin observed "you can't pass nstitutional amendments fast enough to control the court".

Alexander Bickel. "Least Dangerours Branch" PP 24 25

t US (1 Cranch) 137 (1803. 176 180.

13.358 U.S.I (1958). 17

Sam Erwin. Statement before (Committee on the Judiciary Sub-committee on the separation of powers. 90th Congress 2nd Session Hearings June 11, 1968.1.P.26)

legal systems in some form or the other. This is what inspired a hard-headed realist and secular-minded socialist like H.J. Laski to write to O.W. Holmse, "The truth is that we are witnessing a revival of natural law, and the natural is the purely inductive statement of certain minimum conditions we cannot do without if life is to be decent" Furthermore as [25]Edward. S. Corwin has explained, the idea of an all-governing constitution was surely aided by the general idea of "higher law" or laws of nature antecedent and superior to positive law.

However, the conception of judiciary's role and function takes on a different meaning in a Federal context. A Federal Government is characterised by two sets of authority with a limited and mutually checking power distributed to three organs of the State having their distinct spheres. Keeping this in mind [26]A.V. Dicey has said that federalism means legalism. What it implies is that in a federal government, not authority or organ or state has unlimited and unchecked power and therefore no action on the part of any authority, including the parliament is valid unless it carries legal sanction behind it. Judiciary is the branch that oversees and checks transgressions and overlapping form the scope of limited power exercisable within accurately defined sphere that constitutionalism allows.

Judiciary is therefore the branch that interprets and sapplies the constitution. In this process it ensures that whatever happens in a federal state conforms rigorously to the requirements and mandates of the constitution. It also ensures that at all occasions strict legality is maintained. For this purpose it grapples with the deepest thoughts of the nation. It brings a nation's philosophy to bear on the actions

---

25 Edward. S.Corwin, "The Higher Law, the Background of American Constitutional Law."

26 Dicey, "Law of Constitution" 10th edition page 175 "Federation, lastly means legalism - the predominance of the Judiciary in the Constitution - the prevalence of spirit of legality among the people".

THE ROLE OF JUDICIARY AND THE OBJECTIVES RESOLUTION

By Sardar Sher Alam Khan, Advocate, Lahore

(Part III)

THE ROLE OR FUNCTION OF JUDICIARY:

At this stage, we must take up a fundamental question which is essential to the understanding of the whole issue. The question is: What under the circumstances should judiciary do and what are the limits of its powers. This will throw useful light on what judges are expected to do in a situation like that of Hakim Khan's case.

An extreme view is represented by Cicero and Chief Justice Lord Coke. Cicero contended for the striking down of positive laws which contravene natural law. "A legislature" he stated" which said that theft or forgery of wills or adultery was lawful would no more be making laws. Then what a band or robber's might pass in their assembly". Similarly, Chief Justice lord Coke laid down in Dr. Bonham's case in 1610 the proposition that an act of parliament which is against common right or reason or repugnant or impossible to be performed" should be struck down by the judiciary. Even Blackstone, the arch-exponent of parliamentary sovereignty, held doubts about parliament's power to enact and enforce statutes contrary to law of God and reason. Due to evolution of English constitutional history this proposition has not taken root in England. This is due to the fact that the doctrine of legislative supremacy which is a revised version of Dicey's doctrine of parliamentary sovereignty became the supreme constitutional principle in England. Nonetheless the fact is that even in England and else-where too the idea of an overriding law expressing a higher truth and a higher Justice has continued to survive and influence the prevailing

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۴۳

شمارہ: ۴

شوال المکرم ۱۴۱۴ھ

اپریل ۱۹۹۴ء

فی شمارہ -/۷

سالانہ زرِ تعاون -/۷۰

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۴۵ سعودی ریال یا ۱۲ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔	۱۶ امریکی ڈالر
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۲۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر۔	۹ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقامِ اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰۔ فون: ۰۳-۸۵۶۰۰۴-۵۶۰۰

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

کشمیر کا مسئلہ اس وقت زبان زد خاص و عام ہے۔ عالمی سطح پر اس مسئلے کے حوالے سے پاکستان کی جو سبکی ہوئی ہے اس کا صدمہ ہر دردمند پاکستانی کو بے چین کئے دیتا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں خون مسلم کی ارزانی اور مسلمانوں پر ظلم و تشدد کے واقعات اس پر مستزاد ہیں کہ جنہیں سن کر کون مسلمان ہے جو اپنے دل میں شدید کرب و الم محسوس نہ کرتا ہو۔ حالات کا دھارا جس سمت بہہ رہا ہے اس کے پیش نظر بہتری کا امکان دور دور نظر نہیں آتا۔ کشمیر اگر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے تو پاکستان کی بھی شہ رگ ہے۔ مصالحت اور مفاہمت کی کوئی صورت بنے تو کیونکر! ہر سوچنے سمجھنے والا پاکستانی مسلمان جس کے دل میں زندگی کی ادنیٰ سی رمق بھی باقی ہو' خود کو مسئلہ کشمیر کے حوالے سے بالکل بے بس اور لاچار محسوس کرتا ہے کہ حالات کے دھارے کو موڑنا اس کے بس کی بات نہیں۔ ملت اسلامیہ پاکستان ایک عجیب مخمصے سے دوچار ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کے ساتھ سازگاری بھی اس کے لئے سم قاتل ہے اور اس سے ٹکر لے کر مخالف بلاک میں شامل ہونا بھی سنگین مصائب و آلام کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ عالمی سطح پر پاکستان اب بالکل تنہا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے بہترین دوستوں نے بھی کہ جو ہمیشہ پاکستان کا ساتھ دیتے رہے ہیں' آنکھیں بدل لیں۔ ع جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے! ___ ستم بر ستم یہ کہ اب بھی ہمارے سیاسی رہنما اور دانشوران قوم کی اکثریت مفاد پرستی کے خول سے باہر آنے کو تیار نہیں' پوری قوم بحیثیت مجموعی حقائق سے چشم پوشی کی روش اختیار کئے ہوئے ہے۔ گویا قومی و ملکی سطح پر ہم نے وہ تمام اسباب جمع کر لئے ہیں جن کا نتیجہ مولانا حالی کے اس مصرعے کی صورت میں سامنے آتا ہے کہ ع "وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی۔" اللہ ہمیں اس انجام بد سے بچائے۔

امیر تنظیم اسلامی نے اپنے ۱۸/ مارچ کے خطاب جمعہ میں ملکی و بین الاقوامی حالات کے تناظر میں کشمیر کے مسئلے پر اپنا تجزیہ بڑی وضاحت سے شرکاء کے سامنے رکھا اور پاکستان کے لئے جو دو ممکنہ راستے کھلے نظر آتے ہیں ان کے ممکنہ نتائج و عواقب کا بڑی جامعیت کے ساتھ احاطہ کیا ___ اس خطاب کا پریس ریلیز زیر نظر شمارے میں "تذکرہ و تبصرہ" کے عنوان سے شامل ہے ___ ہماری ایک قومی نفسیاتی کمزوری یہ بن چکی ہے کہ ہم ایسی کسی تجویز پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جس میں بھارت سے کسی بھی نوع کی مفاہمت کا ذکر ملتا ہو۔ جہاں کسی نے بھارت کے ساتھ کسی درجے کی مفاہمت یا مصالحت کا ذکر کیا' ہمارے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں وہیں جواب دینے لگتی ہیں۔ یہ ہرگز کوئی صحت مند علامت نہیں ہے۔ ہمیں اپنے ملکی مفاد اور قومی وقار و تحفظ کے لئے ہر ممکنہ راستے کا کھلی آنکھوں سے جائزہ لینا چاہئے اور ہر تجویز کے مصالح و مفاسد پر

سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر ہی نہیں کھل کر اظہار رائے بھی کرنا چاہئے ___ ہماری اس مریضانہ ذہنیت نے ہی قومی سطح پر آج ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہم بدترین حالات کے گرداب میں خود کو محصور پاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان خود ساختہ بندشوں سے آزاد کر کے ملک و ملت کے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے کھلے قلب و ذہن کے ساتھ غور و فکر کرنے کی عادت اپنائیں اور کسی بہتر راہ عمل کو اختیار کریں۔

اسی ضرورت کے احساس کے تحت تحریک خلافت پاکستان کے زیر اہتمام کشمیر کے موضوع پر ایک سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ سیاسی زعماء اور دانشوران قوم میں سے جن حضرات کی شرکت متوقع ہے ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں: جناب حنیف رامے، جناب حافظ حسین احمد، جناب ملک معراج خالد، جناب زیڈ اے سلہری، جناب محمود مرزا اور جناب مجیب الرحمٰن شامی۔ یہ سیمینار ان شاء اللہ جمعرات ۳۱/ مارچ کی شام کو قرآن آڈیٹوریم، اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوگا۔ اس سیمینار کی مفصل رپورٹ اگر اللہ نے چاہا تو ندائے خلافت کے آئندہ شمارے کی زینت بنے گی۔ ○

تذکرہ و تبصرہ

نیو ورلڈ آرڈر اور مسئلہ کشمیر

کیا پاکستانی قوم کے لئے کوئی دروازہ کھلا رہ گیا ہے؟

امیر تنظیم اسلامی کے ۱۸ مارچ کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز

لاہور۔ ۱۸ مارچ: امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر تنہا رہ جانے کے بعد زمینی حقائق کی روشنی میں پاکستان کے لئے اب دو ہی متبادل لائحہ عمل باقی بچے ہیں لیکن دونوں نہایت خوفناک ہیں چنانچہ اس مخمصہ پر اب کھل کر بات ہونی چاہئے کہ دونوں بلاؤں میں سے چھوٹی بلا کون سی ہے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں اپنے مفصل خطاب جمعہ میں انہوں نے تازہ ترین صورتحال کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایران کے مجوزہ بلاک میں بھارت اور چین کے ساتھ شامل ہو کر نئے عالمی استعمار یعنی نیو ورلڈ آرڈر کو للکارنے کی صورت میں ہمیں بھارت کی شرائط پر ہندو ذہنیت سے معاملہ کرنا پڑتا ہے جو ہمارے لئے کسی بالغ نظر اور واقعی و حقیقی قومی قیادت کے فقدان کے باعث سراسر گھاٹے کا سودا ہے اور بصورت دیگر ہمیں سول سپریم پاور یعنی امریکہ کے مجوزہ عالمی نظام کا آلہ کار بننا ہو گا جو سودی قرضوں کی شکل میں کچھ مالی امداد اور دوسرے درجے کے اسلحہ کی فراہمی کے بعد ہماری فوج کو اپنی علاقائی پولیس کے طور استعمال کرنا چاہتا ہے جو بوسنیا اور کشمیر میں تو خون مسلم کی ارزانی پر خاموش تماشائی کا لیکن صومالیہ میں امریکی مفادات کی نگہبانی کا کردار ادا کرے گی اور یہی نہیں بلکہ ہمیں کشمیر سے بھی ہاتھ دھونے ہوں گے جسے امریکہ نئے عالمی استعمار کے لئے چین کے خلاف عسکری اڈے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔

نیو ورلڈ آرڈر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بظاہر یہ امریکہ کی واحد سپریم پاور کے طور پر تاجپوشی ہے' یو این او اب جس کی ایک باندی ہے اور اسرائیل کی حفاظت اور سرپرستی جس کے دین و ایمان کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ذرا گہرائی

میں جا کر دیکھا جائے تو نیو ورلڈ آرڈر پورے کرۂ ارضی اور بالخصوص تیسری دنیا یعنی ایشیا اور افریقہ کے معاشی استحصال کا منصوبہ ہے جس کی کامیابی کے لئے سیاسی بالادستی کا حصول بھی ضروری ہو گا اور اس سے بھی زیادہ نیچے جائیں تو معلوم ہو گا کہ نیو ورلڈ آرڈر در اصل عیسائی اور یہودی گٹھ جوڑ کا نام ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس گٹھ جوڑ میں بھی خود امریکہ ہی صیہونی سازش کا شکار ہوا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ باخبر لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ یہ گٹھ جوڑ بڑے ہی ڈرامائی انداز میں پروان چڑھ رہا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے وضاحت کی کہ "واسپ" یعنی سفید فام اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹ اقوام کو تو یہودیوں نے پہلے ہی شیشے میں اتار رکھا تھا تاہم اب اپنے جانی دشمن کیتھولک چرچ سے بھی گٹھ جوڑ مکمل ہو گیا ہے۔ اس کا آغاز پوپ کی طرف سے یہودی قوم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دینے کے جرم سے بری کر دینے کے فرمان سے ہوا جس کے بعد پوپ کے ویٹیکان نے اسرائیل کو تسلیم کر کے یروشلم میں اپنا سفارت خانہ کھولنے کا اعلان کیا اور تازہ ترین خبر یہ ہے کہ امریکہ سے واپسی پر اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابن نے کوئی شے یا دستاویز یہ کہتے ہوئے پوپ کو پیش کی ہے کہ اس کی حفاظت گزشتہ تین ہزار سال سے ہم کرتے آئے ہیں' اب یہ امانت آپ کے سپرد کی جاتی ہے۔

نیو ورلڈ آرڈر کے منصوبے پر ایشیا اور افریقہ کے ردِ عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ افریقہ تو اپنے مسائل میں الجھا ہوا ہے اور اسے شکار کر لینا امریکہ کے لئے کوئی مسئلہ ہی نہیں البتہ ایشیا کا معاملہ توجہ طلب ہے جس میں عالم اسلام کے بیشتر ممالک واقع ہیں اور جہاں مشرق بعید کے بعض ممالک نئے عالمی استعمار کے مقابلے میں خم ٹھونک کر میدان میں آسکتے ہیں۔ عالم اسلام کے ضمن میں انہوں نے کہا کہ عرب دنیا دو غیر اہم ممالک یعنی لیبیا اور سوڈان کے سوا پورے کا پورا نیو ورلڈ آرڈر کے شکنجے میں جکڑا جا چکا ہے جہاں حکمران تو سب کے سب سر بسجود ہیں البتہ کچھ سر پھرے بنیاد پرست نوجوان جانیں ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں جو بڑی آسانی سے کچل دیئے جائیں گے۔ عربوں کی رسوائی کا یہ عمل خلیج کے بحران کے بعد مکمل ہوا ہے۔ غیر عرب مسلمان ملکوں میں ایران ایک منفرد اور ممتاز حیثیت کا مالک ہے جو اگرچہ شیعہ اسلام کا نمائندہ ہے تاہم واحد مسلمان ملک ہے جو حکومتی

سطح پر بنیاد پرستی کے اقرار کی ہمت رکھتا ہے' پھر بھی وہ امریکہ کی ہٹ لسٹ میں پہلے نمبر پر نہیں' پہلے نمبر پر پاکستان ہی ہے' لیکن یہاں کی بھی دونوں بڑی جماعتیں' سب قابل ذکر سیاسی قوتیں اور سب حکومتی ادارے نیو ورلڈ آرڈر کے سامنے سربسجود ہیں اور افسوس کہ ہماری فوج بھی نئے عالمی استعمار کی پولیس فورس بن چکی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اس کے باوجود امریکہ ہمارے درپے ہے تو اس لئے کہ یہاں متوسط طبقے میں بنیاد پرستی پائی جاتی ہے جو محض جذبات کا جھاگ نہیں بلکہ اس شعور و آگہی کا وزن رکھتی ہے جس کی تجدید علامہ اقبال نے کی اور وسیع نشرواشاعت میں مولانا مودودی جیسے مصنفوں نے حصہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم ایٹمی دانت بھی رکھتے ہیں جو چاہے دودھ کے دانت ہوں لیکن موجود ضرور ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مشرق بعید کے ممالک میں سے چین لوہے کا وہ چنا ہے جسے امریکہ اب تک چبا نہیں سکا۔ پھر شمالی کوریا کی طرف سے بھی نیو ورلڈ آرڈر کو کھٹکا ہے اور جاپان بھی اگرچہ عسکری قوت نہیں تاہم امریکی معیشت کے لئے مستقل خطرہ ہے۔ بھارت امریکہ کے قریب جا رہا تھا لیکن کشمیر پر اس کی نظریں بھانپ کر اس نے اپنی حکمت عملی یکسر بدل ڈالی ہے۔ چین سے بھارت نے اپنے تعلقات اس حد تک سنوار لئے ہیں کہ وہ ہم سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ چین جس کی دوستی پر ہمیں فخر اور اعتماد تھا اب کشمیر کے معاملے میں غیر جانبداری برتنے پر آ گیا ہے۔ اس پس منظر میں ہمسایہ برادر ملک ایران کی طرف سے جو تجویز آئی ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ یہ خیال تو بہت اچھا ہے کہ ہم ایک نئے بلاک کا حصہ بن کر نئے عالمی استعمار کا مقابلہ کریں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کی قیمت ہمیں کیا دینی ہو گی۔ اس کی قیمت کشمیر سے تقریباً دست برداری اور اس مسئلہ پر باہمی گفت و شنید سے بھی پہلے بھارت کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانا ہو گا۔ ہندو ذہنیت سے مصالحت کی کڑوی گولی نگلنا اور نفرت و انتقام کے ان جذبات کو سرد کرنا کیسے ممکن ہو گا جن کی بھٹی نصف صدی سے دہک رہی ہے اور بالخصوص ان حالات میں کہ ہم بالغ نظر اور حقیقی قومی قیادت سے بھی محروم ہیں جو ڈیگال کی طرح اپنی قوم سے حقائق تسلیم کرانے کی اہل ہو۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہماری قیادت تو اپنے سیاسی افلاس

کے باعث لوگوں کو اپنے پیچھے چلانے کی بجائے خود قوم کے پیچھے چلنے پر مجبور ہے۔
امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم امریکی عالمی استعمار کے مکمل آلۂ کار بن جائیں۔ اس صورت میں ہمیں ہتھیار اور امداد بھی مل جائے گی اور ممکن ہے کہ ہمارے ایٹمی پروگرام کی طرف سے بھی ایک بار پھر آنکھیں بند کرلی جائیں جیسے پہلے روس کو نیچا دکھانے کے لئے بند کرلی گئی تھیں لیکن کشمیر اس شکل میں بھی ہمیں نہیں مل سکے گا۔
ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ میں دونوں میں سے کسی بھی متبادل کی وکالت نہیں کرتا لیکن اس امر کی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ قوم کو درپیش اس نازک ترین مرحلے پر ہم سیاسی اور گروہی تعصبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے باہم گفتگو اور بحث و مکالمے کا آغاز کریں کیونکہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور بعد میں ہاتھ ملنے سے تو ظاہر ہے کہ ہمارا بھلا نہیں ہو گا۔
اپنی گفتگو مکمل کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ان دو راستوں کے علاوہ ایک راستہ اور ہے جس کی طرف ہمیں کلام الٰہی سے راہنمائی ملتی ہے۔ یہ ہدایتِ ربانی یوں ہے کہ "اے ایمان والو' یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ' یہ ایک دوسرے کے دوست اور پشت پناہ ہیں۔ جو تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا وہ انہی کے ساتھ ہو گا۔ تم دیکھو گے کہ وہ مسلمان جن کے دلوں میں نفاق کا روگ ہے وہ انہی کے اندر گھس رہے ہیں' کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کوئی مصیبت آنے والی ہے جس سے کوئی بچائے گا تو ہمارے یہی دوست"۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اس ہدایتِ ربانی میں ہمارے لئے جو سبق ہے وہ اپنی جگہ لیکن واقعہ یہ ہے کہ موجودہ عرب حکمرانوں پر تو یہ صد فیصد صادق آتی ہے۔ یہود و نصاریٰ نزول قرآن کے زمانے میں دوست نہ بھی رہے ہوں تو آج ان کا گٹھ جوڑ بہرحال سامنے کی بات ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ اس موقعہ پر جب ہمارے دوست ہمیں چھوڑ گئے ہیں' خدا اور خودی کی بیک وقت بازیافت کا ایک سنہری موقعہ ہمیں میسر آیا ہے جس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ ○○

قاضی حسین احمد سے اتفاق اور اختلاف

ڈاکٹر اسرار احمد

زیر نظر مضمون امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جناب قاضی حسین احمد کے امارت جماعت کے استعفے کے بعد اور امیر جماعت اسلامی کے لئے ہونے والے حالیہ الیکشن سے قبل سپرد قلم کیا تھا جو روزنامہ جنگ میں بالاقساط شائع ہوا۔ جیسا کہ اس مضمون میں امیر تنظیم نے بھی اس توقع کا اظہار کیا تھا' مذکورہ الیکشن میں محترم قاضی صاحب ہی نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی ہے اور کوئی بعید نہیں کہ جب تک یہ شمارہ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے قاضی صاحب محترم کی حلف برداری کا مرحلہ بھی طے ہو چکا ہو۔ قاضی صاحب نے بحیثیت امیر' جماعت اسلامی کو جس انداز سے چلایا اس کی مخالفت اور اس کے حق میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے' تاہم اس مضمون کے ذریعے چونکہ نہ صرف یہ کہ یہ بات بالکل روشن ہو کر سامنے آتی ہے کہ وہ کون سے امور ہیں جن میں امیر تنظیم اسلامی' محترم قاضی صاحب کی آراء سے اتفاق رکھتے ہیں اور کن معاملات میں انہیں قاضی صاحب کی رائے یا لائحہ عمل سے اختلاف رہا ہے' بلکہ آئندہ بھی جماعت اسلامی کی قیادت جس دوراہے سے دوچار ہو گی اس کا تعین بھی بڑے واضح انداز میں ہوتا ہے لہذا اسے یکجا اور مرتب صورت میں شامل شمارہ کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

ویسے تو یہ بات پہلے بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں تھی' لیکن اب جماعت اسلامی کی امارت سے قاضی حسین احمد کے استعفے کے خط نے تو اس حقیقت کو بالکل ہی طشت از بام کر دیا ہے کہ قاضی صاحب کی حمایت اور مخالفت کی شدّت نے جماعت کو بری طرح تقسیم کر دیا ہے۔ اور یہ پولارائزیشن جماعت کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ' اور عام ارکان اور کارکنان کے حلقوں سے بھی شدید ترکیفیت کے ساتھ جماعت کے ہمدردوں' بہی خواہوں' اور "سرپرستوں" کے حلقوں میں پائی جاتی ہے---- تاہم [illegible] علم میں پہلی بار آئی تھی کہ جماعت کے حامیوں اور ہمدردوں کے

ایک حلقے میں انہیں "جماعت اسلامی کا گورباچوف" قرار دیا جارہا ہے تو بہت حیرت ہوئی تھی۔ اور اگرچہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لفظ سب سے پہلے جماعت اسلامی کے قدیمی اور روایتی مخالف خان عبدالولی خان نے استعمال کیا تھا' تاہم میرے علم میں یہ لفظ جس گفتگو کے حوالے سے آیا اس میں چونکہ کچھ تذکرہ میرا بھی تھا' لہٰذا آج کی صحبت میں اسی کے ضمن میں کچھ وضاحتی گزارشات پیش خدمت ہیں۔

اس بحث کا پس منظر

اس گفتگو کے راوی ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم و مغفور کی قائم کردہ "آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس" کے موجودہ مدار المہام چودھری مظفر حسین صاحب ہیں۔ (میں تقریباً ڈھائی ماہ ملک سے باہر گزار کر وسط اکتوبر ۹۳ء میں واپس وطن آیا تھا۔ اور یہ گفتگو اس کے دو تین ہفتے بعد یعنی اواخر نومبر یا اوائل دسمبر کی ہے۔) چودھری صاحب راوی ہیں کہ جماعت اسلامی کے بعض وابستگان اور احباب کی ایک ایسی محفل میں' جس میں قاضی صاحب کے مخالفین جمع تھے' کسی صاحب نے اس ناچیز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "ڈاکٹر صاحب کے دل میں تو قاضی صاحب کے لئے بڑا نرم گوشہ محسوس ہوتا ہے!" جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے صاحب نے کہا: "ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ قاضی صاحب جماعت اسلامی کے گورباچوف ہیں!" جس پر پوری محفل زعفران زار بن گئی۔

یہ گفتگو خواہ لائٹ موڈ ہی میں ہوئی ہو بہرحال کچھ لوگوں کے ان خیالات کی ترجمانی یا کم از کم غمازی کرتی ہے کہ: (۱) میں جماعت کا مخالف اور بدخواہ ہوں۔ اور (۲) قاضی صاحب کے بارے میں اچھی رائے اس لئے رکھتا ہوں کہ ان کے ہاتھوں دانستہ یا نادانستہ طور پر جماعت اسلامی سوویٹ یونین کے سے حشر کے ساتھ دوچار ہو رہی ہے!

حقیقتِ حال

ان میں سے جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے' یہ مجھ پر بہت بڑا بہتان ہے۔ میں جماعت اسلامی کی قیامِ پاکستان کے بعد کی پالیسی کے ایک جزو سے یقیناً شدید اختلاف رکھتا ہوں' اور اسی کی بنا پر ۱۹۵۷ء میں جماعت کی رکنیت سے مستعفی بھی ہوا تھا' لیکن جماعت کا "مخالف یا بد خواہ" نہ میں پہلے کبھی تھا نہ اب ہوں۔ بلکہ میرے قریبی احباب اور رفقائے کار اس سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اکتوبر ۹۳ء کے انتخابات میں جو "حشر" پاکستان اسلامک فرنٹ کے عنوان سے جماعت اسلامی کا ہوا ہے اس کی بنا پر میں ایک شدید صدمے کی سی کیفیت سے دوچار رہا ہوں۔ اگرچہ یہ صدمہ انتخابات میں شکستِ فاش کا نہیں' بلکہ اس بات کا ہے کہ دل کے ایک گوشے میں جو امید اب تک کسی درجہ میں برقرار تھی کہ شاید ؏ "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!" کے مصداق جماعت اپنے سابقہ طریق کار کی جانب مراجعت کر لے' اس نے ؏ "اڑتے اڑتے دُور افق پر آس کا پنچھی ڈوب گیا!" کے سے انداز میں دم توڑ دیا۔ اس لئے کہ ایک تو جماعت شدید انتشار اور خلفشار سے دوچار ہو گئی' چنانچہ "بنیانِ مرصوص" تو کجا وہ "ون پیس" بھی نہ رہی' اور دوسرے اس نے اپنی انتخابی مہم کے دوران جو گھٹیا اور بازاری' اور دینی اعتبار سے صرف مکروہ ہی نہیں حرامِ مطلق طور طریقے اختیار کئے ان کے باعث اپنے دینی اور مذہبی تشخص کو تو بالکل ؏ "میرے اسلام کو اِک قصۂ ماضی سمجھو!" کے سے انداز میں خیرباد کہہ دیا! رہی یہ بات کہ وہ اس کے باوجود لیلائے اقتدار کے ساتھ ؏ "ہنس کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!" کے مصداق ہمکنار نہ ہو سکی' تو یہ "خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃ" کی منہ بولتی تفسیر ہے' جس پر سوائے "اِنَّا لِلّٰہ و انا الیہ راجعون!" پڑھنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے!

بہرحال اس ضمن میں میں اس وقت کوئی نئی بات کہنے کی بجائے اپنی اب سے لگ بھگ بارہ برس قبل کی ایک تحریر نقل کر رہا ہوں جو ایک خط کی صورت میں ہے جو اُس

وقت کے امیر جماعت میاں طفیل محمد صاحب کے نام لکھا گیا تھا' اور ماہنامہ "میثاق' لاہور کی جولائی ۸۲ء کی اشاعت میں بھی شائع ہو گیا تھا اور اب "تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب" نامی تالیف میں بھی صفحات ۳۲۵ تا ۳۲۷ پر مطبوعہ موجود ہے۔ وہو ہذا:

" محترمی و مکرمی میاں صاحب! السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ'!

مزاج گرامی!

مسلمان معاشرے میں خواتین کے فرائض اور دائرۂ کار کے بارے میں میری ایک رائے کے خلاف جو مظاہرہ کراچی کی کچھ مغرب زدہ خواتین کی جانب سے ہوا تھا اس پر آپ کا جو مومنانہ ردعمل سامنے آیا اور میرے ٹی وی پروگرام "الہدیٰ" کو جاری رکھنے کا جو پرزور مطالبہ آپ نے کیا اس پر میری جانب سے ہدیۂ تشکر قیم تنظیم اسلامی قاضی عبدالقادر صاحب نے آپ کو پہنچا دیا تھا اور اس پر آپ کا جواب بھی جناب اسلم سلیمی صاحب کی وساطت سے مجھے مل گیا تھا۔ یعنی یہ کہ آپ نے جو کچھ کیا نصحِ دینی کے جذبے کے تحت اور اپنا فرض سمجھ کر کیا جس پر کسی شکریئے کی آپ کو ضرورت نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ بھی آپ کے خلوص و اخلاص ہی کا مظہر ہے! (حال ہی میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے ایک بزرگ رفیق کار شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے بھی آپ کو شکریئے کا خط لکھا تھا اور ان کے نام جوابی خط میں بھی آپ نے ان ہی جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔)

میرے اس عریضے کی تحریر کا اصل محرک آپ کی اس تقریر کی اخباری رپورٹ ہے جو آپ نے پچھلے دنوں لاہور میں "تعلیم القرآن کانفرنس" میں کی تھی جس میں اس اخباری اطلاع کے مطابق آپ نے جملہ مسلمانانِ پاکستان کو دعوت دی تھی کہ وہ اسلام اور قرآن کی اساس پر متحد ہو جائیں.... اس ضمن میں میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ اخباری اطلاع درست ہے تو

آپ کے پاس اِس اتحاد کے لئے تفصیلی پروگرام کیا ہے؟ اور آیا اس سے مراد کالعدم جماعت اسلامی (واضح رہے کہ اس زمانے میں سیاسی جماعتوں پر عمومی پابندی کے نتیجے میں جماعت اسلامی بھی، اگرچہ فی الواقع بہت فعال، تاہم قانونی طور پر "کالعدم" تھی) میں شمولیت کی دعوت ہے؟ یا یہ کسی وسیع تر دینی اتحاد کی پیشکش ہے؟ اور اگر یہ وسیع تر دینی اتحاد کی دعوت ہے تو بالفرض اگر میں آپ کی اس پکار پر لبیک کہوں تو ایک طرف مجھے کیا تقاضے پورے کرنے ہوں گے اور آپ کی مجھ سے توقعات کیا ہوں گی، اور دوسری طرف اِس مجوزہ ' تَعاوُن عَلَی البِرِّ وَالتَّقوٰی ' کے ضمن میں اشتراکِ عمل کے لئے کون سا میدانِ کار آپ کے سامنے ہے؟

میں چونکہ یہ سوال محض سرِراہے، یا برسبیلِ شغل نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس میں پوری طرح سنجیدہ ہوں لہٰذا۔۔۔ اس کے باوصف کہ میرا گمان ہے کہ تحریک اسلامی کے قائد ہونے کے ناطے آپ ان امور سے ناواقف نہیں ہوں گے۔۔۔ تاہم اپنے بارے میں چند وضاحتیں کئے دیتا ہوں:

(۱) مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے مجموعی دینی فکر میں دین کے باطنی عنصر (یعنی وہ Esoteric Element جو عام طور پر "تصوف" کے عنوان سے جانا پہچانا جاتا ہے) کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے کے باوجود دین کا جو انقلابی اور تحریکی تصور انہوں نے پیش فرمایا اور خصوصاً فرائضِ دینی کی جو نشان دہی انہوں نے کی اس کا میں نہ صرف یہ کہ پوری طرح قائل ہوں بلکہ اپنی بساط بھر اس پر عامل بھی ہوں۔۔۔۔ فلِلّٰہ الحَمد !!

(۲) جماعت اسلامی کی قبل از تقسیم ہند پالیسی کو مجموعی اعتبار سے میں آج بھی صحیح سمجھتا ہوں۔ البتہ جماعت اسلامی پاکستان کی بعد از تقسیم پالیسی کو میں صرف غلط ہی نہیں سابقہ موقف سے انحراف کا مظہر سمجھتا ہوں۔۔۔۔ اور اپنی مقدور بھر کوشش اس امر کی کر رہا ہوں کہ اس سابقہ نہج پر ایک تحریک دوبارہ اٹھے۔ اور اگرچہ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے

اور تحریکیں روز روز نہیں اٹھا کرتیں لیکن اپنے شعورِ فرض کے مطابق کوشش کرتے ہوئے جان جاں آفریں کے سپرد کردینے میں' میں کامیابی کی واحد صورت مضمر دیکھتا ہوں۔ لہٰذا جیسے تیسے کوشش میں لگا ہوا ہوں تاکہ اور کچھ نہیں تو اللہ تعالیٰ کے حضور "معذرت" تو پیش کر سکوں!

(۳) میں دیکھ رہا ہوں کہ ثلث صدی کی سیاسی جدوجہد کے حاصل اور دوبارہ کے شدید مایوس کن اور تلخ تجربوں کے بعد اب جماعت کا مجموعی رخ سیاست سے دعوت و تبلیغ کی طرف مڑ رہا ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اس تبدیلی میں انقلابی رنگ شعوری اور واضح طور پر اجاگر نہ ہوا تو یہ تبدیلی مفید نہیں بلکہ مضر ہوگی۔ اور اس انقلابی رنگ کو شعوری اور واضح طور پر از سرِ نو اجاگر کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ سابقہ غلطی کا واضح اور برملا اعتراف و اعلان ہو ----- اور یہی وہ اصل مشکل ہے جس کے حل کی کوئی امید نہیں' بقول اقبال ؏ "منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں!" تاہم اس سب کے باوجود ----- اگر کسی وسیع تر دینی اتحاد اور اشتراکِ عمل کا کوئی واضح پروگرام آپ کے سامنے ہو تو ان شاء اللہ العزیز آپ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس ضمن میں "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" کی سی شان کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے پائیں گے!!

اگر آپ اس سلسلے میں مجھ سے کسی گفتگو یا تبادلۂ خیال کی ضرورت محسوس فرمائیں تو بلا جھجک جب چاہیں طلب فرمالیں' میں بخوشی حاضر ہو جاؤں گا۔ فقط والسلام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ "

اپنے اس خط پر اِس وقت میں ان چند جملوں کا اضافہ مزید چاہتا ہوں کہ:

(۱) میرے نزدیک اِس وقت پورے عالمِ اسلام میں احیائے اسلام کی جو عظیم لہر چل رہی ہے' جسے اسلام کے دشمن "اسلامک فنڈامنٹلزم" کے نام سے موسوم کر رہے

ہیں، وہ ایک ہی عظیم تر تحریک ہے، جس میں مختلف مسلمان ممالک کے مقامی حالات اور نفسیات کے فرق کی بنا پر جو فرق و تفاوت ہے وہ بس اسی نوعیت کا ہے جس کی عکاسی نعیم صدیقی صاحب کا یہ شعر کرتا ہے کہ ۔

ہے ایک ہی جذبہ، کہیں واضح، کہیں مبہم
ہے ایک ہی نغمہ، کہیں اونچا، کہیں مدھم!

(۲) برعظیم پاک و ہند میں اس تحریک کے لئے ذہنی اور فکری فضا تو علامہ اقبال نے ہموار کی تھی، لیکن اس کی اساس پر دعوت و تنظیم کی عملی پیشقدمی اولاً شروع کی تھی مولانا ابوالکلام آزاد نے "حزب اللہ" کی صورت میں، اور ان کے مایوس اور بددل ہو کر اس سے دستکش ہو جانے کے بعد، اس کا پورے زور و شور کے ساتھ "اِحیاء" کیا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے "جماعت اسلامی" کی شکل میں! جو غیر منقسم ہندوستان میں تو قومی سیاست کے دھارے سے علیحدہ رہ کر "ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت" کی حیثیت سے کام کرتی رہی لیکن قیام پاکستان کے بعد اس نے "ایک اسلام پسند قومی سیاسی جماعت" کا رول اختیار کر لیا۔

(۳) تاہم یہ میرے نزدیک جماعت اسلامی پاکستان کا صرف جماعتی رول ہے، عظیم تر تحریک اسلامی کا اصل اور اصولی رول نہیں! اور میرے نزدیک اصل اہمیت نہ افراد و اشخاص کی ہے، نہ جماعتوں اور تنظیموں کی، بلکہ اس عظیم تر تحریک کی ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، لہٰذا میں خود جماعت اسلامی پاکستان سے تو یقیناً جدا بھی ہوں، اور اختلاف بھی رکھتا ہوں، لیکن اس اصل اصولی انقلابی تحریک اسلامی سے بحمد اللہ نہ صرف یہ کہ آج تک پوری "وفاداری بشرطِ استواری" کی سی کیفیت کے ساتھ وابستہ ہوں، بلکہ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اس سے کسی پسپائی یا معنوی ارتداد اختیار کرنے سے قبل میری موت واقع ہو جائے۔

قاضی صاحب کے بارے میں میری رائے!

رہی قاضی حسین احمد صاحب کے بارے میں میری رائے تو اس کے ضمن
فطری اور طبعی طور پر وقتاً فوقتاً اور درجہ بدرجہ کچھ تبدیلیاں آتی رہی ہیں جن کے ض
میں کسی قدر تفصیلی وضاحت کی ضرورت ہے۔

چنانچہ جہاں تک ان کی ذاتی صلاحیتوں کا تعلق ہے اس میں کسی اختلاف
گنجائش نہیں ہے کہ وہ ایک نہایت باصلاحیت' محنتی' فعال اور متحرک انسان ہیں
اور اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ انہوں نے جماعت اسلامی کو اس گومگو
تذبذب بلکہ جمود کی کیفیت سے نکال کر جس میں وہ میاں طفیل محمد صاحب کے
امارت اور خصوصاً جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دورِ حکومت میں مبتلا رہی تھی ایک با
واقعتاً ایک زندہ' متحرک اور فعال جماعت بنادیا تھا۔ تاہم مجھے ان سے اصل توقع ا
بات کی تھی کہ وہ جماعت کو اقتدار کی کشاکش اور انتخابی سیاست کی دلدل سے نکال
کسی انقلابی طریق کار پر عمل پیرا کرسکیں گے۔

میری اس امید کی سب سے بڑی بنیاد یہ تھی کہ ان کا ایک نہایت گہرا اور قر
تعلق افغان جہاد سے رہا تھا اور افغان رہنماؤں میں سے ان کے خصوصی تعلقا
گلبدین حکمت یار صاحب کے ساتھ رہے تھے' جن کے بعض اقدامات سے تو مجھے
اختلاف ہے' لیکن ان کے ایک انقلاب آفریں شخصیت کے حامل ہونے میں مجھے ک
شک نہیں ہے' بلکہ مستقبل میں افغانستان میں اسلام کی عملی سربلندی کی امیدیں
ہی کی ذات سے وابستہ ہیں۔ اور اب سے سات آٹھ سال قبل جب حکمت یار صاح
نے مجھے اپنے اس کیمپ' کے معائنے کی دعوت دی تھی جو وارسک ڈیم سے متصل وا
تھا تو اس موقع پر ان سے جو مفصل گفتگو ہوئی تھی اس کا حاصل یہی تھا کہ انہوں
قاضی صاحب کو قائل کرلیا ہے کہ اس انتخابی سیاست کے راستے سے پاکستان
اسلامی نظام کے قیام کا مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا' اس کے لئے کسی متبادل راستے

تلاش لازمی ہے!

اس کے کچھ عرصہ کے بعد ایک اطلاع مجھے ملتان سے ملی' جس سے اس امید کو مزید تقویت حاصل ہوئی' اور وہ یہ کہ وہاں ایک تقریب میں جماعت کے ایک اہم رکن بلکہ رہنما جناب صادق خان خاکوانی نے قاضی صاحب سے اپنے چھوٹے بھائی کا تعارف کراتے ہوئے' جنہوں نے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کرلی تھی' کسی قدر استہزائیہ انداز میں کہا: "انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے بیعت کرلی ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کریں گے!" تو غالباً وہ قاضی صاحب سے تو اپنے اس طنز کے نہلے پر کسی دہلے کے انتظار میں تھے' لیکن قاضی صاحب نے یہ کہہ کر انہیں مایوس کردیا کہ "کوئی تیر تو اب تک ہم نے بھی نہیں مار لیا ہے!"

قصہ مختصر' اس نوع کی متعدد اطلاعات سے میری اس امید کو' جس کا تذکرہ پہلے ہوچکا ہے' تقویت حاصل ہوئی تھی کہ قاضی صاحب کے ہاتھوں ان شاء اللہ جماعت کی پالیسی میں بنیادی تبدیلی آجائے گی اور وہ دوبارہ اپنے دعوتی و انقلابی طریق کار پر عمل پیرا ہوجائے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں وہ "بنیادی تبدیلی" آئی تو ضرور لیکن غالب کے اس قول کے مطابق کہ ع "آئیں وہ یاں خدا کرے' پر نہ خدا کرے کہ یوں!" بالکل برعکس سمت میں!

اے بسا آرزو.....

جماعت اسلامی کی امارت کا منصب سنبھالنے کے بعد قاضی صاحب کے مزاج میں جو تبدیلیاں آئیں ان کے بارے میں' واقعہ یہ ہے کہ' میں تاحال یہ فیصلہ نہیں کرپایا کہ آیا وہ ع "دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر!" کے برعکس صورت حال کا نتیجہ تھیں' یا اس کا کہ ان کے ذہن' قلب اور مزاج پر جماعت کے اندر ہی کے کسی ایسے "قبضہ گروپ" کا تسلط ہوگیا جو قوت و اقتدار کی سیاست کا خوگر' رسیا اور ماہر ہے' یا اس کا کہ وہ نادانستہ طور پر جماعت کے باہر کے کسی حلقے کے آلہ کار بن گئے؟ (جیسا کہ

بہت سے لوگوں کا خیال ہے!) ---- واللہ اعلم!

بہر صورت میرا ماتھا اولاً تو اس وقت ٹھنکا تھا جب انہوں نے اینٹی انڈیا بیانات میں وہ انداز اختیار کیا تھا جو کسی عوامی اور خالص سیاسی جماعت کی تیسری چوتھی صف کے کارکنوں کے لئے تو مناسب ہو سکتا تھا' جماعت اسلامی ایسی ثقہ اور سنجیدہ دینی جماعت' اور اس کے بھی امیر کے ہرگز شایانِ شان نہ تھا! اور پھر خلیج کی جنگ کے دوران جو روش انہوں نے اختیار کی وہ تو ان خالص "سیاسی حیوانوں" کی روش سے قطعاً مختلف نہ تھی جن کا مقصدِ زندگی ہی صرف یہ ہوتا ہے کہ عوامی جذبات کی کسی بھی چڑھتی لہر پر سوار ہو کر جلد از جلد ایوانِ اقتدار تک پہنچ جائیں' قطع نظر اس سے کہ جذبات کا وہ ریلا دُور رس اور دیرپا نتائج کے اعتبار سے ملک و قوم کے لئے مضر بلکہ مہلک ہی ہو! ----- مزید بر آں' اس کے ضمن میں عام سیاستدانوں کی معروف روش کے مطابق انہوں نے "کہہ مکرنی" کا جو سلسلہ اختیار کیا اس سے خواہ جماعت کے عام کارکنوں کی کچھ تسلی ہو گئی ہو' جملہ سیاسی و صحافتی حلقوں میں ان کی عزت اور وقار کا دھیلا ہو گیا!

اس کے بعد جب جماعت اسلامی قاضی صاحب کی قیادت میں "آئی ایس آئی" کے ذریعے وجود میں آنے والی "آئی جے آئی" میں شریک ہوئی تو اگرچہ یہ اتحاد ان ہی "جاگیرداروں اور سرمایہ داروں" کے ساتھ تھا جن کے خلاف نعروں سے جماعت کے کارکنوں نے چند ہی دن پہلے لاہور کی دیواروں کو سیاہ کر دیا تھا' تاہم میرے نزدیک یہ بھی اسی سیاسی مزاج اور حکمت عملی کی توثیق مزید تھی جس پر جماعت تو ایک طویل عرصے سے کاربند تھی ہی' اب واضح ہو گیا تھا کہ قاضی صاحب بھی اس رخ پر گامزن ہیں!

البتہ جب انتخابات میں آئی جے آئی کی کامیابی کے بعد اس میں شامل رہتے ہوئے جماعت نے حکومت میں شمولیت سے انکار کر کے ایک "داخلی محتسب" کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا تو اگرچہ مروّجہ سیاست کے اصولوں کے اعتبار سے تو یہ ایک غیر منطقی اور غیر اصولی بات تھی' تاہم میں نے اسے جماعت کے تشخص کو از سرِ نو بحال کرنے کی

سعی کی حیثیت سے جماعت کی اپنے اصولی انقلابی طریق کار کی جانب مراجعت کے امکان کا مظہر قرار دیتے ہوئے خوش آمدید کہا تھا۔

قاضی صاحب سے براہ راست رابطہ

انہی دنوں جناح ہال لاہور میں مولانا سید حامد میاںؒ (مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور و نائب امیر جمعیت علماء اسلام پاکستان) کی یاد میں ایک جلسہ مولانا خان محمد مدظلہ' سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ کندیاں' و صدر مجلس تحفظِ ختم نبوت پاکستان' کی صدارت میں منعقد ہوا' جس میں دوسرے بہت سے مقررین کے ساتھ ساتھ خطاب کی دعوت مجھے بھی تھی اور قاضی صاحب کو بھی' تو وہاں یہ واقعہ پیش آیا کہ جلسے کے سٹیج سیکریٹری مولانا سعید الرحمٰن علوی صاحب تقریباً ہر مقرر کو دعوتِ خطاب دیتے ہوئے یہ اپیل کرتے رہے کہ خدارا اس انتخابی سیاست سے کنارہ کش ہو کر کسی متبادل طریق کار پر غور فرمایئے۔ چنانچہ جب میری باری آئی تو میں نے عرض کیا کہ "سب جانتے ہیں کہ میرے تو یہ دل کی آواز ہے' تاہم اس پر گفتگو اس قسم کے جلسۂ عام میں نہیں محدود انداز کی مشاورتی مجالس میں ہونی چاہئے"۔ میں تو اپنی ایک مجبوری کے باعث تقریر کر کے واپس آ گیا۔ اُس وقت تک' جہاں تک یاد پڑتا ہے' قاضی صاحب وہاں تشریف بھی نہیں لائے تھے۔ بعد میں مجھے اطلاع ملی کہ قاضی صاحب کا ردِّ عمل اس پر بہت مثبت تھا اور انہوں نے صدرِ جلسہ مولانا خان محمد مدظلہ' سے درخواست کی کہ اس معاملے میں وہ ہی کسی گفت و شنید کا آغاز فرمائیں۔ چنانچہ اس پر دل میں پھر امید کے کچھ چراغ روشن ہوئے اور میں نے ٨ جنوری ١٩٩١ء کو قاضی صاحب کی خدمت میں حسب ذیل خط ارسال کیا :

" محترم برادرم قاضی حسین احمد صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ' مزاج گرامی!

٥ جنوری کی شام کو جلسہ بیاد مولانا سید حامد میاںؒ میں میں نے عرض کیا تھا

کہ پاکستان میں اقامتِ دین اور نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے سلسلے میں طریق کار کے بارے میں باہمی مشاورت یا کم از کم تبادلہ خیالات کی صورتیں نکالی جانی چاہئیں---- مجھے تو اپنی ایک معروفیت کے باعث فوراً ہی روانہ ہو جانا پڑا تھا ---- شیخ جمیل الرحمٰن صاحب سے معلوم ہوا کہ بعد میں آپ نے اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مولانا خان محمد صاحب سے اس سلسلہ میں initiative لینے کی فرمائش کی تھی---- میری حقیر رائے میں اس سلسلہ میں کسی بڑے اجتماع کے انعقاد سے قبل نجی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جانا چاہئے۔ پھر اگر ان میں کوئی مثبت پیش رفت ہو تو بات آگے بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔

مجھے ۳۶ سال قبل کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے---- یہ اواخر نومبر یا اوائل دسمبر ۵۴ء کی بات ہے' میں ایم بی بی ایس سے فارغ ہو کر ابھی منٹگمری (ساہیوال) پہنچا ہی تھا' مولانا مودودی مرحوم ان دنوں ملتان جیل میں نظر بند تھے ------ منٹگمری سے چند لوگ ان سے ملاقات کے لئے ملتان گئے تھے جن میں میں بھی شامل تھا۔ اس ملاقات میں میں نے مولانا سے یہ مختصر سوال کیا تھا: "کیا ابھی آپ اس طریق کار سے مایوس نہیں ہوئے جو آپ نے بعد از قیامِ پاکستان اختیار فرمایا تھا؟" مولانا کا بھی اتنا ہی مختصر جواب تھا: "ابھی میں اس طریق کار کے لئے راستے بند نہیں پا رہا!"

آج بھی میں اسی سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے آپ سے ملاقات کا خواہشمند ہوں کہ: "کیا آپ ابھی اس کے قائل نہیں ہوئے کہ انتخابی سیاست سے کامل کنارہ کشی کر کے خالص پریشر گروپ کا رول اختیار کیا جائے؟"---- میرے خیال میں جماعت اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ leading role ادا کر سکتی ہے بلکہ دوسرے تمام حلقوں کے مخلص کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتی ہے! تاہم تفصیل ملاقات ہی میں بیان ہو سکتی ہے!

آخر میں اس شرط کا اعادہ مناسب سمجھتا ہوں جس کا ذکر میں نے اپنی تقریر میں بھی کیا تھا۔۔۔۔ یعنی یہ کہ کسی بھی گفت و شنید اور تبادلہ خیالات کی افادیت اور نتیجہ خیزی اس بات سے مشروط ہے کہ جانبین ایک دوسرے کو مخلص سمجھتے ہوں۔ الحمدللہ کہ مجھے ذاتی طور پر آپ کے خلوص پر پورا اعتماد ہے۔۔۔۔۔ اب اگر آپ بھی اپنے دل میں یہ احساس موجود پائیں کہ میں احیاءِ اسلام' اور اقامتِ دین کے بلند و بالا مقاصد کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتا ہوں اور جماعت اسلامی سے میرا اختلاف صرف طریق کار کا ہے۔۔۔۔۔ تو اتوار ۱۳ جنوری سے جمعرات ۱۷ جنوری تک کسی بھی دن' کسی بھی وقت' خواہ آپ زحمت فرمالیں' خواہ مجھے طلب فرمالیں'۔۔۔۔ پہلی صورت کو اپنے لئے باعثِ اعزاز' اور دوسری کو موجبِ سعادت سمجھوں گا

بصورتِ دیگر۔۔۔۔ یعنی اگر آپ کو میرے خلوص پر اعتماد نہ ہو تو اس خط کو پھاڑ کر پھینک دیجئے' کسی جواب کی بھی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

فقط والسلام' خاکسار اسرار احمد عفی عنہ "

اس کے جواب میں' میں ممنون ہوں کہ' قاضی صاحب نے مجھے ہی "سعادت کے حصول کا موقع عنایت فرمایا۔ چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور حسب ذیل گذارشات پیش کیں۔ (واضح رہے کہ یہی گذارشات میں اس سے قبل کراچی میں جناب محمود اعظم فاروقی اور پروفیسر عبدالغفور احمد کی خدمت میں بالمشافہ پیش کر چکا تھا!)

" اگر جماعت اسلامی مستقل طور پر' یا جیسے کہ جماعت کے ایک سابق رکن (جنہیں جماعت سے خارج کر دیا گیا تھا) ڈاکٹر محمد امین صاحب نے کہا تھا' کم از کم آئندہ پچیس برس کے لئے انتخابات کے میدان سے کنارا کشی کا اعلان کر دے' تو اس سے حسب ذیل دو مثبت نتیجے تو فوری طور پر نہ صرف جماعت اسلامی' بلکہ بحیثیتِ مجموعی خود دین و مذہب' اور ملت و امت کے حق

میں برآمد ہوں گے:

ایکؔ یہ کہ پاکستان کے تمام دینی جذبات کے حامل عوام کو جو شدید شکایت ہر انتخاب کے بعد جملہ مذہبی جماعتوں سے پیدا ہوتی ہے' یعنی یہ کہ یہ جماعتیں اپنی اپنی انفرادی حیثیت میں الیکشن میں حصہ لے کر اور اس طرح اسلام کے حامی ووٹوں کو تقسیم کرا کے لادینیت' الحاد' اور اباحیت کے علمبرداروں کی فتح کا سبب بن جاتی ہیں' اس سے کم از کم جماعت بری ہو جائے گی۔ اور یہ DISCREDIT کم از کم اس کے حصے میں نہیں آئے گا۔ جس سے عوام میں جماعت کے لئے ہمدردی اور حمایت کے جذبات پیدا ہوں گے جو کسی آئندہ فیصلہ کن مرحلے پر اہم ہی نہیں حقیقتاً "فیصلہ کن" ثابت ہو سکتے ہیں۔

دوسرےؔ یہ کہ چونکہ سب جانتے ہیں کہ جماعت کا ایک چھوٹا یا بڑا ووٹ بینک بہرحال موجود ہے' لہٰذا جملہ مذہبی اور سیاسی جماعتیں جماعت کا رخ کریں گی اور چاہیں گی کہ جماعت کے ووٹران کے امیدواروں کے حق میں رائے دیں۔ اس سے ایک جانب اس فرقہ واریت کی شدت میں کمی ہو گی جو سب کے نزدیک پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اور دوسری جانب عام سیاسی جماعتوں سے بھی متعین معاملات میں ایسی COMMITMENTS حاصل کی جا سکیں گی جو اسلام کے قیام و نفاذ میں مفید و معاون ثابت ہوں۔

پھر انتخابی سیاست کے محاذ سے کنارہ کش ہو کر جماعت جب اپنی پوری قوت کو ذہنی و فکری اور عملی و اخلاقی انقلاب اور نہی عن المنکر پر مرکوز کر دے گی تو اس سے بھی بہت قلیل مدت کے اندر اندر دوؔ مثبت نتائج پیدا ہوں گے :

ایکؔ یہ کہ جماعت کا اپنا تنظیمی قاعدہ (BASE) اپنے جملہ موجودہ اخلاقی و عملی معیارات کو برقرار رکھنے کے باوجود وسیع ہو گا جس سے مستقبل

کے کسی اقدام کے لئے اصل قابل اعتماد قوت فراہم ہو گی۔

اور دوسری جانب باقی تمام دینی و مذہبی جماعتوں کے مخلص کارکن بھی جماعت کی جانب کشش محسوس کریں گے۔ اس لئے کہ اس حقیقت کو تو سب لوگ برملا تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی نظام کا نفاذ اس انتخابی راہ سے ممکن نہیں ہے، تاہم چونکہ کوئی قابل لحاظ متبادل قوت میدان میں موجود نہیں ہے، لہٰذا چاروناچار "جمودِ محض کے مقابلے میں تو بغیر آگے بڑھے اپنے مقام پر کھڑے کھڑے حرکت کرتے رہنا یعنی MARK-TIME بھی بہتر ہے!" کے اصول کے تحت اپنی اپنی تنظیموں کے ساتھ منسلک ہیں۔"

قاضی صاحب نے میرا اکرام بھی بہت فرمایا، اور طعام بھی بہت اعلیٰ کھلایا، مزید برآں میرے استدلال کی صحت کو بھی تسلیم کیا، لیکن آخری بات یہ فرمائی کہ یہ تمام کام انتخابی عمل میں شرکت و شمولیت کے ساتھ ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ بھی جماعت میں شامل ہو جائیں اور خود اسی نہج پر کام کرتے رہیں۔ اس سے میں نے شدت کے ساتھ اختلاف کیا اور عرض کیا کہ میرے نزدیک ان دونوں کاموں کے تقاضے اتنے مختلف ہی نہیں اس قدر متضاد ہیں کہ کسی ایک "چھت" کے نیچے انہیں جمع نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ میں نے اپنی اس پرانی پیشکش میں، کہ اگر جماعت انتخابی عمل سے دستکش ہونے کا اعلان کر دے تو میں اپنے تمام ساتھیوں سمیت جماعت میں شامل ہو جاؤں گا، یہ کمی تو ڈاکٹر محمد امین صاحب کی تجویز کے سامنے آتے ہی کر دی تھی کہ مستقل طور پر نہ سہی اگر الیکشن سے کنارہ کشی کا فیصلہ کم از کم پچیس سال کے لئے کر لیا جائے تو بھی میں شمولیت اختیار کر لوں گا، لیکن اس واضح اعلان کے بغیر میں اپنے نقشۂ کار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا بلکہ جو کام اس وقت کر رہا ہوں، وہ جس پیمانے پر بھی مجھ سے بن آ رہا ہے، کرتا رہوں گا۔ چنانچہ اسی بات پر ہماری گفتگو اور ملاقات اختتام کو پہنچ گئی۔

قاضی صاحب سے ایک دوستانہ گلہ

اب اس سے قبل کہ میں اپنی چند ان باتوں کی "وضاحت" کروں جو میں نے الیکشن ۹۳ء سے قبل قاضی صاحب کی بعض آراء کی تائید و تصویب میں کہی تھیں، قاضی صاحب سے ایک دوستانہ گلہ ریکارڈ پر لے آنا چاہتا ہوں جو مجھے اپنے حالیہ سفرِ حجازِ مقدس کے دوران ان کی ایک گفتگو کے حوالے سے پیدا ہوا ہے۔ یہ گیارہ یا بارہ جنوری کی بات ہے کہ جدہ میں جماعت اسلامی کے دو وابستگان سے گفتگو کے دوران قاضی صاحب کا یہ قول نقل ہوا کہ: "کوئی متبادل طریق کار تو ڈاکٹر صاحب نے بھی پیش نہیں کیا!" ---- قاضی صاحب کو میری رائے کو رد کر دینے کا اختیار جس طرح اس سے قبل حاصل تھا اب بھی حاصل ہے اور وہ یہ بھی کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ جو متبادل راستہ میں پیش کر رہا ہوں وہ ناقابل عمل ہے، لیکن "منہج انقلابِ نبوی ﷺ" کے موضوع پر میری بے شمار تقاریر، اور ان کے آڈیو اور وڈیو کیسٹوں پر مستزاد پونے چار سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب جس میں میں نے اس موضوع پر بھی اپنی رائے تفصیل کے ساتھ پیش کر دی ہے کہ آج کے بدلے ہوئے حالات میں نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے آخری مرحلے کے ضمن میں کیا اجتہادی تبدیلی ضروری ہے---- اور ان سب پر مستزاد میری اس مفصل ملاقات کے بعد بھی اس "تجاہلِ عارفانہ" پر سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے!

عَنِ الحَارِثِ الاشعری، قَالَ، قَالَ رسُولُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ:
"اٰمُرُکُم بِخَمسٍ
بِالجَمَاعَةِ وَالسَّمعِ وَالطَّاعَةِ وَالهِجرَةِ وَالجِهَادِ فِی سَبِیلِ اللہِ"
(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد و جامع ترمذی)

الیکشن ۹۳ء سے قبل
قاضی صاحب سے اتفاق اور اختلاف

الیکشن ۹۳ء سے قبل قاضی حسین احمد صاحب نے جن آراء اور خیالات کا اظہار کیا ان میں سے تین امور کی میں نے بھرپور اور اعلانیہ تائید کی تھی' چنانچہ اُس وقت بھی میں نے اس کا اظہار نہ صرف یہ کہ اپنے لاہور اور کراچی کے خطباتِ جمعہ میں کیا تھا بلکہ دوسرے بہت سے مقامات پر خطاباتِ عام میں بھی کیا تھا' اور آج بھی میں ان تینوں باتوں کی صداقت اور حقانیت پر پورا انشراحِ صدر رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ خود میرے ذاتی مشاہدات اور غور و فکر کے نتائج ہیں اور ان کے ضمن میں میرا اور قاضی صاحب کا معاملہ ع "متفق گردید رائے بو علی با رائے من!" کا مصداقِ کامل ہے۔ وہ تین امور حسب ذیل ہیں:

(۱) اولین اور اہم ترین بات یہ ہے کہ قاضی صاحب کا عالمی صورت حال کا یہ مشاہدہ (GLOBAL PERPCEPTION) بالکل درست ہے کہ مولانا ظفر علی خان کے اس شعر کے مصداق کہ۔

"بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں' اک ساورکر اک گاندھی ہے
اِک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے' اِک مکر کی اٹھتی آندھی ہے!"

اس وقت دنیا میں "نیو ورلڈ آرڈر" کے عنوان سے ایک نیا عالمی سامراج "چلتے ہوئے جھکڑ" اور "اٹھتی ہوئی آندھی" کے مانند چھاتا چلا جا رہا ہے ---- مزید بر آں پاکستان کی دونوں قابل ذکر سیاسی قوتوں سمیت' یہاں کے جملہ مقتدر حلقے اس کی بالادستی کو طوعاً یا کرہاً قبول کر چکے ہیں۔

(۲) پاکستان کی موجودہ دونوں بڑی سیاسی قوتیں' یعنی پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نواز شریف گروپ' صرف نئے عالمی سامراج کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے ہی کے

اعتبار سے بالکل مساوی نہیں' دیگر جملہ اعتبارات سے بھی ان کے مابین کوئی بنیا
فرق موجود نہیں ہے۔ چنانچہ خالص دینی اعتبار سے عرض ہے کہ اگرچہ ویسے تو
مسلمان ہم سب اور نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کے اکثر کلمہ گو ہیں ویسے ہی مسلہ
پیپلز پارٹی سے وابستہ لوگ بھی ہیں اور مسلم لیگ سے منسلک لوگ بھی' لیکن ان دو
سیاسی قوتوں کے سماجی اور تمدنی نظریات' اور سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام
بارے میں موقف کے مابین فرق و تفاوت کو "بلا تشبیہ" کفر اور نفاق کے فرق سے تو
کیا جا سکتا ہے۔ یعنی جہاں پیپلز پارٹی کھلم کھلا اور اعلانیہ طور پر سیکولر جماعت۔
چنانچہ اس کی قیادت اسلام کے عائلی نظام کو ظالمانہ' اس کی سماجی اقدار کو دقیانوسی ا
"مولویانہ" اور شریعتِ اسلامی کی معین کردہ حدود و تعزیرات کو "وحشیانہ" قرار د
ہے اور جداگانہ انتخابات تک کی علی الاعلان مخالف ہے' وہاں مسلم لیگ بھی اگر
اپنے نام کی رعایت سے اسلام اور نظریۂ پاکستان سے ذہنی تعلق اور قلبی عقید
اظہار تو ضرور کرتی ہے لیکن دین پر عمل در آمد' اور نظامِ شریعت کے عملی نفاذ
ضمن میں اس کی روش بھی قطعاً مختلف نہیں! چنانچہ الحمد للہ کہ میں نے ۶۸ - ۶۹ء
بھی' جبکہ پاکستان میں "اسلام اور سوشلزم" کے مابین ایک "ہوائی جنگ" زور و
کے ساتھ جاری تھی برملا لکھا تھا کہ "مجھے کوئی بتائے کہ دینی اعتبار سے میاں ممتاز
خاں دولتانہ اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کے مابین کون سا بنیادی فرق یا تفاوت
اور آج بھی برملا کہتا ہوں کہ خالص دینی اعتبار سے محترمہ بے نظیر بھٹو اور سیدہ عا
حسین کے مابین کوئی فرق نہیں! اور اگر پیپلز پارٹی کی حکومت میں محترمہ بے نظیر
بھی "وزیرۂ عظمیٰ" رہیں اور اب بنتی ہیں تو آئی جے آئی کی حکومت میں بھی
عابدہ پہلے "وزیرہ" اور پھر "سفیرۂ عظمیٰ" کے مناصب پر فائز رہیں! رہا یہ سوال کہ
اور نفاق میں سے بہتر چیز کونسی ہے اور بدتر کونسی' تو اس کا فیصلہ بہت مشکل ہے اور ا
کے ضمن میں ذاتی رجحان اور افتادِ طبع کی بنا پر اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال
سب ہی جانتے ہیں کہ سورۃ الحدید کی آیات ۱۴ اور ۱۵ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر

دنیا میں منافق مومنینِ صادقین کے ساتھ گڈمڈ رہتے ہیں، لیکن آخرت میں اُن کا انجام کفار کے ساتھ ہوگا! بلکہ سورۃ النساء کی آیت ۱۴۵ میں تو صاف فرمادیا گیا ہے کہ "اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ" یعنی "منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے!" ---- (تاہم دین کے ساتھ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کی عملی روش کے ضمن میں میری یہ رائے ان کے اجتماعی موقف کے اعتبار سے ہے، ورنہ جہاں تک شخصی اور ذاتی سطح پر اسلام کے ساتھ "مذہبی لگاؤ" کا تعلق ہے تو دونوں ہی جماعتوں میں "پابندِ صوم و صلوٰۃ" لوگ اچھی بھلی تعداد میں موجود ہیں، چنانچہ ایک جانب نواز شریف صاحب ہیں جو خود بھی پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں، اور ان کے والد ماجد تو تہجد گزار بھی ہیں، تو دوسری جانب جناب فاروق لغاری اس اعتبار سے بھی ان کے بالکل "ہم پلّہ" ہیں کہ خود بھی اتنے ہی پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں، اور اس اعتبار سے بھی کہ ان کے چچا سردار عطا محمد خان لغاری مرحوم بحیثیت کمشنر نہ صرف یہ کہ اپنے جملہ دفتری اوقات میں بھی ہمہ وقت باوضو رہا کرتے تھے بلکہ اپنے دفتر کے عمارتی رخ سے قطع نظر اپنی کرسی ہمیشہ "قبلہ رُو" رکھتے تھے! ---- بلکہ اس اعتبار سے تو "لغاری فیملی" ---- "شریف فیملی" سے آگے ہے کہ جناب عطا محمد خان لغاری نے تو اپنی انگریز بیوی سے بھی پورا اسلامی پردہ کرایا اور جناب فاروق لغاری کی اہلیہ بھی تاحال "منظرِ عام" پر نہیں آئیں!)

(۳) تیسری بات جس کے ضمن میں مَیں نے قاضی صاحب کی بھرپور تائید کی تھی یہ ہے کہ اگر کسی کو واقعتاً نظامِ اسلام کے قیام کا کام کرنا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ اَنمل بے جوڑ قسم کے متحدہ محاذوں میں شمولیت کے ذریعے اپنا وقت اور اپنی توانائیاں ضائع نہ کرے بلکہ ایک امیر کی امارت یا ایک قائد کی قیادت میں ایک محکم اور منظم جماعتی نظام کے قیام اور اس کی حتی الامکان توسیع کی کوشش کرے۔ اس لئے کہ "متحدہ محاذوں" کے ذریعے صرف "منفی" کام کئے جاسکتے ہیں، کوئی "مثبت" کام نہیں کیا جاسکتا! ---- یعنی ان کے ذریعے کسی کی ٹانگ تو گھسیٹی جاسکتی ہے اور کسی کو تختِ

حکومت سے نیچے بھی گرایا جاسکتا ہے، جیسے کہ "ڈیک" اور پی ڈی ایم وغیرہ نے صدر ایوب خاں مرحوم کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا، یا ایم آر ڈی وغیرہ نے صدر ضیاء الحق کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا، لیکن کوئی تعمیری کام نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ کسی تخریب کے لئے تو صرف مختلف النوع "نفرتیں" بھی جمع ہو کر مؤثر ثابت ہو سکتی ہیں، لیکن کسی تعمیر کے لئے نظریات اور مقاصد کی ہم آہنگی لازمی ہوتی ہے، جس کے تقاضے بہ تمام و کمال تو صرف ایک "جماعت" ہی کے ذریعے پورے ہو سکتے ہیں، لیکن اس سے کم تر درجہ میں اگر کسی مرحلہ پر کوئی وسیع تر اتحاد ضروری ہو جائے تو اس کے مؤثر اور نتیجہ خیز ہونے کے لئے اس کی "قیادت" کا بھی ایک قائد کی ذات میں مرکوز ہونا لازمی ہے۔ جیسے کہ انڈین نیشنل کانگریس جیسی دستوری و جمہوری جماعت میں بھی کسی عوامی تحریک کے مرحلے پر "ڈکٹیٹر" نامزد کر دیئے جاتے تھے!

قاضی صاحب کے موقف کا منطقی نتیجہ

تاہم قاضی صاحب کی ان تینوں باتوں کی بھرپور تائید کے ساتھ ساتھ میری جانب سے ہمیشہ ایک بہت بڑا "لیکن" لگا رہتا تھا یعنی یہ کہ ان تینوں باتوں کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جماعت انتخابی سیاست سے کنارہ کش ہو کر انقلابی جدوجہد کا راستہ اختیار کرے۔ اس لئے کہ:

۱۔ نیو ورلڈ آرڈر کے نئے عالمی سامراج کے دباؤ کا مقابلہ صرف ایک ایسی حکومت اور قیادت کر سکتی ہے جو کسی انقلابی عمل کے نتیجے میں برسر اقتدار آئی ہو۔ اس لئے کہ انقلاب ہمیشہ ہزاروں جانوں کی قربانی کے ذریعے آتا ہے، اور صرف اس وقت آتا ہے جب ان پر مستزاد لاکھوں مزید لوگ جانیں قربان کرنے پر آمادہ ہو چکے ہوں۔ اور ان کے زیر اثر بحیثیتِ مجموعی پوری قوم نہ صرف یہ کہ بھوکی رہنے یا بقول بھٹو مرحوم "گھاس کھانے" پر آمادہ ہو چکی ہو بلکہ مرنے مارنے پر بھی پوری طرح تیار ہو چکی ہو۔ اور نئے عالمی استعمار ایسے "چلتے جھکڑ" اور "اٹھتی آندھی" تو کجا کوئی قوم

عام استعماری طاقت کا مقابلہ بھی اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک عوام میں یہ انقلابی ہی نہیں "عقابی" روح بیدار نہ ہو چکی ہو۔ چنانچہ میں نے ہمیشہ کہا' اور اب پھر دہرا رہا ہوں کہ انتخابی سیاست کے کسی اتار چڑھاؤ یا کسی وقتی لہر کے ذریعے اگر خود قاضی صاحب پاکستان کے وزیر اعظم بن جائیں تو وہ بھی اپنے آپ کو نئے عالمی سامراج کی بالادستی قبول کرنے پر اسی طرح مجبور پائیں گے جس طرح کوئی دوسری قیادت یا حکومت!

۲۔ ثانیاً اسلامی نظام کا بالفعل قیام صرف ایسے لوگوں کے ذریعے ممکن ہے جو اپنی ذات اور اپنے دائرۂ اختیار میں اسلام کو عملاً نافذ کر چکے ہوں---- اور پھر اسلام کے نظامِ اجتماعی یعنی اللہ کے عطا کردہ "پولیٹیکو سوشیو اکنامک سسٹم" کو ایک کامل حیاتیاتی وحدت کی حیثیت سے پورے نظامِ زندگی پر بالفعل "غالب" کر دینے کے بلند و بالا مقصد کے لئے ایک جانب تن من دھن' حتیٰ کہ جان تک قربان کر دینے پر نہ صرف یہ کہ پوری طرح آمادہ ہوں بلکہ ۔

"شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی!"

کے مصداق اسی کو اصل کامیابی اور مقصدِ حیات سمجھیں' اور دوسری جانب اپنی ذاتی رائے اور "انا" کا ایثار کرتے ہوئے ایک امیر کی قیادت کو قبول کر کے شریعت کے دائرے کے اندر اندر اس کی اطاعت کے لئے بہ دل و جان آمادہ ہوں۔ چنانچہ یہی فلسفہ تھا جو مولانا مودودی مرحوم نے ۱۹۴۰ء میں "ایک صالح جماعت کی ضرورت" کے عنوان سے پیش کیا تھا' جس کی بنیاد پر ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی تاسیس ہوئی تھی۔ پھر اسی کو انہوں نے "اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے" کے عنوان سے تقریباً اسی زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشہور اسٹریچی ہال میں دیئے جانے والے خطبہ میں عقلی دلائل کے حوالے سے' اور پھر ۱۹۴۶ء میں "شہادتِ حق" نامی کتابچے میں اس حدیثِ نبویؐ کے حوالے سے بیان کیا تھا کہ:

آمُرُكُم بِخَمسٍ: اَللّٰهُ اَمَرَنِی بِهِنَّ: بِالجَماعَةِ وَالسَّمعِ وَالطَّاعَةِ وَالهِجرَةِ وَالجِهَادِ فی سَبِیلِ اللّٰه

"(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں' مجھے ان کا حکم اللہ نے دیا ہے' یعنی: التزامِ جماعت' سمع و طاعت' اور ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ!"

(مسند احمدؒ و جامع الترمذیؒ عن الحارث الاشعری رضی اللہ عنہ)

قاضی صاحب اور جماعت اسلامی کا اصل مخمصہ

الغرض' قاضی حسین احمد صاحب کا اصل مخمصہ یہ ہے کہ نہ صرف ان کی ذاتی سوچ اور ان کا مزاج انقلابی ہیں بلکہ ان کے مقاصد اور ان کا تحریکی پس منظر بھی سب کے سب "انقلابی" ہیں' لیکن وہ عملاً راستہ انتخابی سیاست کا اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ انقلابی جدّوجہد اور انتخابی عمل کے تقاضے ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں' بالکل متضاد ہیں۔ چنانچہ عملی اعتبار سے صورت یہ بن جاتی ہے کہ اگر وہ اپنی طبیعت پر جبر کر کے انتخابی سیاست کے کسی ایک تقاضے کو پورا کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں' تو انقلابی مزاج کا کوئی دوسرا تقاضا ان کے پاؤں کی بیڑی بن جاتا ہے۔ جیسے حالیہ انتخابات کے موقع پر ہوا کہ انتخابی عمل کے ایک تقاضے کو تو انہوں نے خوب سمجھا' یعنی یہ کہ موجودہ حالات میں اس کے لئے جماعت اسلامی ایسی محدود اور "کٹر" قسم کی جماعت نہیں' آزاد قسم کے اطوار کی حامل عوامی تنظیم درکار ہے' یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پاسبان اور "پِف" (PIF) کی قسم کی تنظیمیں قائم کیں' لیکن ایک تو ان پر' خواہ وقتی طور پر ہی سہی' بہرحال' جماعت اسلامی کے اولین دور کی "انقلابی اصول پسندی" کا غلبہ ہو گیا جس کے باعث انہوں نے انتخابی سیاست کے اس تقاضے کو بالکل نظرانداز کر دیا کہ اس میدان میں تو ع "کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں" کے مصداق قدم قدم پر اور لحظہ بہ لحظہ "اَھوَنُ البَلِیَّتَین" یعنی "LESSER EVIL" کے نظریئے کے تحت جوڑ توڑ جاری رکھنا ضروری ہوتا

ہے اور اس ضمن میں انیس بیس ہی کا نہیں ساڑھے انیس اور پونے بیس کا فرق بھی بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے' مزید برآں انہوں نے اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر کرلیا کہ کچھ جذباتی اور جوشیلے نوجوانوں یا نیک جذبات کے حامل درمیانہ درجہ کے کاروباری لوگوں سے قطع نظر' جو لوگ سیاست کی موجودہ "منڈی" میں "سکہ رائج الوقت" کے اعتبار سے کسی واقعی اہمیت کے حامل ہیں وہ ان کی "قیادت" کو آخر کس دلیل سے قبول کرلیں گے؟۔ (چنانچہ حال ہی میں دبئ سے جناب محمود اعظم فاروقی کا یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ بہت سے اہم لوگوں نے "پاکستان اسلامک فرنٹ" میں شمولیت کا وعدہ تو کیا تھا لیکن بعد میں وہ اس سے منحرف ہو گئے!)

تاہم یہ "مخمصہ" صرف قاضی حسین احمد صاحب کا نہیں ہے' بلکہ پوری جماعت اسلامی کا ہے۔ اس لئے کہ اس کا آغاز اس کے داعی اور مؤسس یعنی مولانا مودودی مرحوم ہی کی ایک غلطی کے ذریعے ہوا تھا' جو کسی بدنیتی نہیں بلکہ کچھ خوش فہمی اور کچھ پاکستانی معاشرے کی غلط "تشخیص" کی بنا پر ہوئی تھی اور اگرچہ ہماری اطلاع کے مطابق ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد مولانا مرحوم کو تو اس غلطی کا احساس ہو گیا تھا' جس کا انہوں نے برملا اظہار بھی کر دیا تھا' تاہم چونکہ یہ معاملہ اُس وقت ہوا جب ایک جانب خود مولانا مرحوم عمر اور صحت کے اعتبار سے اس پوزیشن میں نہیں رہے تھے کہ جماعت کی بھاری بھرکم گاڑی کے سٹیئرنگ کو خود سنبھال کر اس کا رخ تبدیل کرنے کی کوشش کرتے اور دوسری جانب جماعت کی صفِ دوم کی قیادت کا ذہن اور مزاج بیس برس تک ایک خاص رخ پر کام کرتے رہنے کے باعث اس کے مخصوص سانچے میں ڈھل چکا تھا لہٰذا جماعت اسی رخ پر آگے بڑھتی چلی گئی۔ اور جیسے جیسے وقت گزرا جماعت کے متذکرہ بالا مخمصے کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تاہم اس کا سارا الزام قاضی صاحب کے ذمہ لگا دینا ہرگز درست نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی فعال اور متحرک شخصیت نے اس مخمصے کو اچانک بہت زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ غالباً وسط جولائی ۹۳ء میں جب پاکستان کے ایک ایسے ہفت روزہ جریدے کے اہم نمائندے نے مجھ سے طویل اور مفصل انٹرویو لیا تھا جس کے مالک اور مدیر جماعت اسلامی کے متاثرین اور ہمدردان ہی نہیں' اس کے "سرپرستوں" کے حلقے میں شامل رہے ہیں لیکن اب جناب نواز شریف صاحب کے سیاسی اور صحافتی حلیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انٹرویو لینے والے صاحب نے ہر زاویئے سے سوالات کر کے مجھ سے یہ کہلوانے کی کوشش کی کہ جماعت اسلامی کی موجودہ تمام "خرابیوں" اور "خستہ حالیوں" کی ذمہ داری قاضی حسین احمد پر ہے۔ لیکن میں نے ہر بار یہی کہا کہ میرے نزدیک اس پوری صورت حال کی اصل ذمہ داری جماعت کی پالیسی کی اس تبدیلی پر ہے جو ۵۰-۵۱ء میں اختیار کی گئی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی راہ کا جب رخ بدلتا ہے تو شروع میں تو چونکہ فاصلہ لامحالہ بہت کم ہوتا ہے لہٰذا فرق کا احساس نہیں ہوتا' تاہم اس کے بعد جب نئے رخ پر پیش قدمی جاری رہتی ہے تو جیسے جیسے قدم آگے بڑھتے ہیں سابقہ رخ سے فاصلے میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ لہٰذا قاضی صاحب اِس وقت جس رخ پر جماعت یا تحریک کو لے جارہے ہیں اس میں "کمیت" یعنی مقدار کے اعتبار سے تو یقیناً جماعت اسلامی کے اصل اور ابتدائی رخ اور مزاج سے بہت بُعد پیدا ہو گیا ہے' لیکن اصولی اور منطقی اعتبار سے یہ ہے اسی رخ پر جو اب سے چالیس سال قبل اختیار کیا گیا تھا---- بہرحال میرے اس موقف پر اصرار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس طویل انٹرویو کو طباعت و اشاعت کی "سعادت" آج تک حاصل نہیں ہو سکی!

جماعت اسلامی کی قیادت کے لئے دو راستے

قاضی حسین احمد صاحب کی حمایت یا مخالفت کی شدت کے حوالے سے جس اندرونی انتشار اور خلفشار سے اِس وقت جماعت اسلامی دوچار ہے وہ تنظیمی اعتبار سے تو یقیناً جماعت کا داخلی معاملہ ہے' اور اس پہلو سے ایک صاحبِ قلم (غالباً سید معروف

شاہ شیرازی؟) کا یہ قول بظاہر بہت قوی ہے کہ جماعت سے باہر کے لوگوں کو اس میں "دخل در معقولات" کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ لیکن جماعت چونکہ احیاء اسلام کی عالمی تحریک کا حصہ ہے لہٰذا دین اور ملت کے وسیع تر مفاد سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کا اس بارے میں کچھ عرض کرنا ہرگز بے محل نہیں ہے۔

عالیہ الیکشن کے حوصلہ شکن نتائج۔۔۔ایک لمحۂ فکریہ!

راقم الحروف کو الیکشن ۹۳ء سے قبل قاضی صاحب کی بعض آراء سے جو اتفاق تھا، اس کی تفصیل بھی اس سے قبل بیان کی جا چکی ہے۔ اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ راقم کے نزدیک ان کا منطقی تقاضا کیا تھا۔ تاہم یہ ایک اصولی بات تھی جو جولائی ۹۳ء سے قبل کے حالات پر مبنی تھی۔ میں اواخر جولائی میں بیرونِ ملک سفر پر روانہ ہو گیا تھا اور وہاں سے میری واپسی لگ بھگ ڈھائی ماہ بعد وسط اکتوبر میں ہوئی تھی جبکہ انتخابات کا ہنگامہ بھی گزر چکا تھا اور اس کے نتائج بھی سامنے آ چکے تھے اور اس کے نتیجے میں جماعت کا وہ انتشار اور خلفشار بھی، جو اس سے قبل باہر کے لوگوں کے علم میں صرف بعض اکابر کی آراء اور ان کی بھی اخبارات میں اشاعت کے حوالے سے آیا تھا، نہ صرف یہ کہ طشت از بام ہو گیا تھا بلکہ جماعت اسلامی کے عام ارکان اور کارکنان ہی نہیں، ہمدردوں، "سرپرستوں" اور بہی خواہوں کے حلقے میں بھی پوری شدت ہی نہیں تلخی کے ساتھ پھیل چکا تھا!

بہرحال بیرونی سفر سے واپسی پر مجھے انتخابی مہم کی جن تفصیلات کا علم حاصل ہوا، ان کی بنا پر میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے حیرت زیادہ ہوئی تھی یا صدمہ۔ حیرت اس بنا پر بھی کہ میں ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ جماعت کی نئی قیادت پبلسٹی کے اس درجہ عامیانہ ہی نہیں "سوقیانہ" انداز بھی اختیار کر سکتی ہے، اور اس اعتبار سے بھی کہ ع "ہم نے کیا کیا نہ کیا دیدہ و دِل کی خاطر!" کی اس انتہاء کے بعد بھی جماعت کو نیشنل اسمبلی میں کُل تین سیٹیں حاصل ہو سکیں۔ اور صدمہ اس لئے کہ ایک دینی جماعت کے اخلاقی

اور مذہبی تشخص کو۔ "پہلے بھی ایسی کون سی تھی اپنی آبرو - پر شب کی منتوں نے تو کھودی رہی سہی" کے مصداق جو سخت دھچکا اس کے ذریعے لگا وہ صرف اس جماعت ہی کے لئے نقصان دہ نہیں' اس ملک میں اسلام کی حیثیت اور اس کے مستقبل کے اعتبار سے بحیثیتِ مجموعی شدید نقصان کا باعث بنا ہے۔ اور خواہ قاضی صاحب اور ان کے بعض رفقائے کار اور مشیرانِ خاص نے اس انتخابی مہم کے دوران ہونے والی بعض حرکتوں پر مبہم سے انداز میں اظہارِ افسوس و ندامت بھی کیا ہے' تاہم وہ اس کی ذمہ داری سے کسی طرح بری نہیں ہو سکتے۔

اس کے بعد کچھ عرصہ تک واقعہ یہ ہے کہ محترم قاضی صاحب کی اس "استقامت" پر بھی حیرت ہوتی رہی کہ انتخابات سے قبل اتنے بلند بانگ دعووں اور بالکل۔

"کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے"

کا سا سماں باندھ دینے کے بعد "پِف" جس بری طرح چاروں شانے "چت" ہوئی اس پر بھی قاضی صاحب نہ جماعت کی امارت سے مستعفی ہوئے نہ پِف کی قیادت سے!

بہر حال یہ تو قاضی صاحب کا ذاتی معاملہ تھا' جماعتی اختلاف و افتراق کے ضمن میں اس کے بعد بھی امید تھی کہ قاضی صاحب وہ طرز عمل اختیار کریں گے جس سے جماعت پالیسی اور طریق کار کے معاملے میں یکسو ہو جائے اور جس راہ کو بھی اختیار کرے علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرے اور اس کے جملہ تقاضوں کے واضح فہم و شعور کے ساتھ ان کو پورا کرنے کے عزمِ مصمم کا فیصلہ انشراحِ صدر کے ساتھ کر لے تاکہ پھر قدم قدم پر اختلاف اور رکاوٹ کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ اس لئے کہ الیکشن ۹۳ء کے موقع پر طریق کار اور پالیسی کے اختلاف کے بعض ایسے نکات بھی جو اس سے قبل صرف نظری حیثیت سے زیرِ بحث آتے تھے واضح عملی صورت میں سامنے آ چکے ہیں' اور موجودہ طریق کار کی بنیاد میں کار فرما اساسی حکمتِ عملی کے بعض پہلو بھی اپنی منطقی

انتہاء کو پہنچ چکے ہیں اور ان کے نتائج کو بھی ارکان اور کارکنان نے۔

"یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!"

کے مصداق بچشم سر دیکھ لیا ہے۔ لہٰذا صحیح فیصلے تک پہنچنا بہت آسان ہو گیا ہے!

امارت سے استعفاء یا قرار دادِ اعتماد کا مطالبہ؟

لیکن قاضی صاحب نے جو انداز بالفعل اختیار کیا وہ یہ کہ بجائے اس کے کہ جماعت کے ارکان کو بنیادی طریق کار اور اس کی اساسی حکمتِ عملی' اور اس کے ساتھ ساتھ بعض معین اقدامات پر بحث و گفتگو کا موقع دیا جاتا' اور پھر کثرتِ رائے سے فیصلے کر لئے جاتے اور کسی نئے امیر کے انتخاب یا قاضی صاحب ہی پر دوبارہ اظہارِ اعتماد کا مرحلہ اس کے بعد طے کیا جاتا' انہوں نے جماعت کی امارت سے اپنے جذباتی انداز کے استعفے کے ذریعے گویا "پیش دستی" یعنی PRE-EMPTION کے انداز میں براہ راست "اعتماد کا ووٹ" طلب فرمالیا۔

اعتماد کا یہ ووٹ تو ہمیں یقین ہے کہ قاضی صاحب کو جماعت کے بعض اکابر کے اس "نکتۂ اعتراض" کے علی الرغم مل ہی جائے گا جو جناب نعیم صدیقی کے ایک خط کی صورت میں منظرِ عام پر بھی آ چکا ہے' لیکن کیا اس سے افتراق و انتشار کا خاتمہ ہو جائے گا؟ یا کیا اس سے پالیسی کا ابہام ختم ہو جائے گا اور جماعت اس مخمصے سے نکل کر' جس کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے' یکسو ہو کر آگے قدم بڑھا سکے گی؟ اور اقامتِ دین کے بلند و بالا مقصد کے لئے مؤثر اور نتیجہ خیز کام کر سکے گی؟ ہم افسوس کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان تمام سوالات کا جواب کامل نفی میں ہے!

اس ضمن جماعت کے بعض اکابر نے قاضی صاحب سے اختلاف کا جو طریقہ اختیار کیا ہم اسے بھی درست نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اب کچھ عرض کرنے کی بجائے اس خط کا مختصر اقتباس کافی ہے جو راقم نے میاں طفیل محمد صاحب کی خدمت میں

۲/ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ارسال کیا تھا۔ (اور ایک سال بعد نومبر ۹۲ء کے "میثاق" میں شائع بھی کر دیا تھا)---- و هو هذا:

"اواخر اگست میں میں ملائیشیا کے سفر پر تھا۔ واپسی پر جماعت کے پچاس سالہ یوم تاسیس کے جشن کے موقع پر آپ کے تلخ لیکن مبنی بر حقیقت ارشادات کا چرچا سننے میں آیا۔

اتفاقاً اواخر ستمبر میں پھر بھارت کا سفر پیش آگیا۔ اور اس بار واپسی پر آپ کا وہ بیان پڑھنے میں آیا جو روزنامہ جنگ کی اشاعت بابت ۲۶/ ستمبر میں شائع ہوا ہے، جس میں آپ کے اسی موقف اور جذباتی کیفیت کا اعادہ ہے جس کا اظہار ایک ماہ قبل ہوا تھا۔

میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے اس طرز عمل سے کوئی خیر بر آمد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو جماعت کے عام کارکنوں کے ذہنوں میں آپ کی شخصیت کا تصور ایک مایوس، بددل، جذباتی، شکست خوردہ اور از کار رفتہ بوڑھے کا سا بنتا چلا جائے گا!"

اصل قابل غور مسائل

راقم الحروف کو، اللہ گواہ ہے کہ، اس بات سے کوئی خوشی نہیں ہے بلکہ شدید صدمہ ہے کہ اس کی ڈھائی سال قبل کی یہ پیشینگوئی اِس وقت حرف بحرف پوری ہو رہی ہے اور جماعت کے نوجوان کارکنوں کی بڑی تعداد کی نگاہوں میں بعض بزرگوں کی حیثیت فی الواقع یہی بن چکی ہے، لیکن ہم فرمانِ نبوی "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" یعنی "دین تو نام ہی نصح و اخلاص، اور وفاداری اور خیر خواہی کا ہے" پر عمل کرتے ہوئے قاضی صاحب اور ان کے رفقاء کار سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اِس وقت اپنی ذاتی اور وقتی کامیابی یا ناکامی کی بجائے جماعتی ہی نہیں عالمی تحریک اسلامی، اور اس کی بھی فوری نہیں دُور رس اور دیرپا مصلحتوں کو پیش نظر رکھیں۔ اور حالیہ افتراق و انتشار کے

"شر" سے آئندہ کے لئے مستقل "خیر" بر آمد کرنے کی کوشش کریں، جس کا واحد راستہ یہ ہے کہ جماعت کے اصحابِ شوریٰ ہی نہیں عام ارکان بھی ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتے ہوئے حسب ذیل امور پر غور اور پُر سکون انداز میں بحث و گفتگو کریں:

(۱) اس سے قطع نظر کہ جماعت اسلامی آج سے ساڑھے باون برس قبل قائم کیوں اور کس مقصد کے لئے کی گئی تھی (اس لئے کہ یہ بحث اب بہت پرانی اور خالص نظری نوعیت کی حامل ہو چکی ہے!) اِس وقت بالفعل جماعت کے پیش نظر کوئی سطحی تبدیلی ہے یا وہ ملک میں رائج و قائم سیاسی و معاشرتی اور بالخصوص معاشی نظام میں کوئی اساسی اور بنیادی تبدیلی چاہتی ہے؟

(۲) کیا کسی نظامِ اجتماعی اور خاص طور پر اس کے معاشی ڈھانچے میں کوئی بنیادی اور اساسی تبدیلی انتخابات کے ذریعے برپا کی جا سکتی ہے؟ مثلاً کیا پاکستان میں جاگیرداری اور سودی معیشت کا خاتمہ انتخابات کے ذریعے ممکن ہے؟ اور آیا "انقلاب بذریعہ انتخابات" کا نظریہ خالص مغالطہ اور فریبِ نظر ہے یا اس میں کوئی عنصر حقیقت اور واقعیت کا بھی موجود ہے؟

(۳) پھر بالفرض اگر کسی کے نزدیک اس میں خالص نظری اعتبار سے بھی کوئی وزن ہو تو کیا جماعت اسلامی اپنے مخصوص دینی و مذہبی تصورات و معیارات اور ناقابلِ تغیر تاریخی پس منظر کے ساتھ پاکستان کے مسلمانوں کے "سوادِ اعظم" سے اتنے ووٹ حاصل کر سکتی ہے کہ فیصلہ کن قوت و اقتدار کی مالک بن سکے! (واضح رہے کہ جماعت کی کوئی بھی ذیلی اور "نقابی" تنظیم خواہ وہ کتنا ہی نیا نام اور جدید رنگ و روپ اختیار کر لے عوام کی نگاہوں میں۔

"بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم"

کے مصداق جماعت کے مذہبی اور تاریخی پس منظر سے ہرگز جدا نہیں ہو سکتی'

بالخصوص جبکہ اس کی قیادت کی چلمن سے جماعت اسلامی کے چہرے ہی جھلک رہے ہوں!)

ہماری رائے میں جہاں تک ان تین بنیادی سوالات کا تعلق ہے 'ان میں سے پہلے کے جواب میں تو شاید کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ہو جو یہ کہے کہ جماعت معاشرتی اعتبار سے کسی سطحی سی اصلاح کی علمبردار یا سیاسی سطح پر صرف حکومت کرنے والے ہاتھوں اور چہروں کی تبدیلی کی خواہاں ہے۔ البتہ بقیہ دونوں سوالوں کے ضمن میں شاید کچھ لوگ "منطق کی دلیلوں" کے سہارے اثبات میں جواب دینے کی کوشش کریں۔ ایسے لوگوں کے لئے "اخلاص و مروّت" سے مطابقت رکھنے والا واحد راستہ یہ ہے کہ انتخابی عمل میں براہ راست جماعت اسلامی ہی کے نام سے حصہ لینے کو جاری رکھیں اور اگر اس کے تنظیمی ڈھانچے کے بعض پہلوؤں کو اس راہ میں رکاوٹ محسوس کریں تو اس رکاوٹ کو بھی جس حد تک جماعت کے ارکان کی اکثریت قبول کرلے دور کرنے کی کوشش کریں۔ (جیسے 'مثال کے طور پر 'سنا ہے کہ بعض حضرات نے تجویز کیا ہے کہ جماعت کی رکنیت پر جو دینی پابندیاں اور اخلاقی بندشیں عائد ہیں انہیں صرف عہدیداروں کی حد تک محدود کردیا جائے 'اور عام رکنیت کا دروازہ ہر مسلمان کے لئے کھول دیا جائے 'خواہ وہ بالفعل صالح اور متقی ہو 'خواہ عاصی و بے عمل!) ---- بصورتِ دیگر یعنی اگر جماعت کے ارکان کی اکثریت اس راہ کو قبول نہ کرے تو سیدھی راہ یہ ہے کہ وہ جماعت سے علیحدگی اختیار کرکے نئے نام اور نئے معیارات کے ساتھ ایک نئی سیاسی جماعت قائم کریں 'اس لئے کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس مغالطے میں تو بحمد اللہ جماعت کا کوئی بھی شخص مبتلا نہیں ہے کہ اسلام صرف جماعت اسلامی کے دائرے کے اندر منحصر ہے اور اس سے علیحدگی کفر یا ارتداد ہے! بہرحال اس صورت میں وہ جماعت کے بعض قدیم اور "دقیانوسی" نظریات سے علی الاعلان اظہارِ براءت کرکے اور اس طرح عوام کے سوادِ اعظم کے قلوب و اذہان سے قریب تر ہو کر اپنے مقاصد کے حصول کو بھی بہت آسان بنا سکتے ہیں اور خواہ اس ملک کے پولیٹیکو سوشیو

اکنامک سسٹم میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ لاسکیں، اسے ایک نسبتاً بہتر حکومت و قیادت کا تحفہ دینے کی مؤثر کوشش تو کر ہی سکتے ہیں!

اس صورت میں یہ ضرور ہے کہ نئی جماعت یا تنظیم کو جماعت کی بین الاقوامی ساکھ کی بنا پر حاصل ہونے والے مفادات (خواہ مادی ہوں، خواہ صرف اخلاقی) سے کم از کم وقتی طور پر محروم ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ بات ان شاءاللہ ان حضرات کی سمجھ میں بادنیٰ تامل آجائے گی کہ یہ بین الاقوامی تعارف اور "گُڈوِل" مقامی اور ملکی سطح پر کبھی فیصلہ کن نہیں ہوسکتا۔ اور اگرچہ ہر بندۂ مومن اور ہر احیائی تحریک کے پیش نظر تو یہی ہونا چاہئے کہ اسلام کا بول عالمی سطح پر بالا ہو، اور اللہ کا کلمہ کُل روئے ارضی پر سب کلموں سے بلند اور اس کا دین سب ادیان پر غالب ہو جائے، (اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ ایسا بالفعل ہو کر بھی رہے گا) لیکن اس کا عملی آغاز بہرصورت کسی ایک خطۂ ارضی ہی سے ہوگا، اور ظاہر ہے کہ ہم اس کے لئے عملی جدوجہد اور مؤثر سعی سلطنتِ خداداد پاکستان ہی میں کرسکتے ہیں (جو معرضِ وجود میں آئی ہی اسی لئے ہے!) لہٰذا ہمیں اپنی حکمتِ عملی معین کرنے میں بنیادی توجہ بین الاقوامی مصلحتوں سے بڑھ کر مقامی انقلاب کے تقاضوں پر مرکوز کرنی ہوگی۔

"آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر"

جماعت اسلامی کے موجودہ اختلاف اور خلفشار کے حل کے لئے اگر یہ "راہ راست" اختیار نہ کی گئی اور وہی طرز عمل جاری رکھا گیا جو قاضی صاحب کے استعفے کے انداز سے ظاہر ہے تو فوری طور پر تو وہ بلاشبہ "فلائنگ کلرز" کے ساتھ کامیاب ہو جائیں گے، لیکن جماعت کا بحران ختم نہیں ہوگا بلکہ (i) کچھ بوڑھے اور بزرگ تو یا تو پت جھڑ کے پتوں کی طرح جھڑ جائیں گے۔ یعنی جماعت سے علیحدہ ہو جائیں گے یا نکال دیئے جائیں گے۔ یا شاخ پر لگے ہوئے بھی سوکھ جائیں گے۔ یعنی جماعت میں رہتے ہوئے بھی ع "میں ہوں اپنی شکست کی آواز!" اور ع "اگلے وقتوں کے ہیں یہ

لوگ انہیں کچھ نہ کہوا" کے مصداق بن کر رہ جائیں گے! (ii) اسی طرح جماعت کے پرانے ارکان کی اکثریت بھی خواہ جماعت سے ظاہری طور پر وابستہ رہے' عملی اعتبار سے بددل اور معطل ہو کر رہ جائے گی---- اس طرح گویا اقامتِ دین کی تحریک کی وہ تنظیمی شکل تو عملی اعتبار سے بالکل دم توڑ جائے گی---- جو برِ عظیم پاک و ہند میں ۱۹۴۱ء سے شروع ہوئی تھی۔ (iii) رہی قاضی صاحب اور ان کی امارت اور قیادت تو وہ بھی خواہ خالص جماعتی سطح پر مزید "دو چار دن بہارِ جانفزا دکھلا" جائے' قومی اور ملکی سطح پر فی الواقع "اُترا شحنہ مردک نام!" کی مصداقِ کامل بن چکی ہے۔ اس لئے کہ سیاست کے میدان میں "طوفانی انداز" سے حملہ آور ہونے کی کوشش کرنے والوں کے دو ہی انجام ہوتے ہیں: یا تو وہ پہلی ہی بار یعنی اول وہلے ہی میں "وہ آیا' اس نے دیکھا' اور اس نے فتح کر لیا!" کے مصداق بن جاتے ہیں' یا پھر لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کا موضوع اور ع "دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!" کی تصویر بن کر رہ جاتے ہیں۔

بہرحال ہم نے اپنی حد تک سورۂ ہود کی آیت ۸۸ میں وارد شدہ الفاظ: "اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ" یعنی "میں امکانی حد تک اصلاح حال کے سوا اور کسی چیز کا خواہاں نہیں ہوں اور اس کی توفیق کا بھی صرف اللہ ہی سے خواستگار ہوں" کے مطابق حقِ نصیحت ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے آگے ع "فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے' دل یا شکم!"

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ!

اقامتِ دین کی جدّوجہد فرضِ عین یا فرضِ کفایہ؟

دورۂ ترجمہ قرآن کے شرکاء کے سوالات اور
امیر تنظیم اسلامی کے جوابات

——— مرتّب: خالد محمود خضر ———

سوال: اقامتِ دین اب امت کی اجتماعی ذمہ داری ہے جس کے لئے آپ اپنی توانائیاں خرچ کر رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود دینی حلقوں میں اس کو پذیرائی نہیں ملی؟ خاص طور پر تبلیغی جماعت ساٹھ ستر سال گزرنے کے باوجود کلمہ کی دعوت سے آگے نہیں بڑھ سکی اور جماعت اسلامی مسلسل ناکامی کے باوجود انتخابی سیاست سے باہر نہیں آ سکی۔ سوال یہ ہے کہ اس کے لئے آپ نے کیا سعی کی ہے اور آپ کو اس کا کیا جواب (respose) ملا؟ آپ کے نزدیک اقامتِ دین فرضِ عین ہے جبکہ دوسرے علماء اسے فرضِ کفایہ کہتے ہیں۔ وضاحت فرمائیں!

جواب: اقامتِ دین کے بارے میں دو باتیں سمجھ لیجئے---- ایک ہے دین کو بالفعل قائم کر دینا' یہ اور شے ہے۔ اور ایک ہے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنا' یہ فرضِ عین ہے۔ دین کو قائم کر دینا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق و تیسیر ہو' اللہ لوگوں کے دلوں میں اس کی طرف رجوع ڈالے' response ملے' مناسب تعداد میں لوگ آئیں' اور اسباب و وسائل جمع ہوں تبھی ممکن ہے۔ لیکن اس کی جدوجہد کرنا فرضِ عین ہے۔ اور یہ دراصل ہماری اجتماعی نہیں' انفرادی ذمہ داری ہے۔ تاہم یہ اجتماعی اس طرح بن جاتی ہے کہ بہرحال ہر کام انفرادی سے اجتماعی ہوتا ہے۔ ایک آدمی کھڑے ہو کر دعوت دیتا ہے کہ میرے ساتھ آؤ اور دوسرا آدمی اس کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے تو یہ جماعت بن جاتی ہے۔ ایک امام کے ساتھ ایک یا دو مقتدی ہوں تو جماعت

ہو جاتی ہے اور اجتماعی ذمہ داری بھی ادا ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اقامتِ دین
جدوجہد کرنا ایمان کا عین تقاضا ہے اور فرض عین ہے۔ البتہ دین کو بالفعل قائم کر
در حقیقت ایک دوسرا مرحلہ ہے' جس کے بارے میں ہمیں بہت زیادہ تشویش کی ضرور
نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک بہت وسیع سپیکٹرم (spectrum
ہے۔ آپ نے قرآن حکیم میں رسولوں کے حالات وواقعات متعدد بار سنے ہیں۔ ان
پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام اور آخری حضرت محمد ﷺ ہیں۔ حضرت نو
ساڑھے نو سو برس تک دعوت دیتے رہے لیکن قوم کی طرف سے کوئی esponse
نہیں ملا۔ کیا اس میں ان کا قصور تھا؟ ظاہر ہے کہ نہیں! ہم اگر کوشش کریں تو اس میں ہما
قصور بھی ہو سکتا ہے' لیکن رسول تو اپنی کوشش میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ تو سار
سارا قصور ان کی قوم ہی کا تھا' چنانچہ وہ ہلاک کر دی گئی۔ لیکن جب تک response
ملے اقامتِ دین کی گاڑی تو آگے نہیں چل سکتی۔

حضرت نوحؑ کے بعد جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں بھی ہم
نظر نہیں آتا کہ وہ مرحلہ آیا ہو۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے' جن کے پاس ا
مسلمان امت بنی اسرائیل پہلے سے موجود تھی (اس اعتبار سے ہمارے حالات حضر
موسیٰؑ کے حالات سے بہت مشابہ ہیں۔ آج ہم بھی کافروں میں نہیں بلکہ مسلمانوں
کام کر رہے ہیں) بنی اسرائیل مشرک یا کافر نہیں تھے' لیکن ان کا حال بھی یہ تھا کہ حضر
موسیٰؑ کے نو عظیم معجزات دیکھنے کے باوجود' اور مصر سے نکلتے وقت چھ لاکھ کی تعداد
ہونے کے باوجود' جنگ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور حضرت موسیٰؑ کو کورا جوا
دے دیا کہ "فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ" یعنی "(اے مو
پس تم اور تمہارا رب جا کر جنگ کرو' ہم تو بس یہاں بیٹھے ہیں"۔ تو حضرت موسیٰؑ تہ
کرتے؟ انہوں نے فریاد کی: "رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُ
بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ" یعنی "اے میرے رب' مجھے تو اختیار ہے تو بس
اور اپنے بھائی کا' پس ہمارے اور اس نافرمان قوم کے مابین علیحدگی فرما دے!" (سو

المائدہ' آیات ۲۴'۲۵) تو ظاہر ہے کہ بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس کے بعد حضرت مسیحؑ آئے۔ ان کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے کہ وہ بھی ایک مسلمان قوم میں آئے۔ (یہود پہلے سے مسلمان تھے' صاحب کتاب تھے' نبیوں کو ماننے والے تھے۔) لیکن صرف گنتی کے چند حواریوں نے آپؑ کی دعوت پر لبیک کہا۔ ان کا معاملہ بہت مختصر یعنی صرف تین برس پر محیط رہا اور انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔

اس spectrum کے دوسرے سرے پر محمدؐ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہیں۔ آپ ﷺ کو اللہ نے response دیا۔ آپ ﷺ کو وہ ساتھی ملے جن کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا: "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" (الفتح: ۲۹) لہٰذا آپ ﷺ اور آپؐ کے جان نثار ساتھیوں کی جدوجہد سے اقامت دین اس معنی میں تکمیل کو پہنچ گئی۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بھی ایک بات جان لیجئے کہ آپ ﷺ کی جدوجہد کے بیس برسوں میں سے پہلے دس برس میں بمشکل سوا سو یا ڈیڑھ سو افراد آپ ﷺ کے اعوان و انصار بنے' جبکہ اگلے دس برس میں پورا جزیرہ نمائے عرب آپؐ کے دامن سے وابستہ ہو گیا۔ تو یہ حساب کتاب کی بات نہیں۔ وہی محمد رسول اللہ ﷺ کہ جن سے بڑا داعی' مبلغ' مربّی اور مزکّی کوئی نہیں' دس برس تک مکہ میں دعوت دیتے رہے لیکن اس کے نتیجے میں سوسوا سو' زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو آدمی آپ ﷺ پر ایمان لائے۔ اور اگلے دس برس میں آپؐ کے دست مبارک سے انقلاب کی تکمیل ہو گئی۔ اس لئے ان تمام چیزوں سے قطع نظر کر کے ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ ہمارا فرض کیا ہے؟ اس کے لئے صحیح طریق کار کیا ہے؟ اور اس پر ہمیں پوری دلجمعی سے لگے رہنا چاہئے اور نتیجے کو اللہ پر چھوڑ دینا چاہئے۔

باقی رہا مختلف جماعتوں کا طرز عمل تو ان کا نام لے لے کر تذکرہ کرنا اور ان پر تنقید کرنا تو مناسب نہیں ہے' لیکن اس ضمن میں اصولی بات میں عرض کئے دیتا ہوں کہ کیا بنی اسرائیل مسلمان امت نہیں تھے؟ وہ حضرت موسیٰؑ کے ہمراہ قتال کے لئے کیوں تیار نہیں ہوئے؟ اب اس کی جوابدہی میرے ذمہ تو نہیں! اس کی جوابدہی کے ذمہ دار تو وہی ہیں کہ

ہ کیوں تیار نہیں ہوئے۔ پھر یہی مسلمان امت بنی اسرائیل حضرت مسیحؑ کو سولی پر
چڑھانے کے درپے کیوں ہو گئی؟ اور اپنی دانست میں 'اپنے بس پڑتے تو انہوں نے آنجنابؑ
کو سولی پر چڑھادیا۔ وہ تو اللہ نے جو تدبیر کی اور جس طرح آپؑ کو بچایا یہ دوسری بات
ہے..... تو مسلمانوں کی مختلف جماعتیں کیا کر رہی ہیں اور کیوں کر رہی ہیں۔ یہ تو آپ انہی
سے پوچھئے۔ ہمارے نزدیک تو ان میں سے کوئی بھی منہجِ انقلاب نبوی ﷺ پر کام نہیں کر
رہی۔ ایک جماعت صرف تبلیغ کر رہی ہے۔ ان کے سامنے اسلام کا صرف مذہبی تصور ہے'
ور ان کے پیش نظر انقلاب کا نقشہ تو کیا ہوگا' ان کے ہاں تو انقلاب کا لفظ ہے نہ اقامتِ
ین کا نام۔ ان کی دعوت تو یہی ہے کہ اپنی نماز اور روزہ درست کرلو' کلمہ درست کرلو اور
پنے لباس' وضع قطع اور روزمرہ کے معمولات میں سنتوں کا اہتمام کرلو۔ یہ چیزیں وہ کر
رہے ہیں اور ان میں اللہ کے فضل سے انہیں کامیابی بھی ہو رہی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ
انہوں نے اپنا جو ہدف بنایا ہے اسی میں انہیں کامیابی ہوگی اور جو ان کا ہدف ہے ہی نہیں
اس میں انہیں کامیابی کیسے ہو جائے گی؟

البتہ جماعت اسلامی اس نہج پر کام کرنے کے لئے اٹھی تھی اور وہ آٹھ برس تک ایک
اصولی اسلامی انقلابی جماعت کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد انہیں
ایک سراب سا نظر آیا کہ اگر ہم جلدی سے الیکشن میں حصہ لے کر حکومت میں آجائیں تو
پھر یہاں کے سارے معاملات کو درست کرلیں گے۔ اور وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ
واقعتاً سراب ثابت ہوا اور جلدی سے حکومت حاصل کرنے کا خواب ابھی تک شرمندۂ
تعبیر نہیں ہو سکا جبکہ انہیں اس صحرائے تیہ میں بھٹکتے ہوئے چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ
ہو گیا ہے اور یہ اب بھی اس سے نکلنے کو تیار نہیں۔ حالانکہ انتخابات کے راستے سے کبھی
کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بہرحال ہمیں اس ضمن میں اپنے آپ کو بری نہیں کرلینا چاہئے بلکہ ان
کے سامنے اپنی صحیح بات رکھتے رہنا چاہئے۔ باقی ہم اللہ کے ہاں مکلّف صرف اس بات کے
ہیں کہ ہم نے منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ سے جو طریق کار سمجھا ہے اس پر عمل پیرا رہیں۔
البتہ غور کرتے رہیں کہ اس میں ہمارے فہم کی کوئی کجی یا غلطی ہو تو اس کو درست کرنے کی
کوشش کرتے رہیں۔

سوال: امتِ مسلمہ کے حکمران اپنوں کے روپ میں غیروں کو مسلط کر رہے ہیں اور جہاد تو مسلمانوں میں زبردستی نافذ ہو رہا ہے' جیسے بوسنیا اور کشمیر میں۔ تو کیا ان حالات میں "منہج نبوی ﷺ" کے بجائے افغانستان والا فارمولا ٹھیک نہیں؟ قومی اتحاد اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تحریکوں کا کریڈٹ بھٹو اور ضیاء الحق لے گئے۔ کیا اسلامی تحریکوں کے لئے جہاد کی تربیت ضروری نہیں؟ جبکہ حالات روز بروز خراب ہو رہے ہیں؟

جواب: اب بھی اگر کوئی افغانستان والے فارمولے کو ٹھیک کہہ رہا ہے تو اسے عقل کے ناخن لینے کی ضرورت ہے۔ اب تو اس کا کوئی حامی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ افغانستان والا فارمولا ٹھیک ہے۔ باقی رہا قومی اتحاد اور نظامِ مصطفیٰ کی تحریک کا معاملہ تو میں کئی بار واضح کر چکا ہوں کہ یہ تحریکیں اسلام کے لئے چلی ہی نہیں تھیں۔ اس ملک میں خالص اسلام کے لئے تحریک کا ایک موقع آیا تھا' یعنی متحدہ شریعت محاذ کے زیر اہتمام شریعت بل کی منظوری کے لئے تحریک کا..... لیکن اس محاذ سے خود وہ جماعتیں ہی بھاگ کھڑی ہوئیں۔ باقی تو ساری خالص سیاسی تحریکیں تھیں جن پر اسلام کا نعرہ لگایا گیا۔ یا پھر کوئی خالص اسلامی تحریک یہاں پر اُس وقت اٹھ سکتی تھی جب یہاں عائلی قوانین نافذ کئے جا رہے تھے۔ اگر اس معاملے کو لے کر علماء اور مذہبی جماعتیں اٹھتیں تو ایک خالص اسلامی تحریک برپا کی جا سکتی تھی۔ اس معاملے میں ہندوستان کے مسلمان ہم سے بڑی سبقت لے گئے کہ انہوں نے اپنے عائلی قوانین میں کوئی مداخلت برداشت نہیں کی۔ وہ اس سلسلے کی ہر کوشش کی راہ میں مزاحم ہوئے اور اپنی جانیں قربان کیں اور اس طرح انہوں نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کر لی کہ ایک ایسے ملک میں جہاں وہ بے چارے بڑے کمزور ہیں' دبے ہوئے' پسے ہوئے اور مقہور ہیں' اپنی یہ بات منوالی کہ ہندوستان کی کوئی عدالت مسلمانوں کے عائلی قوانین میں دخل نہیں دے سکتی۔ لیکن ہمارے ہاں اس کے برعکس صورتحال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری مذہبی جماعتوں نے سیاست کے کھیل کو اپنایا ہے کہ کبھی ایک کو کندھا دے کر اوپر چڑھا دیا کبھی دوسرے کو۔ کبھی کسی کو اوپر چڑھا دیا تو کبھی نیچے گرا دیا۔ اور اس چڑھانے اور گرانے میں دوسری سیکولر جماعتوں کا ساتھ دیا۔ تو اصل کام تو ہمارے ہاں ہوا ہی

نہیں۔ پھر اس کام کی یہ شرط بھی پوری نہیں ہوئی کہ جو لوگ اس کام کے لئے آگے آئیں وہ پہلے اپنے وجود پر، اپنے گھر میں اور اپنے دائرۂ اختیار میں دین کو نافذ کریں۔ ورنہ وہ منافق قرار پائیں گے اور نفاق کے نتیجے میں کبھی خیر اور اسلام وجود میں نہیں آسکتا۔ ان دو شرطوں کے بغیر کوئی راستہ قابل عمل نہیں ہے۔

سوال: آپ ہی سے سنا تھا کہ آج امتِ مسلمہ کو یہود و نصاریٰ اور دیگر غیر مسلموں کی طرف سے جو مار پڑ رہی ہے اس کی بنیادی وجہ امتِ مسلمہ کی اپنے نصب العین یعنی دعوت و تبلیغ وغیرہ سے غفلت ہے۔ اور حقیقت میں یہ غیر مسلموں کے ہاتھوں مسلمانوں پر اللہ کا عذاب ہے۔ پاکستان اور عرب ممالک میں حرکۃ الانصار اور الاخوان المسلمون جیسی جو تنظیمیں وجود میں آئی ہیں جن کا مقصد مسلح جدوجہد کے ذریعے کافروں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کرنا ہے، تو کیا یہ مسلح جدوجہد کر کے مسلمانوں کو اللہ کے عذاب سے بچانا چاہتے ہیں؟

جواب: الاخوان کے بارے میں تو آپ کی اطلاع درست نہیں ہے کیونکہ انہوں نے تو مسلح جدوجہد کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اِخوان مصر اور اردن میں سرگرم عمل ہیں اور دونوں جگہ وہ اسی رخ پر چل رہے ہیں جس پر یہاں جماعت اسلامی چل رہی ہے، یعنی انتخابات میں حصہ لے کر تبدیلی کی کوشش کرنا۔ اس کے ساتھ ساتھ اب وہ زیادہ زور سماجی کاموں پر دے رہے ہیں جیسے یہاں جماعت اسلامی کرتی رہی ہے، مثلاً ہسپتالوں اور سکولوں وغیرہ کا قیام اور خدمتِ خلق کے دوسرے کام، اگرچہ اب جماعت کا زور ادھر سے کم ہو کر پاسبان اور دوسرے اقدامات کی طرف زیادہ ہو گیا ہے۔ تو اخوان کا راستہ تو یہ نہیں ہے جو آپ نے بیان کیا۔ باقی حرکۃ الانصار سے میں واقف نہیں ہوں۔ اس سلسلہ میں اصل اصولی بات یہ ہے کہ جب تک ہم کسی ایک خطۂ ارضی میں اللہ کے دین کو قائم نہیں کرتے ہم قرآن حکیم کے الفاظ "لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ" کا مصداق بنے رہیں گے۔ یعنی تمہاری کوئی حقیقت نہیں، تمہارا کوئی مقام نہیں، تمہارا کوئی موقف نہیں، ہم سے بات کرنے کا تمہارا منہ ہی نہیں! یہ بات پہلے سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس کے لئے پھر سوچنا ہو گا کہ اس کا طریق کار کیا

ہے' یہ کیسے کیا جائے' اس پر باہم گفتگو کی جائے۔ افہام و تفہیم ہو' عصبیتوں اور گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر اس پر غور کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے کوئی تیار نہیں۔

باقی جہاں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو وہاں پر ان کی مدد کرنا اپنی جگہ ایک اچھا کام ہے۔ یہ مدد آپ چاہے انہیں ادویات کی صورت میں پہنچائیں یا اشیائے خورد و نوش کی صورت میں۔ دیکھئے' علاج کی دو صورتیں ہوتی ہیں: ایک Palliative Treatment ہوتا ہے اور ایک Curative Treatment --- کسی کو سخت قسم کا سردرد ہو رہا ہو تو اسے وقتی طور پر اسپرین تو دینی چاہئے تاکہ درد میں تو کمی ہو' لیکن اسپرین اس کا علاج نہیں ہے۔ مرض کی صحیح تشخیص ہونی چاہئے کہ اتنے شدید سردرد کا کیا سبب ہے؟ کہیں دماغ میں کینسر تو نہیں ہے؟ البتہ فوری طور پر اسے آپ اسپرین تو دیں تاکہ اس کا درد تو کچھ کم ہو۔ تو دنیا میں جہاں بھی مسلمانوں پر اس طرح کے ظلم و ستم ٹوٹ رہے ہیں اور انہیں ستایا جا رہا ہے ان کی جو بھی مدد کی جا سکتی ہو کی جائے۔ لیکن یہ اس مرض کا حل نہیں ہے اور اس سے اصل مسئلہ طے نہیں ہو گا۔ مسئلہ کا اصل حل یہی ہے جو میں عرض کر چکا ہوں کہ پہلے ہم دنیا کے کسی ایک خطے میں اللہ کا دین قائم کر کے دکھائیں اور اس کے لئے ظاہر ہے کہ ہم اپنے ملک ہی میں کوشش کر سکتے ہیں۔ ہم بوسنیا میں جا کر تو اسلام قائم نہیں کر سکتے۔ وہاں تو یہی ہو سکتا ہے کہ ادویات اور دوسرا امدادی سامان لے جایئے۔ اور اگر کسی وقت موقع ہو تو انہیں ہتھیار پہنچا دیجئے جس کی انہیں شدید ضرورت ہے۔ یا یہ کہ اگر اللہ کسی کو ہمت دے اور وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لئے وہاں جانا چاہتا ہے تو جائے اور وہاں جا کر جنگ کرے اور اگر اس میں اس کی جان چلی جاتی ہے تو اسے شہادت کا رتبہ حاصل ہو جائے گا۔ ان میں سے کسی چیز کی نفی نہیں' لیکن اس سے اصل مسئلہ حل نہیں ہو گا' کیونکہ آپ وہاں جا کر اسلام نافذ نہیں کر سکتے۔

اس کی ایک مثال میں نے قبل ازیں کہیں تحریر بھی کی ہے۔ ۵۴-۵۵ء میں جب "الجزائر کا جہاد" شروع ہوا تو ہمارے ایک دوست سعید الظفر' جو آج کل ٹورنٹو میں ہیں' اس وقت الہ آباد یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ جوشِ جہاد میں سرشار ہو کر اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر الہ آباد سے چلے اور الجزائر پہنچ گئے۔ وہاں جا کر جنگ میں حصہ

لیا گولی کھائی اور زخمی ہوئے۔ پھر طویل عرصہ ہسپتال میں رہے۔ اس دوران انہیں ٹی
بھی ہو گئی اور بڑے خراب حالات سے دوچار رہے۔ بہرحال ان کے بعد لندن م
settle ہوئے اور پھر امریکہ چلے گئے۔ اس کے بعد وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ یہ خبر پڑ
کر میرا خون کھولنے لگتا ہے کہ شمالی افریقہ میں شراب کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ملک الجزا
ہے۔ جس ملک کی آزادی کے لئے میں ہندوستان سے جا کر جنگ میں شریک ہوا اور اپنا خو
بہایا، جس کے لئے میں نے اپنی تعلیم کا نقصان کیا اور اپنا کیریئر برباد کیا، اس جہاد کے نتیجے م
وہاں ایسی حکومت قائم ہوئی جو اس وقت شمالی افریقہ میں شراب کی سب سے بڑی ایکسپور
ہے۔

چنانچہ میری تشخیص تو یہ ہے کہ جب تک ہم اس پوری ترکیب کو نہیں بدلیں گے اُ
وقت تک عالم اسلام کے حالات بہتر نہیں ہوں گے۔ لہٰذا ہم اسی پر زور دے رہے ہیں
پہلے اس ملک کے اندر، جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا، اسلام کے حقیقی نفاذ کی جدوجہد
جائے۔ ہمیں بوسنیا سے زیادہ اس ملک کی فکر کرنی چاہئے اور اپنی خیر منانی چاہئے۔ ہو
ہے کہ یہاں پر عذابِ الٰہی کا دوسرا کوڑا ہمارے سروں پر تن چکا ہو اور برسنے ہی والا ہو
اس لئے کہ قیامِ پاکستان کے بعد پہلے اللہ تعالیٰ نے ہمیں پچیس برس کی مہلت دی تھی، لیکن
جب ہم نے اس کے قیام کے مقصد کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں کی اور اللہ سے کئے ہو
سارے وعدے بھلا دیئے "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!" کا نعرہ فراموش کر دیا
ہماری پیٹھ پر سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں عذابِ الٰہی کا کوڑا برسا۔ اور اب پچیس
برس دوبارہ پورے ہونے کو ہیں۔ اس رمضان المبارک کی ستائیسویں کو پاکستان قا
ہوئے ۴۸ برس پورے ہو چکے ہیں اور مزید دو سال بعد دوسرے پچیس برس بھی پورے
جائیں گے۔ تو ہمارے لئے اس پر غور و فکر کی زیادہ ضرورت ہے۔

سوال: سورۃ النساء کی آیت ۷۵ میں اللہ کی راہ میں کمزور مردوں، عورتوں اور بچو
کے لئے قتال کا ذکر ہے۔ جس وقت اور ماحول میں یہ آیت نازل ہوئی اُس وقت
تک ابھی اسلامی ریاست یا خلافت قائم نہیں ہوئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ا

وقت جبکہ خلافت قائم نہیں ہے' اس آیت پر عمل کی صورت کیا ہوگی؟ جبکہ بوسنیا اور کشمیر کے مسلمانوں کے حالات پر یہ آیت سو فیصد صادق آ رہی ہے۔

جواب: اصل میں آپ نے اپنے سوال میں دو انتہائی باتوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ حکم اس وقت کا ہے جب ایک دعوت یا تحریک "اِقدام" (Active Resistance) کے دور میں داخل ہو چکی ہو' خواہ اسلامی ریاست قائم ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ آپ خود سوچئے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں مسلمانوں کو کفار کے ظلم و ستم سے کیوں نہیں بچایا؟ مکہ میں حضرت سمیہؓ اور حضرت یاسر (رضی اللہ عنہما) کو شہید کر دیا گیا لیکن حضور ﷺ نے کوئی اقدام نہیں کیا' بلکہ آخری دم تک ان ہی کو صبر کی تلقین فرماتے رہے کہ "اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃ" (اے یاسرؓ کے گھر والو صبر کرو' تمہارے وعدے کی جگہ جنت ہے۔) حالانکہ میرے اندازے کے مطابق اس وقت مکہ میں کم از کم چالیس مسلمان موجود تھے' جو "اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن" تھے۔ یہ بزدل تو نہیں تھے' انہیں جان تو پیاری نہیں تھی' معاذ اللہ بے غیرت نہیں تھے' ان سے اونچے مسلمان تو کوئی دوسرے ہو ہی نہیں سکتے جو مکہ کے ابتدائی دور میں ایمان لائے تھے۔ لیکن انہوں نے حضرت سمیہؓ اور حضرت یاسرؓ کو کیوں نہیں بچایا؟

پھر میرے نزدیک جس معنی میں آج کا تصورِ ریاست ہے یہ تصور اُس دور میں تھا ہی نہیں۔ ہم آج کی اصطلاحات کو اُس وقت کے زمانے پر جو منطبق کر دیتے ہیں تو افہام و تفہیم کے لئے تو کسی وقت اس طرح تشبیہ دینا مناسب ہوتا ہے لیکن کُلّی طور پر وہی تصور قائم کر لینا بالکل غلط ہے۔ آج کل کا "Established State" کا جو ایک تصور ہے یہ بالکل مختلف ہے' یہ تصور اُس وقت تھا ہی نہیں۔ خاص طور سے مدینہ منورہ میں تو ریاست کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ وہاں پر دوہرا عدالتی نظام قائم تھا۔ حضور ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ "فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْھُمْ" (المائدہ: ۴۲) یعنی آپ چاہیں تو ان کے مقدمات کا فیصلہ فرمائیں اور چاہیں تو انکار کر دیں۔ کیا ایسا کسی حکومت میں ہو سکتا ہے؟ مدینہ منورہ میں حضور ﷺ پر ایمان کا دعویٰ رکھنے والے منافق بھی اپنے مقدمات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے۔ ایک واقعہ ایسا بھی ملتا ہے کہ یہودی رسول اللہ ﷺ کے

پاس مقدمہ لانا چاہتا ہے لیکن مقدمہ کا دوسرا فریق ایک منافق اسے یہودی مولویوں کے پاس لے جانے پر مصر ہے۔ تو کیا یہ کسی ریاست کا نقشہ ہے؟ پھر میدانِ اُحد سے تین سو آدمی حضور ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر واپس چلے آئے' لیکن ان میں سے کسی کو سزا نہیں ملی۔ اس سے بڑا کوئی جرم ہو سکتا ہے کہ فوجی میدانِ جنگ سے فرار ہو جائے؟ تو اصل میں مدینہ منورہ میں ریاست یا حکومت اُس وقت تک قائم ہوئی ہی نہیں تھی۔ البتہ حضور ﷺ کی دعوتی جدّوجہد کی انقلابی تحریک Active Resistance کے دور میں آ چکی تھی اور قتال کا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ لہٰذا اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا کہ وہ ایسے مجبور مردوں' عورتوں' بچوں کی خاطر اللہ کی راہ میں جنگ کریں جنہیں کمزور بنالیا گیا ہے اور انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ OO

علاقائی اجتماع

برائے رفقاء تنظیم اسلامی پاکستان حلقہ پنجاب شمالی

از ۸ تا ۱۰ اپریل ۹۴ء

مقام : البدر ہوٹل کمیٹی چوک راولپنڈی

پروگرام : روزانہ صبح ساڑھے آٹھ بجے تا ایک بجے دوپہر

اور بعد نماز عصر تا بعد نماز عشاء

- ۸ اپریل ساڑھے بارہ بجے دوپہر لیاقت باغ راولپنڈی میں **جلسہ عام** منعقد ہو گا اور اسی روز بعد نماز مغرب توسیعی مشاورت کا اجلاس ہو گا
- علاقائی اجتماع میں حلقہ پنجاب شمالی کے تمام رفقاء کی شرکت لازم ہو گی
- علاقائی اجتماع کے بعد اسی مقام پر ۱۱ تا ۱۴ اپریل مبتدی اور ملتزم رفقاء کے لئے الگ الگ تربیت گاہیں منعقد ہوں گی

مدنی دور کے آغاز میں

اہلِ ایمان کو پیشگی تنبیہہ

(مباحثِ صبر و مصابرت' درس ۴)

(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓىِٕكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے پانچویں حصے کا تیسرا درس سورۃ البقرہ کی ان پانچ آیات (۱۵۳ تا ۱۵۷) پر مشتمل ہے۔ ان آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے۔

"اے ایمان والو مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے۔ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور مت کہو ان کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں' مردہ! بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں۔ اور ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں کچھ خوف سے' بھوک سے اور مال و جان کے نقصان سے اور نتائج و ثمرات کے ضیاع سے۔ اور اے نبی خوشخبری سنا دیجئے ان صبر کرنے والوں کو کہ جن پر اگر کوئی مصیبت ٹوٹتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے۔ یہی ہیں وہ

لوگ کہ جن پر ان کے رب کی جانب سے عنایتیں ہیں اور یہی ہیں وہ لوگ کہ جو راہ یاب ہونے والے ہیں (منزلِ مراد تک پہنچنے والے ہیں)۔"

ان آیات سے در حقیقت سورۃ البقرۃ کے نصفِ ثانی کا آغاز ہو رہا ہے' تاہم اس بات کو سمجھنے کے لئے سورۃ البقرۃ کے زمانۂ نزول کو ذہن میں رکھنا اور اس کے مضامین کے درمیان جو ایک نہایت گہری حکیمانہ ترتیب ہے' اس پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ زمانہ نزول کے اعتبار سے سورۃ البقرہ پہلی مدنی سورت ہے۔ تقریباً ڈھائی پاروں پر پھیلی ہوئی اور ۲۸۶ آیات پر مشتمل قرآن حکیم کی یہ طویل ترین سورۃ اکثر و بیشتر ان آیات پر مشتمل ہے جو ہجرت کے فوراً بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً قبل وقتاً فوقتاً نازل ہوئیں۔ صرف چند آیات مستثنیٰ ہیں' مثلاً سود کی حرمت سے متعلق آیات اور قرض کے لین دین سے متعلق احکام پر مشتمل طویل آیت جو کہ مدنی دور کے آخری زمانے سے متعلق ہیں' یا پھر سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں جن کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ وہ معراج کی شب نبی اکرم ﷺ کو امت کے لئے تحفے کے طور پر عطا ہوئیں' باقی قریباً پوری سورۃ ہجرت کے فوراً بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً قبل کے عرصے کے دوران نازل ہوئی جس کا دورانیہ کم و بیش دو سال بنتا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس سے متصلاً قبل سورۃ الحج ہے اور ان دونوں سورتوں کے مضامین میں بڑی گہری مناسبت ہے گو مصحف میں ان کے مابین لگ بھگ پندرہ پاروں کا فصل ہے' سورۃ البقرہ بالکل آغاز میں ہے اور تیسرے پارے کے قریباً نصف تک چلی گئی ہے جبکہ سورۃ الحج سترھویں پارے کے نصف آخر میں ہے' تاہم زمانہ نزول کے اعتبار سے یہ دونوں سورتیں متصل ہیں۔

سورۃ البقرہ — دو امتوں کی سورت

سورۃ البقرہ کے دو بڑے بڑے حصے ہیں۔ پہلے حصے میں رکوعوں کی تعداد دوسرے حصے کے مقابلے میں قدرے کم ہے لیکن آیات کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ حصہ اٹھارہ رکوعوں اور ایک سو باون آیات پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے حصے میں رکوع بائیس ہیں اور آیات ایک سو چونتیس ہیں۔ گویا ایک خوبصورت توازن یہاں موجود ہے' تقریباً نصفین پر یہ سورۂ

مبارکہ تقسیم کی جا سکتی ہے۔ نصفِ اول میں خطاب کا رخ تقریباً کل کا کل بنی اسرائیل کی طرف ہے' جبکہ نصفِ ثانی میں خطاب امتِ مسلمہ سے ہے بحیثیتِ امتِ مسلمہ۔ ویسے بنی اسرائیل سے براہ راست خطاب کا آغاز پانچویں رکوع سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پندرھویں رکوع تک چلا گیا ہے۔ گویا مسلسل دس رکوع بنی اسرائیل سے براہ راست گفتگو پر مشتمل ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے ابتدائی چار رکوع تمہیدی نوعیت کے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو رکوعوں میں تین قسم کے افراد کا ذکر آیا ہے اور پھر قرآن کی بنیادی دعوت کا خلاصہ دو رکوعوں میں بیان کر دیا گیا۔ وہاں بھی اگرچہ بین السطور یہود کا ذکر موجود ہے تاہم ان سے براہ راست خطاب نہیں ہے۔ پھر پانچویں رکوع سے یہود کے ساتھ براہ راست خطاب کا آغاز ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پندرھویں رکوع تک چلا گیا ہے۔ اس میں یہود یعنی بنی اسرائیل کو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کی مؤثر دعوت بھی ہے اور ان پر ایک نہایت مفصل قراردادِ جرم بھی عائد کی گئی ہے' اس لئے کہ ان کی حیثیت سابقہ امت مسلمہ کی تھی۔ یہود اڑھائی ہزار برس تک اس منصب پر فائز رہے' نبوت و رسالت کا سلسلہ ان کے یہاں لگاتار جاری رہا' آسمانی کتابیں انہیں عطا کی گئیں' اس پورے عرصے کے دوران شریعتِ الٰہی کے وہ حامل رہے' یوں کہئے کہ وہ اڑھائی ہزار برس تک اللہ کی زمین پر اللہ کی نمائندہ امت تھے۔ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی جو ناقدری کی' شریعتِ الٰہی کو جس طرح بازیچۂ اطفال بنایا' اللہ کی کتاب میں جس جس طرح سے تحریف کی' وہ دنیا پرستی میں جس طرح غرق ہوئے اور دین کا جو حلیہ انھوں نے بگاڑا' اس سب کا ذکر کر کے گویا یہ اعلان فرما دیا گیا کہ انہیں ان کے منصبِ جلیلہ سے معزول کیا جا رہا ہے اور ان کی جگہ ایک نئی امت محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کی بنیاد پر برپا کی جا رہی ہے۔ یہ ہے وہ مضمون کہ جس کے لئے سورۃ البقرہ کے پانچویں رکوع میں اگرچہ یہود کے لئے دعوتی انداز بھی ملتا ہے لیکن پھر دسویں رکوع تک ملامت کا رنگ غالب ہے' ان کے جرائم کی طویل فہرست کا بیان ہے بلکہ یوں کہئے کہ ایک مفصل فردِ قراردادِ جرم ہے جس کے نتیجے میں وہ اس مقام و مرتبہ سے محروم اور اس عظیم منصب سے معزول ہوئے جس پر وہ اڑھائی ہزار برس تک فائز

رہے اور اب امتِ مسلمہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس مقام پر فائز کی گئی ہے۔

چنانچہ پندرھویں رکوع سے لے کر اٹھارھویں رکوع تک، ان چار رکوعوں میں اسی اہم تبدیلی کی جانب اشارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان رکوعوں میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے کہ جو بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں کے جدِ امجد تھے اور اس اعتبار سے دونوں کے نزدیک یکساں طور پر محترم تھے۔ پھر ان رکوعوں میں خانہ کعبہ کی تعمیر کا باہتمام ذکر آیا ہے اور بوقتِ تعمیر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دعا کا ذکر ہے کہ اے پروردگار، ہماری نسل میں سے ایک امت برپا کیجیو اور ان میں اپنا ایک نبی مبعوث فرمائیو۔ اس دعا کا ذکر پندرھویں رکوع میں ہے۔ اور پھر گویا کہ یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب وہ امت برپا ہو گئی ہے اور اس نبی کی بعثت ہو گئی ہے جس کے لئے حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند اسماعیل (علیہما السلام) نے دعائیں مانگی تھیں۔ اب اس نبی کی نبوت و رسالت کی بنیاد پر ایک امت وجود میں آچکی ہے جسے ایک نہایت بلند منصب عطا کیا گیا ہے۔ چنانچہ سترھویں رکوع میں وہ آیۂ مبارکہ آئی جس میں نئی امت کی تشکیل کا ذکر ہے:

"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا"

"اور اسی طرح بنایا ہے ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت، ایک بہترین امت، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور رسول تم پر گواہ بن جائیں۔"

نئی امت کیوں تشکیل دی گئی؟

سورۃ الحج کے آخری رکوع میں یہی مضمون ایک دوسری ترتیب سے آیا تھا۔ اے مسلمانو، اپنے نصیب پر فخر کرو کہ اس نے تمہیں ایک اہم منصب کے لئے چن لیا ہے، پسند کر لیا ہے "هُوَ اجْتَبٰكُمْ" تم نبوت و رسالت کے سلسلے میں ایک مستقل کڑی کی حیثیت سے شامل کر لئے گئے ہو۔ یہ سب کچھ کس لئے ہے؟ "لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" تاکہ رسول تم پر گواہ بن جائیں اور تم پوری نوع

انسانی پر دین حق کی گواہی دینے والے بن جاؤ------ گویا دونوں مقامات پر ایک ہی مضمون مختلف ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہ شہادت علی الناس کا مضمون سورۃ الحج کے درس کے ضمن میں وضاحت کے ساتھ آ چکا ہے۔ پھر انہی رکوعوں میں دو مرتبہ وہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ کے اساسی طریق کار کا بیان ہے۔ پہلے تو پندرھویں رکوع میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا میں وہ الفاظ وارد ہوئے اور پھر اٹھارہویں رکوع میں جہاں اس دعا کی قبولیت کا اعلان ہے وہاں یہ الفاظ اس شان کے ساتھ آئے: " كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ " گویا کہ امتِ مسلمہ کے مقصدِ وجود اور اس کی غرضِ تاسیس کا نمایاں انداز میں ذکر سورۃ البقرہ کی اس آیت میں آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑی ہی اہم اور قابلِ توجہ بات ہے' اس لئے کہ چھوٹی سی انجمن بھی اگر بنائی جاتی ہے تو آغاز ہی میں اس کے اغراض و مقاصد معین کئے جاتے ہیں کہ یہ ادارہ کیوں تشکیل دیا جا رہا ہے اور کون سا اہم کام ہے جو اس کے پیش نظر ہے' اس انجمن کی غرض تاسیس کیا ہے؟ وغیرہ -- سوچئے کہ اتنی بڑی امت اگر تشکیل دی گئی ہے تو لازماً اس کے بھی کچھ اغراض و مقاصد ہوں گے۔ یہی درحقیقت اس آیت کا موضوع ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل لفظ "امت" کے مفہوم پر بھی غور کیجئے! "اَمَّ - يَؤُمُّ" کے معنی ہیں قصد کرنا' ارادہ کرنا۔ امت سے مراد ہے ہم مقصد لوگوں کا ایک گروہ یا ایک جماعت۔ ایک مشترک نصب العین رکھنے والے اور ایک ہی ہدف اور منزلِ مقصود رکھنے والے لوگ امت قرار پاتے ہیں۔ اس پس منظر میں سمجھئے کہ مسلمانوں کو امت اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہ فریضۂ نبوت اور کارِ رسالت جو پہلے انبیاء اور رسل ادا کیا کرتے تھے اب ختم نبوت کے بعد قیامت تک یہ ذمہ داری اس امت کو ادا کرنی ہے۔ لوگوں تک اللہ کے دین کو پہنچانے کا فریضہ اب اس امت کے حوالے کیا گیا ہے۔ اسی فریضے کا عنوان ہے "شہادت علی الناس" اور "اتمامِ حجت"۔ کہ اپنے قول و فعل سے دین حق کی گواہی دینا اور اللہ کی طرف سے خلقِ خدا پر حجت قائم کر دینا تاکہ محاسبۂ اخروی کے وقت وہ یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ اے اللہ تیری ہدایت ہم تک پہنچی نہیں' ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے' ہمیں

بتایا ہی نہیں گیا کہ تیری مرضی کس چیز میں ہے۔ سورۃ النساء میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

"لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ○"

"تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے (محاسبہ کے) مقابلے میں کوئی دلیل اور حجت باقی نہ رہے' اور اللہ تو ہے ہی سب پر غالب' کمال حکمت والا۔"

تو سورۃ البقرہ کے پندرھویں رکوع سے لے کر اٹھارھویں رکوع تک یوں سمجھئے کہ وہی مضامین جن کا مطالعہ ہم سورۃ الحج' سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں' یہاں ایک ذرا مختلف ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ خاص طور پر امت کے فرضِ منصبی کے حوالے سے ان سب مضامین کو بیان کرنے کے بعد اب خطاب شروع ہوتا ہے مسلمانوں سے بحیثیتِ امتِ مسلمہ' کہ اپنے ان فرائض کی عظمت کو پہچانو' ایک بڑا کٹھن اور نہایت بھاری بوجھ ہے جو تمہارے کاندھے پر آ گیا ہے۔ اس پہلو سے یہ مقام سورۃ المزمل کی ابتدائی آیات کے بہت مماثل ہے کہ جہاں آنحضور ﷺ کو آغازِ وحی کے بالکل ابتدائی دور میں شخصی طور پر خطاب کر کے کچھ خصوصی ہدایات دی گئیں اور پیشگی آگاہ کر دیا گیا کہ "اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا" (اے نبی) "ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں"۔ کارِ رسالت کی بھاری ذمہ داری آپؐ کے کاندھوں پر ڈالی جا رہی ہے۔ چنانچہ اسی موقع پر یہ تلقین بھی کی گئی کہ "وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا" کہ ان مخالفین کی باتوں پر آپ صبر کیجئے اور استقامت کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی پر کمربستہ رہئے اور ان مخالفین کو خوبصورتی کے ساتھ نظر انداز کر دیجئے۔

امت سے پہلا باضابطہ خطاب

اب کارِ رسالت کا یہ بوجھ چونکہ امت کے کاندھوں پر آ رہا ہے' یہ اجتماعی ذمہ داری ہے جو امت کو تفویض کی جا رہی ہے' لہٰذا امت سے خطاب ان الفاظ میں ہوا:

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ"

"اے اہل ایمان مدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے۔"

ہو رہا ہے کہ دعوت و تبلیغ دین کی اہم ذمہ داری اور فریضہ شہادت علی الناس سے عہدہ ہونے کے لئے قوت پکڑو صبر و ثبات سے' سہار اور تحمل سے اور نماز سے کہ جو اللہ کے کی ایک اعلیٰ شکل اور اس کے ساتھ ایک مضبوط تعلق قائم رکھنے کا موثر ذریعہ ہے۔

اگرچہ اس سے پہلے ہمارے اس منتخب نصاب میں "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے اظ متعدد بار آ چکے ہیں' یہاں تک کہ صرف سورۃ الحجرات میں پانچ مرتبہ یہ الفاظ وارد ئے ہیں لیکن یہاں ان الفاظ کے حوالے سے ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ قرآن حکیم کا یہ وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں سے بحیثیتِ امتِ مسلمہ گفتگو کا آغاز ہو ا ہے۔ امت کی تشکیل کے اعلان کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں کو باضابطہ خطاب یا گیا اور اس کے لئے "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ لائے گئے۔ یہ بات بہت سے ضرات کے لئے شاید قابل تعجب ہو کہ پورے مکی قرآن میں کہیں "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ نہیں آئے۔ قرآن مجید کا قریباً دو تہائی حصہ مکی سورتوں پر مشتمل ہے اور رے مکی قرآن میں "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے خطاب نہیں ملتا۔ اس قاعدے میں ستثناء صرف ایک ہے اور وہ سورۃ الحج کا وہی مقام ہے جو ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے' لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ اس سورۃ کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں اختلاف لا آ رہا ہے۔ بہت سے حضرات اسے مدنی مانتے ہیں اور اس کی بعض آیات کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مدنی دور میں نازل ہوئیں۔ وہ یقیناً یا تو ہجرت کے بعد نازل وئیں یا اثنائے سفر ہجرت میں ان کا نزول ہوا۔ اس پہلو سے یہ استثناء بھی باقی نہیں رہتا اور یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ پورے مکی قرآن میں "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے لفاظ نہیں آئے۔ آیت زیر نظر سے قبل سورۃ البقرہ میں اگرچہ صرف ایک مرتبہ یعنی آیت ۱۰۴ میں "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں لیکن وہ بھی ایک ضمنی بات کے طور پر' اصل میں مسلمانوں سے بحیثیتِ امت مسلمہ خطاب شروع ہو رہا ہے سورۃ البقرہ کی اس آیت ۱۵۳ سے۔ اس کے بعد مدنی سورتوں میں "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کا

اندازِ خطاب نہایت کثرت سے ملتا ہے۔ کی قرآن میں خطاب جہاں بھی ہے وہ براہ راست محمد رسول اللہ ﷺ سے ہے بصیغۂ واحد، ہاں تبعاً آپ کی وساطت سے مسلمان بھی اس خطاب کے مخاطب ہوتے ہیں، لیکن قرآن حکیم میں مسلمانوں کو بحیثیتِ امت خطاب کا آغاز مدینے میں آکر ہوا کہ جہاں مسلمان ایک اُمت کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور تشکیلِ امت کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا تھا۔ یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اگرچہ مکے میں بھی ان کی حیثیت ایک جماعت کی اور ایک REVOLUTIONARY PARTY کی تھی لیکن ان کی بحیثیت امت مسلمہ باقاعدہ تاج پوشی (CORONATION) مدینے میں ہوئی اور اس کی علامت کے طور پر تحویل قبلہ کا معاملہ ہوا۔ دوسرے پارے کے بالکل آغاز میں یہ حکم وارد ہوا کہ تمہارا قبلہ بدل دیا گیا ہے، آئندہ نماز میں بیت المقدس کی طرف رخ نہیں ہوگا بلکہ "فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" کہ اب پھیرلو اپنے چہروں کو مسجد حرام کی جانب۔ ایک نئے مرکز کے گرد ایک نئی امت کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا اور اسی اعتبار سے اب قرآن مجید میں مسلمانوں سے خطاب کے لئے مستقل اصطلاح ہے :
"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا"

ایک نئے دورِ آزمائش کا آغاز

بہرحال اس مرحلے پر یہ آیات ایک پیشگی تنبیہہ کا درجہ رکھتی ہیں کہ مسلمانو، یہ نہ سمجھو کہ ہجرت کے بعد اب تمہاری تکالیف کا دور ختم ہو گیا، مشکلات اور مصائب کا دور اب بیت گیا، تم نے ہجرت کی ہے فرار کی راہ اختیار نہیں کی، یہ درحقیقت اپنے مشن اور مقصد کی طرف پیش قدمی کے لئے ایک مرکز ہے جو اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے، تمہاری جدوجہد اب ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی ہے ع ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں، ابھی تو بڑی بڑی آزمائشیں آئیں گی، اصل کٹھن مراحل تو ابھی آنے ہیں کہ جن سے تمہیں سابقہ ہوگا اس لئے کہ تمہاری یہ دعوت اور تحریک اب ایک ایسے مرحلے میں آگئی ہے کہ جہاں نظریاتی تصادم اور کشمکش سے آگے بڑھ کر عملی تصادم یعنی جہاد بالسیف اور قتال کا آغاز ہو گا۔ گویا تم PASSIVE RESISTANCE کے مرحلے سے ACTIVE RESISTANCE کے دور میں داخل ہو گئے ہو۔ اب صرف جھیلنے اور

داشت کرنے کے مرحلے سے آگے بڑھ کر باطل پر حملہ آور ہونے اور دشمن پر ضرب
انے کا وقت آ رہا ہے' تو اچھی طرح سمجھ لو کہ آنے والا دور ہرگز کوئی آسائشوں اور آرام
دور نہیں ہے بلکہ تمہارے لئے نئی نئی آزمائشوں کے دروازے کھل رہے ہیں' لہٰذا ان
زمائشوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے صبرو ثبات اور نماز سے قوت و استقامت حاصل
رو۔ "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ"

بلاء و آزمائش کے مقابلے کے لئے اصل ہتھیار۔ صبر اور نماز

اس مرحلے پر تمہاری قوت کی اساس اور تمہارے صبرو ثبات کی بنیاد دو چیزوں پر ہے'
یک صبر اور دوسرے نماز۔ یہی دو چیزیں ہیں کہ جن کو تم اپنی مدافعت اور اپنے ثبات کے
لئے اپنا سہارا اور بنیاد بناؤ۔ "اِسْتَعِیْنُوْا" کا مفہوم ہے مدد چاہو' قوت پکڑو۔ ذہن میں
رکھئے کہ اس سے پہلے ہم سورۃ العنکبوت کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ ہم نے اس کے پہلے رکوع کو
تفصیل سے پڑھا' پھر ہم نے دیکھا کہ جن حالات سے اُس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دوچار تھے
ن میں انہیں جو ہدایات دی گئیں ان کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔ چنانچہ پانچویں رکوع کے آغاز
ں فرمایا گیا: "اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ
تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ" یعنی اے نبی! "تلاوت کرتے رہئے جو وحی کیا گیا آپ
کی طرف کتاب میں سے' اور نماز قائم کیجئے۔ یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی
ہے۔" یہی بات ہم سورۂ بنی اسرائیل میں دیکھ چکے ہیں۔ وہاں پر بھی فرمایا گیا کہ اے نبی!
گرچہ جو مصالحانہ پھندے آپ کے لئے لگائے گئے آپ اللہ کے فضل و کرم سے ان سے بچ
نکلے' لیکن صبرو ثبات کے لئے بنیاد وہی اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ
الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ" یعنی "قائم رکھئے نماز کو سورج کے
ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن پڑھنا فجر کا" اور سورۃ العنکبوت میں تلاوتِ
قرآن حکیم اور اقامتِ صلوٰۃ کے حکم کے ساتھ ہی فرمایا: "وَ لَذِکْرُ اللّٰهِ اَکْبَرُ" "اور
اللہ کا ذکر سب سے بڑی شے ہے۔" اور تلاوتِ قرآن حکیم اور اقامتِ صلوٰۃ اللہ کے ذکر
اور تعلق مع اللہ کی بہترین صورتیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ کسی بھی انقلابی کارکن کے لئے اپنی انقلابی جدوجہد میں ثابت قدم رہنے کا دارومدار اپنے مقصد اور نصب العین کے ساتھ پوری یکسوئی کے ساتھ وابستگی اور لگاؤ پر ہے۔ اپنے نصب العین سے اس کی وابستگی جس قدر گہری ہو گی' ذہن اور قلب کے اندر اس کی جڑیں جتنی گہری اتری ہوئی ہوں گی' اسی قدر وہ اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کرے گا' مصائب کو جھیلے گا' امتحانات میں کامیابی سے دندناتا ہوا گزر جائے گا اور آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے سرخرو ہو کر نکلے گا۔ یہ جدوجہد چونکہ اللہ کے لئے اور اللہ کے دین کے لئے ہے اور اس میں اصل مقصود و مطلوب اللہ کی رضا جوئی ہے لہٰذا یہاں تمہارے صبرو ثبات کی بنیاد تعلق مع اللہ ہے۔ اللہ کی یاد تمہارے دل میں جس قدر ہو گی اور اللہ تمہارے ذہن سے جتنا قریب تر رہے گا اتنا ہی تم اس راہ میں ثابت قدم رہ سکو گے۔ اور ذکر اللہ کے لئے جو سب سے جامع پروگرام تمہیں دیا گیا وہ ہے نماز۔ چنانچہ یہاں فرمایا گیا: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ" "اے اہل ایمان! مدد چاہو صبر سے اور نماز سے۔" "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ" "یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

اللہ کی معیّت اور نصرت کے اصل حقدار کون؟

——— یہ معیت تائید و نصرت کے معنی میں ہے۔ اس لئے کہ اللہ کی ایک معیت تو وہ ہے جو ہر شے کو حاصل ہے' کیونکہ اللہ ہر جگہ ہر آن موجود ہے۔ "ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ" "جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو اللہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے"۔ ان الفاظ میں اللہ کی معیتِ عمومی کا ذکر ہے' لیکن اہلِ ایمان کو اللہ کی جو معیت حاصل ہوتی ہے وہ ہے اللہ کی تائید و نصرت' اس کی طرف سے توفیق و تیسیر' اس کی طرف سے ہمت کا بندھے رہنا اور بشارتوں کا ملتے رہنا۔ یہاں اسی معنی میں فرمایا گیا: "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ" کہ یاد رکھو' اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے! اس کی یہ معیت ان لوگوں کو حاصل نہیں ہے جن میں مصائب جھیلنے اور مشکلات برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں' جو تھڑدلے' بزدل اور کم ہمت لوگ ہیں' جن کا نقشہ سورۃ النساء میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے: "مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ

ذٰلِکَ لَاۤ اِلٰی هٰۤؤُلَآءِ وَ لَاۤ اِلٰی هٰۤؤُلَآءِ "جن کی کیفیت یہ ہے کہ دنیا کو بھی چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا' یہاں کی لذاتِ سے کنارہ کشی بھی کسی درجے میں گوارا نہیں ہے' مال و اولاد اور تعیشات کی محبتیں بھی دل کے اندر گہری موجود ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ دین کی طرف بھی رغبت ہے۔ ایسے لوگ کسی طرح کا کوئی کام نہیں کر سکتے۔ تائیدِ ربانی اور توفیقِ الٰہی تو انہی لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے جو یکسو ہو کر آئیں' جن کے بارے میں پہلے عرض کیا گیا کہ جو "ہر چہ بادا باد' ما کشتی در آب انداختیم" کے سے جذبے کے ساتھ آئیں۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ کی معیت اور توفیق و تائید حاصل ہوتی ہے۔ سورۃ العنکبوت کی آخری آیت بھی ہم پڑھ آئے ہیں: "وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ' وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ" "اور جن لوگوں نے ہماری خاطر جدوجہد کی ہم لازماً انہیں اپنی راہیں بھا دیں گے۔ اور یقیناً اللہ تو احسان کی روش اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔ اللہ کی تائید اور توفیق ہر دم ان کے شامل حال رہتی ہے۔

اسی معیتِ خداوندی کا ایک ظہور ہمارے سامنے حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں آتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ جب بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے اور پیچھے سے فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب شروع کیا تو ایک مرحلہ وہ آیا کہ بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا' سامنے سمندر تھا اور پیچھے نظر آرہا تھا کہ فرعون اور اس کا لشکر چلا آرہا ہے' گرد اڑاتا ہوا قریب سے قریب تر پہنچ رہا ہے۔ اُس وقت موسیٰؑ کے ساتھیوں نے عالمِ بے چارگی میں کہا: "اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ" کہ اے موسیٰ' ہم تو پکڑے گئے! اب تو بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اُس وقت حضرت موسیٰؑ نے کمال دلجمعی کے ساتھ جواب دیا: "كَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ" نہیں نہیں! میرے ساتھ میرا رب ہے' وہ یقیناً مجھے راستہ دے گا!! چاہے بظاہر احوال کوئی راستہ نہیں' مادی اسباب و وسائل راستہ روکے کھڑے ہیں' لیکن میرا توکل و انحصار اور میرا تکیہ اور دارومدار اس ذات پر ہے جو مسبب الاسباب ہے' جو اسباب سے ماوراء ہے' وہ یقیناً راستہ نکال دے گا۔ یہی بات غار ثور میں حضور ﷺ نے فرمائی تھی۔ جب بربنائے طبع بشری حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی کچھ گھبرا گئے تھے کہ حضور' یہ لوگ غار کے دہانے تک پہنچ گئے ہیں اور اگر ان میں سے کسی نے غیر ارادی طور

پر بھی اپنے قدموں کی طرف نگاہ ڈال لی تو ہم پکڑے جائیں گے۔ اُس وقت حضور ﷺ نے فرمایا تھا: "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" نہیں نہیں گھبراؤ نہیں' اللہ ہمارے ساتھ ہے! تو یہ ہے مفہوم "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ" کا۔ یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ معیتِ الٰہی کا مقام ہے' یہ درحقیقت بندۂ مومن کا آخری سہارا ہے ان حالات میں بھی کہ جہاں کوئی حالت امید افزا نظر نہ آ رہی ہو' جہاں کہیں کوئی راستہ نکلتا ہوا دکھائی نہ دے رہا ہو اور امید کی کوئی کرن کسی جانب سے نظر نہ آتی ہو۔ معیتِ خداوندی کا یہ یقین اور اللہ کی تائید و نصرت پر یہ بھروسہ ایک ایسی شے ہے جو بندۂ مومن کو اس طرح کے انتہائی مایوس کن حالات میں بھی ثابت قدم رکھتی ہے اور وہ اپنی منزل مقصود کی طرف پیش قدمی جاری رکھتا ہے' نتائج کو اللہ پر چھوڑتے ہوئے جو کچھ اس کے بس میں ہوتا ہے وہ کئے چلے جاتا ہے۔ لہٰذا اس مرحلے پر امت کو اس کے فرضِ منصبی سے آگاہ کرنے اور اس کٹھن ذمہ داری جو اس کے کاندھے پر آ رہی ہے اس سے مطلع فرمانے کے بعد جو پہلی ہدایت دی گئی وہ یہی ہے کہ: "یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝"

(جاری ہے)

رپورتاژ

"لذتِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تانہ چشی"

ماہ رمضان المبارک کے دوران امیر تنظیم اسلامی کے دورۂ ترجمۂ قرآن کے بارے میں ایک شریکِ محفل 'جناب راشد حفیظ' کے تاثرات

رمضان المبارک باری تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے ہے جن میں عطائے ربانی کی سعت کا ادراک انسانی احاطۂ فہم سے بالا تر ہے۔ اس سے استفادے کا بہترین طریقہ ظاہر ہے کہ وہی ہو سکتا ہے جس کو نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک نے بہترین کہا ہو۔ چنانچہ یہ ریث ہماری آپ کی نگاہوں سے بارہا گزری ہے کہ تم میں سے بہترین وہ ہیں جو قرآن ھیں اور پڑھائیں۔ رمضان کے دوران اس تصور کو عملی شکل دینے کی سب سے عمدہ بیر یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو قیام اللیل کے ساتھ جوڑ دیا جائے اور یوں رحمتوں کا نزول سہ آتشہ ہو جائے۔

اہلِ لاہور پر اللہ کی خاص نظرِ کرم ہے کہ ان کو ان کے اپنے ہی شہر میں اللہ نے اپنے یک مخلص بندے کے ذریعے اسی سہ آتشہ رحمت و برکت کے حصول کی یہی سعادت میب فرمائی اور سچ تو یہ ہے کہ اس سعادت پر صرف لاہوریوں کی اجارہ داری تھوڑا ہی ہے۔ اآخرت میں شانِ کئی کے متلاشی جانے کہاں کہاں سے دورۂ ترجمہ قرآن میں شرکت کے لئے آئے تھے کہ رمضان سے قبل ہی اخبارات کے ذریعے اہل دل کو دعوت دی گئی تھی۔ ان کی سہولت کے لئے قیام و طعام کے انتظامات بھی کئے گئے تھے۔ ملک کے طول دعرض سے متعدد افراد اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے شعبان کی آخری تاریخ کو قرآن اکیڈمی پہنچے کہ اس پروگرام کے لئے قرعۂ فال 'قرآن اکیڈمی لاہور کی جامع مسجد کے نام نکلا تھا۔ مثال کے طور پر محترم عمر حیات الحسینی بوسن جو کہ جامع منہاج القرآن کے فارغ التحصیل ہیں' ملتان سے تشریف لائے۔ اسی طرح ایک جرمن نومسلم عزیزی الیگزنڈر مصطفےٰ فلزل جو کہ انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں دو ماہ کا نو مسلموں کے لئے

خصوصی تعارفی کورس کرنے تشریف لائے ہوئے ہیں' دورۂ ترجمہ میں شرکت سے فیض یاب ہوئے۔ یہ دو احباب تو وہ ہیں جن کا قیام راقم الحروف کے ساتھ رہا۔ ایسے نہ جانے کتنے اہلِ درد اور ہوں گے جو دل کی تڑپ کے ہاتھوں اس دعوتِ قرآنی پر دور دور سے کچے دھاگے سے بندھے چلے آئے تھے۔ باری تعالیٰ ان تمام احباب کی سعی و قربانی کو قبول فرمائے۔

رمضان کے دوران جامع القرآن' قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن میں جشن کا سا سماں رہتا۔ رات آٹھ بجے سے اکیڈمی کے گرد و نواح میں گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں لگنا شروع ہو جاتیں۔ اکیڈمی کے پڑوسیوں نے کمال خوشدلی سے اپنے گھروں کے باہر شرکاء کو گاڑیوں کی پارکنگ کی اجازت دے رکھی تھی۔ حتیٰ کہ ایک پڑوسی نے تو اپنے گھر کا اندرونی پارکنگ ایریا تک کھول دینے کی پیشکش بھی کی جسے بوجوہ قبول کرنے سے شکریئے کے ساتھ معذرت کر لی گئی۔ جامع القرآن کا سٹاف ان گاڑیوں کی حفاظت کے لئے شب بھر گشت پر رہتا۔ ان کی مزید تقویت کے لئے مقامی انتظامیہ کی طرف سے پولیس کے اہلکاروں کی بھی ڈیوٹی لگی رہتی۔ اللہ کا لاکھ شکر کہ اس نے اپنے لطف و کرم سے کسی ناخوشگوار واقعہ کو وقوع پذیر نہ ہونے دیا ورنہ ایسے حالات میں یہ کچھ بعید نہ تھا۔

دورۂ ترجمۂ قرآن کے معمولات اس طرح تھے کہ عشاء کی جماعت ساڑھے آٹھ بجے کھڑی ہوتی تھی جس کے بعد سنتوں سے فارغ ہونے پر امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد ایک گھنٹے میں پہلی چار تراویح میں پڑھے جانے والے متنِ قرآنی کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان فرماتے۔ پھر تراویح کی چار رکعت امیر محترم کے فرزندِ سعید حافظ عاکف سعید کی امامت میں ادا کی جاتیں۔ ترجمہ سن کر انہی آیات کی نماز تراویح میں سماعت کا کچھ اور ہی لطف تھا۔ ع "لذتِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تانہ چشی"۔ اس کے بعد اگلی چار تراویح کے متنِ قرآنی کے ترجمہ و تشریح کی وہی گھنٹہ بھر کی نشست ہوتی۔ آٹھ تراویح کے بعد پندرہ منٹ کا وقفہ ہوتا جس میں شرکاء کی چائے سے تواضع کی جاتی۔ بیس رکعت تک یہی سلسلہ چلتا رہتا اور یوں ڈھائی بجے شب کے کہیں بعد وتر کی جماعت ہوتی۔ تراویح اور ترجمۂ قرآن کی نشست جامع القرآن کے مرکزی ہال میں رہتی جس کے شمال میں پہلی منزل پر چھوٹا ہال

خواتین کے لئے مخصوص تھا۔ دونوں ہال اپنی اپنی تنگیٔ داماں سے "بے حال" رہے۔ خاص طور پر آخری عشرہ میں جب تراویح کی جماعت صحن کی آخری صفوں تک پہنچ جاتی تو تاخیر سے آنے والوں کو تو چند لمحے تک رک کر انتظار بھی کرنا پڑتا۔

اس دفعہ رمضان میں موسم نہایت خوشگوار رہا' جاڑے کا چل چلاؤ تھا اور بہار کی آمد آمد تھی۔ فطری بات ہے کہ ایسے موسم میں قلب و نظر کے دریچے آپ ہی آپ کھل جاتے ہیں' اس پر رمضان کی متبرک و معتبر ساعتیں' نزولِ سکینہ کی روحانی جلاء' قرآن کی سحر انگیزی اور پھر امیر محترم کی معجز بیانی — الاہور والے پنجابی میں اسے چُپڑی اور دو دو نہیں کہتے' سو سو کہتے ہیں۔

بارے وارداتِ قلبی کا بھی کچھ بیاں ہونا چاہئے۔ ہم جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے قبل جن رسولوں کو معجزات عطا کئے گئے تھے' چونکہ ان کی رسالت ایک محدود وقت اور علاقہ یا نسل وغیرہ تک کے لئے ہوتی تھی لہٰذا ان کے معجزات کی نوعیت بھی اسی کے مطابق تھی جبکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت چونکہ کافۃ الناس کے لئے اور قیامت تک وسیع ہے لہٰذا آپؐ کو عطا ہونے والا معجزہ یعنی قرآن پاک بھی اپنے اندر ایسی کیفیات رکھتا ہے جو قیامت تک کسی نہ کسی پہلو سے بنی نوع انسان کی بصیرت کے لئے معجزہ ثابت ہوتی رہیں گی۔ ہم سب کا اس پر ایمان تو ہے تاہم اس کیفیت کا عملی ظہور حالیہ دورۂ ترجمۂ قرآن میں دیکھنے میں آیا۔ حالانکہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دروس کا ایک امتیازی رنگ یہ ہوتا ہے کہ یہ معاشرے کے بالائی طبقہ یعنی انٹیلیکچولز پر سب سے گہرا تاثر چھوڑتے ہیں لیکن یہ دورۂ ترجمۂ قرآن ہر طبقہ کے لوگوں کے لئے قرآن کی اثر آفرینی کا معجزاتی ردِّعمل یعنی دل میں بے ساختہ اتر جانے والی کیفیت کا مظہر دکھائی دیا اور دانشور' معروف صحافی' تاجر' سرکاری ملازمین' علمائے کرام اور اہل ہنر یعنی ڈاکٹرز' انجینئرز سے لے کر ٹیلرز تک' گویا زندگی کے تقریباً ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے ہدایت کے متلاشی یکساں اور بھرپور ذوق و شوق سے شریک ہوتے رہے۔ گلبرگ کی ایک جامع مسجد کے محترم خطیب تو باقاعدہ ایک جماعت کی صورت' احباب کے ہمراہ تشریف لانے کا اہتمام فرماتے رہے۔۔۔ اگر ایسی سب مثالیں نوکِ قلم پر لاؤں تو کتاب ہو جائے لہٰذا خوفِ طوالت سے اپنے ایک

ذاتی احساسِ محرومی کے ذکر پر بات ختم کر رہا ہوں کہ اس دورۂ ترجمہ قرآن کے بعد قلم
ذہن میں زلزلہ سا برپا ہے اور شاید شدتِ انشراح کے ردِّ عمل میں رہ رہ کر یہ خیال اٹھتا
کہ کاش قرآن فہمی کی ایسی مجلس اگر پہلے نصیب ہو جاتی تو زندگی کا اتنا سفر جو رائیگاں گزر
شاید کچھ سنور جاتا۔ چند شرکاء نے تو یہاں تک گلہ کیا کہ محترم ڈاکٹر صاحب نے دورۂ تر
قرآن کے ساتھ تراویح کے اس معمول کا آغاز کرنے میں بہت تاخیر کی ہے اور سچ تو یہ
کہ یہ تاثر ہم سب شرکاء کا "سانجھا" ہے' حفیظ جالندھری کا ایک شگفتہ سا شعر ہے۔

ملے غیر کو بھی درد کی دولت یا رب اک میرا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

درد کی یہ دولت ترجمۂ قرآن میں بے پناہ لٹی اور "غیر" اپنے ہوتے چلے گئے۔ مجموعی تا
اندازہ اس کے ردعمل سے یوں ہو سکتا ہے کہ کتنے ہی دردمندوں نے اس درد میں مح
ڈاکٹر صاحب کے ساتھ شیئر کیا' انجمن خدام القرآن کے مقصدِ تاسیس یعنی قرآن کے پیغا
بلاواسطہ سمجھنے کی طلب اور پکار پر لبیک کہی اور انجمن کے زیر اہتمام عربی کی کلاسز اور قر
کالج کے ایک سالہ کورس میں شریک ہونے کے مصمم عہد کا اظہار کیا۔ دل کی کسک ان
اس جستجو کی طرف لے جاتی تھی کہ کاش کوئی ایسا راستہ مل جائے جس پر چل کر انسان ا
اور اس کے رسول ؐ کی مخالفت یعنی موجودہ غلیظ دجّالی نظام کی دلدل سے باہر آ سکے۔ ·
خیال ہے کہ یہ طلب ہی درحقیقت باری تعالیٰ کی رحمت کا دروازہ کھلنے کی ابتداء ہوتی ہ
یہی وہ طلب ہے جو انسان کے دل کی گہرائیوں سے "رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا" کی دعا نکلواتی
اور پھر آسمانوں پر لطف و عطا' رشد و ہدایت کے فیصلے ہونے لگتے ہیں۔ شرط صرف پہلا ق
اٹھانے کی ہوتی ہے اور یہ وہی پہلا قدم ہے جس کا اہتمام اللہ نے اپنے فضل و کرم
انجمن خدام القرآن کے ہاتھوں کروا کے ہمارے لئے گویا حجت پوری کر دی ہے یعنی قر
پیغام کے براہ راست فہم کی صلاحیت حاصل کرنا اور اسی کی پرزور دعوت اور پھر اس
بھرپور ردِّ عمل دورۂ ترجمۂ قرآن کا شاید سب سے بڑا نفع تھا۔

رمضان میں یوں تو ترجمۂ قرآن اور بھی کئی جگہ ہوتے ہوں گے کیونکہ جب
ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے یہ سلسلہ شروع کیا' اس کی افادیت نے بہت سے لوگوں کو کم
کم جزوی پیروی پر مجبور سا کر دیا ہے لیکن تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام ہونے والے دو

ہائے ترجمہ میں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ محور قرآنی یعنی امتِ مسلمہ کی اصل ذمہ دا
"اقامتِ دین" کی فکر کو دل میں اتارنے کی ہر پہلو سے سعی کی جاتی ہے۔ خاص طور پر
یہ خود امیر تنظیم کی زبان فصیح البیان سے ادا ہو رہا ہو تو اس کی اثر انگیزی کا دو چند ہو نا
بات ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کا بار بار یہ فرمانا کہ "خدا جانے آئندہ عمر وفا کرے یا نہ کر
پھر یہ سعادت مجھے نصیب ہو یا نہ ہو"۔ ہر چند کہ یہ سن کر دل میں ٹیس سی اٹھتی تھی مگر
ہی ان کا یہ فرمانا آتشِ شوق حصول کو ہوا بھی دیتا رہا اور امرِ واقعہ ہے کہ میں نے بارہا
سے آس پاس بیٹھے لوگوں کے لہو کی گردش کو بھی تیز تر ہوتا ہوا محسوس کیا۔ امیر محتر
بیان میں یہ روانی اور یہ الہامی سی کیفیت اس سے قبل کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔

دورۂ ترجمۂ قرآن کے علمی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کا یہ موقع نہیں۔ مختصراً صرف
عرض کروں گا کہ اقوام کی تواریخ کے اسباق' سابقہ اور موجودہ مختلف علمی و نفسیاتی مکا
ہائے فکر کے نظریات' جدید سائنسی و طبی علوم کے نظائر اور آج کے عالمی حالات کو
طریقے سے استنباط کرتے ہوئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے جس توجہ' گہرائی اور گیرائی
ساتھ قرآن کے پیغام کا احاطہ کیا ہے' بادی النظر میں انسان کی محدود صلاحیت سے ما
دکھائی دیتا ہے۔ ویسے تو امیر محترم کی ذات' گفتار اور کردار میں بھی اللہ کی برہان کی مع
ہے تاہم اس شان کو فزوں تر کرنے میں ان کی اپنی بساط سے بڑھ کر کوشش کرنے کی تمنا
مجلس سے چھپی نہ رہ سکی۔ ناسازیٔ طبع اور لگاتار تکلم کی وجہ سے گلے کی بڑھتی
تکلیف اور دیگر عوامل سے' جو عمر کے اس حصے میں ان کو ویسے ہی آزمائشوں میں ڈ
ہوئے ہیں' دواؤں اور گوناگوں ٹوٹکوں کے سہارے نبرد آزمائی کرتے ہوئے ہم نے ا
ہر نشستِ ترجمہ کے بعد پژمردہ لیکن ہر نئے آغاز پر پھر سے تر و تازہ پایا۔ باری تعالیٰ ا
اس کا اجر دے کہ جہاں تک قرآن کے پیغام کو شرکاء تک پہنچانے کا تعلق ہے' یہ کہنا
غلط نہ ہو گا کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا ہو گیا۔" اب اس سے کماحقہ' استفادے کی م
ہمارے اپنے بس میں ہیں' استطاعت' صلاحیت اور توفیق دینا پروردگار کے اختیار میں
یہ چیزیں طلب کے ساتھ مشروط ہیں۔

اس دورۂ ترجمۂ قرآن کی ایک اہم بات ۲۹ ویں شب کو منعقد ہونے والی سو
جواب کی نشست اور اس کے بعد بیعتِ مسنونہ کی کارروائی تھی۔ دورۂ ترجمۂ ا

اٹھائیسویں شب تکمیل کو پہنچا تھا۔ اشکالات کی وضاحت کے لئے اگلی شب مختص کی گئی تھی۔ احباب نے تنظیم اسلامی کی طرف سے تقسیم کئے گئے تعارف ناموں پر وضاحت طلب امور لکھ کر منتظمین کو دے دیئے تھے۔ ان کی وضاحت خود امیر محترم نے اپنے مخصوص دلنشیں انداز میں فرمائی جو اقامتِ دین کی جد و جہد کے فرضِ عین ہونے کے ادراک میں بہت زیادہ انشراح کا باعث ہوئی۔ اس کے بعد مسنون طریق پر بیعت کا انعقاد ہوا۔ ایک چادر پر ہاتھ رکھ کر جس کا سرا امیر محترم کے دست مبارک میں تھا' رفقاء نے ان کے ہاتھ پر اللہ سے اطاعت کا عہد کیا' جس کے بعد اجتماعی دعا مانگی گئی۔ یہ ایک نہایت روح پرور اور ایمان افروز نظارہ تھا' کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس پروگرام کو آخرِ شب کی بجائے شروع میں رکھا جاتا تاکہ وہ لوگ بھی جو اس وقت تک جاچکے تھے' اس سے کماحقہ' اثر لے سکتے۔

دورۂ ترجمہ کا یہ پورا پروگرام بحمد اللہ آڈیو' ویڈیو ریکارڈنگ کے ذریعے محفوظ کرلیا گیا ہے اور ہردو طرح کے کیسٹس کی شکل میں دستیاب ہے۔ باری تعالیٰ کا ہم پر یہ احسان ہے کہ اس نے انسانی فہم کو آج کی سائنسی ترقی کی صورت اس قدر شعور بخشا ہے۔ گو کہ وہ خاص روحانی فضا تو لوٹ کر نہیں آئے گی مگر اہل تمنا کی اشک شوئی کا سامان موجود ہے۔ کسی مجبوری یا فاصلے کی وجہ سے جو احباب شریک نہیں ہو پائے ان کے لئے تاخیر روا نہیں ہے۔ ان کیسٹس کو حاصل کرنے میں فرصت کا انتظار بے معنی ہے۔ مبادا کہ عمرِ دراز کے یہ چار دن آرزو یا انتظار میں ہی کٹ جائیں۔

آخر میں ایک تعریض' مقصود جس سے قطعِ محبت نہیں مجھے۔ دروغ برگردنِ راوی' ایک دانشور صحافی نے جو دورۂ ترجمۂ قرآن کی اس مبارک محفل میں بھی اکثر دیکھے گئے' اپنی نجی مجلس میں امیر محترم کے قرآن مجید سے خصوصی شغف کا ذکر کرتے ہوئے گوہر افشانی فرمائی کہ "ڈاکٹر اسرار احمد صاحب قرآن کے قوال ہیں"۔ سنتے ہیں کہ اس نہلے پر دہلا تو ایک ہم جلیس نے یوں مارا کہ "اور ایسی بات کوئی بھانڈ ہی کہہ سکتا ہے" تاہم واقعہ یہ ہے کہ قرآن کے قوال ہونے کا رتبۂ بلند تو جسے ملنا تھا مل گیا' اس ناچیز کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اسی قوال کے طائفے میں ہی شامل رکھے جس کی قوالی سننے کے لئے وہ دانشور صحافی نجانے کس جذبے سے مجبور ہو کر آتے رہے تھے۔ ○○

ماہ رمضان المبارک کے دوران دورۂ ترجمہ قرآن کے ذریعے

قرآن حکیم سے تجدیدِ تعلّق کی ملک گیر تحریک

پشاور سے کراچی تک پاکستان کے مختلف شہروں میں دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگراموں کی مختصر رپورٹ

ماہ رمضان المبارک میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن جس کا آغاز آج سے دس برس قبل امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے لاہور کی قرآن اکیڈمی سے کیا تھا' بحمد اللہ وہ لاہور کی قرآن اکیڈمی تک محدود نہیں رہا' بلکہ اب پاکستان کے متعدد شہروں میں قرآن حکیم کے ساتھ تجدیدِ تعلق کے اس مؤثر اور مفید پروگرام کا باہتمام انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک جامع رپورٹ ہدیۂ قارئین کی جارہی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہ رمضان کا یہ مفید پروگرام اب بحمد اللہ ایک تحریک کی صورت اختیار کرچکا ہے۔ (ادارہ)

لاہور میں دورۂ ترجمۂ قرآن کے دیگر پروگرام

جامع القرآن قرآن اکیڈمی کے علاوہ لاہور میں باقاعدہ دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام دو مقامات پر ہوئے۔ البتہ جامع مسجد گنگ محل میں حافظ محمد اقبال صاحب روزانہ نماز تراویح کے بعد آدھ گھنٹہ تلاوت کردہ حصہ کے مطالب کا خلاصہ بیان کرتے رہے۔

(ا) مسجد و مکتب' مدینہ روڈ' والٹن لاہور

تنظیم اسلامی کے سینئر رفیق محترم فتح محمد قریشی صاحب نے نہایت ذوق و شوق اور جانفشانی سے یہاں دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کی۔ یہ پروگرام روزانہ رات آٹھ بجے سے بارہ بجے تک جاری رہا۔ ہر چار تراویح سے قبل محترم قریشی صاحب لگ بھگ پاؤ پارہ کا ترجمہ بیان کرتے۔ سورتوں کی ابتدا میں سورتوں کا تعارف اور شان نزول بیان کرتے اور دوران ترجمہ اہم مضامین کی مختصر تشریح اور فقہی مسائل پر بھی مختصر بیان ہوتا۔ یہ پروگرام روزانہ چار نشستوں میں مکمل ہوتا رہا۔ حاضرین کی تعداد ابتدائی آٹھ تراویح میں ۲۵ تا ۳۰ رہتی' جب کہ ۱۵ تا ۲۰ افراد آخر تک شریک رہتے۔ چند خواتین نے بھی باقاعدگی سے

رکت کی۔ ۲۷ ویں شب میں ختمِ قرآن کے موقع پر کثیر تعداد میں لوگ پروگرام میں ریک ہوئے۔ ختمِ قرآن کے بعد محترم قریشی صاحب نے فرائض دینی کے جامع تصور اور قامتِ دین کی اہمیت کے موضوع پر مفصل خطاب کیا۔

۲) دار القرآن، وسن پورہ لاہور

یہاں پر امیر محترم کی ویڈیو کیسٹس کے ذریعے دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام مکمل کیا یا۔ یہاں حاضرین کی تعداد اوسطاً سات سے آٹھ تک رہی اور پروگرام روزانہ رات ٹھ بجے تا ایک بجے تک جاری رہا۔ (مرتب: عبدالرزاق)

کراچی میں قرآنی فصلِ بہار

تنظیم اسلامی کو دوسری دینی جماعتوں کے مقابلے میں یہ امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ ں کی تمام سرگرمیوں کا محور و مرکز قرآن کریم ہے۔ رمضان المبارک میں دورۂ ترجمۂ رآن کی محفلوں نے اس کی انفرادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ فیق ہی سے ممکن ہوا ہے۔۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لراچی میں دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز ۱۹۸۶ء میں ہوا جب پہلی بار امیر تنظیم اسلامی نے ماہ مضان المبارک میں ناظم آباد نمبر ۵ کی جامع مسجد میں دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کی۔ ہاں کے شہریوں نے اس پروگرام کو بہت سراہا اور پروگرام کے اختتام پر پچاس سے زیادہ فراد اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے تشکیل دیئے گئے اس کارواں میں شریک ہوئے۔ ۱۹۹ء میں قرآن اکیڈمی کراچی کی تعمیر مکمل ہونے پر قرعۂ فال ایک بار پھر کراچی کے نام نکلا ور امیر تنظیم اسلامی پاکستان نے قرآن اکیڈمی میں دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کی۔ شہر سے وری اور ٹرانسپورٹ کی عدم دستیابی کے باوجود دو ڈھائی سو افراد روزانہ اس پروگرام یں شریک ہوتے رہے جبکہ شب جمعہ کے موقع پر شرکاء کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا

تھا۔ ان پروگراموں کے انعقاد سے قرآن کریم کی انقلابی تعلیمات لوگوں میں عام ہوئیں جس کے نتیجے میں متعدد افراد کی زندگیوں میں بھی انقلاب رونما ہوا۔ تقویٰ کے مظاہر کے علاوہ باطنی کیفیات میں بھی درجہ بدرجہ ترقی ہوئی۔ گزشتہ سال یہ پروگرام قرآن اکیڈمی میں رفیق تنظیم انجینئر نوید احمد کے ذریعہ ہوا۔ اس پروگرام میں اوسط حاضری تقریباً پچاس کے قریب رہی۔ مزید برآں تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبرا کے دفتر واقع گلشن اقبال میں جو کہ شہر کے وسط میں واقع ہے یہ پروگرام ویڈیو کیسٹس کے ذریعہ کیا گیا۔ رفیق تنظیم جناب حافظ الطاف احمد نے صلوٰۃ تراویح پڑھائی۔ پچھلے سال کی مانند اس سال بھی کراچی میں دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام متعدد مقامات پر ہوئے:

قرآن اکیڈمی:

اس پروگرام کے لئے اس بار بھی قرعہ فال حسب سابق انجینئر نوید احمد کے نام نکلا۔ الحمدللہ کہ موصوف نے اس پروگرام کو احسن طریق پر انجام دیا۔ تسلسل کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کرتے رہے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے امیر محترم کے رفیق کار ہونے کا حق ادا کردیا ہے۔ اس پروگرام کی تشہیر کے ضمن میں قریباً چھ ہزار ہینڈ بل تقسیم کئے گئے اور ایک ہزار پوسٹرز چپکائے گئے۔ مزید برآں ماہ شعبان میں دوبار مختلف اخبارات میں اشتہارات شائع کروائے گئے۔

روزانہ تقریباً ۷۵ تا ۱۰۰ افراد اس پروگرام میں شریک رہے جبکہ شب جمعہ میں شرکاء کی تعداد ۱۲۵ تا ۱۵۰ افراد تک پہنچ جاتی تھی۔ ان میں اچھی خاصی تعداد نوجوانوں کی ہوتی تھی جو اپنے بزرگوں کے ہمراہ اس پروگرام میں شریک رہے۔ ان کے علاوہ تقریباً ۲۵ تا ۳۰ خواتین نے بھی اس پروگرام میں شرکت کی۔ بعض اوقات یہ تعداد ۷۰ تا ۸۰ تک پہنچ جاتی تھی۔ اس پروگرام کے دوران ہر ہفتہ اخبارات کو پریس ریلیز جاری کئے گئے جو روزنامہ "جنگ" "نوائے وقت" "جسارت" اور "امن" وغیرہ میں شائع ہوئے۔

اس پروگرام کی دو اور باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول یہ کہ صدر انجمن خدام القرآن سندھ کے اعلان کے مطابق شرکاء پروگرام کو کتابوں کی فروخت پر پچاس فیصد کی

خصوصی شرح پر رعایت دی گئی جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ امیر محترم کی کتابوں کے دو مکمل سیٹ بلکہ اس کے علاوہ سینکڑوں مزید کتابیں بھی فروخت ہوئیں۔ توقع ہے کہ اس کے ذریعہ تنظیم اسلامی کی دعوت اور طریقہ کار کا ایک وسیع حلقہ میں تعارف ہوگا۔

دوسری خاص بات یہ تھی کہ قرآن اکیڈمی میں معتکفین کے طعام کا انجمن کی طرف سے بندوبست کیا گیا۔ اخباری اشتہارات کے ذریعہ لوگوں کو قرآن اکیڈمی میں اعتکاف کی دعوت دی گئی۔ قرآن اکیڈمی چونکہ شہر سے دور افتادہ مقام پر واقع ہے لہٰذا معتکفین کے لئے طعام کی پیشکش ناگزیر تھی۔ معتکفین نے بھی جذبہ انفاق کا بھرپور مظاہرہ کیا اور طعام کے اخراجات کے لئے اچھی خاصی رقم کی اعانت کی۔ ۳۸ افراد نے اعتکاف کی سعادت حاصل کی۔ اس پروگرام کا نقد ثمریہ حاصل ہوا کہ معتکفین میں سے دس افراد نے تنظیم اسلامی میں اور گیارہ افراد نے تحریک خلافت پاکستان میں شمولیت اختیار کی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انجنیئر نوید احمد سمیت اکیڈمی کے تمام افراد کو جنہوں نے اس پروگرام کے لئے بھرپور محنت کی' اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

کراچی کے دیگر مقامات پر دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگراموں کی تفصیل

دفتر تنظیم اسلامی شرقی نمبر۲: اس پروگرام کی تکمیل مقامی امیر جناب اعجاز لطیف نے کی۔ جناب اعجاز لطیف درس و خطابت کا ایک منفرد انداز رکھتے ہیں۔ اس پروگرام کے بارے میں بہت حوصلہ افزا رپورٹ ملی ہے۔ عموماً ۲۵ تا ۳۰ افراد اس پروگرام میں شریک رہے۔ رفیق تنظیم جناب اصغر علی مجاہد کے دونوں صاحبزادوں نے اس پروگرام میں بطور حافظ اور سامع حصہ لیا۔ صدر انجمن کی پیش کش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں بھی شرکاء کو خصوصی رعایت پر سینکڑوں کتب مہیا کی گئیں۔

چھوٹا گیٹ۔ ایئرپورٹ: امیر تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبر۳ کی اہلیہ نے قرآن اکیڈمی کراچی میں منعقد ہونے والے پہلے یک سالہ کورس میں اپنے خاوند کے ہمراہ حصہ لیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ انہوں نے اتنی استعداد حاصل کی کہ اس مرتبہ اپنی رہائش گاہ پر خواتین کے لئے دورۂ ترجمہ قرآن کے لئے کمرہمت کس لی اور یہ ثابت کر دیا کہ کراچی کی خواتین خدمتِ دین میں مردوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ موصول شدہ رپورٹ کے مطابق تقریباً ۵۰ تا ۶۰ خواتین نے اس پروگرام میں شرکت کی۔

محمود آباد: تنظیم اسلامی ضلع جنوبی کے تحت قائم اسرہ کے دفتر واقع محمود آباد میں نقیبِ اسرہ جناب جاوید عبداللہ نے دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کا فریضہ انجام دیا۔ ان کے ترجمہ قرآن کی خاص بات یہ تھی کہ ان کے بیان میں تنظیم کی فکر کے ساتھ ساتھ تصوف کا سوز و گداز بھی شامل ہو گیا ہے۔ یہاں تقریباً ۱۵ سے ۲۰ افراد نے اس پروگرام سے استفادہ کیا۔

ان پروگراموں کے علاوہ متعدد مقامات پر دورۂ ترجمہ قرآن کے لئے امیر تنظیم اسلامی کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کے ذریعہ بھی استفادہ کیا گیا۔ اس کے لئے ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ عصر حاضر کے ان مؤثر ترین ذرائع ابلاغ سے جتنا ہماری تنظیم نے فائدہ اٹھایا ہے شاید ہی کسی اور تنظیم نے اٹھایا ہو۔

دورۂ ترجمہ قرآن کے آڈیو کیسٹ کے ذریعہ امیر تنظیم اسلامی ضلع وسطی جناب اختر ندیم اور ان کے اہل خانہ نے اور ناظم بیت المال ' تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبر ۳ جناب عبداللطیف کھوکھر اور ان کے اہل خانہ نے استفادہ کیا۔ علاوہ ازیں بذریعہ ویڈیو کیسٹس درج ذیل مقامات پر دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام سے استفادے کا اہتمام کیا گیا۔

برمکان جناب عبدالمجید ، رفیق تنظیم ضلع وسطی: اس پروگرام میں ۲۰ تا ۲۵ افراد شریک ہوئے۔

برمکان جناب فاضل صاحب: ان کے گھر پر ان کی اہلیہ نے اس پروگرام کا اہتمام کیا جو تنظیم کی رفیقات میں سے ہیں۔ تقریباً ۱۰ خواتین نے استفادہ کیا۔

برمکان جناب اسلم علوی رفیق تنظیم ضلع شرقی نمبر ۲: اس پروگرام کی تفصیلات ہمیں تاحال موصول نہیں ہوئیں۔ جناب علوی صاحب اپنے بھائی کی علالت کی بناء پر ملتان

روانہ ہو گئے۔

کھارادر: رفیق تنظیم اسلامی ضلع جنوبی جناب عبدالقادر انصاری کے توسط سے کھارادر میں دو مقامات سے لیڈ سسٹم کے ذریعہ امیر محترم کے دورۂ ترجمہ قرآن اور منتخب نصاب کے آٹھ آٹھ کیسٹس ٹیلی کاسٹ کئے گئے۔ لیڈ سسٹم سے تقریباً ڈیڑھ سو مکانات منسلک ہیں۔ یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے لوگوں نے اس ٹیلی کاسٹ سے فائدہ اٹھایا' تاہم توقع یہی ہے کہ وہاں رہائش پذیر اکثر افراد نے اس پروگرام سے استفادہ کیا ہو گا۔

عرشی سیلز پوائنٹ: فیڈرل بی ایریا میں شاہراہِ پاکستان پر واقع یہ سیلز پوائنٹ توسیع دعوت کے لئے ایک مفید ذریعہ ثابت ہوا۔ یہ سیلز پوائنٹ حال ہی میں قائم کیا گیا ہے جہاں مکتبہ و لائبریری کے علاوہ ویڈیو پر دروس و خطابات کے دکھانے کا اہتمام ہے۔ رمضان المبارک کے دوران رفیق تنظیم اسلامی ضلع وسطی سرفراز خاں نے اس پوائنٹ پر بھرپور محنت کی۔ نماز تراویح کے بعد سے رات بارہ بجے تک یہ پوائنٹ کھلا رہتا تھا۔ لوگوں کا خاصا رجوع رہا۔ ۲۰ سے زیادہ افراد لائبریری کے رکن بنے اور کتابوں اور کیسٹس کی خاطر خواہ فروخت ہوئی۔

انجمن خدام القرآن سندھ کو جسے ہماری تحریک کی جڑ کی حیثیت حاصل ہے' قرآن اکیڈمی میں اعتکاف پذیر حضرات میں سے ۲۵ ارکان میسر آئے جن میں دو محسنین اور بقیہ عام ارکان بنے۔

کراچی کے مذکورہ بالا پروگراموں میں جن رفقاء' معاونین اور ارکان انجمن نے حصہ لیا ان کا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے البتہ نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد گرامی کے مطابق کہ جو انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کر سکتا' ہم ان تمام افراد سے اظہار تشکر کرتے ہیں اور اس دعا کے ساتھ اس رپورٹ کو ختم کرتے ہیں کہ رمضان المبارک کے دوران کی گئی ان کاوشوں کو قبول فرمائے اور ہمارے لئے توشۂ آخرت بنائے۔

(مرتب کردہ: محمد سمیع)

منفرد رفیق حلقہ سندھ

ملتان

نی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ جو شخص میری سنت کو زندہ کرے گا جب کہ ہر جگہ
ونما ہو چکا ہو گا تو اسے سو شہیدوں کا اجر دیا جائے گا۔ اگرچہ سنت سے مراد اس کا کوئی
جز نہیں بلکہ یہ آپؐ کی پوری اجتماعی زندگی اور آپؐ کے طریقہ کا نام ہے' لیکن
ات کو بنیاد بناتے ہوئے اگر کوئی شخص آپؐ کے طریقے کے کسی ایک جزو کو بھی زندہ
ے گا تو اس کا اجر بھی یقیناً قابل رشک ہو گا۔

رمضان المبارک میں جہاں دن کو صیام کا حکم دیا گیا ہے اور وہ بھی پورے ایمان اور
ب کے ساتھ' وہاں رات کے قیام کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ اور جیسا کہ ہم
تے ہیں ایمان کا منبع و سرچشمہ قرآن حکیم ہے لہٰذا رمضان المبارک کی راتوں میں ہم
ن کو تراویح میں سننے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے ہاں اکثر و بیشتر تراویح جس برق
ری سے ادا کی جاتی ہیں اور ان میں قرآن حکیم جس انداز سے پڑھا جاتا ہے اس کے
نظر قرآن مجید کے فیوض و برکات' تعلیمات اور تجلیات سے انسان تہی دست رہتا ہے'
شاء اللہ ۔ امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے اس میدان میں بھی اللہ کے
اور اس کی توفیق سے عزیمت کی راہ کو اختیار کیا اور ماہ رمضان المبارک کی راتوں
قرآن مجید کا ترجمہ مع مختصر تشریح پیش کیا اور اس طرح اولاً اہل لاہور کے سینوں میں
ن کی شمع کو روشن کیا۔

۱۹۹۲ء میں محترم ڈاکٹر صاحب نے ملتان کی قرآن اکیڈمی کو یہ رونق بخشی اور ۲۳
اں میں' ۹ بجے شب سے لے کر ۳ بجے صبح تک' قرآن کا دورہ مکمل فرمایا۔ یوں پہلی
بہ اہل ملتان اس "بزم" سے روشناس ہوئے اور انہوں نے تقاضا کیا کہ یہ سلسلہ چلنا
ئے۔

۱۹۹۳ء میں یہ ذمہ داری انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب نے اپنے کاندھوں پر لی اور
پنے استاذ کی پیروی کرتے ہوئے ۲۳ راتوں میں قرآن مجید کا ترجمہ اور مختصر تشریح پیش
ہ امسال بھی انجمن خدام القرآن ملتان کی مجلس منتظمہ نے محترم فاروقی صاحب سے

درخواست کی کہ وہ اس ذمہ داری کو دوبارہ نبھائیں۔ اس مقصد کیلئے اخبار میں اشتہار د
گیا' بینر آویزاں کئے گئے' ۵۰۰ پوسٹر نما رنگا رنگ کارڈ بنوائے گئے' جنہیں مساجد' دوکانو
اور دفتروں میں آویزاں کیا گیا اور دس ہزار ہینڈ بل تقسیم کئے گئے۔

رمضان المبارک کی پہلی رات کو موصوف نے قرآن مجید کے نظم' اس کے ربط' ام
کی آیات' رکوعوں اور سورتوں کی تقسیم' اس کی عظمت اور اس کے حقوق پر سیر حاصل
گفتگو فرمائی اور ۲۰ رکعت تراویح مروجہ طریقے پر ادا کی گئیں۔ دوسری رات سے ترج
کا آغاز کیا گیا جسے پوری ۲۲ راتوں میں مکمل کیا گیا۔ جہاں تک پروگرام کا تعلق ہے میر
پاس الفاظ نہیں ہیں کہ اس کی افادیت اور اثر پذیری کو بیان کر سکوں۔ محترم فاروقی صاحب
اسے کمال روانی کے ساتھ بیان کرتے جاتے تھے اور سامعین ہمہ تن گوش سنتے چلے جا
تھے۔ سابقہ امت مسلمہ کی کارستانیاں' حضرت موسیٰؑ کی اپنی امت سے بیزاری' حضر
عیسیٰؑ کی معجزانہ ولادت' انباء الرسل' قصص النبیین' التذکیر بالاء اللہ' التذکیر بایام اللہ
قریش کی ہٹ دھرمی' منافقین کی چالیں اور نبی کریم ﷺ کی حکمت بھری نصیحت آمو
باتیں' اللہ کے عطا کردہ نظام عدل وقسط کا قیام اور نظام خلافت کی پکار --- یہ چند موضوعا
تھے جن پر موصوف نے اظہار خیال فرمایا۔ شرکاء کی تعداد آغاز میں تقریباً ایک سو کے لگ
بھگ ہوتی تھی جو وقفہ کے بعد نصف رہ جاتی۔ وقفہ بارہ تراویح کے بعد کیا جاتا جس میں
چائے اور بسکٹ پیش کئے جاتے تھے۔ تقریباً ۲۵ خواتین نے بھی مسجد کے پچھلی طرف' کر
خواتین میں بیٹھ کر مکمل قرآن سنا۔ چائے کے وقفے میں ان کے ہاں تو پورا دعوت کا سماں
ہوتا تھا اور بعض اوقات تو وہاں سے مردوں کیلئے بھی کچھ تحفتاً بھیج دیا جاتا تھا۔

آخری رات تقریباً ۲۷۵ مرد و خواتین شریک ہوئے۔ دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل
کے بعد شیرینی تقسیم کی گئی۔ شرکاء کی اکثریت نے اس تاثر کا اظہار کیا کہ کاش یہ پروگرا
پوری انتیس یا تیس راتوں تک چلتا تو کم از کم آخری عشرے کی طاق راتیں تو قرآن کے
میں گزر جاتیں۔ انجمن خدام القرآن کے عملے نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں انتھک
محنت کی اور "داعی" کا اجر تو اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ محترم قاری صاحب نے بھی اپنی کھنک
دار خوبصورت آواز سے قرآن پاک سنایا۔ اختتامی دعا انجمن کے صدر کرنل غلام حید

صاحب نے منگوائی۔ آخر میں اعلان کیا گیا کہ قرآن اکیڈمی ملتان میں ماہ جون میں ایک روزہ قرآنی ورکشاپ منعقد کی جائے گی۔ جو حضرات دین اور اس سے متعلق ذمہ وں کو سمجھنا چاہتے ہوں وہ اس میں شرکت کریں۔ کافی لوگوں نے اس میں دلچسپی ظاہر

(مرتب: ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی)

فیصل آباد

توفیقِ الٰہی گزشتہ سالوں کی طرح امسال بھی رمضان المبارک کے دوران نماز یح کے ساتھ ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن مکمل کیا گیا' جسکی تفصیل درج ذیل ہے۔

یہ پروگرام فیصل آباد شہر کے مرکز میں واقع دفتر انجمن خدام القرآن و تنظیم اسلامی منعقد کیا گیا۔ مترجم کے فرائض انجمن خدام القرآن فیصل آباد کے صدر ڈاکٹر عبدالسمیع ب نے انجام دیئے۔ دورۂ ترجمہ قرآن کی تشہیر کے لئے مقامی اخبارات میں پریس ز دیئے گئے۔ علاوہ ازیں بیس ہزار ہینڈ بلز چھپوا کر مختلف اخبارات میں رکھ کر تقسیم ائے گئے' تاکہ فیصل آباد کی دیگر مساجد کے منتظمین و نمازی حضرات تک زیادہ سے تعداد میں یہ پیغام پہنچے۔ اس طرح عوامی سطح پر لوگوں کو ترغیب دی گئی کہ اپنی متعلقہ جد میں تراویح کے دوران قرآن مجید کے ترجمہ کا بھی اہتمام کیا جائے۔

مورخہ ۱۱ فروری کو بعد نماز عشاء محترم ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے استقبال رمضان موضوع پر خطاب فرمایا اور اگلے روز سے دورۂ ترجمہ قرآن کا سلسلہ شروع ہو گیا' جو بیا ساڑھے آٹھ بجے سے شروع ہو کر رات ایک بجے تک جاری رہتا' جس میں ہر چار ت میں پڑھے جانے والے قرآن مجید کا پہلے باقاعدہ قرآن پاک سامنے کھول کر ترجمہ کیا ا اور مختصر تشریح ہوتی۔ بعد میں چار رکعات تراویح ادا کی جاتیں۔ ساڑھے دس بجے ہ کر کے شرکاء کو چائے پیش کی جاتی تھی۔ مستقل شرکاء کی اوسط تعداد ۳۵ کے قریب ی' جبکہ شب جمعہ اور آخری عشرہ میں اس تعداد میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔ شرکاء میں کٹرز' وکلاء اور دیگر اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے علاوہ خواتین بھی شامل رہیں۔ ۲۷ رمضان المبارک کی شب یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ ۲۸ رمضان المبارک کی شب

"سیرت النبی ﷺ کے عملی پہلو" اور ۲۹ رمضان المبارک کی شب شرکاء کے سا
"فرائض دینی کا جامع تصور" کے موضوعات پر محترم ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے ،
خطاب فرمایا۔

مزید برآں مقامی امیر تنظیم جناب محمد رشید عمر صاحب کو جامع مسجد محمدی اہلحدیث
پیپلز کالونی میں نماز تراویح کے دوران روزانہ تقریباً ۲۵ منٹ خطاب کی سعادت حا
ہوئی۔ جس میں موصوف تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن مجید کے حصہ سے ؛
آیات کا ترجمہ سامعین کے سامنے پیش کرتے رہے۔ شرکاء کی اوسط حاضری چالیس
قریب رہی۔

علاوہ ازیں مدینہ ٹاؤن کی اتفاق مسجد میں محترم کفیل احمد ہاشمی صاحب نے رمض
المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کے دوران قرآن مجید کی سورتوں کے مضا
اجمالی تجزیہ سامعین کے سامنے پیش کیا۔ اوسط حاضری ۴۵ رہی۔ جبکہ ۲۷ اور ۲۹ رمض
المبارک کو حاضری بڑھ کر ۴۰۰ ہو گئی تھی۔ موصوف امیر محترم کے قرآنی فکر سے
متاثر ہیں۔ اگرچہ ابھی تنظیم کی رفاقت اختیار نہیں کر پائے۔ (مرتب: حسین رضا)

پشاور

رمضان وہ مبارک مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا اور نبی کریم ﷺ
"جَعَلَ اللّٰہ صِیامَہ فریضۃً و قیامَ لیلِہ تطوّعًا" کے الفاظ کے ذریعے ا
مبارک کے دن کا روزہ فرض اور رات قیام نفل قرار دیا۔ اس حدیث مبارک کی ر
رمضان المبارک کے پروگرام کی دو شقیں ہیں۔ ایک دن کا روزہ اور دوسرے رات
اور اس میں قراءت و استماعِ قرآن۔ اور نبی اکرم ﷺ نے ایمان و احتساب کے
صیام و قیام رمضان پر گناہوں کی مغفرت کی بشارت دی ہے اور فرمایا ہے کہ روز
قرآن روز قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور بندۂ مومن کے حق میں سفارش کریں گے جو
کی جائے گی۔

روزے اور قرآن کے باہمی تعلق کے حوالے سے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرا

صاحب نے نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کی جس تحریک کی ابتدا آج سے دس سال قبل کی تھی وہ بحمد اللہ بتدریج وسعت پذیر ہے اور اب لاہور کے علاوہ پاکستان کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی یہ پروگرام شروع ہو چکا ہے۔ فی الحقیقت خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو غرض اور لوث کی آلودگی سے اپنے قلب و دماغ کو پاک و صاف رکھتے ہوئے صرف اور صرف رضائے الٰہی کے حصول اور فلاح آخرت کے لئے قرآن مجید کے ترجمہ و تفہیم سے مستفید ہوتے ہیں۔

اسی ماہ کی مناسبت سے رفقائے تنظیم اسلامی پشاور نے یہ فیصلہ کیا کہ اس مرتبہ رمضان المبارک میں ابتدائی طور پر اور دورۂ ترجمہ قرآن کی تمہید کے طور پر صلوٰۃ التراویح کے ساتھ قرآن مجید کے مضامین کا اجمالی تجزیہ پیش کیا جائے تاکہ اہل پشاور کو اس لذت سے شناسا کیا جا سکے۔ اس کے لئے راقم الحروف کو یہ ذمہ داری سونپی گئی اور اس کی تیاری اور بیان کرنے کا بار گراں اس کے ناتواں کاندھوں پر ڈالا گیا۔

یکم رمضان المبارک سے اس پروگرام کی ابتدا کی گئی۔ قرآن مجید کا جو منتخب حصہ تراویح میں پڑھا جانا ہوتا، فرض نماز کے بعد اس کے مضامین کا خلاصہ پیش کیا جاتا تھا۔ ابتداءً یہ پروگرام ۱۵، ۲۰ منٹ کے دورانیے پر مشتمل ہوتا تھا۔ لیکن آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں سورتوں کی تعداد بڑھتی گئی توں توں سورتوں کے مضامین کا احاطہ کرنے کے لئے وقت بھی بڑھتا گیا، چنانچہ اس میں نصف گھنٹہ سے لے کر ۳۵، ۴۰ منٹ تک صرف کئے جاتے رہے۔ جبکہ آخری روز انجمن خدام القرآن سرحد کے ناظم دفتر جناب غلام مقصود صاحب نے آخری پاروں کی منتخب سورتوں کا ترجمہ کیا اور ان سورتوں کے حوالے سے تذکیر بالآخرت کا فریضہ انجام دیا۔

صلوٰۃ التراویح کے اس پروگرام کی نمایاں خصوصیت ہمارے رفیق حافظ محمد عرفان صاحب کی قراءتِ قرآن تھی۔ حافظ صاحب نے عام روایت کے برعکس اور "وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا" کے حکم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر، ترتیل کے انداز میں قرآن حکیم سنایا۔

یہ پروگرام اہل پشاور کے لئے ہر پہلو سے ایک نئی اور انوکھی بات تھی جس کا انہیں

پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ معاشرے کا جو عام رجحان اور چلن ہے اس کا مظاہرہ یہاں بھی دیکھنے میں آیا اور لوگوں کی حاضری کم رہی اور تقریباً تیس سے چالیس افراد نے باقاعدگی سے شرکت کی، لیکن جو لوگ بھی اس میں شریک رہے انہوں نے اس کی افادیت کو محسوس کیا اور آئندہ کے لئے اس سے بھی آگے بڑھ کر دورۂ ترجمہ قرآن کے لئے عزم و ہمت کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس محنت کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور رجوع الی القرآن کی اس تحریک میں مزید برکت و وسعت پیدا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

(مرتب: خورشید انجم)

راولپنڈی / اسلام آباد

رمضان المبارک کی سعادتوں سے مستفید ہونے کیلئے راولپنڈی میں مندرجہ ذیل پانچ مقامات پر دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام بنایا گیا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ مقامی مساجد میں نماز عشاء اور تراویح پڑھ کر بعد میں بذریعہ وڈیو کیسٹ دورۂ ترجمہ قرآن کی محافل منعقد ہوتی تھیں:

(۱) ڈھوک گنگال، بر مکان محبوب ربانی مغل

(۲) بمقام شکریال، بر مکان شمس الحق اعوان

(۳) مسلم ٹاؤن، بر مکان شمیم اختر

(۴) بر مکان غلام مرتضیٰ اعوان۔ G.6.2 اسلام آباد

(۵) بمقام فیصل مسجد۔

فیصل مسجد میں خالد محمود عباسی اور چند دیگر رفقائے تنظیم نے اعتکاف کیا اور اس دوران خالد محمود عباسی صاحب نے دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام کیا۔ جس سے متاثر ہو کر دو افراد تنظیم میں شامل ہوئے۔ دیگر مقامات پر بھی دورۂ ترجمہ قرآن کے ہمراہ شرکاء کے اشکالات کے جوابات دینے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ان مقامات پر بھی مجموعی طور پر دو مزید افراد تنظیم اسلامی سے منسلک ہوئے۔

ان پروگراموں میں شرکاء کی تعداد ۵ تا ۲۵ تک رہی۔ رفقاء تنظیم نے اپنی تربیت و تعلیم کے لئے اسے بہت مفید پایا۔ (مرتب: شمس الحق اعوان)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۴۳
شمارہ: ۶
محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
جون ۱۹۹۴ء
فی شمارہ ۷/-
سالانہ زرِ تعاون ۷۰/-

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۴۵ سعودی ریال یا ۱۲ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔	۱۶ امریکی ڈالر
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۲۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر	۹ امریکی ڈالر

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقامِ اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰۔ فون: ۰۳-۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴
سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

زیر نظر شمارے کا مرکزی مضمون تو وہی ہے کہ جس کا حوالہ "میثاق" کے سرورق پر دیا گیا ہے یعنی "حسابِ کم و بیش" کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی کا وہ مفصل مضمون جس میں انہوں نے اپنے مالی و معاشی حالات کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے اور ضمناً کچھ دیگر ذاتی و خاندانی معاملات بھی زیر بحث آئے ہیں۔ آج کے دور میں کسی ایسی شخصیت کو کہ جو کسی بھی حوالے سے معروف ہو گئی ہو، داغدار کرنے کے لئے جو مختلف حربے اختیار کئے جاتے ہیں ان میں ذریعہ معاش اور مالی معاملات کے حوالے سے کسی اسکینڈل کا اچھالنا سب سے زیادہ مروّج ہے اور شاید آسان ترین بھی یہی ہے۔ معاش کا مسئلہ فی الواقع اتنا گھمبیر اور سنگین ہو چکا ہے اور فی زمانہ اتنی اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ آج بجا طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان کا اہم ترین اور مرکزی مسئلہ معاش ہی کا ہے اور بقیہ تمام مسائل اسی کی فروعات ہیں اور اس اعتبار سے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ یہودی ایک نہایت قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے مالیاتی نظام کے بل پر پوری دنیا پر حاوی ہیں اور، یہ بات اگرچہ ضمنی ہے تاہم دلچسپی سے خالی نہیں کہ، دجالی فتنے کے مظاہر میں سے اہم ترین مظہر احادیثِ مبارکہ کے حوالے سے یہ سامنے آتا ہے کہ ذرائع پیداوار اور وسائلِ معیشت پر اس کو مکمل تسلط حاصل ہو گا اور اسی حوالے سے وہ لوگوں کو کفر پر مجبور کرے گا کہ پہلے اپنی زبان سے کلمۂ کفر ادا کرو پھر تمہیں کھانے کو روٹی ملے گی۔ آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ ملکی بجٹ اور معیشت سے متعلق ہماری جو پالیسی بھی بنتی ہے وہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے تابع ہوتی ہے، ان کا انداز تحکمانہ ہوتا ہے کہ ہماری بنائی ہوئی پالیسی کو اگر اختیار نہیں کرو گے تو تمہارا دانہ پانی بند کر دیا جائے گا اور ہم جو اپنے کرتوتوں کے سبب سے حقیقی ایمان سے محروم ہو چکے ہیں، چار و ناچار ان کے "احکامات" کے سامنے اپنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں!!

وہ شخصیات جن کی شہرت دین کے حوالے سے ہو، ان کا معاملہ اس پہلو سے اور زیادہ نازک اور اہم ہو جاتا ہے کہ اگر پبلک کے سامنے یہ بات آئے کہ انہوں نے دین کو بھی دراصل دنیاداری کے لئے استعمال کیا اور خدمتِ دین کے پردے میں وہ اپنا بینک بیلنس بڑھانے اور جائیدادیں بنانے

پر کمربستہ رہے تو دعوت و تبلیغ کے میدان میں کی گئی ان کی تمام محنت اپنی اثر انگیزی کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ صفر ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ یہ چیز دین اور رجالِ دین کی بدنامی کا باعث بنتی ہے اور اس طرح بالواسطہ طور پر عوام کو دین سے برگشتہ کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور چونکہ ہمارے معاشرے میں ایسے واقعات کی کمی نہیں ہے کہ جن میں دین کو حصولِ دنیا کا ذریعہ بنایا گیا ہو لہٰذا پبلک میں ہر ایسے شخص کو جو خدمتِ دین کا عزم لے کر میدان میں آئے' شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے' خود وہ لوگ جو ہماری اس دعوت سے متاثر ہوتے اور تنظیم میں شامل ہونے کا جذبہ لے کر ہمارے قریب آتے ہیں' ان کے ذہنوں میں بھی یہ سوالات کلبلا رہے ہوتے ہیں کہ امیر تنظیم کا ذریعہ آمدن کیا ہے' ان کی گزر بسر کے ذرائع کیا ہیں' وہ تنظیم سے کوئی ماہانہ مشاہرہ لیتے ہیں یا انجمن خدام القرآن کے تنخواہ دار ہیں' وغیرہ۔ تنظیم کے سالانہ اجتماعات میں امیر تنظیم وقتاً فوقتاً ان امور کی وضاحت کرتے رہتے ہیں لیکن ظاہر بات ہے کہ ہر سالانہ اجتماع میں ان باتوں کا دہرایا جانا بھی خلافِ مصلحت ہے' اس لئے کہ اس میں دلچسپی تو صرف ان نئے رفقاء کو ہوتی ہے جو ان امور سے ابھی تک باخبر نہ ہوئے ہوں۔ چنانچہ رفقاء کی طرف سے بارہا یہ تقاضا سامنے آیا کہ ان تمام تفصیلات کو مدون کر کے ایک کتابچے کی صورت میں شائع کر دینا چاہئے تاکہ نئے شامل ہونے والے رفقاء اور وہ احباب جو تنظیم اسلامی یا تحریک خلافت میں شمولیت کے لئے آمادہ نظر آتے ہوں' اس کتابچے کو پڑھ کر اپنے اشکالات کے ضمن میں تشفی حاصل کر سکیں!

اس مضمون کی اشاعت کا ایک اضافی فائدہ' ان شاء اللہ' یہ بھی ہو گا کہ وہ رفقاء جو خدمت دینی کے جذبے سے سرشار ہو کر تنظیم اسلامی میں داخل ہوتے ہیں لیکن مالی حالات اور مستقبل کے اندیشوں کے پیش نظر اس میدان میں کچھ زیادہ پیش رفت نہیں کر پاتے' وہ اس مضمون کے ذریعے اپنے اندر اک ولولۂ تازہ محسوس کریں گے اور امیر تنظیم کے یہ تمام حالات پڑھ کر انہیں بھی شاید یہ ہمت ہو کہ وہ کسی مادی سہارے کے بغیر بالکلیہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے خود کو خدمت دینی کے لئے وقف کرنے پر آمادہ کر سکیں اور معاشی میدان میں امیر تنظیم کی یہ عزیمت جو بلاشبہ اللہ کے خصوصی فضل و کرم کا مظہر ہے' ان کے لئے کسی مستقل خیر کا ذریعہ بن جائے۔ وما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز ○○

○○○

اہم ملکی و ملی مسائل کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی کا تجزیہ

۶ مئی ' ۱۳ مئی اور ۲۰ مئی کے خطابات جمعہ کے پریس ریلیز

-------(۱)-------

کیا پاکستان کے خاتمے کا آغاز ہو چکا ہے؟

لاہور - ۶ / مئی : داعیٔ تحریک خلافت پاکستان و امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک جامع پانچ نکاتی لائحہ عمل پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسے پورے کا پورا اختیار نہ کیا گیا تو پاکستان کے خاتمے کا وہ عمل ہماری دعاؤں کے علی الرغم بھی مکمل ہو کر رہے گا جس کا آغاز ہو چکا ہے۔ مسجد دار السلام باغ جناح میں جمعہ کے بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایک قومی اخبار نے میری اس تقریر کے اشتہار کو موجودہ عنوان کے ساتھ شائع کرنے سے انکار کر دیا جسے میں قومی حمیت سے تعبیر کر کے قابل قدر سمجھتا ہوں' لیکن اسے بھی یہ تو ضرور سوچنا چاہئے کہ کبوتر اپنی آنکھیں بند کر لے تو وہ بلی غائب نہیں ہو جاتی جو اس کی تاک میں ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہر باشعور اور محبِ وطن پاکستانی کے دل و دماغ میں وطن کی فکر میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی ہیں' تاہم ہر شخص کے نزدیک صورت حال کی وجوہات اور تدارک کی تدابیر مختلف ہو سکتی ہیں' جبکہ قرآن حکیم کا ایک طالب علم ہونے کے ناتے مجھے یہ سب کچھ اسی کتاب ہدایت سے حاصل ہوتا ہے جس میں پچھلوں کے حالات ہی نہیں اگلوں کی خبریں بھی پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سورۃ الروم کی آیت ۴۱ میں فرمایا گیا کہ : "بحر و بر میں لوگوں کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے فساد ظاہر ہو گیا ہے تاکہ ان کے بعض اعمال کا مزا انہیں چکھایا جائے تو شاید وہ لوٹ آئیں۔" پھر سورۃ السجدہ کی آیت ۲۱ کا مضمون یہ ہے کہ : "بڑے عذاب سے پہلے انہیں چھوٹے عذاب سے گزارا جائے گا کہ شاید وہ سنبھل کر پلٹ آئیں۔"

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہم نے اپنی قومی زندگی کے ان ۴۷ برسوں میں اپنے ہاتھوں جو کمائی کی ہے اس کی سزا سورۃ الانعام کی آیت ۶۵ میں وارد ہونے والی وعید کے عین مطابق ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ تم پر اوپر سے عذاب نازل فرمائیں یا تمہارے قدموں کے نیچے سے یا پھر تمہیں باہم متصادم گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کی قوت کا مزا چکھا دیں۔" امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ سندھ کے بڑے شہروں بالخصوص کراچی میں گزشتہ چھ دن خونریزی کی جو کیفیت رہی اور شیعہ سنی جھگڑوں کے بعد اب ان عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے فساد کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں جن کی پشت پر پوری عیسائی دنیا موجود ہے۔ اور جہاں تک زمین و آسمان سے

عذاب نازل ہونے کا تعلق ہے تو وہ بھی بجلی اور پانی کی نایابی کی شکل میں ہمیں گھیرے میں لے رہا ہے جس کی شدت میں کالا باغ ڈیم کے بننے تک اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا' وہی کالا باغ ڈیم جو ہمارے سیاستدانوں کے گروہی مفادات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کبھی ظلم روا نہیں رکھتے اور جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے اس کا جواز کسی نے سمجھنا ہو تو سورۃ التوبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۷ کا مطالعہ کرے جہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر انہیں فراوانی عطا کی جائے تو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں گے اور نیکوکار بن کر رہیں گے لیکن جب انہیں فضل و کرم سے نوازا گیا تو اپنے عہد و پیمان سے پھر گئے جس کی سزا میں ان کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے نفاق ڈال دیا گیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ احادیث مبارکہ میں نفاق کی جو نشانیاں بیان کی گئی ہیں وہ بکمال و تمام ہمارے خواص و عوام میں پائی جاتی ہیں اور حکومتی' سیاسی بلکہ مذہبی قیادتوں میں تو سوائے چند مستثنیات کے یہ علامات مبالغے کی حد تک موجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لوگوں میں مشہور ہو گیا ہے کہ وزیر اعلیٰ سندھ براہ راست بھارت کے ایجنٹ ہیں تو اس زبانِ خلق کو نقارۂ خدا کیوں نہ سمجھا جائے' جبکہ بھارت نے کچھ ہی دنوں پہلے ہمیں دھمکی دی تھی کہ کشمیر کی رٹ لگانے والوں کو خود بہت جلد سندھ کے لالے پڑ جائیں گے۔ افواہ یہ بھی گرم ہے اور بہت وثوق سے بتایا جاتا ہے کہ الطاف حسین نے لندن میں اپنی رہائش کے لئے بیالیس لاکھ پاؤنڈ سٹرلنگ کا مکان خرید رکھا ہے' نیویارک میں پانچ کروڑ ڈالر میں خریدا ہوا ان کا ہوٹل شب و روز مال بنا رہا ہے اور یہ کہ ان کے پاس نقد موجود رقم کی مالیت دس ارب روپے ہے۔ پی پی پی کے ڈاکٹر غلام حسین کے حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پاکستانیوں کے ساٹھ ارب ڈالر باہر کے بینکوں میں جمع ہیں جن کو اگر واپس منگایا جاسکے تو بیس ارب ڈالر کا پورا غیر ملکی قرضہ بیک مشت ادا کر کے عالمی مالیاتی اداروں کے منہ پر چپت رسید کی جاسکتی ہے اور باقی چالیس ارب ڈالر سے پاکستانی معیشت کی از سر نو تعمیر ممکن ہے' لیکن ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے ان پاکستانیوں کی کھال کھینچنی ہو گی اور یہ کون کرے۔ کس کا دامن اتنا صاف ہے کہ دوسروں کو ٹکٹکی پر باندھنے کی ہمت کر سکے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بعض سندھی بھارت کے اشاروں پر یہ سوچے بغیر ناچ رہے ہیں کہ سندھ کو پاکستان سے جدا کر کے اس کی لاش نوچنے کے لئے کون کون سے گدھ سامنے منتظر ہیں' اور ایم کیو ایم کا سازشی عنصر نیو ورلڈ آرڈر کے لئے ہانگ کانگ کا متبادل تیار کرنے کے لئے کراچی کو سندھ سے کاٹنا چاہتا ہے۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے وزیر داخلہ نے یہ فرما کر اپنے خیال میں بڑا تیر مارا ہے کہ الطاف حسین کا حشر مجیب الرحمٰن جیسا ہو گا۔ کیا انہیں یہ یاد نہیں کہ مجیب کا حشر تو جو ہوا سو ہوا وہ ہمارے ملک کو تو دولخت کر ہی گیا تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بددیانتی اور لوٹ کھسوٹ کی اس ملک میں انتہا ہو چکی ہے اور کسی کا دامن ان دھبوں سے پاک نہیں۔ کروڑوں اربوں کے غبن سامنے آتے ہیں اور چند دن اخباروں میں سنسنی پھیلا کر گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے سوال کیا کہ آج کے زمانے میں اس ملک کا بھی کوئی مستقبل ہو سکتا ہے جہاں احتساب کی کوئی روایت ہی موجود نہ ہو۔ لیاقت علی خاں کے قتل سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک اور اس کے بعد بھی سینکڑوں کمیشن بیٹھے لیکن کسی ایک کی بھی رپورٹ منظرِ عام پر نہ آئی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ان حالات میں مجھے تو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ پاکستان کے خاتمے کا آغاز ہو چکا ہے اور اگر ملک کو بچانا مقصود ہے تو پانچ امور کی طرف فوری پیش قدمی لازم ہے، جن میں سے اولین یہ ہے کہ کتاب و سنت کو مکمل بالادستی کا مقام دیا جائے کیونکہ پاکستان کی واحد وجہ جواز یہی ہے، ورنہ یہ ملک ہم نے برلوں اور ٹاٹاؤں کے باپ پیدا کرنے اور جاگیرداری کو تحفظ دینے کے لئے نہیں بنایا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہم جوہری توانائی کو ہر مقصد کے لئے استعمال کریں اور ڈنکے کی چوٹ ایٹم بم بھی بنائیں، کیونکہ نیو ورلڈ آرڈر کو چیلنج کر کے ہی ہم اپنی قوم میں ایک نئی روح پھونک سکتے ہیں۔ تیسرے سود کا مکمل خاتمہ کیا جائے اور اس سلسلے میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے پر پوری دیانتداری سے عمل کیا جائے۔ چوتھے صدارتی نظام کو اختیار کیا جائے کیونکہ انگریزوں کی لعنتی وراثت پارلیمانی نظام ہمارے ہاں سیاسی بدعنوانی کی جڑ اور عدم استحکام کا اصل باعث ہے۔ اور آخری بات یہ کہ صوبوں کی نئی حد بندی کی جائے۔ پنجاب کو چھ صوبوں میں، سندھ کو تین صوبوں میں اور سرحد و بلوچستان کو بھی چھوٹے انتظامی یونٹوں میں تقسیم کرنا ضروری ہو چکا ہے جس کے بغیر سندھ کا مسئلہ کبھی حل نہ ہو گا۔ آخر میں ڈاکٹر اسرار احمد نے پاکستان کے مسلمانوں کو قومِ یونسؑ کی طرح توبہ کی تلقین کی جس کے بعد عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایک بار پھر جوش میں آئے۔ انہوں نے کہا کہ ضرورت اجتماعی توبہ کی ہے لیکن اس سے پہلے ہم میں سے ہر شخص کو انفرادی توبہ کر کے کم از کم اپنی زندگی پر تو خلافت قائم کر دینی چاہئے۔ OO

-------(۴)------

پاکستان کی سالمیت اور مسئلہ سندھ

لاہور۔ ۱۳/ مئی : امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت ڈاکٹر اسرار احمد نے دعویٰ کیا ہے کہ سندھ کے مسئلے کا صوبے کی تقسیم کے سوا کوئی حل نہیں، اور کوئی ہے تو سامنے لایا جائے، کیونکہ اسے فوج کے حوالے کئے رکھنا وہاں نیم مارشل لاء کا تسلسل ہے جس کی وکالت جمہوریت کے دعویداروں کو زیب نہیں دیتی۔ مسجد دار السلام باغ جناح کے خطاب جمعہ میں انہوں نے کہا

کہ کراچی کی اتنی بڑی آبادی کو دیوار سے لگا کر رکھنے میں ملک و قوم کا مفاد ہرگز نہیں' جو پاکستان پر اس کے دوسرے شہریوں سے کم حق نہیں رکھتی۔ ایم کیو ایم حقیقی کے چیئرمین آفاق احمد کے انتباہ کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ واشنگٹن پلان محض کوئی واہمہ نہیں ہے۔ ان کی یہ اطلاعات بالکل درست نہ بھی ہوں کہ کئی امریکی کمپنیوں کو کراچی کی بندرگاہ کے متعدد اہم ترین حصے لیز پر دے دیئے گئے ہیں اور امریکی بینکوں کی کراچی میں موجود شاخوں میں دہشت گردوں کے اکاؤنٹ چل رہے ہیں تب بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کو ایک نئے ہانگ کانگ کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے' چنانچہ ایم کیو ایم کے لیڈروں سے امریکی سفارتی عملے کے روابط بڑھتے چلے جا رہے ہیں' جن پر اخباری اطلاعات کے مطابق حکومت پاکستان نے احتجاج بھی کیا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ ان بین الاقوامی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سندھ میں آباد مہاجروں کو مطمئن کرنا ضروری ہے جو صوبائی سطح پر ان کے معاملات خود انہی کے ہاتھوں میں دیئے بغیر ممکن نہیں اور اس کے لئے صوبے کی تقسیم لازم ہے۔ تاہم تقسیم کا فارمولا صرف سندھ پر استعمال ہوا اور پنجاب کو بھی لسانی ثقافتی بنیادوں پر اس کے تقریباً مساوی ٹکڑوں میں تقسیم نہ کیا گیا تو سندھی اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مشرقی پنجاب ہمارے مغربی پنجاب سے رقبے میں پہلے ہی چھوٹا تھا لیکن اسے بھی ایک عرصہ پہلے تین صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اس سے بھارت کی سالمیت پر آج تک کوئی آنچ نہیں آئی۔ انہوں نے کہا کہ صوبوں کی تقسیم اور صدارتی نظام کے حق میں میری حمایت دینی اصولوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی حکمت عملی کا تقاضا ہے' ورنہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور کتاب و سنت کی مکمل بالادستی کے تحت حکومت کا کوئی بھی بندوبست اسلام میں مباح ہے۔ میرے نزدیک اگرچہ صدارتی نظام خلافت کے نظام سے قریب تر ہے تاہم پارلیمانی نظام کی خرابیوں کا کوئی علاج نکال لیا جائے تو وہ بھی خلافت کی ضد نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اس اعتراض کے جواب میں کہ "پارلیمانی نظام انگریز کی وراثت ہے تو صدارتی نظام بھی امریکہ کا عطیہ ہے" کہا کہ پھر یہ بھی تو دیکھا جانا چاہئے کہ انگریز کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا اور امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور ہے۔ انہوں نے کہا کہ پارلیمانی نظام میں قوت کے دو مراکز صدر اور وزیر اعظم کے نام سے وجود میں آ جاتے ہیں جن کے درمیان اختیارات کی تقسیم میں توازن برقرار رکھنا تقریباً ناممکن ہے' جبکہ توحید کے حق میں قرآن مجید میں ایک دلیل یہ بیان ہوئی ہے کہ خدائی اختیارات رکھنے والے معبود اگر دو ہوتے تو کائنات فساد سے بھر کر رہ جاتی۔ صدارتی نظام کے جواز میں ایک دلیل کے طور پر ڈاکٹر اسرار احمد نے مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی کے اصول کا ذکر کیا جسے اب ایک عصری تقاضے کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور جو

ہ دارتی نظام حکومت میں ہی ممکن ہے' جبکہ پارلیمانی نظام میں مقننہ اور انتظامیہ ہمیشہ گڈمڈ رہتی ہے۔

قبل ازیں ڈاکٹر اسرار احمد نے حج اور قربانی کے شعائر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ اللہ ے خلیل' ابوالانبیاء اور امام الناس ابراہیم علیہ السلام کی مثالی زندگی کے نقوش ہیں جو شروع ے آخر تک کڑے امتحان سے عبارت ہے۔ انہوں نے کہا کہ اپنی طویل اور ابدی زندگی کا وہ تصر حصہ جو ہم دنیا میں گزارتے ہیں دراصل ایک امتحان ہے جس سے افراد اور قوموں دونوں کو زرنا پڑتا ہے' البتہ فرق یہ ہے کہ افراد کے امتحان کا آخری نتیجہ آخرت میں نکلتا ہے جبکہ اقوام ے امتحان کے پورے نتائج اسی دنیا میں ظاہر کر دیئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ امت سلمہ کو یہ امتحان درپیش ہے کہ ختم نبوت کے بعد وہ اللہ کے بندوں کو اس کا دین پہنچانے کا فرض ا کرتے ہیں یا نہیں' جس میں عرب تو ناکام ہو کر اغیار کے شکنجے میں جکڑے جا چکے ہیں' اگلی باری اری ہے' کیونکہ ہم نے بھی پاکستان کو اللہ تعالیٰ سے اسلام کا نمونہ بنانے کے لئے مانگا تھا۔ اب ہم متحان کے عرصۂ محشر میں ہیں جس میں سرخروئی کے حصول کے لئے ہمیں ملکِ خداداد کو اسلام کے ظام عدل و قسط کے ماڈل کے طور پر پیش کر کے پوری دنیا پر حجت تمام کرنی ہے۔ اس مشن میں ہم س طرح ناکام رہے جیسے اب تک ہیں تو پاکستان کے وجود کا کوئی جواز نہ رہے گا اور ویسے بھی کستان کو نہ تاریخ کی پشت پناہی حاصل ہے نہ جغرافیہ کا تحفظ' جبکہ کوئی نسلی' لسانی اور تہذیبی ندس بھی اس کی یکجائی کے لئے میسر نہیں ہے اور صرف اسلام ہی وہ رشتہ ہے جو اس کی آبادی کو تحد رکھ سکتا ہے۔ ○○

-------(۳)------

امریکی عیاری کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جانا چاہئے!

قوم ایٹمی تنصیبات کے معائنے کی اجازت نہیں دے گی

لاہور۔ ۲۰/مئی : امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ قومی اور بین الاقوامی سیاست میں میکیاولی اور چانکیہ کے بدنام زمانہ موقع پرستانہ اصول پہلے بھی استعمال ہوتے رہے ہیں لیکن جس عیاری سے اب بڑے پیمانے پر کام لیا جا رہا ہے اس کا مقابلہ صرف اپنے مبنی برحق موقف پر ڈٹ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح کے اپنے خطاب جمعہ میں انہوں نے کہا کہ دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ کو عیاری کا یہ استعمال زیب نہیں دیتا جو اس کے بغیر بھی دنیا کو اپنے اشاروں پر چلا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پاکستان کے ساتھ اپنے معاملات میں امریکہ کسی ایک موقف پر قائم نہیں رہتا اور پینترے بدلتا رہتا ہے' جس کا عکس

ہماری حکومت کی حکمت عملی میں بھی نظر آنے لگا ہے جس کے ذمہ دار ترجمان حساس مسائل پر قوم کا شاید رد عمل ہی دیکھنے کے لئے متضاد بیانات دیتے رہتے ہیں۔ ڈپلومیسی کے اس انداز کی ایک مثال تو خاموش سفارتکاری کی پراسرار اصطلاح ہے اور دوسرا شوشا ہمارے وزیر خارجہ نے قوم کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں انہی دنوں چھوڑا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ ہم اتنے بے خبر نہیں کہ یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ امریکہ اپنے وسیع اور موثر جاسوسی نظام کے بل پر ہماری ہر بات سے بروقت آگاہ ہو جاتا ہے اور اس کے جاسوسی کے لئے مخصوص خلائی سیارے زیر زمین حقائق کو بھی بر آمد کرلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود قوم اپنی ایٹمی تنصیبات کو معائنے کے لئے کھولنے کی اجازت نہیں دے گی، جس کا مطلب اپنے جوہری پروگرام پر امریکہ کی براہ راست نگرانی اور بالادستی کو قبول کرلینا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ میرا تعلق حزب اقتدار سے ہے نہ حزب اختلاف سے، تاہم نوابزادہ نصر اللہ خان اور محمد نواز شریف صاحب کے اس موضوع پر بیانات کی تائید کرنا میرا قومی فرض ہے۔ انہوں نے قوم کو خبردار کیا کہ بھارت اور اسرائیل کے مقابلے میں کھڑا ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جوہری صلاحیت دے کر ہمیں اپنے خاص فضل سے نوازا ہے جس کی ہم نے ہتھیاروں میں بھی استعمال کرکے پوری قدر نہ کی تو پھر ہمیں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے محروم ہونا پڑے گا۔

مالاکنڈ میں نفاذ شریعت کے حق میں مظاہرے اور دھرنے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اگرچہ مقاصد بھی بہت محدود تھے کہ شریعت کا نفاذ پورے ملک میں مطلوب ہونا چاہئے تھا اور مقام کا انتخاب بھی غلط تھا کیونکہ عام شاہراہ کو بند کرکے علاقے کے عام لوگوں کو بلاوجہ تکلیف میں ڈالا گیا، تاہم عزم و ارادے کی پختگی کے ساتھ پرامن مظاہرے میں اپنے جائز مطالبات منوانے کی قوت کا ایک بار پھر اثبات ہو گیا ہے جسے نظام کی تبدیلی کے لئے میرے انقلابی لائحہ عمل میں آخری مرحلے کی حیثیت حاصل ہے اور جس کا اظہار اہل تشیع کی طرف سے اسلام آباد سیکرٹریٹ کے گھیراؤ کے ذریعے زکوٰۃ کے معاملے میں اپنا مطالبہ منوانے سے بھی ہوا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مولانا صوفی محمد کی زیر قیادت مرکزی اجتماع اور اصل دھرنے کے مقام پر کوئی بدنظمی نہیں ہوئی اور تصادم کے بعد جانوں کا افسوسناک اتلاف ایک دوسرے راستے پر ہوا جسے ایک غیر منظم ہجوم غیر ضروری طور پر بند کر رہا تھا۔ تاہم اگر یہ اطلاع درست ہے کہ خشت باری اور فائرنگ کا آغاز جوشیلے ہجوم کی طرف سے ہوا تو میں لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے حکومتی مشینری کی جوابی کارروائی کی مذمت نہیں کروں گا کیونکہ مظاہرے کو پرامن اور ایک مضبوط نظم کا پابند رکھنا میرے نزدیک قائدین کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔ OO

مدنی دور کے آغاز میں

اہلِ ایمان کو پیشگی تنبیہہ (۳)

(مباحثِ صبر و مصابرت ' درس ۴)

(گزشتہ سے پیوستہ)

قرآن حکیم کے مطالعے سے صبر کا جو تصور سامنے آتا ہے اس کی رو سے صبر ہرگز کوئی منفی شے نہیں ہے بلکہ یہ ایک مثبت جذبہ ہے۔ کسی مقصد کی تکمیل کی خاطر یا کسی نصب العین اور منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد میں جو تکالیف آئیں اور اس راہ کی رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونے میں جو مصائب آئیں انہیں ثابت قدمی کے ساتھ جھیلنا اور برداشت کرنا صبر ہے' جو یقیناً ایک مثبت جذبہ ہے۔ صبر و استقلال کا مظاہرہ کرنے والے باہمت لوگوں کے بارے میں ہی یہ الفاظ یہاں آئے ہیں : ﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ﴾ "اور (اے نبیؐ) بشارت دیجئے صبر کرنے والوں کو!"

صبر کے حوالے سے یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والا کوئی شخص اگر میدان جنگ میں پامردی اور استقامت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے جان بچانے کے لئے وہاں سے راہ فرار اختیار کرے گا تو اس کا یہ عمل دراصل اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس کا سب کچھ کیا دھرا ضائع ہو جائے گا' بلکہ سورۃ الانفال میں تو ایسے شخص کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ تو یہاں پیشگی متنبّہ کر دیا گیا کہ اس راہ میں آزمائشیں اور مشکلات تو آئیں گی اور ان میں سرخرو وہی ہو سکیں گے جو صبر و ثبات کا مظاہرہ کریں گے۔ اگلی آیت میں ان صبر کرنے والوں کے ایک نہایت اہم وصف کا ذکر ہے :

﴿اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝﴾

"(وہ صبر کرنے والے کون ہیں؟) وہ لوگ کہ جب بھی کوئی مصیبت ان پر پڑتی ہے یا کوئی تکلیف انہیں پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہم لوٹنے والے ہیں۔"

اسی سورۂ مبارکہ میں ذرا آگے چل کر وہ آیۂ بِر ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب کے حصۂ اول میں شامل ہے۔ وہاں ہم دیکھ چکے ہیں کہ نیکی کی بحث کا نقطۂ عروج یہی مضمون ہے: ﴿وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ﴾ "اور خصوصاً صبر کرنے اور جھیلنے والے جسمانی اذیت کو، فقر اور فاقے کو اور وہ کہ جو عین حالتِ جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔" یہاں ان صبر کرنے والوں کی یہ شان بیان ہوئی کہ جب بھی انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے، کوئی چٹان ان پر پڑتی ہے تو ان کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہو جاتا ہے کہ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝﴾

بندۂ مومن کا نظریۂ حیات

اس آیۂ مبارکہ میں دراصل ایک مسلمان کے نظریۂ زندگی اور تصورِ حیات کی مکمل عکاسی موجود ہے۔ ہمارا تصورِ حیات کیا ہے؟ — ہم اللہ کے پاس سے آ رہے ہیں اور اللہ ہی کے پاس واپس لوٹ جائیں گے۔ یہ دنیوی زندگی ایک سفر ہے، یہ ہرگز ہماری منزل نہیں ہے۔ یہ ہمارے سفرِ حیات کا ایک عارضی سا وقفہ ہے۔ اِس دنیا میں رہتے ہوئے ہم پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ ہم آئے کدھر سے ہیں اور اپنی اس منزل کا بھی واضح شعور ہمیں ہونا چاہئے جہاں ہمیں جانا ہے۔ اسی حقیقت کا اظہار اس آیۂ مبارکہ میں ہے کہ ہمارا وجود بھی اللہ کا عطا کردہ ہے اور ہمیں حیات بھی اسی نے عطا کی ہے۔ لہٰذا ؏ "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے" اللہ ہمارے بارے میں جو فیصلہ بھی کرے ہمیں قبول ہے۔ اس کی مرضی کے آگے ہمارا سرِ تسلیم خم ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی عطا ہے۔ ؏ "ہرچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است" میرے اس پیالے میں میرے ساقی نے جو کچھ ڈال دیا یہ اس کی نگاہ کرم ہی کے طفیل ہے، یہ اس کا عطیہ ہے، لہٰذا دل و جان سے قبول ہے۔ آگے فرمایا:

ک عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ﴾
وگ کہ جن پر ان کے رب کی طرف سے عنایتیں ہیں اور رحمت ہے "۔

، اور رب کے مابین دو طرفہ معاملہ

صَلَوَات " بھی خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔ یہ صلوٰۃ کی جمع ہے اور
فظ ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کے
ہ : ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ ... "صلوٰۃ"
ا گیا تھا' توجہ کا نام ہے۔ لغت میں اس کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا جاتا
، اِلَى الشَّىْءِ " یعنی کسی کی جانب متوجہ ہو جانا' کسی کی طرف رخ
ماز جس کی اصل روح ہے اللہ کی جانب متوجہ ہو جانا' اس کا آغاز ان الفاظ
، : ﴿اِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
ـا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾
یقت ایک دو طرفہ عمل ہے جو اللہ اور بندے کے مابین ہے۔ بندہ جذبہ
ر اپنے رب کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور پروردگار شفقت و عنایت کے
انب متوجہ ہوتے ہیں۔ ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید میں بہت سے مقامات
ربط و تعلق کو ایک دوہرے اور دو طرفہ تعلق کی شکل میں سامنے لایا گیا
ۃ البقرہ ہی میں اس مقام سے متصلاً قبل کہ جو ہمارے زیر درس ہے' یہ
: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝﴾
کھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر بجالاؤ اور میری ناشکری نہ کرو!"
ضاحت ایک حدیث مبارکہ سے ہوتی ہے جس کی رو سے آپ ؐ نے فرمایا
مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور
ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو اس سے بہت اعلیٰ محفل میں (یعنی ملائکہ
یں) اس کا ذکر کرتا ہوں "۔ اسی طرح کا معاملہ لفظ توبہ کا بھی ہے۔ بندہ
ند کی جناب میں پشیمانی اور احساسِ ندامت کے ساتھ گناہ کے راستے سے

واپس پھرتا ہے اور اللہ بھی بندے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اپنی شفقتوں اور عنایتوں کے ساتھ۔ گویا اس کی وہ نگاہ کرم جو بندے کی جانب سے ہٹ گئی تھی وہ اب پھر اس کی طرف ملتفت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح "نصرت" کا معاملہ بھی دو طرفہ ہے: ﴿اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ﴾ "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔" یہ صریحاً ایک دو طرفہ معاملہ ہے۔ اسی طرح شکر کے بھی دو رخ ہیں۔ اللہ بھی شکور ہے اور بندے کے لئے بھی شکور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بندے کا شکور ہونا اس معنی میں کہ وہ اللہ کا حق مانے، اس کا احسان مانے اور اس کی نعمتوں کا حق ادا کرے، اور اللہ اس اعتبار سے شکور ہے کہ وہ کوششوں اور قربانیوں کی قدر افزائی فرمانے والا ہے، وہ بڑا قدر دان ہے۔ تو ذہن میں رکھئے کہ کچھ اسی طرح کا معاملہ صلوٰۃ کا بھی ہے۔ بندہ اگر اللہ کی طرف متوجہ ہو گا تو اللہ بھی بندے کی طرف کمال شفقت کے ساتھ متوجہ ہو جائے گا۔ سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم ﷺ کی شان میں جو الفاظ وارد ہوئے وہ چونکہ بالعموم سیرت کی ہر تقریر کا عنوان بنتے ہیں، لہٰذا اکثر لوگوں کو یاد ہیں کہ:

﴿اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ۝﴾

یہاں دیکھئے کہ "صلوٰۃ" کی نسبت اللہ اور فرشتوں کی طرف ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں، ان کی جانب سے آپ پر شفقتوں اور عنایتوں کا مسلسل نزول ہوتا رہتا ہے، لیکن نوٹ کیجئے کہ یہ الفاظ صرف نبی اکرم ﷺ کے لئے نہیں آئے بلکہ سورۃ الاحزاب ہی میں بعینہٖ یہی الفاظ اہل ایمان کے لئے بھی استعمال ہوئے ہیں:

﴿ہُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ وَکَانَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَحِیۡمًا ۝﴾

"وہی ہے اللہ جو (اے اہل ایمان) تم پر عنایتیں بھیجتا رہتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تم پر عنایتیں (درود) بھیجتے ہیں، تاکہ وہ تمہیں نکالے اندھیروں میں سے روشنی کی جانب، اور وہ اہل ایمان کے حق میں بہت ہی رحیم ہے۔"

یہ ہے لفظ صلوٰۃ کا قرآن حکیم میں استعمال ا —— یہاں فرمایا: ﴿اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ

لَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ﴾ اللہ کی عنایات اور شفقتوں کا نزول ان لوگوں پر ہوتا
جو مشکلات اور آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے والے ہیں' جنہوں نے دین کو محض
دثی عقائد اور چند رسومات کا عقیدہ سمجھ کر قبول نہیں کیا بلکہ شعوری طور پر حقائق کو
ا' فرائضِ دینی کا شعور حاصل کیا' دین کی دعوت پر لبیک کہا' جنہوں نے اس حقیقت کو
کہ دین کے لئے جان و مال کا کھپانا اور اس کے غلبہ و اقامت کے لئے قربانیوں کا دینا
ے ایمان کا عین تقاضا ہے اور پھر اس راہ کے تمام امتحانوں اور آزمائشوں میں پورے
ے' یہ ہیں وہ لوگ جن پر ان کے رب کی جانب سے عنایتیں ہیں' جن کے لئے شاباشیں
' جن پر اللہ کی رحمتوں کا مسلسل نزول ہوتا رہے گا۔ اور فرمایا : ﴿ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
لْمُهْتَدُوْنَ ﴾ "اور یہی ہیں وہ لوگ جو راہ یاب ہونے والے ہیں" جو ہدایت یافتہ
۔ نوٹ کیجئے کہ یہاں پھر اسلوبِ حصر ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ صرف
لوگ فی الواقع راہِ ہدایت پر گامزن ہیں۔

اس سے قبل سورۃ الفاتحہ کے درس کے ضمن میں عرض کیا جاچکا ہے کہ ہدایت کے
ف مدارج ہیں۔ ایک انسان درجہ بدرجہ ہدایت کی منزلیں طے کرتا ہے۔ ایک منزل
، بعد اگلی منزل ہے اور ایک مرحلے کے بعد دوسرا مرحلہ ہے۔ گویا ہدایت ایک مسلسل
ں ہے۔ چنانچہ لفظ ہدایت کا اطلاق اپنے تکمیلی معنوں میں کسی کے منزل مراد تک پہنچ
نے کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ اس پہلو سے ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ کا مفہوم
گا: "یہ ہیں وہ لوگ جو منزل مراد تک پہنچ جانے والے ہیں"۔

ان چند آیات میں اہل ایمان کو ذہنی دور کے بالکل آغاز میں جن مراحل سے سابقہ پیش
نے والا تھا ان کے بارے میں پیشگی طور پر متنبہ کر دیا اور ساتھ ہی مسلمانوں کو بحیثیت
تِ مسلمہ شہادت علی الناس کا جو فرضِ منصبی سونپا گیا تھا اس کے ضمن میں ہمیشہ ہمیش کے
لئے یہ رہنمائی عطا کر دی گئی کہ جو مرتبہ و مقام تمہیں ملا ہے اس کے تقاضے کے طور پر بات
ان لو کہ اس راہ میں مصائب و مشکلات آئیں گی' آزمائشوں میں سے تمہیں گزرنا ہوگا۔
ں لئے کہ ؏ "جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے"۔

حکمِ قتال اور اس کا ہدف

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ سورۃ البقرہ مدنی سورۃ ہے اور اس کے زمانہ نزول کا
تعین کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً قبل تک
کے عرصے میں نازل ہوئی۔ چنانچہ یہ آیات جو ہمارے زیرِ درس ہیں گویا کہ قتال فی سبیل
اللہ کے لئے تمہید کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل
کر چوبیسویں رکوع میں قتال فی سبیل اللہ کے ضمن میں متعین حکم بھی موجود ہے ﴿
وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا﴾ حکم ہو
کہ اے اہل ایمان اب اللہ کی راہ میں قتال کرو، اور جان لو کہ تمہاری دعوت اب ا
مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، سورۃ الحج میں، جو نزولی اعتبار سے سورۃ البقرہ
سے متصلاً قبل شمار کی جاتی ہے، اذنِ قتال والی آیت آئی ہے۔ ذہن میں رکھئے کہ قتال
اجازت اور قتال کا حکم، دو مختلف چیزیں ہیں۔ اجازتِ قتال یہ ہے کہ اب تمہیں بھی ہا
اٹھانے کی اجازت ہو گئی:

﴿ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴾

یعنی آج اجازت مرحمت کی جا رہی ہے ان لوگوں کو جن پر جنگ ٹھونسی گئی تھی، جن پر مظالم
توڑے گئے تھے، جنہیں ان کے گھربار سے نکالا گیا تھا، جن پر زندگی کا قافیہ تنگ کیا گیا
لیکن جنہیں اب تک اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ تھی گویا ان کے ہا
باندھ دیئے گئے تھے، جیسا کہ سورۃ النساء میں ایک جگہ فرمایا گیا کہ ان سے کہہ دیا گیا تھا
﴿كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ﴾ (اپنے ہاتھ بندھے رکھو، جھیلو اور برداشت کرو، جس کے لئے
دروس میں بار بار PASSIVE RESISTANCE کا لفظ استعمال ہوا ہے) آج ان
ہاتھ کھول دیئے گئے اور انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے
ہیں۔ اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت کی نوید بھی دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ ان

در پر قادر ہے۔ ﴿وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾ اس کے بعد سورۃ البقرہ میں
حکم قتال وارد ہوا :

"وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ"

"جو لوگ تم سے جنگ کر رہے ہیں اب تم ان سے جنگ کرو اللہ کی راہ میں۔"

سورۃ البقرہ کے چوبیسویں رکوع میں جہاں قتال کا یہ حکم آیا ہے وہاں ساتھ ہی اس کا ہدف
بھی معین کر دیا گیا :

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ﴾

"اور ان سے جنگ کرتے رہو (یہ تلواریں جو اب میان سے نکلی ہیں یہ اب میان
میں واپس نہیں جائیں گی) جب تک کہ فتنہ بالکل فرو نہ ہو جائے (اللہ کے باغی جب
ہتھیار نہ ڈال دیں) اور پورا نظامِ اطاعت اللہ ہی کے لیے نہ ہو جائے۔"

جب تک اللہ کی زمین پر اسی کا حکم نافذ نہیں ہوتا اور اس کا کلمہ سربلند نہیں ہوتا اس وقت
تک جنگ جاری رہے گی۔ گویا قتال فی سبیل اللہ کا ہدف یہ ہے کہ دین کُل کا کُل اللہ کے
لئے ہو جائے، اسی کا جھنڈا سربلند ہو، اسی کی مرضی نافذ ہو، اسی کے حکم کی تنفیذ ہو، مختصراً یہ
کہ اللہ کی زمین پر اللہ ہی کا دین قائم ہو جائے۔ بہرکیف یہ ہے قتال کا باضابطہ حکم جو سورۃ
البقرہ کے چوبیسویں رکوع میں آیا ہے۔

اب ذرا ایک نظر سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱۴ پر بھی ڈال لیجئے جس کا حوالہ اس سے پہلے
سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کے درس میں دیا جا چکا ہے۔ یہ بات سمجھ لیجئے کہ کسی بھی
نظریاتی گروہ یا جماعت میں ہر مزاج اور ہر افتادِ طبع کے لوگ ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی
جماعت میں جہاں کثیر تعداد میں ایسے باہمت لوگ تھے کہ جنہوں نے حکمِ قتال کی آیت کے
نزول پر خوشیاں منائیں کہ اب ہمارے ہاتھ کھول دیئے گئے، اب ہمارے لئے دین کی راہ
میں سرفروشی کا وقت آگیا اور ہمیں اب شہادت کے مواقع نصیب ہوں گے، وہاں کچھ وہ
بھی ہوں گے کہ جن پر کچھ گھبراہٹ طاری ہوئی ہو گی۔ جن کے لئے یہ نیا مرحلہ جس میں
جنگ و قتال سے سابقہ تھا، شاید زیادہ ہی کڑی آزمائش بن گیا ہو۔ ایسے لوگوں سے صاف
کہہ دیا گیا : ﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ "کیا تم نے یہ گمان کیا تھا کہ تم

(سیدھے سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے" ﴿وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ "حالانکہ ابھی تو تم پر وہ حالات آئے ہی نہیں (وہ آزمائشیں' وہ کٹھنائیاں اور وہ مشکلات ابھی آئیں ہی نہیں) کہ جو تم سے پہلی امتوں کو پیش آئے تھے" ﴿مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا﴾ "فقروفاقہ اور تکالیف ان پر مسلط ہو گئیں اور وہ ہلا مارے گئے" ﴿حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ﴾ "یہاں تک کہ (وقت کے) رسول اور ان کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی! (تب انہیں خوشخبری سنائی گئی) آگاہ رہو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے"۔ اور اس کے ایک ہی آیت کے بعد مسلمانوں سے فرمایا گیا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾ "تم پر یہ قتال فرض کر دیا گیا (یہ دعوت آج اپنے اگلے مرحلے میں داخل ہو گئی) اور یہ تمہیں ناپسند ہے" "تم پر یہ بڑا بھاری گزر رہا ہے" ﴿وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ "اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو درآنحالیکہ اسی میں تمہارے لئے بہتری ہو۔" ﴿وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ﴾ "اور ہو سکتا ہے کہ کسی چیز سے تمہیں محبت ہو (وہ تمہیں پسند ہو) درآنحالیکہ فی الواقع وہ تمہارے لئے شر ہو" ﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ "اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

ایک آخری بات یہ عرض کرنی ہے کہ یہاں اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا چونکہ بحیثیت مجموعی بھی ایک تجزیہ عرض کیا گیا ہے لہٰذا اسی حوالے سے یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ اس سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر تاریخ بنی اسرائیل کی اس اہم جنگ کا تفصیلاً ذکر آیا ہے جسے ان کی تاریخ میں جنگِ بدر کے قائم مقام سمجھا جا سکتا ہے جس کے بعد کہ ان کے دنیوی اقتدار اور جاہ و جلال کے دور کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ طالوت اور جالوت کے مابین ہوئی جس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا وہ عہدِ حکومت ہے جسے بجا طور پر تاریخ بنی اسرائیل کا زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ میں اس اہم تاریخی واقعے کا ذکر دراصل مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ اب وہی مرحلہ تمہاری تاریخ

(البقرۃ، صفحہ ۷۹)

حسابِ کم و بیش

یعنی،

امیرِ تنظیمِ اسلامی،
داعی تحریکِ خلافت پاکستان،
وصدرِ مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

کے بعض ذاتی و خاندانی، اور مالی و معاشی کوائف

ان کے اپنے قلم سے!

سپردم بہ تو مایۂ خویش را تو دانی حسابِ کم و بیش را

وَمَا اَسْئَلُكُمْ
عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ
اِنْ اَجْرِيَ اِلاَّ عَلَى
رَبِّ الْعَالَمِيْنَ
(القرآن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

ویسے تو یہ بات پہلے بھی بہت مرتبہ ذہن میں آئی' لیکن اس سال رمضان مبارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران جب بھی یہ الفاظِ مبارکہ سامنے آئے کہ:

"میں تم سے اس کی (یعنی اپنی تعلیم و تلقین' دعوت و تبلیغ' اور نصح و خیرخواہی کی) کوئی اجرت طلب نہیں کرتا۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے!" (واضح رہے کہ یہ الفاظ بعض دوسرے مقامات کے علاوہ صرف سورۂ شعراء میں پانچ مرتبہ وارد ہوئے ہیں!) تو دل میں یہ پختہ ارادہ پیدا ہوا کہ باطن کا معاملہ تو اللہ ہی کے حوالے ہے' چونکہ کم از کم ظاہری حد تک میں نے بھی اپنی پوری زندگی دین کی دعوت و خدمت ہی میں بسر کی ہے' لہٰذا مناسب ہے کہ اپنی زندگی کے کم از کم اس دعوتی دور کے مالی معاملات کا "حسابِ کم و بیش" پبلک کے سامنے پیش کردوں تاکہ ایک عربی شعر۔

"اُحِبُّ الصّالحینَ و لستُ منهم
لعلّ اللّٰهَ یَرزُقنی صَلاحا"

کے مصداق واضح ہو جائے اور اس کا "تَحدیثًا لِلنِّعمَۃ" ذکر بھی ہو جائے کہ گو "چہ نسبت خاک را باعالمِ پاک" کے مطابق دوسرے اعتبارات سے تو کوئی نسبت مجھے اصحابِ ہمّت و عزیمت کے ساتھ حاصل نہیں ہے' تاہم اس خاص معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے' خواہ لاکھ بلکہ کروڑ میں ایک ہی کے تناسب سے سہی' بہرحال یہ نسبت اپنے اس بندۂ ناچیز کو عطا کردی ہے کہ اس خدمتِ دین کو دولت کمانے' یا جائیداد بنانے' یا اثاثے جمع کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔

موجودہ دور میں اس معاملے کی اہمیت پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ "پبلک لائف" سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر لوگوں کا معاملہ، خواہ وہ اہلِ سیاست و حکومت ہوں، خواہ رجالِ دین و مذہب، عوام کے لئے بہت سی بدگمانیوں کا موجب بن رہا ہے۔ چنانچہ جب لوگوں کے علم میں آتا ہے کہ صرف قومی و سماجی خدمت کرنے والے ہی نہیں، عبا و قبا اور جُبّہ و دستار کے حاملین بھی "اس حمام میں سب ننگے ہیں!" اور "چوں دُم بر داشتم مادہ بر آمد" کے مصداقِ کامل ہیں تو فطری طور پر عوام میں شدید ردِ عمل پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں مخلص اور نیک نیت لوگوں کے کام میں بھی رکاوٹ پیش آتی ہے۔ بنا بریں ضروری ہے کہ جیسے اربابِ سیاست و حکومت سے عام طور پر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے سیاسی کیریئر سے قبل اور بعد کے اثاثوں کا اعلان کریں، ایسے ہی لازم ہے کہ خادمانِ دین و مذہب بھی اپنا "حسابِ آمد و خرچ" لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔ تاکہ بدگمانی کی عمومی فضا ختم ہو اور اعتماد کی صورت بحال ہو جائے۔

محاسبۂ اخروی کے اہم اور اساسی امور کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ سے متعدد ہم مضمون احادیث مروی ہیں جن میں سے ایک کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

﴿ لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ مِنْ عِنْدِ رَبِّہٖ حَتّٰی یُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِہٖ فِیْمَا اَفْنَاہُ، وَعَنْ شَبَابِہٖ فِیْمَا اَبْلَاہُ، وَعَنْ مَالِہٖ مِنْ اَیْنَ اکْتَسَبَہٗ وَفِیْمَا اَنْفَقَہٗ، وَ مَاذَا عَمِلَ فِیْمَا عَلِمَ ﴾ (ترمذیؒ عن عبداللہ ابن مسعودؓ)

ترجمہ: "کسی انسان کے قدم قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے سے ہل نہیں سکیں گے جب تک کہ اس سے پانچ باتوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کر لی جائے: (i) عمر کے بارے میں کہ کس کام میں صرف کی؟ (ii) خصوصاً عہدِ شباب کے بارے میں کہ وہ کہاں بِتایا؟ (iii) اور (iv) مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کن کاموں میں خرچ کیا؟ اور (v) جو علم حاصل

ہوا اس میں عمل کتنا کیا؟"

اگر چہ پوری زندگی کے بارے میں تو میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا' اس لئے کہ معلوم نہیں ہے کہ ابھی اس کا کتنا حصہ باقی ہے' اور اس بقیہ حصے کے بارے میں اللہ ہی کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ مبادا "وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ" (الاعراف : ۱۷۶) کی صورت بن جائے اور 'معاذ اللہ' اگلا پچھلا کیا دھرا سب اکارت ہو جائے' تاہم الحمد للہ کہ عہدِ شباب کے بارے میں پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کے فضل و کرم سے' اپنی ساری ذاتی خامیوں اور کوتاہیوں' اور جملہ "عجز" اور "کسل" کے وجود کے "جنوں میں جتنی بھی گزری بہ کار گزری ہے!" کے مصداق نوجوانی کی عمر سے لے کر کہولت کی عمر تک کا پورا زمانہ اللہ کے دینِ حق' اور بالخصوص اس کی کتابِ عزیز کی خدمت ہی میں بسر ہوا!

رہا علم اور اس کے مطابق عمل کا معاملہ' تو اس کے ضمن میں اولاً تو "عصمتِ بی بی است از بے چادری!" کے مطابق اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ "معلومات" کے بارِ گراں سے بچائے ہی رکھا ہے' البتہ حضرت بُلّھے شاہ کے اس شعر کے مصداق کہ۔ "علموں بس کریں او یار۔ اِکّو الف ترے درکار!" دین کے اصول و مبادی کا جو فہم اللہ نے دیا' بحمد اللہ اس پر کم از کم ناگزیر حد تک عمل کی توفیق بھی خود ہی اپنے خصوصی فضل و کرم سے ارزانی فرما دی۔ فَلَهُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ!

البتہ جہاں تک مالی امور کے بارے میں سوالات کا تعلق ہے یعنی یہ کہ کیا اور کن ذرائع سے کمائی کی اور کہاں اور کس طور سے خرچ کیا' تو اس کے تیس سال کے لگ بھگ عرصے کا تفصیلی حساب کتاب تو ظاہر ہے کہ دنیا میں تو ممکن ہی نہیں ہے' رہا آخرت کا معاملہ تو اگر چہ وہاں پائی پائی کا حساب تو یقیناً محفوظ ہو گا لیکن خیریت اور عافیت میں صرف وہی رہ سکیں گے جن سے "حسابِ یسیر" لیا جائے۔ چنانچہ اسی پر قیاس کرتے ہوئے ایک "موٹا حساب" آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

چونکہ ہر وہ شخص جو لوگوں کو قرآن حکیم کا درس دیتا ہے' یا وعظ و خطاب کی کوئی اور صورت اختیار کرتا ہے' اس کی حیثیت لامحالہ ایک "داعی" کی سی ہو جاتی ہے' بنا بریں میری زندگی کے "دعوتی دور" کا آغاز اصلاً تو اٹھارہ برس کی عمر میں ۱۹۵۰ء ہی سے ہو گیا تھا' تاہم آزادانہ حیثیت میں دعوتِ دین اور خدمتِ قرآن کا سلسلہ ۱۹۶۵ء سے شروع ہوا۔ جو پہلے چھ برس یعنی ۷۱ء تک خالص انفرادی جدوجہد کی صورت میں جاری رہا' تا آنکہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس (مارچ ۱۹۷۲ء) سے اس میں اجتماعی رنگ کا آغاز ہوا' جو تین سال بعد یعنی مارچ ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کے قیام کے ساتھ اپنی پوری پختگی کو پہنچ گیا۔ لہٰذا "دعوتی دور" کے مالی معاملات کے ضمن میں "حسابِ کم و بیش" بھی اصولی طور پر اس کے بعد کے زمانے ہی سے متعلق ہے۔

تاہم اس سے پہلے کا اجمالی خاکہ بھی حاضرِ خدمت ہے' یعنی :

(i) پیدائش (۲۶/اپریل ۱۹۳۲ء) سے ۱۹۴۷ء میں میٹرک پاس کرنے تک پوری کفالت والد صاحب مرحوم نے فرمائی۔

(ii) ۴۷ء تا ۵۴ء ایف ایس سی اور میڈیکل کی تعلیم کے دوران کچھ بار والد صاحب نے برداشت کیا' کچھ تعاون بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کا رہا' کچھ مدد میرٹ سکالرشپ سے ملتی رہی (الحمد للہ کہ ایف ایس سی اور میڈیکل کالج کے فرسٹ ایئر کے دوران بھی میں "وظیفہ خوار" تھا' پھر میڈیکل کالج کے سیکنڈ ایئر کے دوران تو میرے پاس دو دو سکالرشپ تھے' ایک ایف ایس سی کی اساس پر' اور دوسرا فرسٹ ایئر کے امتحان میں فرسٹ آنے پر!) مزید برآں اس زمانے میں بعض اداروں سے قرض حسنہ بھی حاصل کیا جو تعلیم سے فراغت کے بعد ادا کیا۔

(iii) ۵۴ء سے ۵۷ء تک تین سال جماعت اسلامی منٹگمری (حال ساہیوال) کی ڈسپنسری میں ملازمت کی اور پھر ۵۷ء تا ۶۲ء اپنی ذاتی پریکٹس کی' جس کی بنا پر انکم ٹیکس

دہندگان میں تو شمار ہونے لگا، تاہم مالی حیثیت لوئر مڈل کلاس ہی کی رہی۔

(iv) ۶۲ء تا ۶۵ء لگ بھگ تین سال بھائیوں کے ساتھ ایک کاروباری اشتراک میں گزرے، اور اس دوران میں رہائش، سواری اور دیگر سہولتیں بھی مرفہ الحال طبقے کی سی میسر رہیں اور عام رہن سہن بھی کم از کم اَپر مڈل کلاس کا رہا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کچھ نقد پونجی بھی جمع ہو گئی۔

ان سطور کی تحریر کے وقت (۹ مئی ۹۴ء) میری عمر شمسی حساب سے باسٹھ برس اور بارہ یوم ہو چکی ہے۔ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ ع "کچھ ترے آنے سے پہلے، کچھ ترے جانے کے بعد" کے مصداق میری زندگی کے پورے تیس سال متذکرہ بالا کاروبار میں شرکت سے قبل بسر ہوئے تھے، اور ٹھیک تیس ہی سال اس سے علیحدگی کے بعد ہو گئے ہیں۔ اور یہ "شراکت مع الاِخوان" میری زندگی میں نہ صرف زمانی اعتبار سے "مرکزی" حیثیت کی حامل ہے بلکہ متعدد دیگر اعتبارات سے بھی بہت "فیصلہ کن" ثابت ہوئی۔ چنانچہ اسی کے نتیجے میں میں نے دوبارہ لاہور منتقل ہو کر اپنی آزادانہ حیثیت میں اور بھرپور طور پر زندگی کے "دعوتی دور" کا آغاز کیا۔ اور، جیسے کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، اسی کے ذریعے مجھے اپنی زندگی کے نئے دور کے لئے لازمی ابتدائی سرمایہ حاصل ہوا۔ بنابریں میری زندگی کے دعوتی دور کے مالی معاملات کے صحیح فہم کے لئے اس کاروباری اشتراک کا صغریٰ کبریٰ اور اس کے ضمن میں وَصل و فصل کے بنیادی حقائق کے مختصر تذکرے کے ساتھ ساتھ برادرانِ بزرگ و خورد کا اجمالی تعارف بھی ضروری ہے۔

اس سلسلے میں اِس وقت مجھے یہ سہولت حاصل ہے کہ اب سے چھ سال قبل اپنے "بعض ذاتی اور خانگی کوائف" پر مشتمل میری ایک تحریر ماہنامہ "میثاق" میں تین اقساط میں (جولائی تا ستمبر ۸۸ء) شائع ہوئی تھی۔ جس کا فوری سبب تو یہ تھا کہ

برادرم اقتدار احمد نے اپنے ذاتی ہفت روزہ جریدے "ندا" کے دسویں شمارے میں میرے بارے میں چند جملے ایسے شائع کئے جن سے پرانی یادوں کے بہت سے دریچے وا ہو گئے اور اپنی خاندانی زندگی کے بہت سے بھولے بسرے واقعات کی فلم پردۂ ذہن پر چلنے لگی اور یہ احساس شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ یہ حقائق و واقعات تنظیم اسلامی کے رفقاء و احباب کے علم میں آنے ضروری ہیں۔ اس لئے کہ "بیعت" کی بنیاد پر قائم ہونے والی تنظیم میں داعی کی زندگی کے اہم حالات و واقعات کا "مبایعین" کے علم میں ہونا مناسب اور مفید ہی نہیں' ضروری ہے۔ تاہم جب میں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو ایک تو بات بہت طویل ہوتی چلی گئی۔ اور دوسرے ع "اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں!" کے مصداق بعض "ناگفتنی" باتوں کا تذکرہ بھی ناگزیر ہو گیا۔ بنابریں میں خود تو اس کی اشاعت کے بارے میں متردّد ہو گیا تھا' لیکن تنظیم اسلامی کے بہت سے سینئر اور ذمہ دار رفقاء کا خیال ہوا کہ اس کی اشاعت ضروری ہے۔ تاہم جب وہ تحریر شائع ہونی شروع ہوئی تو اس کے بعض جملوں پر جو میرے نزدیک تو صرف لطیف مزاح کے حامل تھے' بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کی جانب سے شدید رنج و غم کا اظہار ہوا۔ بنابریں وہ سلسلہ وہیں روک دیا گیا۔

اُس وقت اس تحریر کی تسوید کا فوری سبب تو واقعتاً وہی بات بنی تھی جو اوپر بیان ہوئی۔ لیکن اس کا ایک دوسرا اور عملی اعتبار سے اہم تر محرک' جسے میں نے اُس وقت صریحاً بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا' یہ تھا کہ انہی دنوں متعدد گوشوں سے یہ بات سننے میں آئی تھی کہ لوگوں میں عام طور پر یہ چرچا ہے کہ ڈاکٹر اسرار کی تحریک کی اصل سرپرستی اور مالی معاونت' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس کے اپنے ذاتی مصارف اور گذر بسر کا ذریعہ بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کا "تعاون" ہے۔ گویا معاملہ وہ بن رہا تھا جس کی "لفظی تصویر" سورۂ آل عمران کی آیت ۱۸۸ میں وارد شدہ ان الفاظ میں سامنے آتی ہے کہ : "اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا" یعنی : "ان کی تعریف کی

جائے ایسے کاموں پر جو انہوں نے کئے ہی نہیں!" — جبکہ واقعہ یہ تھا کہ ۷۰ء کے بعد سے لے کر اس تحریر کی تسوید تک نہیں' آج تک بھی 'بھائی اظہار کا ایک پیسے تک کا تعاون مجھے ذاتی اعتبار سے 'یا میری تحریک اور تنظیم کو اجتماعی سطح پر حاصل نہیں ہوا۔ بیس برس سے زائد عرصے پر محیط اس "قاعدہ کلیہ" میں صرف دو استثناءات ہیں' اور وہ بھی اختیاری نہیں جبری (۱) ایک یہ کہ جس دور میں اظہار لیٹڈ کے منیجنگ ڈائریکٹر برادرم اقتدار احمد بن گئے تھے' اس زمانے میں انہوں نے اپنے اختیارِ خصوصی سے یکمشت ایک لاکھ روپے کی اعانت بھی مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی کی تھی' اور بھائی اظہار کو بھی "جبرا" انجمن کا ممبر بنوا دیا تھا' جس کا "ماہانہ چندہ" ان کی جانب سے بعد میں بھی آتا رہا۔ اور (ii) ایک خاص مرحلہ پر جب اللہ تعالیٰ نے انہیں کاروبار میں غیر معمولی نفع عطا کیا تھا' انہوں نے اپنے غریب بھائیوں اور بہنوں کو ایک ایک لاکھ روپے کی "خیرات" تقسیم کی تھی' جس کی پیشکش مجھے بھی کی گئی تھی — بلکہ والدہ صاحبہ مکرمہ کے ہاتھوں وہ رقم مجھ تک پہنچا بھی دی گئی تھی — لیکن الحمد للہ کہ میں نے اسے ع "غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول" کے مصداق رد کر دیا تھا۔ اور جو رقم والدہ صاحبہ کے جذبات کے لحاظ کی بنا پر ان کے دستِ شفقت سے "وصول" کرلی تھی بھائی اظہار کو "باعزت" طور پر واپس کر دی تھی۔ اور یہ اس لئے کہ چونکہ انہوں نے میرے مشن میں شرکت اور شمولیت اختیار نہیں کی تھی' لہٰذا یہ ان کا خالص "ذاتی تعاون" تھا جسے میری "غیرتِ فقر" نے گوارا نہیں کیا۔

اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ ۷۲ء۔۱۷ء کے بعد سے جو مالی تعاون بھی' خواہ ذاتی سطح پر' خواہ تنظیم و تحریک یا انجمن کی سطح پر' بھائیوں میں سے کسی سے مجھے حاصل ہوا' وہ صرف برادرم اقتدار احمد کی جانب سے تھا۔ بہت بعد میں اس میں اضافہ برادرِ عزیز وقار احمد کے تعاون کی صورت میں ہوا۔ گویا اگر وضاحت نہ کردی جاتی تو جو کریڈٹ فی الحقیقت برادرم اقتدار احمد کا حصہ تھا' وہ بالکل ناجائز اور ناروا طور پر بھائی

اظہار کو مل رہا تھا۔ چنانچہ اس تحریر سے پیش نظر یہ تھا کہ "حق بحقدار رسید" والا معاملہ ہو جائے اور لوگوں کو اصل حقیقت کا علم حاصل ہو جائے ۔۔۔ یہ دوسری بات ہے کہ ابھی یہ مقصد صرف "نفی" کی حد تک ہی حاصل ہوا تھا، یعنی اس کی تو وضاحت ہو گئی تھی کہ جو عارضی اور وقتی "جبری" تعاون بھائی اظہار کی طرف سے ۶۹ ۔ ۶۸ء کے دوران مجھے حاصل رہا تھا اس کا سلسلہ اوائل ۷۰ء ہی میں منقطع ہو گیا تھا ۔۔۔ لیکن ابھی "اِثبات" کی نوبت نہیں آئی تھی یعنی "حق بحقدار رسید" والا معاملہ نہیں بنا تھا اور برادرم اقتدار کے تعاون کا تذکرہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ تحریر کا سلسلہ رک گیا اور بات ادھوری ہی رہ گئی۔

اس "بین الاخوانی" معاملے کے علاوہ اس تحریر کا ایک اور مقصد بھی تھا جو ع "جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے!" کے مصداق بقیہ تمام "اسباب" سے "عظیم تر" تھا، اور وہ تھا خدائے بزرگ و برتر، اور ربِّ عظیم و اکبر، اور اس کے ایک حقیر اور ناچیز بندے کے مابین تعلّق کا معاملہ یا صحیح تر الفاظ میں ع "چوں معاملہ نہ دارد، سخن آشنانہ باشد!" کے مصداق اللہ اور اس کے ایک بندے کے مابین "معاملے" کی بات! جس کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔

انسان کی دنیوی زندگی کا اصل مقصد از روئے قرآن "امتحان و ابتلاء" ہے، جس کے بہت سے مراحل اور مدارج ہیں (جن کا ایک حسین پیرائے میں بیان، بحمد اللہ، راقم کے قلم سے "حج اور عید الاضحیٰ" کے موضوع پر تحریر میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکرے کے ضمن میں ہوا ہے!) ۔۔۔ چنانچہ اس کا ایک درجہ اور مرحلہ وہ ہے جس کا ذکر سورۂ انفال میں "وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا" (آیت ۱۷) کے الفاظِ مبارکہ میں ہوا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بسا اوقات اپنے بندوں کو ایسے امتحانات سے دوچار کر دیتا ہے کہ اگر وہ ہمت کر کے ان سے کامیابی کے ساتھ گزر جائیں (اور یہ

مت بھی اسی کی عطا کردہ ہوتی ہے) تو اس سے ان میں ایک جانب اللہ پر توکل میں اضافہ ہو جائے، اور دوسری جانب کسی قدر "خود اعتمادی" بھی پیدا ہو جائے! میرے ساتھ ایک ایسی ہی صورت ۷۰ء میں شدت کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی جس سے فروری ۷ء میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے خصوصی فضل و کرم کے طفیل کامیابی سے گزار دیا۔

میری چار برس قبل کی اس تحریر میں، جو اس کتابچے میں باب دوم کی حیثیت سے شامل ہے، پوری تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ ۷۰ء میں میں اپنی صحت اور مالی حالت دونوں کے اعتبار سے کس قدر سخت آزمائش سے دوچار ہو گیا تھا، اور ایک جانب دنیا اور اس کی ضروریات، اور حالات و واقعات کے تلخ اور سنگین حقائق، اور دوسری جانب دین اور مقصدِ حیات کے مشکل اور کٹھن تقاضوں کے مابین شیکسپیئر کے الفاظ "To be or not to be is the question" میں بیان شدہ کیفیت کس شدت کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی ــــ یہ امتحان، ظاہر بات ہے کہ، ہرگز اس درجہ سخت اور شدید نہ ہوتا اگر بھائیوں میں سے کسی کا بھی کوئی تعاون اُس وقت مجھے حاصل ہوتا!! چنانچہ اسی کی جانب میں نے اپنی اس تحریر میں بھی ایک سے زائد مقامات پر اشارہ کیا ہے (اگرچہ صراحت اب کر رہا ہوں) یعنی برادرم اقتدار احمد سے پانچ چھ سال کی "مغائرت" اور بھائی اظہار کی جانب سے تعاون کا "انقطاعِ کُلی" ظاہری اسباب اور ان کے اپنے ارادوں اور نیتوں اور محرکاتِ عمل سے قطع نظر، اصلاً "منجانب اللہ" تھا۔ اور میرے پروردگار نے مجھے اس فیصلہ کن سوال سے اس حالت میں دوچار کیا تھا کہ عالمِ اسباب میں کسی بھی تعاون اور مدد کا کوئی محسوس سہارا موجود نہ تھا۔ اور بحمد اللہ و بفضلہ میں نے اُس وقت جو فیصلہ کیا وہ اسی کی عطا کردہ توفیق سے صرف اور صرف اسی کی ذات پر "توکل" کی بنیاد پر تھا "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ"۔ "ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ تانہ بخشد خدائے بخشندہ!"

چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کی اسی سنتِ ابتلاء کے ابدی قوانین کا مظہر ہے کہ جیسے ہی میں فروری ۷۱ء میں حج کے موقع پر "آخری فیصلہ" کر کے واپس آیا، مسائل اور مشکلات کے بادل چھٹنے شروع ہو گئے اور صوفیاء کرام کی اصطلاح میں "فتوحات" کا سلسلہ اور قرآن حکیم کے الفاظ مبارکہ "وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰى" کا انعکاس شروع ہو گیا۔ چنانچہ زیر حوالہ تحریر کا اہم ترین "مقصد" یہ تھا کہ اپنے نوجوان ساتھیوں اور صُلبی اور معنوی بیٹوں کے سامنے یہ حقیقت کھول کر بیان کر دوں تاکہ زندگی کے آئندہ مراحل میں اگر وہ بھی کبھی کسی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہو جائیں تو ہمت نہ ہاریں اور اولوالعزم انبیاء و رسل علیہم السلام اور صلحاء و اتقیاء رحمہم اللہ کی سیرتوں کے علاوہ مجھ ایسے ناتواں اور ناچیز کی "آپ بیتی" سے بھی حوصلہ پا سکیں!

بہرحال "مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ" کے مطابق اُس وقت تو اس تحریر کا معاملہ نامکمل رہ گیا تھا۔ لیکن "عَلٰى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ" (القمر: ۱۲) کے مصداق اور "كُلُّ شَيْءٍ مَرْهُوْنٌ لِوَقْتِهٖ" (الحدیث) کے مطابق لگ بھگ چار سال بعد اس کی تکمیل کا سبب پیدا ہو گیا۔ اور وہ اس طرح کہ ایک جانب بڑے بھائی اظہار احمد صاحب اور ان کے صاحبزادوں، اور دوسری جانب چھوٹے بھائی اقتدار احمد اور ان کے بیٹوں کے مابین کچھ کاروباری مخاصمت پیدا ہو گئی جس نے بعض دوسرے عوامل کے ساتھ مل کر "بین الاخوانی" تعلقات میں تلخی کا شدید زہر گھول دیا۔ ادھر بھائی اظہار صاحب کو ایک تو خود مجھ سے بھی بعض صحیح یا غلط شکایات تھیں، دوسرے ان کا خیال یہ تھا کہ میں برادرم اقتدار احمد کی ناجائز طرف داری سے کام لیتا ہوں۔ بنابریں انہوں نے ۵ راگست ۱۹۹۲ء کو ایک جذباتی دباؤ کی کیفیت میں ایک نہایت زہریلی تحریر میرے اور عزیزم اقتدار احمد کے خلاف لکھ کر اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں (نامعلوم تعداد میں) بہت سے اعزہ و اقارب، یہاں تک کہ بعض کاروباری احباب کو بھی بھیجو...

اس پر چار و ناچار، اور واقعتاً بادلِ ناخواستہ مجھے بھی قلم اٹھانا پڑا جس کی تمہید ان الفاظ سے ہوئی:

۱۔ میرے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب نے جو تحریر میرے اور برادرم اقتدار احمد کے بارے میں حال ہی میں سپرد قلم کر کے بعض اقارب واحباب کو پہنچائی ہے، اس نے مجھے "گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل" کے شش و پنج اور گومگو میں مبتلا کر دیا ہے۔

۲۔ اس لئے کہ اگر میں خاموش رہتا ہوں تو اسے ان کے الزامات کو درست ماننے کے مترادف سمجھا جائے گا۔ اور اگر جواب دیتا ہوں تو حقائق و واقعات کے ساتھ ساتھ ان کے پس منظر حتیٰ کہ نیتوں اور محرکاتِ عمل کا معاملہ بھی لازماً زیر بحث آتا ہے (جس کی ابتداء انہوں نے تو ببانگِ دہل کر بھی دی ہے)۔ اور اس طرح بہت سے نئے اور پرانے گندے کپڑوں کے بر سرِ عام دھلنے کی صورت پیدا ہوگی۔

۳۔ میں پہلی ہی صورت اختیار کر لیتا اور یہ خطرہ بھی مول لے لیتا کہ نہ صرف بعض اقرباء اور احباب بلکہ میرے اپنے بچے بھی میرے بارے میں سُوءِ ظن میں مبتلا ہو جائیں (اس لئے کہ متنازعہ واقعات ان کے سنِ شعور سے قبل کے زمانے سے متعلق ہیں)---- لیکن چونکہ میری ذات کے ساتھ ایک انجمن، ایک تنظیم، اور ایک تحریک کا معاملہ بھی وابستہ ہے، اور ع "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!" کے مصداق ان کی اس تحریر کا حملہ ان سب کی عزت اور وقار پر ہوا ہے---- لہٰذا تقریباً دس روز کے گہرے غور و فکر کے بعد میں نے مجبوراً قلم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

لیکن اس کے بعد جب قلم چلنا شروع ہوا تو اتنے مواد کی تسوید ہو گئی کہ عام کتابی سائز کے دو سو صفحات میں بمشکل سما سکے۔ اسی طرح برادرم اقتدار احمد نے جو جوابی تحریر تیار کی وہ میری تحریر سے بھی لگ بھگ دو گنی تھی۔ (ان تحریروں کے بارے میں ایک وضاحت

"پس نوشت" کے عنوان سے اس پیش لفظ کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں) تاہم میری اس تحریر کا صرف قدرِ قلیل حصہ میرے مالی اور معاشی معاملات سے متعلق تھا۔ اگرچہ اس کے ذریعے چار سال قبل کی تحریر میں جو کمی رہ گئی تھی بحمد اللہ اس کی تکمیل ہو گئی۔

چنانچہ صفحاتِ آئندہ میں حسب ذیل حصے شامل کئے جا رہے ہیں :

اولاً جولائی ۸۸ء میں شائع شدہ قسط بہ تمام و کمال (اس لئے کہ اس میں ہمارے بین الاخوانی علائق اور تحریکِ اسلامی کے ساتھ تعلق کے آغاز کے ضمن میں تمہیدی امور شامل ہیں جو اس تحریر کی اشاعت کے مقصد کے اعتبار سے لازمی ہیں)۔

ثانیاً: اگست اور ستمبر ۸۸ء میں شائع شدہ اقساط میں سے صرف متعلق حصہ۔ (جو کل تحریر کے ثُلث سے بھی کم ہے۔ اور اس میں سے بھی وہ جملے حذف کر دیئے گئے ہیں جو ۸۸ء میں بھائی اظہار صاحب کو ناگوار گزرے تھے۔) اور

ثالثاً: اگست ستمبر ۹۲ء میں تحریر شدہ طویل وضاحتی بیان کا صرف وہ قدرِ قلیل حصہ جو میری زندگی کے اصل اور شعوری دعوتی دور کے "حسابِ کم و بیش" پر مشتمل ہے۔ اور جو، جیسے کہ آغاز میں عرض کیا گیا تھا، اس تحریر کی اشاعت کے اصل مقصد کے اعتبار سے اہم ترین ہے۔

واضح رہے کہ یہ آخری حصہ ۱۰/ ستمبر ۱۹۹۲ء کو سپردِ قلم ہوا تھا، جس پر اب لگ بھگ ڈیڑھ سال بیت چکا ہے۔ اور اس عرصے کے دوران بعض حالات میں جزوی تبدیلی بھی رونما ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں مناسب طریق یہ نظر آیا ہے کہ ۹۲ء کی تحریر تو جوں کی توں شائع ہو، البتہ حواشی کے ذریعے اسے آج کی تاریخ تک UPDATE کر دیا جائے۔

ضمناً عرض ہے کہ بھائی اظہار احمد صاحب کے ساتھ تلخی اپنی انتہاء کو پہنچ کر ۱۲/ دسمبر ۹۳ء کو اچانک طور پر اس طرح ختم ہو گئی کہ ان کی جانب سے ہمارے بہنوئی اللہ بخش سیال صاحب حسب ذیل تحریر لے کر آئے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
میرے ماں جائے بھائیو۔۔السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،
کافی دنوں سے ہماری آپس میں بول چال بند ہے۔ اس کی وجہ ہماری تحریریں ہیں۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ اپنی تحریر میں بعض باتیں غیر شعوری طور پر مجھ سے غلط لکھی گئی تھیں۔ اور جواباً آپ دونوں بھائیوں نے بھی اپنی تحریروں میں میرے ساتھ زیادتیاں کی ہیں۔ میں اپنی تحریر کو بالکلیہ واپس لیتا ہوں اور ساتھ ہی لوجہ اللہ آپ کو معاف کرتا ہوں اور آپ سے بھی متوقع ہوں کہ آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔ اس سے بقول نبی اکرم ﷺ ہمارے والدین کی ارواح کو بھی تسکین ہو گی۔
بھائی اللہ بخش سیال صاحب اور عزیزم ڈاکٹر ابصار احمد کی کوششیں لائقِ صد تحسین ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ آمین والسلام
تمہارا بڑا بھائی اظہار احمد عفی عنہ"

بھائی اظہار صاحب کی اس تحریر پر ان کے فرزندِ اکبر عزیزم ایوب صابر کی بھی حسب ذیل EDNDORSEMENT موجود تھی:

"محترم جناب بڑے چچا و محترم جناب اقتدار چچا
السلام علیکم!
میں محترم ابی جان کے شعوری اور غیر شعوری تسامحات پر معذرت خواہ ہوں۔

والسلام آپ کا بھتیجا ایوب صابر"

چنانچہ معاملہ رفع دفع ہو گیا ـــــ اور اب یہ خیال ہوتا ہے کہ جیسے غزوۂ احزاب کے موقع پر کفر کی ساری یلغار کا مقصدِ وحید صرف اہلِ ایمان کے لئے ایک شدید آزمائش کی صورت پیدا کر دینا تھا، اسی طرح ہمارے مابین یہ ساری تلخی صرف اس لئے پیدا

ہوئی تھی کہ میری وہ تحریر جو ۸۸ء سے نامکمل پڑی تھی تکمیل کا مرحلہ طے کر لے!

بہرحال اب یہ "حسابِ کم و بیش" انجمن خدام القرآن کے وابستگان' تنظیمِ اسلامی کے رفقاء اور تحریکِ خلافت کے معاونین اور دیگر جملہ احباب و متعلقین کی خدمت میں ع "سپردم بہ تو مایۂ خویش را!" کی صورت میں پیش ہے۔ اگر یہ راہِ حق کے کسی ایسے مسافر کو جو حالات کی ظاہری ناموافقت کے باعث گھبرا رہا ہو از سرِ نو کمرِ ہمت کسنے پر آمادہ کر سکے تو شاید کہ یہ میری نجات کا ذریعہ بن جائے۔ فقط

خاکسار

اسرار احمد

لاہور۔ ۹ر مئی ۱۹۹۴ء

پس نوشت

میری اور برادرم اقتدار احمد کی جوابی اور وضاحتی تحریریں' ظاہر ہے کہ' اشاعتِ عام کے لئے تو تھیں ہی نہیں' البتہ یہ خیال ضرور تھا کہ بھائی اظہار صاحب سے ان لوگوں کی فہرست حاصل کر لی جائے جنہیں انہوں نے اپنی الزامی تحریر ارسال کی تھی تاکہ ہم بھی اپنی تحریریں انہیں بھجوا دیں۔ لیکن بوجوہ بھائی اظہار صاحب نے ہمیں وہ فہرست فراہم نہیں کی۔ چنانچہ ہم نے اپنے بیانات اپنی اولاد کے علم میں لانے کے علاوہ قریب ترین اعزّہ میں سے بھی صرف ان کو پہنچائے جن کے بارے میں ہمیں صراحت کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ بھائی اظہار کی تحریر ان تک پہنچی ہے۔ ان پر مستزاد راقم نے بھائی اظہار صاحب کی الزامی تحریر اور اپنا وضاحتی بیان ع "آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک؟" کے مصداق تنظیم اسلامی کے مرکزی ناظمین کو بھی پڑھوا دیئے تاکہ ان کے علم میں آ جائے کہ ان کے "امیر" پر اس کے بڑے بھائی نے کیا الزامات عائد کئے ہیں اور اس کے پاس ان کا کیا جواب ہے ــــــ بعد میں جب بھائی اظہار صاحب نے اپنا پورا بیان ہی واپس لے لیا تو بحمد اللہ پورا معاملہ رفع دفع ہو

گیا اور لگ بھگ ڈیڑھ سال تک جاری رہنے والی ذہنی کوفت اور قلبی اذیت کا خاتمہ ہو گیا ـــــ تاہم صرف ایک بھائی کے ہاتھوں جو کیفیت مجھ پر بیتی اس سے مجھے حضرت یوسف علیہ السلام کے اس ابتلاء اور امتحان کی شدت کا ہلکا سا اندازہ ہو گیا جو ایک نہیں دس بھائیوں کے بغض و عداوت' اور عناد و شقاق کی بنا پر آنجناب کو پیش آیا تھا۔ بہر حال یہ تو ع "جن کے رتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے" اور ع "دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر!" والا معاملہ ہے۔ مجھ ایسے کمزور انسان کے لئے تو یہی بہت ہے کہ رحمتِ خداوندی نے "اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ" (سورۂ یوسف: آیت ۱۰۰) کے بعد جلد ہی "اِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ" (آیت ۹۱) والی صورت پیدا فرمادی۔ فَلَهُ الْحَمْد۔!

باب اوّل

تحریکی اور "بین الاخوانی" پس منظر

(شائع شدہ "میثاق" جولائی ۱۹۸۸ء)

ہمارے خاندان کا مولانا مودودی مرحوم کی تصانیف اور ان کی دعوت و تحریک سے اولین تعارف بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کے ذریعے ہوا۔ جنہوں نے اپنی انجینئرنگ کی تعلیم کے دوران جماعت اسلامی کے لٹریچر کو نہ صرف پڑھ لیا تھا' بلکہ اپنی محنتی طبیعت کے مطابق اس کے مفصل نوٹس تیار کر کے گویا اسے اچھی طرح ہضم بھی کر لیا تھا۔۔۔ ۱۹۴۷ء کے وسط میں وہ تعلیم سے فارغ ہوئے' اور پھر تین چار ماہ تقسیم ہند کے حوادث سے دوچار رہنے کے بعد اسی سال کے اواخر میں ایک جانب محکمہ نہر میں ایس ڈی او کے عہدے پر فائز ہو گئے۔۔۔ اور دوسری جانب جماعت اسلامی کے رکن بن گئے!

جماعت سے تعلق کے ضمن میں ان کے ساتھ ایک عجیب حادثہ یہ پیش آیا کہ جب حکومت نے جماعت اسلامی کو سیاسی جماعت قرار دے کر سرکاری ملازمین کے لئے اس کی رکنیت ممنوع کر دی تو انہوں نے اپنی ذاتی اور خاندانی مجبوریوں کے باعث رکنیت سے استعفاء دے دیا۔۔۔ لیکن ۱۹۵۱ء میں جب جماعت نے پنجاب کے انتخابات میں زور شور سے حصہ لیا تو وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے اور انہوں نے اپنی ذاتی کار انتخابی مہم میں استعمال کے لئے جماعت کے حوالے کر دی' جس کی پاداش میں وہ سرکاری ملازمت سے برخواست کر دیئے گئے!۔۔۔ بعد ازاں شدید محنت و مشقت اور اپنی فنی مہارت و قابلیت کے بل پر اپنی آزاد معیشت کو استوار کرنے کے بعد وہ دوبارہ جماعت کے رکن بنے تو اس بار جماعت کی پالیسی اور طریق کار کے ضمن

ں جو شدید اختلاف ۵۷-۱۹۵۶ء میں رونما ہوا تھا اس کا شکار ہو گئے اور نہایت مایوس
ر بد دل ہو کر دوبارہ علیحدہ ہو گئے اور اس بار ان کی مایوسی اور بددلی اتنی شدید تھی کہ
ںوں نے باضابطہ استعفاء تحریر کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی!

وہ دن اور آج کا دن' ان کی جملہ صلاحیتیں اپنے فن اور کاروبار کے لئے وقف
کر رہ گئیں ـــــ اور اگرچہ پالیسی کے اختلاف کے ضمن میں ان کی رائے صدفی صد
اقم کی رائے کے مطابق تھی' چنانچہ اجتماع ماچھی گوٹھ میں جو چند ووٹ راقم کو ملے
ھے ان میں سے ایک ان کا بھی تھا ـــــ لیکن اس کے بعد ان میں تحریکی داعیہ دوبارہ کبھی
یرانہ ہو سکا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر ایک بار پھر ان کے جذبات میں ایک
ارضی سا ابال آیا تھا جس کی بنا پر انہوں نے جماعت اسلامی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی
یک نشست کے لئے بڑے جوش و خروش اور جذبہ و شوق کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ لیکن
نتخابات کے نتائج نے انہیں پہلے سے بھی زیادہ مایوس اور بددل کر دیا ـــــ چنانچہ کچھ
سی مایوسی اور بددلی' اور کچھ بعض دوسرے اسباب و عوامل کے باعث وہ راقم کی
دعوت و تحریک کے ساتھ' اس سے نظری طور پر بہت حد تک متفق ہونے کے باوجود'
تاحال عملاً منسلک نہیں ہو پائے!

یہ بھی یقیناً راقم پر اللہ تعالیٰ کے عظیم فضل و احسان کا مظہر ہے کہ اس کے باقی
تینوں حقیقی بھائی' واحد حقیقی چچازاد بھائی سمیت' اس کے مشن میں عملاً شریک و شامل
اور تنظیم اسلامی سے باضابطہ منسلک ہیں۔

ان میں سب سے چھوٹے یعنی ڈاکٹر ابصار احمد سے رفقائے تنظیم و انجمن' اور
قارئینِ "میثاق" و "حکمت قرآن" بخوبی واقف ہیں' اس لئے کہ وہ تنظیم اسلامی میں
باضابطہ شامل ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن اکیڈمی کے اعزازی ڈائریکٹر اور "حکمتِ
قرآن" کے اعزازی مدیر بھی ہیں۔

عمر میں ان سے بڑے ہمارے واحد عم زاد مظفر احمد منور ہیں جو کراچی یونیورسٹی کے انتظامی شعبے سے منسلک اور تنظیم اسلامی کراچی سے وابستہ ہیں۔ کچھ عرصہ قبل تک وہ نہایت فعال کارکن تھے ___ لیکن اولاً اپنی والدہ مرحومہ کی شدید اور طویل علالت' پھر اپنی اہلیہ کی ناسازیٔ طبع اور پھر اپنے ایک چھوٹے بچے کی پریشان کن علالت کے باعث اگرچہ زیادہ فعال نہیں رہے[1] ___ تاہم نظم کی پابندی میں ہرگز کوئی کوتاہی نہیں کرتے!

ان سے بڑے یعنی برادرم وقار احمد اگرچہ نہایت کم گو ہونے کے باعث زیادہ نمایاں نہیں ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ چوالیس پینتالیس برس کی عمر میں' جوان بچوں کے باپ اور دو نواسوں کے نانا ہونے کے باوجود' اور ایک معروف تعمیراتی فرم کے ڈائریکٹر اور کاروباری اعتبار سے نہایت مصروف ہونے کے باوصف انہوں نے جس طالب علمانہ شان کے ساتھ قرآن اکیڈمی کا دو سالہ تعلیمی کورس امتیازی حیثیت میں مکمل کیا' وہ ان کی سعادت' دین کے ساتھ لگن اور راقم کے مشن کے ساتھ گہری وابستگی کا بیّن ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ان کی زبان کا "عقدہ" کھول دے اور ان کی طبیعت کی جھجک دور فرمادے تو ان شاء اللہ وہ قرآن حکیم کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کے میدان میں نہایت نمایاں خدمت سرانجام دے سکیں گے۔ (جس کا آغاز انہوں نے' بحمد اللہ' اپنے بچوں اور بچیوں کو عربی زبان اور ترجمۂ قرآن کی تدریس کی صورت میں کر بھی دیا ہے۔)

ان میں سب سے بڑے' ___ اور مجھ سے متصلاً چھوٹے ہیں مدیرِ "ندا" برادرم اقتدار احمد' جن کے ساتھ حقیقی بھائی ہونے کے اساسی رشتے پر مستزاد راقم کے چار مزید رشتے قائم ہو چکے ہیں' یعنی ان کی دو بچیاں میرے دو بیٹوں کے گھروں کی زینت

---

[1] افسوس کہ بعد میں یہ غیر معمولی طور پر ذہین اور ہونہار بچہ بھی انہیں داغِ مفارقت دے گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ہیں[1] اور میری دو بچیاں ان کی بہوئیں ہیں' لیکن ان جملہ رشتوں سے اہم تر معاملہ یہ ہے کہ وہ میرے نہایت دیرینہ معاون اور رفیق کار ہیں' اور تحریک اسلامی کے ساتھ ان کا تعلق بھی تقریباً اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود میرا!

چنانچہ جن دنوں راقم میڈیکل اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے اسلامی جمعیت طلبہ کا فعال کارکن تھا' وہ بھی ہائی اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے سرگرم کار تھے۔ اور ۵۱-۵۰ء کی انتخابی مہم میں بھی انہوں نے انتھک کام کیا تھا ــــ اور دسمبر ۵۱ء کی اُس دس روزہ تربیت گاہ میں بھی شرکت کی تھی جو راقم نے بحیثیت ناظمِ جمعیت لاہور منعقد کی تھی اور جس کے نہایت دور رس اثرات خود راقم کی شخصیت اور بعد کی زندگی کے رخ پر مترتب ہوئے تھے!

۵۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کچھ خاندانی حالات اور زیادہ تر ذاتی نفسیاتی الجھنوں کے باعث نہ صرف یہ کہ ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا بلکہ کچھ عرصہ وہ نہایت شدید نفسیاتی بحران کا شکار رہے۔ راقم کو نہایت شدت کے ساتھ احساس تھا کہ ان کی نفسیاتی الجھنوں کے پیدا ہونے میں کچھ حصہ الفاظِ قرآنی "اِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ " (سورۂ ص : ۲۴) اور فارسی مقولے "سگ باش برادرِ خورد مباش!" کے مصداق ہم بڑے بھائیوں ــــ بالخصوص راقم کا بھی تھا۔ لہٰذا راقم نے اس کی تلافی اور ان کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کی اور ان ہی مساعی کے سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم و مغفور کے ساتھ اپنے ذاتی مراسم اور رسوخ کو بروئے کار لا کر مولانا محمد ایوب صاحب کی صاحب زادی سے ان کی شادی کا اہتمام کیا۔ (مولانا ان دنوں سردار صاحب کے یہاں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے تھے! اور جماعت اسلامی کے ساتھ فعال

---

[1] ان میں ایک مزید اضافہ حال ہی میں ہوا ہے جب میرے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی بھی ان ہی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی سے ہو گئی۔

وابستگی رکھتے تھے۔) اور بحمد اللہ اس کے نہایت صحت مند نتائج ظاہر ہوئے ـــ اور نہ صرف یہ کہ آں عزیز کی زندگی کی گاڑی صحیح پٹڑی پر پڑ گئی بلکہ پھر انہوں نے اپنی تعلیمی کمی کی بھی بھرپور تلافی کی ـــ اور گیارہ ماہ کے اندر اندر تین امتحان پاس کر لئے، اولاً ادیب فاضل، پھر ایف اے اور پھر بی اے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے لاہور کا رخ کیا اور ایک جانب اسلامیہ کالج سول لائن میں ایم اے انگلش کے لئے اور دوسری جانب لاء کالج میں ایل ایل بی میں داخلے کے لئے آزمائشی ٹیسٹ دیئے، اور دونوں میں کامیابی حاصل کر کے بالفعل داخلہ ایل ایل بی میں لے لیا ـــ اور اس کے ساتھ ساتھ اولاً ڈیڑھ دو ماہ روزنامہ "تسنیم" اور بعد ازاں ہفت روزہ "ایشیا" میں کام کرنا شروع کر دیا اور مؤخر الذکر کے سلسلے میں تو اتنی کامیابی حاصل کر لی کہ ملک نصر اللہ خاں مرحوم و مغفور نے اپنی آپ بیتی پر مشتمل ایک کالم کے سوا باقی پورا پرچہ ان کے حوالے کر دیا۔ اور انہوں نے بھی چھ ماہ کے اندر اندر اس کی اشاعت میں معقول اضافہ کر کے دکھا دیا۔

اُس وقت تک اللہ تعالیٰ نے بھائی جان کی شدید محنت اور مشقت کے صلے میں ان کے کاروبار میں برکت عطا فرما دی تھی اور ان کی تعمیراتی فرم کا کام کافی وسعت اختیار کر گیا تھا، جس کے لئے انہیں معاون ہاتھ درکار تھے۔ چنانچہ ان کی دعوت پر عزیزم اقتدار احمد نے بقولِ خود قلم ہاتھ سے رکھ کر بیلچہ تھام لیا۔ اور الحمد للہ کہ اس میدان میں بھی ان کی طبعی ذہانت نے جلد ہی اپنا لوہا منوا لیا۔ بعد میں بھائی جان نے ان کے، اور ان سے چھوٹے بھائی عزیزم وقار احمد کے لئے جنہوں نے بی ایس سی کا امتحان پاس کر لیا تھا، پرائیویٹ ٹیوشن کے ذریعے سول انجینئرنگ کی تعلیم کا اہتمام بھی کر دیا۔ جس کے نتیجے میں انہیں اس کاروبار کے ضمن میں عملی مہارت کے ساتھ ساتھ فنی بصیرت بھی حاصل ہو گئی ـــ اور اس طرح یہ دونوں چھوٹے بھائی پیشہ اور کاروبار کے اعتبار سے مستقلاً اس "شاہراہ" پر گامزن ہو گئے جس کا "افتتاح" بھائی جان نے کیا تھا!

اس دوران میں خود راقم الحروف ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی کی رکنیت اور
جماعت کی ڈسپنسری کی ملازمت کو خیرباد کہنے کے بعد از سرِنو اپنی معاشی زندگی کی بنیاد
استوار کرنے اور تحریکی وابستگی کی نئی راہیں متعین کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔
چنانچہ تین چار سال کی محنت کے نتیجے میں ایک جانب اس نے منٹگمری (حال ساہیوال)
میں اپنا ذاتی مطب مستحکم (ESTABLISH) کر لیا تھا اور دوسری جانب کچھ عرصہ
جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے "بزرگوں" کے کوچوں کا طواف کرنے، اور
بالآخر کسی نئی تعمیر و تشکیل کے ضمن میں ان سے مایوس اور بددل ہو جانے کے بعد،
ذاتی سطح پر منٹگمری ہی میں "حلقہ مطالعۂ قرآن" اور "دارالاقامہ" کے نام سے ایک
ہاسٹل کے قیام کے ذریعے اپنے مقصدِ زندگی کی لگن اور تحریکی جذبے کی تسکین کا
سامان فراہم کر لیا تھا۔ اس ہاسٹل کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ کالج میں زیرِ تعلیم طلبہ کے لئے
دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ اور الحمدللہ کہ برادرِ عزیز مظفر احمد منور اور
برادرم ڈاکٹر ابصار احمد کے فکر و نظر کی داغ بیل اسی ہاسٹل میں پڑی اور ان کی زندگی کا
رخ یہیں متعین ہوا۔

میں اپنی ان مصروفیات میں پوری طرح مگن اور مطمئن تھا کہ اچانک بھائی جان کی
جانب سے مجھے بھی اپنے کاروبار میں شرکت کی دعوت موصول ہوئی، خود اپنے بارے
میں اس "اعتراف" کے ساتھ کہ "میرے پاس فنی صلاحیت اور مہارت تو موجود ہے،
تنظیمی اور انتظامی صلاحیت بالکل نہیں ہے" اور میرے بارے میں اس "مغالطے" کے
باعث کہ "تمہیں اللہ نے یہ صلاحیتیں وافر مقدار میں عطا کی ہیں!" —— اس سلسلہ
میں انہوں نے ایک جانب والدین سے بھی سفارش کرائی اور دوسری جانب خود مجھ پر
ترپ کا یہ پتہ آزمایا کہ "تم اپنی میڈیکل پریکٹس کے ساتھ دعوت اور تحریک کا کام کیسے
کر سکو گے؟ بہتر یہ ہے کہ کچھ دن اس کاروبار میں وقت لگا کر اس کے انتظامی ڈھانچے کو
استوار کر دو، پھر ہم تمہیں دین کے کام کے لئے مستقل طور پر "فارغ" کر دیں

گے!" — تحریک اسلامی کے ساتھ میری شدید جذباتی وابستگی نے مجھے اس دلیل کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا — اور میں نے بھی ان کی دعوت قبول کرلی۔ چنانچہ میں قریشی کنسٹرکشن کمپنی لیمیٹڈ کا حصہ دار بھی بن گیا، اور اس کا ڈائریکٹر اور جنرل مینیجر بھی! اور میرے ذاتی مطب نے بھی اسی کمپنی کی جانب سے ایک خیراتی ہسپتال (WELFARE CLINIC) کی حیثیت اختیار کرلی۔

لیکن جلد ہی راقم نے محسوس کرلیا کہ یہ تو "دام ہم رنگِ زمین" ہے، اس لئے کہ اولاً یہ کام جس قدر محنت اور توجہ کا طالب ہے اس کے پیش نظر اندیشہ ہے کہ کہیں میں مستقل طور پر اسی میں "گم" ہو کر نہ رہ جاؤں — مزید بر آں یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ اعلیٰ معیارِ زندگی کی بیڑیاں پاؤں میں مستقل طور پر نہ پڑ جائیں، ثانیاً ہم دونوں بھائیوں کے مزاج اور اندازِ کار کا فرق قدم قدم پر پیچیدگیوں کا باعث بن رہا تھا، جس سے فوری طور پر ذہنی کوفت اور وقت اور صلاحیت کے ضیاع کے علاوہ یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ کہیں مستقبل کے اعتبار سے لینے کے دینے نہ پڑ جائیں کہ کہاں تو مقصد یہ تھا کہ احیائے اسلام کے لئے مشترک جدّوجہد کریں گے کہاں یہ کہ باہمی اخوت کا رشتہ بھی مجروح ہو جائے!

بنا بریں، میں نے کاروبار میں شرکت کے بعد جلد ہی واپسی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لیکن چونکہ یہ پورے خاندان کا مسئلہ بن گیا تھا اور اس میں ہم چار بھائیوں کے علاوہ ایک بہنوئی بھی شامل تھے لہٰذا اس شراکت کو ختم کرنے میں کچھ وقت لگا — اور اگرچہ اس کے دوران بھائی جان مجھے ہر طرح سمجھاتے رہے کہ میں علیحدگی اختیار نہ کروں لیکن میرا حال یہ تھا کہ اس "دام ہمرنگِ زمین" سے نکلنے میں مجبوراً جو تاخیر ہو رہی تھی اس کا ایک ایک لمحہ سوہانِ روح بن گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار بھائی جان نے فرمایا: "اسرار تم ذرا محنت کرلو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم ہشتم خاں سے بڑے کنٹریکٹر بن سکتے ہو۔" (یہ نام میں نے تو پہلی بار ان ہی کی زبان سے سنا تھا، لیکن بعد میں

معلوم ہوا کہ یہ صاحب کوئی کروڑ پتی قسم کے ٹھیکیدار تھے۔) جس کا جواب میں نے یہ دیا تھا کہ "بھائی جان مجھے یہ کام کرنا ہی نہیں ہے۔ مجھے اگر پیسہ ہی بنانا مقصود ہوتا تو اللہ نے جو "پیشہ" مجھے عطا فرمایا تھا (یعنی میڈیکل پریکٹس) وہ بھی کچھ ایسا برا نہ تھا!"

بہرحال راقم ۱۹۶۵ء میں کراچی سے رسی تڑا کر (جہاں ۶۲ء میں اسی کاروبار کے سلسلے میں منتقلی ہوگئی تھی اور جہاں مزارِ قائداعظم کے قریب اس کوٹھی میں قیام رہا تھا جس میں بعد میں پیپلز پارٹی کا سنٹرل سیکرٹیریٹ قائم ہوا) سیدھا لاہور پہنچا' اس لئے کہ ع "کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے!" کے مصداق کسی انقلابی دعوت و تحریک کا آغاز ملک کے کسی "اُمّ القریٰ" ہی سے ہو سکتا تھا--- اور اُس وقت میں نے اپنی زندگی کے اس عجیب و غریب حادثے پر نگاہِ بازگشت ڈالی تو یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ الفاظ قرآنی "لَقَدْ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی" کے مصداق اس پورے معاملے میں یہ حکمتِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی مضمر تھی کہ مجھے ساہیوال سے اکھاڑ کر لاہور لے آیا جائے --- اور یہاں اپنی زندگی کے نئے سفر کے آغاز کے لئے ابتدائی سرمایہ بھی فراہم کر دیا جائے۔

چنانچہ کاروبار سے علیحدگی پر جو خطیر رقم میرے حصے میں آئی' اس سے میں نے:

(۱) ایک دو منزلہ مکان کرشن نگر لاہور میں خریدا جس میں اتنی گنجائش موجود تھی کہ رہائشی ضروریات بھی پوری ہو جائیں' اور مطب بھی قائم ہو سکے'۔

(۲) "دارالاشاعت الاسلامیہ" قائم کیا جس کے تحت سب سے پہلے میری اپنی تالیف "تحریکِ جماعتِ اسلامی' ایک تحقیقی مطالعہ" شائع ہوئی' اور پھر مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف اور تفسیر "تدبرِ قرآن" --- اور میرے ابتدائی دعوتی کتابچوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ (۳) ماہنامہ "میثاق" جاری کیا' جو کچھ عرصے سے بند تھا' چنانچہ اس کے ضمن میں کچھ سابقہ واجبات بھی مجھے ادا کرنے پڑے!

الغرض' اس طرح مجھے اپنی زندگی کے اس نئے سفر کے آغاز میں کوئی دقت نہیں

ہوئی' جس کے اہم نشاناتِ راہ ہیں: ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس' اور اس کے تحت قرآن اکیڈمی کا قیام --- اور ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کی تاسیس اور اس عنوان کے تحت اقامتِ دین کی ایک انقلابی جدوجہد کا آغاز!

انگریزی زبان کے ایک مشہور مقولے[1] کا حاصل یہ ہے کہ علیحدگیاں ہمیشہ تلخیوں کو جنم دیتی ہیں --- ہماری کاروباری علیحدگی بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہ رہ سکی' اور بھائی جان کے ضمن میں تو وہ صورت پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو کر رہی جس کا اندیشہ میری علیحدگی کے اسباب میں داخل تھا۔ چنانچہ ان کے ساتھ ایک طویل عرصے تک تعلقات نہایت کشیدہ رہے۔ خود عزیزم اقتدار احمد کے ساتھ اگرچہ کوئی براہِ راست تلخی تو پیدا نہیں ہوئی' لیکن غیر محسوس طور پر مغائرت کے پردے حائل ہوتے چلے گئے۔ (اور اس میں بھی' جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم حکمت مضمر تھی!)

ہماری کاروباری علیحدگی جس انداز میں ہوئی' اس کے نتیجے میں برادرم اقتدار احمد کو ایک مستحکم کاروباری ادارے کے مالک و مختار ہونے کی حیثیت حاصل ہو گئی' اور اس طرح ان کی ذہانت اور صلاحیت کو بھرپور طور پر بروئے کار آنے کا موقع ملا۔ اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنی خداداد لیاقت اور شدید محنت و مشقت کے نتیجے میں نہایت شاندار کامیابی حاصل کی اور اس میدان میں فتح و کامرانی کے بہت سے بلند اور نمایاں جھنڈے نصب کئے۔ (اور اس کے نتیجے میں ہماری معاشی سطح میں جو نمایاں فرق و تفاوت پیدا ہوا' اس نے ہمارے مابین مغائرت کے پردوں کو مزید دبیز کر دیا!)

---

[1] "PARTINGS ARE ALWAYS PAINFUL"

۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۱ء

دعوت و تبلیغ کی خالص انفرادی مساعی

کے دوران

معاش اور معاد کی شدید کشاکش

اور بالآخر

خالصۃً توکلاً علی اللہ

میڈیکل پریکٹس کو خیر باد کہنے کا

آخری فیصلہ

وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ

الطلاق : ۳

(شائع شدہ "میثاق" اگست و ستمبر ۱۹۸۸ء)

اواخر ۶۵ء سے اواخر ۷۰ء تک پانچ سال کا عرصہ راقم کی زندگی کا معروف ترین اور شدید ترین مشقت کا دور تھا، جس کے دوران مختلف ہی نہیں متضاد قسم کی مصروفیات کا شدید دباؤ راقم پر رہا۔

یادش بخیر، محنت و مشقت کی شدت کے اعتبار سے ان ایام کا مقابلہ اگر کسی درجہ میں کر سکتے ہیں تو صرف ۵۰ء تا ۵۳ء کے وہ تین چار سال جو اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ انتہائی فعال وابستگی میں گزرے تھے، اور جن کے دوران اولاً میڈیکل کالج کی نظامت، پھر لاہور اور پنجاب کی دوہری نظامت اور بالآخر پورے پاکستان کی نظامتِ علیا کا بوجھ راقم کے کندھوں پر رہا تھا۔

شدید مشقت کے اس دورِ ثانی (۶۵ء تا ۷۰ء) کی مصروفیات کا کسی قدر اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ:

ایک جانب مطب کی مصروفیت تھی جس میں صبح سے شام تو ہوتی ہی تھی، اس پر مزید یہ کہ چونکہ رہائش اور مطب یکجا تھے، لہٰذا رات کا آرام بھی یقینی نہ تھا۔ اور اکثر "تہجد بالمرضیٰ" کی صورت پیش آتی رہتی تھی۔

دوسری جانب "حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن" تھے جو لاہور کے مختلف گوشوں میں قائم تھے اور جن سے ہفتے کی کوئی شام مستثنیٰ نہ تھی۔ ان میں سے جو حلقے دور دراز کے علاقوں میں قائم تھے وہ تو مریضوں کی یلغار سے محفوظ رہتے تھے، لیکن جو دو حلقے خود کرشن نگر میں قائم تھے ان کے ضمن میں تو اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ادھر میں درس دے رہا ہوتا تھا اور ادھر دروازے پر مریض یا ان کے لواحقین منتظر ہوتے تھے۔ شام کے ان دروس پر مستزاد تھا جمعہ کا خطبہ و خطاب اور اتوار کی صبح کا مرکزی درسِ قرآن! گویا ہفتے کا کوئی پورا دن تو کجا، دن کا کوئی حصہ بھی آرام کے لئے مختص نہ تھا!

تیسری جانب تحریر و تسوید کا کام تھا، جس میں "میثاق" کے اداریوں کے علاوہ اپنے دعوتی مضامین اور کتابچوں کی تالیف بھی شامل تھی۔

اور چوتھی جانب اور ان سب سے بڑھ کر پریشان کن تھا "دارالاشاعت
سلامیہ" کا انتظامی "کھکھیڑ" جس میں خوشنویس حضرات کا تعاقب' کاغذ کی مارکیٹ
، رابطہ' مطابع کے چکر' دفتری اور جلد ساز حضرات کے ساتھ "سرد و گرم"
ملات' پھر پرچے اور کتابوں کی ترسیل' ڈاک کی دیکھ بھال اور سب سے بڑھ کر
ابات کا اندراج ایسے مشقت طلب اور خالص "غیر رومانوی" قسم کے کام شامل
ے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اُس وقت یہ تمام کام میں
ا تنہا کر رہا تھا ـــــ اور اس پورے کام میں میرے صرف دو معاون تھے۔ ایک مطب
؛ پنسر اور دوسرے "دارالاشاعت" کے ایک جز وقتی کارکن!

الغرض ـــــ ان پانچ سالوں کے دوران صورت بالکل وہ رہی جس کا نقشہ
ضرت حسرت نے اپنے اس شعر میں کھینچا ہے۔

ہے مشقِ سخن جاری' چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

رحال ـــــ سورۃ النجم کی آیات مبارکہ "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ وَاَنَّ
سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ۝" میں بیان شدہ قانونِ خداوندی کے مطابق اس محنت و
شقت کا یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہوا کہ نہ صرف یہ کہ جماعت اسلامی سے لگ بھگ دس
رس قبل علیحدہ ہونے والے لوگوں میں سے بہت سوں کے باطن میں دبی ہوئی
چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء میں "تنظیم اسلامی" کی تاسیس کے ضمن میں
یک اہم اجتماع بھی ہوا۔ (اگرچہ یہ کوشش بھی ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل
بود" کے مصداق ناکامی سے دوچار ہو گئی) بلکہ ہم خیال لوگوں کا ایک بالکل نیا حلقہ بھی
وجود میں آ گیا اور اس طرح ایک نئی تحریک کی داغ بیل پڑ گئی' لیکن اس کے ساتھ دو
بحران بھی پیدا ہو گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شدت میں بھی اضافہ
ہوتا چلا گیا۔

چنانچہ ــــ ایک جانب صحت متاثر ہونی شروع ہوئی اور اوائل ۷۰ء میں تو اس نے گویا بالکل جواب دے دیا۔ نتیجۃً مستقل طور پر حرارت رہنے لگی جو شام کے وقت باقاعدہ بخار کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ جیسے کہ عام طور پر ہوتا ہے، اولاً میں نے اس کی جانب توجہ ہی نہ کی، اور درد اور بخار کو دفع کرنے والی ادویات کے سہارے اپنے معمولات جاری رکھے۔ لیکن جب ایک دو بار تھوک میں خون کی آلائش بھی نظر آئی تو سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہونا پڑا۔ متعدد بار ایکسرے کرانے کے باوجود پھیپھڑوں میں تو کوئی واضح خرابی نظر نہ آئی، لیکن شام کے بخار اور ہلکی ہلکی کھانسی کے پیش نظر اکثر مخلصین کا اصرار تھا کہ ٹی بی کا علاج شروع کر دیا جائے ــــ وہ تو بھلا ہو ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب کا کہ سختی کے ساتھ اڑ گئے کہ جب تک صریح اور مثبت شواہد نہیں ملیں گے میں ٹی بی کی ادویات استعمال کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ انہی دنوں پروفیسر یوسف سلیم چشتی (مرحوم و مغفور) حکیم سعید احمد پھلوری (مرحوم) کو لے آئے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پھیپھڑوں کے سرطان کی تشخیص کر ڈالی۔ چشتی صاحب ان کی "نباضی" کے بے انتہا معتقد تھے، لہٰذا ان کے اصرار پر ایک کرم فرما کی وساطت سے ریلوے کیرز ہاسپٹل کے ڈاکٹر سعید صاحب سے باضابطہ "برانکوسکوپی" (BRONCHOSCOPY) کرانی پڑی جس کا نتیجہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ "پھیپھڑوں کی تمام نالیاں بالکل شیشے کے مانند صاف ہیں اور مجھے کہیں بلغم کی اتنی مقدار بھی نہیں ملی جسے خوردبینی معائنہ کے لئے نکال لاتا" ــــ گویا ثابت ہو گیا کہ یہ علالت نتیجہ تھی صرف جسمانی مشقت کی زیادتی، آرام کی کمی، اور اعصاب پر متضاد قسم کے کاموں کے شدید دباؤ کا!

دوسری جانب ابتدائی "فارغ البالی" کے کچھ ہی عرصے بعد مالی مشکلات نے سر اٹھانا شروع کر دیا ــــ اور رفتہ رفتہ اس اعتبار سے بھی صورت حال تشویش ناک ہوتی چلی گئی۔

کرشن نگر کے مکان کی خرید اور اس کی ابتدائی مرمت وغیرہ کے مصارف کے بعد جو سرمایہ میرے پاس بچا تھا' اس میں سے قدرِ قلیل کسی ہنگامی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے محفوظ رکھ کر باقی کُل کا کُل میں نے "دارالاشاعت الاسلامیہ" میں کھپا دیا تھا۔ لیکن اس سے جو مطبوعات شائع ہو رہی تھیں' ظاہر ہے کہ وہ نہ تو "نرم و گرم نان" (HOT CAKES) کے مانند بکنے والی تھیں' نہ ہی چیٹ پٹے ڈائجسٹوں کی طرح قبولِ عام حاصل کر سکتی تھیں' لہٰذا جلد ہی محسوس ہوا کہ کُل سرمایہ منجمد (BLOCK) ہو کر رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ "تدبرِ قرآن" کی جلد دوم کی اشاعت کے لئے مجھے ایک دوست سے کچھ رقم حاصل کرنی پڑی۔ (جو انہوں نے قرض کی بجائے شراکت کی اساس پر دی' اور افسوس ہے کہ اُس وقت میں بھی اس شراکت کی پیچیدگیوں کو نہ سمجھ سکا۔ لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ صرف ایک کتاب کے سلسلے میں نفع و نقصان کی شراکت حساب کتاب کے اعتبار سے ناقابلِ عمل ہے۔ لہٰذا جیسے بھی بن پڑا میں نے جلد ہی ان کی رقم معذرت کے ساتھ واپس کر دی' اگرچہ وہ اس پر کچھ جز بز بھی ہوئے۔)

جہاں تک میڈیکل پریکٹس کا تعلق ہے' میں اپنا سات آٹھ سال کا تعارف یا پیشہ ورانہ "نیک نامی" (GOOD WILL) کا سرمایہ تو منٹگمری (ساہیوال) ہی میں چھوڑ کر کراچی چلا گیا تھا۔ پھر لگ بھگ ساڑھے تین سال پریکٹس سے تقریباً لاتعلق رہا۔ مزید برآں ان گیارہ سالوں کے دوران بہت سا پانی وقت کے دریا میں بہہ چکا تھا' اور ایک کثیر تعداد میں نوجوان ڈاکٹر میدان میں آ گئے تھے' ـــــ چنانچہ لاہور میں تو گلی گلی ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کے مطب قائم ہو چکے تھے' ان حالات میں جان توڑ محنت سے بھی مطب بس اتنا ہی جم سکا کہ میری اور میرے اہل و عیال کی بقدرِ کفاف کفالت کر سکے ـــــ جبکہ "دارالاشاعت" بھی مسلسل "هَلْ مِن مَّزِيد" کے نعرے لگا رہا تھا اور "میثاق" بھی ہر ماہ اچھے خاصے "خسارے کی سرمایہ کاری" کا متقاضی تھا!

الغرض وسط ۷۰ء تک صحت کی خرابی، اور مالی مشکلات دونوں نے مل جل کر ایک گمبھیر مسئلے کی صورت اختیار کرلی۔ اور اگرچہ داخلی طور پر تو یہ اطمینان حاصل رہا کہ بحمد اللہ اپنے مقصدِ زندگی کی خاطر وہ صورت پیدا ہو گئی کہ۔

خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

لیکن خارجی طور پر، عالمِ اسباب و علل میں "پس چہ باید کرد؟" کا سوال پوری شدت کے ساتھ سامنے آکھڑا ہوا۔

اُن دنوں برادرم اقتدار احمد سے تو مکانی فصل و بُعد بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ ان کا کاروباری مرکز بھی کراچی میں تھا اور کاروباری سرگرمیاں بھی زیادہ تر اندرونِ سندھ تک محدود تھیں۔ مزید بر آں کاروباری علیحدگی کے بعد سے کچھ ذہنی اور قلبی حجابات بھی طاری ہو گئے تھے، جن میں، جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ان کے کاروبار میں نمایاں کامیابیوں اور ترقیوں سے پیدا شدہ مالی حیثیت کے فرق و تفاوت کی بنا پر بھی بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔

بڑے بھائی اظہار احمد صاحب نے اپنا رہائشی اور کاروباری مرکز جوہر آباد کو بنایا اور ان کے کاروبار کا دائرہ پنجاب اور سرحد میں پھیلا اور اس میں بھی فوری طور پر بہت ترقی اور وسعت ہوئی۔ لہٰذا ان کی لاہور آمد و رفت کا سلسلہ بکثرت جاری رہتا تھا۔ انہوں نے میرے حالات کا اندازہ کر کے کچھ بڑے بھائی ہونے کے ناتے، کچھ نظریاتی اور مقصدی ہم آہنگی کے پس منظر کے باعث، اور کچھ غالباً کاروباری اشتراک اور پھر علیحدگی کے ضمن میں اپنی بعض ذمہ داریوں کی ادائیگی کی خاطر ۶۹۔۱۹۶۸ء کے آس پاس مالی تعاون کی صورت پیدا کرنی چاہی ـــــ لیکن میں نے کچھ طبعی غیرت اور کچھ ان کی بعض بالا زیادتیوں کے شدید ردِ عمل کے باعث ان کا کسی قسم کا تعاون قبول کرنے

سے صاف انکار کردیا۔

اس پر انہوں نے "زبردستی کے تعاون" کی بعض نہایت دلچسپ صورتیں اختیار کیں :

مثلاً ایک یہ کہ "تدبرِ قرآن" کی جلد اول کے سو نسخے اپنی جیب سے پوری قیمت پر خرید کر بعض اعزہ و احباب کو ہدیہ کر دیئے (حالانکہ ان میں سے اکثر کے بارے میں ہرگز کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اس کا ایک لفظ بھی پڑھیں گے۔)

دوسرے یہ کہ میرے ذاتی فون سے لمبی لمبی کاروباری ٹرنک کالیں شروع کر دیں ــ اور میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ یااللہ! انہیں روکوں تو کیسے؟ اور نہ روکوں تو بل کیسے ادا ہو گا؟ ـــ کہ انہوں نے دفعتہً کہہ دیا کہ اس فون کا پورا بل میں ادا کروں گا۔ اور اس پر میں سوائے خاموشی اختیار کرنے کے اور کچھ نہ کر سکا!

تیسرے یہ کہ اسی فون کی سہولت کے پیش نظر میرے مکان کے ایک کمرے میں اپنا لاہور آفس قائم کر دیا ـــ (واضح رہے کہ اُن دنوں ٹیلی فون بہت کمیاب ہی نہیں تقریباً نایاب تھا اور مجھے بھی صرف مطب کی ترجیح کی بنا پر حاصل ہو گیا تھا) ــ اور اس کے کچھ عرصے کے بعد "حسابِ دوستاں در دل" کے مطابق گویا اس کے کرائے کے طور پر نہ صرف یہ کہ مکان کی بعض بوسیدہ چھتوں کو اپنی "تیار چھتوں" سے بدل دیا' بلکہ ان کے دفتر کے باعث جو تنگی پیدا ہو گئی تھی اس کے ازالے کے لئے دوسری منزل پر کچھ اضافی تعمیر بھی کر دی۔ جس سے مکان کی مالیت میں لامحالہ گرانقدر اضافہ ہو گیا۔

چوتھے یہ کہ جب میں نے "میثاق" کے مالی خسارے کے ناقابلِ برداشت ہونے کا ذکر "میثاق" ہی میں کیا تو انہوں نے فوراً پیشکش کر دی کہ اس کا کُل خسارہ میرے ذمے رہے گا۔ یہ ایک بالکل نئی صورت حال تھی جس سے میں دفعتہً دوچار ہوا۔ اس لئے کہ اوپر کی متذکرہ جملہ صورتیں کچھ در پردہ اور بالواسطہ تعاون کی تھیں جبکہ یہ پیشکش کھلم کھلا اور براہ راست تعاون کی تھی۔ اور میں اپنی اس ذہنی اور نفسیاتی

کیفیت کے پیش نظر جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اسے ٹھکرانے والا ہی تھا کہ اچانک میرے اندر ہی سے یہ آواز آئی کہ "تم 'میثاق' اللہ کے دین کی خدمت کے لئے شائع کر رہے ہو' اب اگر یہ مالی اسباب کی بنا پر بند ہو گیا تو تم اللہ کو کیا جواب دو گے اگر اللہ کی جانب سے یہ حجت قائم ہو کہ ہم نے تو اس کا ذریعہ پیدا فرمادیا تھا' تم نے اپنی ذاتی 'انا' کو کیوں مزاحم ہونے دیا؟" —— بنا بریں میں نے خاموشی اختیار کرلی اور اس طرح بھائی جان کے "زبردستی کے تعاون" کا سلسلہ مزید دراز ہو گیا۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ جگر کے اس شعر کے مصداق کہ ۔

احساسِ خودی پر ہوتی ہے اک بوجھ نگاہِ لطف و کرم
جیناو ہیں مشکل ہو تا ہے' مشکل جہاں آساں ہوتی ہے

بھائی جان کے اس زبردستی کے مالی تعاون سے میرے اعصابی دباؤ میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوا۔ اس لئے کہ ایک تو میری غیرت اسے گوارا نہیں کرتی تھی اور دوسرے انہوں نے اپنی زیادتیوں کے اعتراف کے ساتھ معذرت نہیں کی تھی۔

موضوعِ گفتگو کی تکمیل کی خاطر یہ عرض کر دینا مناسب ہو گا کہ برادرم اقتدار احمد اور بھائی اظہار احمد صاحب کے علاوہ دونوں چھوٹے بھائی ابھی کسی شمار قطار ہی میں نہیں تھے۔ ان میں سے عزیزم ابصار احمد تو انگلستان میں زیر تعلیم تھے اور مالی اعتبار سے خود دوسروں کے زیر کفالت تھے۔ (ان کی بیرونی تعلیم کے جملہ مصارف برادرم اقتدار احمد نے اپنے ذمے لے لئے تھے۔) البتہ ان کے خطوط سے گاہ بگاہ ہمت افزائی بھی ہوتی رہتی تھی اور یہ اطمینان بھی حاصل ہو تا رہتا تھا کہ انہیں میں نے جس مقصد کے تحت فلسفہ کے رخ پر ڈالا تھا اور جس مقصد کی داغ بیل منٹگمری کے "دار القامہ" میں پڑی تھی اس کی جانب تسلی بخش پیش رفت ہو رہی ہے۔ خصوصاً جب انہوں نے اپنے ایک خط میں یہ لکھا کہ : "جب سے یہاں (انگلستان) آیا ہوں 'اسلام کی نشأۃِ ثانیہ' کا مطالعہ چھ مرتبہ کر چکا ہوں اور ہر بار مجھے اس سے نئی رہنمائی حاصل ہوئی ہے!" تو

خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی ہوا کہ ان شاء اللہ وہ اس مقصد کے لئے مؤثر خدمات انجام دے سکیں گے جس کا خاکہ اس کتابچے میں دیا گیا ہے ——— رہے عزیزم وقار احمد تو وہ اگرچہ اولاً برادرم اقتدار احمد اور بعد ازاں بھائی اظہار احمد صاحب کے ساتھ کاروبار میں بالفعل شریک تھے ——— لیکن کچھ عمر میں کم ہونے، اور کچھ طبعاً کم گو اور نرم مزاج ہونے کے باعث کسی معاملے میں مضبوط موقف اختیار نہیں کر سکتے تھے ——— تاہم ان کی بھی ہمدردیاں مجھے ہمیشہ حاصل رہیں۔

وسط ۷۰ء تک ایک جانب تو، جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، متذکرہ بالا دونوں "بحران" اپنی پوری شدت کو پہنچ گئے تھے ——— اور دوسری جانب ۷۰ء کے عام انتخابات کے حوالے سے ذاتی طور پر میرے لئے دو مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں:-

ایک یہ کہ بھائی اظہار احمد صاحب کے دل میں کچھ تو جماعت اسلامی کے ساتھ جذباتی لگاؤ نے دوبارہ زور پکڑا ——— اور کچھ ملک اور قوم کی خدمت کے جذبے نے انگڑائی لی ——— چنانچہ انہوں نے انتخابات کی منجدھار میں چھلانگ لگا دی۔ اس سے ایک تو میرے اور ان کے مابین زندگی میں پہلی بار نظریاتی بُعد پیدا ہو گیا جس کے نتیجے میں وہ حجابات جو پانچ سال کی مدت میں بمشکل کچھ کم ہونے پر آئے تھے نہ صرف یہ کہ دوبارہ قائم ہو گئے بلکہ پہلے سے بھی دبیز تر ہو گئے ——— ثانیاً جب ان کی انتخابی مہم عروج کو پہنچی اور انہوں نے واقعتاً دیوانہ وار گاؤں گاؤں اور گلی گلی صدا لگانی شروع کی تو غالباً انہیں شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ میرا ایک بھائی زبان اور قلم دونوں کی صلاحیتوں سے کسی قدر بہرہ ور ہونے کے ناتے میری اس مہم میں مؤثر مدد کر سکتا تھا، جو وہ نہیں کر رہا! ——— اور واقعہ یہی تھا کہ میں اپنے نظریاتی موقف کے ہاتھوں مجبور ہونے کے باعث ان کی اس مہم سے قطعاً لا تعلق تھا۔ لہٰذا فطری طور پر ان کی طبیعت میں شدید ردِّ عمل پیدا ہوا ——— اور کچھ اس بنا پر، اور کچھ اس وجہ سے کہ الیکشن کی شدید مصروفیات

کے باعث ان کے کاروبار کو بھی بڑا دھکا لگا تھا، ان کی جانب سے "زبردستی کا تعاون" یکلخت بند ہو گیا۔ (اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی ایک عجیب حکمت مضمر تھی جس کا اندازہ بعد میں ہوا' ــــ چنانچہ اس کا تذکرہ بھی بعد ہی میں ہو گا اور در حقیقت اسی کی وضاحت کے لئے راقم کو اپنے اور بھائی جان کے مابین معاملات کے اس ناخوشگوار حصے کا ذکر کرنا پڑا ــ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف بڑے بھائی کی حیثیت سے ' بلکہ تحریکِ اسلامی کے ساتھ اولین تعارف کا ذریعہ ہونے کے ناتے مجھ پر ان کے بے شمار احسانات ہیں۔ اور میں اکثر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اب جبکہ وہ دنیوی کامیابیوں اور کاروباری اور پیشہ ورانہ کامرانیوں سے حصۂ وافر حاصل کر چکے ہیں۔ اور "مسنون عمر" کی بھی آخری حد کو چھو رہے ہیں ان میں دین کے لئے دوبارہ وہی جوانی والا جوش و خروش اور جذبۂ عمل پیدا ہو جائے ---وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ!)

دوسرے یہ کہ جمعیت علماء اسلام نے جو ان دنوں مولانا مفتی محمود احمد مرحوم و مغفور کی زیرِ قیادت خاصی فعال تھی مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ میں ان کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑوں۔ چنانچہ اس سلسلے میں دو بار مولانا محمد اجمل خاں اور علامہ خالد محمود صاحب میرے مطب (یا مکان) پر تشریف لائے۔ میں نے ان حضرات سے لاکھ عرض کیا کہ میں نے تو پالیسی کے اسی اختلاف کی بنیاد پر کہ الیکشن کے ذریعے پاکستان میں اسلامی نظام نہیں قائم کیا جا سکتا' جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی' اب میں کیسے الیکشن میں حصہ لے سکتا ہوں۔ لیکن ان کی جانب سے اصرار جاری رہا ــ ادھر کرشن نگر کے حلقے کی جماعت اسلامی کی ایک رسمًا متفق لیکن عملاً سرپرست شخصیت' حاجی محمد لطیف (مرحوم و مغفور) نے ان حضرات کو میرے پاس آتے جاتے دیکھا تو یہ گمان کرتے ہوئے کہ شاید یہ حضرات کسی اور امیدوار کے لئے تعاون (SUPPORT) حاصل کرنے کی غرض سے چکر لگا رہے ہیں' پُر جلال انداز میں فرمایا : "اگر یہ لوگ ایسے ہی مخلص ہیں تو آپ کو کیوں نہیں کھڑا کرتے!" اس پر جب

ں نے عرض کیا : "حاجی صاحب ارادہ تو میرے پاس اسی لئے تشریف لائے تھے!" تو
ہوں نے فوراً فرمایا کہ "اگر ایسا ہے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ جماعت اسلامی بھی آپ
ے مقابلے میں کوئی امیدوار کھڑا نہیں کرے گی۔ بلکہ آپ کو SUPPORT کرے
ں!" (واضح رہے کہ حاجی صاحب موصوف خود تو جماعت اسلامی کے علاقائی
سرپرست" تھے ہی' ان کے صاحب زادگان بھی اس ڈیمو کریٹک یوتھ فورس کے
ئی کے قائدین میں سے تھے جو اُس وقت جماعت کی عوامی قوت کے اہم ترین ستون
ی حیثیت رکھتی تھی ــــ چنانچہ ان کے ایک صاحب زادے "شوکتِ اسلام" کے
وس میں مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے محافظِ خصوصی کی حیثیت سے ان کے
کل برابر ایستادہ رہے تھے!) اس پر میں نے ہنستے ہوئے عرض کیا کہ : "حاجی
احب! میرے پاس تو شاید ضمانت کے پیسے بھی نہ ہوں!" تو انہوں نے فرمایا کہ :
زرِ ضمانت بھی میرے ذمہ رہا!"

اس پر میں یہ انتہائی راز کی بات بتانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ 'میں
نے اپنے اندر واقعتاً بالکل وہی کیفیت محسوس کی جو کسی انگریز آئی سی ایس افسر کے
رے میں بیان کی جاتی ہے کہ جب اسے کسی شخص نے رشوت پیش کی تو ابتداءً تو اس
نے اسے شرافت اور ملائمت کے ساتھ رد کر دیا' لیکن جب وہ شخص مسلسل اصرار بھی
کرتا رہا اور رشوت کی رقم بھی بڑھاتا چلا گیا تو ایک خاص حد تک پہنچ جانے کے بعد اس
نگریز افسر نے اس شخص کو نہایت سختی اور درشتی کے ساتھ حکم دیا کہ "میرے کمرے
ے فوراً نکل جاؤ' اس لئے کہ اب تم 'میری قیمت' کے بہت قریب پہنچ گئے ہو!"
ــ چنانچہ میں نے بھی یہ اندیشہ شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اگر یہ بات آگے بڑھی
ۃ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے نفس کی گہرائیوں میں حبِ جاہ کی کوئی دبی ہوئی چنگاری
بھڑک اٹھے' اور میں بھی انتخابی سیاست کی دلدل میں پھنس کر ہمیشہ کے لئے اپنی منزل
کھوٹی کر لوں ــــ بنابریں میں نے ملک سے راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت محسوس

کی اور برادرِ عزیز وقار احمد کو کراچی فون کر دیا کہ میرے لئے عمرے کا بندوبست کریں تاکہ ایک تو میں انتخابات کے ہنگامے سے الگ تھلگ رہ سکوں۔ اور دوسرے حرمین شریفین کی پرسکون اور روح پرور فضا میں ٹھنڈے دل کے ساتھ غور و فکر کر کے اپنا آئندہ لائحہ عمل طے کر سکوں۔ عزیزم وقار احمد نے سوال کیا: "آپ کب جانا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا: "تم کارروائی شروع تو کرو، میں تاریخ بھی جلد بتادوں گا!" ——— مجھے کیا پتہ تھا کہ کراچی میں یہ کام کس آسانی اور عجلت کے ساتھ ہو جاتے ہیں، انہوں نے دوبارہ کہا کہ آپ جب بھی جانا چاہیں گے انتظام ہو جائے گا!" اس پر میں نے تو گویا اپنے طور پر بہت مشکل ذمہ داری ان پر ڈال دی کہ: "میں تو ایک ہفتے کے اندر اندر روانہ ہو جانا چاہتا ہوں!" لیکن انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ: "بس آپ تیار ہو کر آجائیں، آپ جملہ انتظامات موجود پائیں گے!" اور واقعتاً جب میں چند دن کے اندر اندر وہاں پہنچا تو مجھے نہ صرف عمرے کا ویزا، اور پی آئی اے کا چار ماہ کار عایتی ٹکٹ تیار ملا ——— بلکہ حفظانِ صحت کے ٹیکے بھی "لگے لگائے" مل گئے یعنی بغیر ٹیکہ لگوائے مصدقہ سرٹیفکیٹ حاصل ہو گیا!) ——— یہ دوسری بات ہے کہ میں لاہور سے متعلقہ ٹیکے لگوا کر گیا تھا اور اس سفر میں میرے پاس دو ہیلتھ سرٹیفکیٹ تھے۔ ایک جعلی اور دوسرا اصلی۔

میرا یہ سفر جو ۱۶/۱۵ شعبان المعظم سے ۱۸/۱۷ ذی الحج ۱۳۹۰ء تک پورے ایک سو بیس دن (یا تبلیغی بھائیوں کی اصطلاح میں تین چلوں) پر محیط رہا، میری زندگی کا طویل ترین سفر بھی تھا اور ہر اعتبار سے اہم ترین بھی۔ اس لئے کہ اسی کے دوران، عین حج کے موقع پر، میں نے اپنی حیاتِ دنیوی کا اہم ترین فیصلہ کیا۔ یعنی میڈیکل پریکٹس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد، اور جملہ صلاحیتیں اور توانائیاں، اور کُل اوقات وقف برائے نشر و اشاعتِ دعوتِ قرآن و سعیٔ اقامتِ دین و اعلاءِ کلمۃ اللہ!!

یہ فیصلہ جو اِس وقت چند الفاظ میں بیان ہو گیا ہے، اُس وقت کئی ماہ کے مسلسل غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد ہو سکا تھا، جس کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ عقل و فہم کی جملہ صلاحیتیں ماؤف سی ہو گئی تھیں، حتیٰ کہ عارضی طور پر یادداشت بھی بالکلیہ زائل ہو گئی تھی! اور چند ساعتیں تو مجھ پر فی الواقع اس حال میں گزری تھیں کہ ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں، سو یہ بھی کیا معلوم!

لہٰذا اس کے ضمن میں کسی قدر تفصیل مناسب ہے۔

اپنے ذاتی مسئلے میں رہنمائی کے لئے میں نے مکہ مکرمہ میں طواف اور سعی کے دوران بھی قلب کی گہرائیوں سے دعائیں کی تھیں۔ اور پورے ماہ رمضانِ مبارک کے دوران بھی میں مسلسل دعا بھی کرتا رہا تھا اور کسی قدر سوچ بچار بھی کرتا رہا تھا۔ اور اگرچہ رمضان مبارک کی اپنی مصروفیات اور خصوصاً روحانی کیف و سرور نے مسئلے کے حل کی جانب زیادہ متوجہ ہونے کی مہلت نہیں دی تھی، تاہم تحت الشعور میں "پس چہ باید کرد؟" اور "To be or not to be is the question" کی ادھیڑ بن دھیمے انداز میں جاری رہی تھی!

رمضان مبارک کے اختتام پر ایک تو ویسے بھی ایک نوع کے Anti-Climax کی سی کیفیت لازماً پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ خلا کا سا احساس ہونے لگتا ہے اور ایک گونہ اداسی اور افسردگی سی طاری ہو جاتی ہے، اور طیبہ کے رمضان کے بعد تو یہ معاملہ بہت ہی نمایاں تھا — پھر پاکستان کے عام انتخابات میں تمام مذہبی جماعتیں جس طرح چاروں شانے چت ہوئی تھیں اور بڑے بڑے سیاسی اور صحافی پنڈتوں کی پیشین گوئیوں کے بالکل برعکس پاکستان کے مشرقی اور مغربی دونوں خطوں میں خالص سیکولر مزاج کی حامل جماعتوں کو واضح اور مطلق اکثریت حاصل ہو گئی تھی،

اس کا بھی دل و دماغ پر شدید اثر تھا۔ ایسے میں جب ذہن نے توجہ کے پورے ار
کے ساتھ اپنے مسئلے پر غور کرنا شروع کیا' اور ایک جانب معاش اور اہل و عیا
دوسری جانب دین اور اس کی دعوت و تحریک' اور تیسری جانب "عافیتِ جا
راحتِ تن' صحتِ داماں" کے تلخ مگر سنگین حقائق ایک دم ذہن میں تازہ ہو گئے تو
نے بالکل ایسے محسوس کیا جیسے میں پہاڑ تلے آ گیا ہوں۔

ایک بات تو اس عرصے کے کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری غور و فکر کے نتیجے
بالکل قطعی اور دو ٹوک انداز میں سامنے آ چکی تھی ــ یعنی یہ کہ معاش و مطب ا
دعوت و تحریک' دونوں کو میں جس انداز میں گزشتہ پانچ سال کے دوران ساتھ لے
آگے بڑھتا رہا تھا وہ اب مزید جاری رہنا ناممکن تھا اور حالات ایک ایسے فیصلہ
دوراہے پر آ پہنچے تھے کہ "یا چناں کن یا چنیں!" کے انداز میں ایک دو ٹوک فیصلہ لاز
تھا۔

مجھے اپنے سامنے دو راستے واضح طور پر نظر آ رہے تھے جن میں سے کسی ایک
ذہن و قلب کی کامل یکسوئی کے ساتھ اختیار کرنا اور دوسرے کو واضح شعوری فیصلے
ساتھ ترک کرنا ناگزیر ہو گیا تھا:۔

ایک یہ کہ مطب بند کر دوں۔ اور پریکٹس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر اپنے آ
کو ہمہ تن اور ہمہ وقت دعوت اور تحریک کے لئے وقف کر دوں۔ اور معاش
معاملے میں کلیۃً اللہ پر توکّل کروں اور اس یقین کا سہارا لوں کہ : "وَكَاَيِّنْ مِّ
دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ
(العنکبوت : ۶۰) ــ اور

دوسرے یہ کہ دعوت و تحریک کے ضمن میں جتنی پیش رفت ہو چکی ہے اس
بھی کسی قدر پسپائی اختیار کر کے اسے ایک سطح پر منجمد (SEAL) کر دوں' اور ا
اصل توجہ کو مطب اور معاش پر مرتکز کر کے ثانوی درجے میں درس و تدریس کا

ں قدر بھی ہو سکے اس پر اکتفا کر لوں۔
پہلی بات کہنے میں جس قدر آسان تھی' واقعتاً اتنی ہی مشکل اور کٹھن تھی۔ اور
ر چہ بحمد اللہ میرا ذاتی رجحان اسی کی جانب تھا لیکن یہ حقائق بھی پوری شدت کے
تھ پیش نظر تھے کہ مطب کے سوائے معاش کا کوئی ظاہری یا مرئی ذریعہ یا وسیلہ
رے سے موجود نہ تھا' چنانچہ نہ کوئی زمین تھی نہ جائیداد' اور روئے ارضی پر میری
ں "ملکیت" اس مکان کی صورت میں تھی جس میں میں اور میرے اہل و عیال
ائش پذیر تھے' لہٰذا وہ بھی کسی آمدنی کا ذریعہ نہیں بن سکتا تھا' رہی نقد پونجی تو وہ ایک
ر قلیل کے سوا سب کی سب "دارالاشاعت" کے اسٹاکس کی صورت میں جامد
(BLOCK ہو چکی تھی' دوسری جانب میں تنہا نہ تھا بلکہ نو دس افراد کے کنبے کا واحد
یل تھا' پھر تا حال نہ کوئی جماعت تھی نہ تنظیم جس کی جانب سے "کفاف" کی توقع کی
سکے۔ رہا خاندان' تو اس کا شیرازہ بھی بالکل منتشر ہو چکا تھا اور صورت بالکل وہ بن
لی تھی کہ ع "دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا!" ــــ الغرض' یہ تمام تلخ مگر سنگین حقائق
ے اپنے سر پر بالکل "وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ" کی سی کیفیت کے ساتھ معلق نظر
رہے تھے۔ اور ان سب پر مستزاد' اور بعض پہلوؤں سے ان سب سے مشکل سوال
تھا کہ اگر۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

کے مصداق ان تمام حقائق و واقعات کو نظر انداز کر کے چھلانگ لگا دی جائے تو آیا یہ
ین اور شریعت کی رو سے جائز بھی ہو گا یا نہیں؟

رہی دوسری صورت تو یہ آسان بھی تھی اور دنیا کے عام دستور اور چلن کے
موافق بھی ــــ لیکن مجھے یہ صریحاً "خودکشی" کے مترادف نظر آتی تھی۔ اس لئے کہ
یں نے پورے بیس سال قبل اٹھارہ برس کی عمر اور نیم شعوری کے دور میں "فرائضِ

دینی" کے ایک خاص تصور کے مطابق اپنی زندگی کا ایک رخ متعین کر کے سفر کا عملاً آغاز کر دیا تھا۔ پھر جیسے جیسے معلومات میں اضافہ ہوا' اور شعور میں پختگی پیدا ہوتی گئی اس تصور اور رخ کے بارے میں اعتماد اور یقین میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب قرآن حکیم اور سنت و سیرتِ رسول ﷺ تک براہ راست رسائی ہوئی تب تو "وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي" کے مصداق پورا انشراح اور اطمینان حاصل ہو گیا کہ ع "جا ایں جا است!" اور "اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ" — پھر اس ذہنی اور قلبی انشراح کے ساتھ ساتھ بحمد اللہ عملی پیش قدمی بھی جاری رہی تھی۔ چنانچہ زمانۂ طالب علمی میں اسی تصور کے حسنِ معنی کی خاطر خوب سوچ سمجھ کر اور پورے شعوری طور پر اپنے تعلیمی اور پیشہ ورانہ کیریئر کی قربانی کا فیصلہ کیا تھا۔ اور مسلسل بیس برس تک بفضلہٖ تعالیٰ جسم و جان کی بہتر اور بیشتر توانائیاں اسی رخ پر صرف کئے رکھی تھیں۔ (اس میں جو ذرا سی کمی ان تین سالوں کے دوران آئی تھی جو مشترک خاندانی کاروبار میں شمولیت کی صورت میں بسر ہوئے' تو اس کا اصل سبب بھی "سیر عن اللّٰہ اِلی اللّٰہ" کے مانند اسی مقصدِ زندگی کے نام پر دی جانے والی دعوت کے سوا کچھ نہ تھا۔) اور بحمد اللہ اس وقت تک میرا ضمیر بالکل مطمئن تھا کہ بفضلہٖ تعالیٰ میں نہ صرف یہ کہ

"واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں' راحتِ تن' صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی"

کے معیار پر پورا اترا تھا — بلکہ میں نے اپنے تصورات و معتقدات اور زندگی کے رخ اور مقصد کی خاطر "غیروں" کے "ناوکِ دشنام" کے وار بھی خوشدلی سے سہے تھے اور "اپنوں" کے "طرزِ ملامت" کی بھی ہر ادا کو برداشت کیا تھا۔ اور جہاں اپنے موقف کی صحت کے یقین کی بنیاد پر دشمنوں سے جنگیں لڑی تھیں وہاں اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک

تے ہوئے دوستوں اور بزرگوں سے بھی لڑائی مول لی تھی ـــــ لیکن مجھے صاف نظر
رہا تھا کہ اس سب کے بعد اگر اب' جبکہ مجھ پر اللہ کا مزید کرم یہ ہو گیا تھا کہ اُس اللہ
نے اپنی کتابِ حکیم کے ساتھ قلبی انس اور ذہنی مناسبت عطا فرمادی تھی اور نہ صرف
کہ اس کے فہم کے لئے میرے ذہن و قلب کے دروازے کھول دیئے تھے بلکہ اس
ِ تفہیم و تبلیغ کے لئے میری زبان کو بھی رواں کر دیا تھا' محض پیٹ کے ہاتھوں مجبور
کر یا جسم و جان کی صحت و خیریت کی خاطر میں نے اس راہ سے انحراف تو کجا اس کی
جیحات (Priorities) میں کوئی ردوبدل بھی کیا تو میں یقیناً ؏ "میں ہوں اپنی
ست کی آواز!" ـــ اور ؏ "وہ بد نصیب جو گر جائے اپنی آنکھوں سے!" کا مصداقِ
ل بن کر رہ جاؤں گا۔ پھر اس معنوی خود کشی کے بعد محض حیوانی جبلتوں کی خاطر اور
لب جدید طبی اصطلاح کے مطابق "Human Vegetable" کی صورت میں
ندہ رہنا "چہ ضرور؟" گویا ؏ "نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا!" ۔ کسی غیر معروف شاعر
کے یہ دو اشعار مجھے بے حد پسند ہیں :۔

اک تصور کے حسنِ معنی پر
ساری ہستی لٹائی جاتی ہے
زندگی ترکِ آرزو کے بعد
کیسے سانسوں میں ڈھالی جاتی ہے

الغرض' یہ تھی وہ ادھیڑ بن جس میں مَیں رمضانِ مبارک کے بعد شدت کے
ساتھ مبتلا ہو گیا تھا۔ کہ دل پہلی راہ کی جانب کھینچتا تھا اور توکّل و تفویض کی راہ دکھاتا تھا
نفس دوسرے راستے کی طرف رہنمائی کرتا تھا اور ساتھ ہی یہ "رشوت" بھی پیش
کرتا تھا کہ سعودی عرب کی ملازمت اختیار کر لو' تنخواہ بھی اچھی ملے گی' حج اور عمروں
کی سہولت بھی میسر رہے گی' اور حرمین کی نمازوں کے ذریعے اجر و ثواب کے انبار بھی
جمع کیے جا سکیں گے' جن سے کسی نہ کسی حد تک دعوت و اقامتِ دین کی راہ سے پسپائی

اختیار کرنے کی تلافی بھی ہو جائے گی۔ (واضح رہے کہ اُس وقت تک سعودی عرب م
پاکستانی ڈاکٹروں کی مانگ بہت تھی!)

میں اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھا' اور اس شش و پنج نے مجھے بالکل اس کیفیہ
سے دوچار کر دیا تھا جو حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے
ایک حدیث میں وارد ہوئے ہیں' یعنی : "قَدْ اَمْرَضْتَنِی وَاَسْقَمْتَنِ
وَاَحْزَنْتَنِی" ("جس نے مجھے بیمار کر دیا ہے اور نڈھال کر دیا ہے اور غمزدہ کر
ہے۔" حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ایک طویل حدیث میں وارد ہو
ہیں جسے احمدؒ' بزارؒ' نسائیؒ' ابن ماجہؒ' اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذ
نے اسے حدیث حسن قرار دیا ہے!) کہ اچانک لندن سے برادر عزیز ابصار احمد کی ز
دار دعوت موصول ہوئی کہ آپ کے پاس حج تک کافی وقت ہے' کیوں نہ ایک چ
انگلستان کا لگالیں؟ —— میرے دل نے بھی صلاح دی کہ زندگی کا اہم ترین اور مشکا
ترین فیصلہ مسلسل ایک ہی فضا میں رہتے ہوئے کرنے سے بہتر ہے کہ ایک مختلف بلا
مخالف ماحول میں اپنی قوتِ ارادی اور ذہن و قلب کی استقامت و مقاومت کو آزما
جائے —— چنانچہ فوراً پروگرام بن گیا —— اور برادرم صہیب حسن کی معیت میں دو
عمرہ ادا کرتے ہوئے جدّہ آنا ہوا۔ اور وہاں بھی انہی کی رہنمائی میں لندن کے لئے و
کے حصول اور پھر سستے ٹکٹ کی تلاش کے مراحل طے ہوئے' اور غالباً ۱۶/ دسم
۱۹۷۰ء کو میری لندن اور ان کی نیروبی روانگی ہو گئی —— اور غالباً ۱۵/ دسمبر کی سہ پہر
جدہ ہی میں میرے اعصاب پر جو شدید دباؤ پچھلے دو ہفتوں کے دوران رہا تھا' اس
ظہور اس طور سے ہوا کہ مجھے دفعتاً اپنے ذہن میں ایک مہیب خلا محسوس ہوا اور میر
یادداشت بالکلیہ جواب دے گئی۔ چنانچہ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے میری نگاہوں کے سا
کی چیزوں کے سوا ہر شے اور ہر بات میرے ذہن سے اوجھل اور حافظے سے محو ہو
ہے۔ اُس روز چند گھنٹے مجھ پر جس شدید الجھن میں گزرے اس کی یاد ہی سے مجھ پر لر

طاری ہو جاتا ہے — اور میں اللہ کی پناہ مانگنے لگتا ہوں۔ میری اس کیفیت پر برادرم میب حسن بھی سخت پریشان ہوئے، تاہم وہ ہر طرح مجھے سکون پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ رات کی آمد کے ساتھ ہی یہ کیفیت ختم ہو گئی اور میں گویا دوبارہ دنیا میں آگیا۔

ایامِ حج میں میں اپنی اس الجھن کے بارے میں مسلسل غور کرتا رہا جس پر سوچ بچار کو میں نے اسی موقع کے لئے مؤخر کر دیا تھا۔ وہ الجھن یہ تھی کہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے اتنا بڑا فیصلہ کر تو رہا ہوں کہ حصولِ معاش کے واحد ذریعے یعنی مطب کو بند کر دیا جائے درانحالیکہ دوسرا کوئی مرئی اور محسوس و مشہود ذریعہ سرے سے موجود نہیں ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر "اندھے" اعتماد (BLIND FAITH) کے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی — اور یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس پر میرے دل کو مطمئن کر دیا ہے — لیکن ایک پہلو سے میرا یہ فیصلہ "خلافِ قرآن" ہے، اس لئے کہ قرآن مجید نے انسان کی شعوری پختگی کی عمر چالیس سال قرار دی ہے بمصداق آیتِ قرآنی : "حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ...... الآیہ" (الاحقاف : ۱۵) اور میں اتنا بڑا اقدام اس وقت کر رہا ہوں جبکہ ابھی پورے انتالیس سال کا بھی نہیں ہوا۔

یہاں یہ وضاحت مناسب ہے کہ یہ آیۂ مبارکہ اور اس کے حوالے سے یہ خیال کہ انسان کی نفسیاتی اور شعوری پختگی کی عمر چالیس سال ہے، بہت عرصہ سے میرے ذہن میں موجود تھا — چنانچہ نومبر ۱۹۶۵ء میں جب والد صاحب مرحوم کا انتقال ہوا، اور اس صدمے کا غم ہلکا کرنے کے لئے میں نے برادرم وقار احمد کی معیت میں وادیٔ کاغان کا رخ کیا (جس میں میں اپنی پرانی ہلمین کار میں وادیٔ کاغان کے درمیانی مقام جرد تک پہنچ گیا تھا — تو جاتے یا آتے ایک رات کا قیام ایبٹ آباد میں اپنے ایک عزیز

کے مکان پر ہوا ــــ وہ نومبر کی ۲۶ تاریخ تھی اور مجھے اچانک یاد آیا کہ یہ بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کا یوم پیدائش ہے۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ ان دنوں میرے تعلقات ان سے خاصے کشیدہ تھے، میں نے ایبٹ آباد ہی سے انہیں ایک خط تحریر کیا تھا کہ : آج آپ اتالیس سال پورے کر کے چالیسویں میں داخل ہو گئے ہیں، اور یہی ازروئے قرآن انسان کی پختگی کی عمر ہے، لہٰذا آپ ذرا اپنے ماضی اور حال پر دوبارہ نظر ڈالیں ــــ اور غور کریں کہ عنفوانِ شباب میں آپ نے تحریک اسلامی کا دامن کن جذبات اور احساسات اور کن عزائم اور امنگوں کے ساتھ تھاما تھا ــــ اور اب آپ بالکلیہ کن مشاغل و مصروفیات میں منہمک ہیں! ــــ اپنے اس خط میں بھی میں نے پوری آیۂ مبارکہ درج کر دی تھی اور پھر لاہور واپسی پر "میثاق" کے خوشنویس صاحب سے اس کی خوشنما کتابت کرا کے بھی ارسال کر دی تھی۔ اور بعد ازاں اس کا چربہ "میثاق" میں بھی شائع کر دیا تھا۔ (اور اب بھی اس کا عکس اس تحریر کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔)

مزید برآں اسی آیۂ مبارکہ کے حوالے سے میرے ذہن میں بعض اوقات یہ خیال بھی آتا تھا کہ بعض سابق داعیان و خادمانِ دین کی مساعی میں ثبات و استقلال کی کمی کا سبب بھی شاید یہی تھا کہ انہوں نے اپنی دعوت و تنظیم کا آغاز نیم پختہ عمر میں کر دیا تھا۔ چنانچہ آغاز تو بلاشبہ ؏ "دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!" ــــ اور ؏ "آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم!" والا تھا لیکن افسوس کہ انجام بھی ؏ "ہو گئے خاک، انتہا یہ ہے!" سے مختلف نہ ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ خود میں نے اُس وقت تک ایک "داعی" کی حیثیت سے سامنے آنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اور میں اپنی حیثیت واقعتاً قرآن حکیم کے ایک ادنیٰ طالب علم یا زیادہ سے زیادہ خادم کی سمجھتا تھا ــــ اور اُس وقت بھی میرے سامنے اصل مسئلہ کسی نئی دعوت یا جماعت کے آغاز کا نہیں تھا، بلکہ صرف تعلیم و تعلّمِ قرآن

ی ہمہ وقت وہمہ تن خدمت کے لئے مطب کو بند کر دینے کا تھا— لیکن چونکہ یہ بھی
جائے خود ایک بڑا فیصلہ تھا لہٰذا مجھے اس میں تردد اور تذبذب تھا کہ آیا مجھے چالیس
سال کی عمر سے قبل اتنا بڑا اقدام کر گزرنا چاہئے یا نہیں؟

عرفات میں میں نے اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعا کی اور بار بار دعاءِ
ستخارہ کو دہرایا— لیکن تذبذب میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لیکن واپسی پر ایک روز حرم
بیں بیٹھے ہوئے اچانک دماغ میں بجلی سی کوندی اور دفعۃً یہ خیال دل میں آیا کہ قرآن
ی تقویم قمری ہے' اور قمری سال شمسی سال سے دس دن کے قریب چھوٹا ہوتا
ہے— اب جو اپنی عمر کا حساب لگایا تو ہمارے عقدے ایک دم حل ہو گئے' اس لئے کہ
س وقت شمسی حساب سے میری عمر انتالیس برس سے لگ بھگ ڈھائی ماہ کم تھی—
گویا کہ قمری حساب سے میں تقریباً چالیس برس کا ہو چکا تھا!

لہٰذا اسی وقت آخری فیصلہ بھی کر لیا اور اللہ سے عہد بھی باندھ لیا کہ:
'پروردگارا میں عہد کرتا ہوں کہ آج کے بعد سے اپنی توانائیوں یا صلاحیتوں یا اوقات
کا کوئی حصہ تلاشِ معاش میں صَرف نہیں کروں گا— اور اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ
وقت تیری کتابِ مبین اور تیرے دینِ برحق کی خدمت کے لئے وقف رکھوں گا— رہا
میری اور میرے اہل و عیال کی معاش کا معاملہ تو وہ کلیۃً تیرے سپرد ہے۔

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را!!

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

باب سوم

فروری ۱۹۷۱ء سے ستمبر ۱۹۹۲ء تک

"وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاغْنٰى"

کا عکس' اور

"وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ"

کا ظہور و ثبوت

فروری ۷۱ء سے لے کر ان سطور کی تحریر کے وقت تک (۱۰ ستمبر ۱۹۹۲ء) اور آئندہ جب تک اللہ تعالیٰ اس دنیا میں رکھے' یہ ازروئے قرآن حکیم (سورۂ احقاف : ۱۵) میری زندگی کا شعوری بلوغ اور نفسیاتی پختگی کا دور ہے' جس کے شمسی تقویم کے مطابق ساڑھے اکیس' اور قمری حساب سے سوا بائیس برس بیت چکے ہیں (اس لئے کہ میری عمر اِس وقت شمسی حساب سے ساڑھے ساٹھ برس اور قمری تقویم کے مطابق باسٹھ برس ہو چکی ہے![1]) اور اگرچہ میری ذہنی اور قلبی کیفیت تو بہت سے رفقاء و احباب کے علم میں ہے کہ کئی سال سے بالکل یہ ہے کہ ۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے' باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!

اور واقعہ یہ ہے کہ "مسنون عمر" سے زیادہ کی تو ہرگز کوئی آرزو یا تمنا نہاں خانۂ قلب میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے — ہاں' آرزو ہے تو صرف یہ کہ اللہ جب بھی واپس بلائے اپنے خصوصی فضل و کرم سے' جو اب تک بھی زندگی کے ہر سانس کے

---

[1] اور اب اس میں مزید ڈیڑھ سال کا اضافہ ہو چکا ہے۔

ساتھ شاملِ حال رہا ہے' یہ کیفیت بھی عطا فرمادے کہ ع "چوں مرگ آید تبسم برلبِ اوست" "وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیزٍ" تاہم "وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ" کی طرح یہ بھی کسی کے علم میں نہیں ہے کہ واپسی کا اذن کب ہوتا ہے! بہرحال ان اکیس بائیس سالوں کے دوران ـــــ میرے طبعی کسل' جسمانی ضعف اور ہمت کی کمی (بحمد اللہ پستی نہیں!) کے باعث جو کوتاہی اور تقصیر ہوئی اس کے لئے ربِّ جبّار و قہار سے عفو و درگزر کا امیدوار ہوں' اس لئے کہ یہ "وسعت" اور "شاکلہ" بندے کے لئے خالق کی جانب سے موہوب (Given) ہوتا ہے' اور قیامت کے دن حساب کتاب اسی کی نسبت سے ہوگا' بمصداق : "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (البقرہ : ۲۸۶) اور "لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (الانعام : ۱۵۲' الاعراف : ۴۲' المومنون : ۶۲) اور "قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِهٖ' فَرَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰی سَبِیْلًا" (بنی اسرائیل : ۸۴)

اسی طرح اس امر پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہ کسی شعوری اور ارادی ہوسِ جاہ اور طلبِ شہرت سے اس نے بچائے رکھا ہے' اگر تحت الشعور یا لاشعور کی سطح پر ہوسِ اقتدار' طلبِ عزت' خودنمائی کی خواہش' ریاکاری کا جذبہ یا محض انجمن آرائی کا ذوق و شوق کارفرما رہا ہو ـــــ تو اللہ تعالیٰ سے اس کا بھی خواستگار ہوں کہ اپنی شانِ غفّاری و ستّاری کے طفیل عفو و صفح' اور غفر و ستر کا معاملہ کرے اور اس کا بھی کہ اپنے پاس واپس بلانے سے پہلے پہلے میرے باطن کو ان آلودگیوں سے پاک اور صاف کردے: اَللّٰهُمَّ زَکِّ نَفْسِی فَاِنَّکَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰهَا ـــــ اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِی مِنَ النِّفَاقِ وَ عَمَلِی مِنَ الرِّیَاءِ وَ لِسَانِی مِنَ الْکَذِبِ وَ اَعْیُنِی مِنَ الْخِیَانَةِ' فَاِنَّکَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْیُنِ وَ مَا تُخْفِی الصُّدُورُ آمین یا ربَّ العالمین!!

الحمد للہ کہ ... [illegible]

وہ یہ ہے کہ میں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وسط فروری ۱۹۷۱ء سے لے کر آج تک میں نے بحمد اللہ اپنے وقت کا کوئی لمحہ 'اور اپنی قوت اور توانائی کا کوئی شمہ حصولِ معاش کے لئے صَرف نہیں کیا (سوائے ایک چند ماہ کی ایک یا دو گھنٹے روزانہ کی جزوی "ملازمت" کے جو ایک مرتبہ پھر خاندانی مجبوری کے تحت ہوئی) بلکہ "جو کچھ اور جیسا کچھ" واہبِ حقیقی کی جناب سے عطا ہوا تھا اسے امکانی حد تک پورے کا پورا اسی کے کلام اور پیغام کی نشر و اشاعت' اور اسی کے دین کی دعوت و اقامت کی جدّوجہد میں صرف کر کے گویا ع "جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی!" کے مصداق اسی کے قدموں میں ڈال دیا۔ اور "حق" نہ صرف یہ ہے کہ "حق ادا نہ ہوا" بلکہ یہ بھی کہ جس درجہ میں بھی ہوا محض اسی کی توفیق سے ہوا: "وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ" —!

میری زندگی کے یہ اکیس بائیس سال (بلکہ دوبارہ لاہور منتقل ہونے کے بعد سے آج تک کے ستائیس سال[ل]!) کوئی ڈھکی چھپی شے نہیں ہیں' بلکہ بحمد اللہ ایک کھلی کتاب کے مانند ہیں۔ میں نے معروف معنی میں نہ کوئی "آپ بیتی" آج تک لکھی ہے' نہ لکھنے کا ارادہ ہے' لیکن توفیق و تائیدِ خداوندی سے جو کچھ مجھ سے اس عرصے میں بن آیا ہے اس کا ذکر کتابوں میں بھی ہے (بالخصوص "عزمِ تنظیم" اور "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں جو مطبوعہ شکل میں موجود اور دستیاب ہیں' اور تنظیم اسلامی کی "رودادوں" میں جو فی الوقت دستیاب نہیں ہیں) اور "میثاق" اور "حکمت قرآن" کے فائلوں پر مستزاد لاتعداد سمعی اور بصری کیسٹوں میں بھی — اور سب سے بڑھ کر انجمن ہائے خدّام القرآن' قرآن اکیڈمیوں' قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم ایسی ٹھوس حقیقتوں کی صورت میں بھی ہے اور تنظیم اسلامی اور تحریکِ خلافت کی معنوی لیکن فعال اور متحرک حقیقتوں کی شکل میں بھی — لہٰذا مجھے یہاں اپنی

ل جواب لگ بھگ انتیس سال بن چکے ہیں۔

"کارگزاری" کے کسی تذکرے کی کوئی حاجت نہیں ہے، چنانچہ اس وقت اس اکیس بائیس سالہ دور کے بارے میں مجھے صرف اپنے معاشی حالات اور مالی معاملات کا ذکر کرنا ہے، تاکہ ایک جانب "یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ یَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ" (الطلاق : ۲-۳) کی تفصیل سامنے آجائے اور دوسری جانب میرے معاشی معاملات کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں یا کردی گئیں ان کی وضاحت اور ازالہ ہو جائے۔ (چنانچہ یہی پہلو تھا جس کے پیش نظر ۸۸ء والی تحریر کی اشاعت پر تنظیم اسلامی کے بعض اہم رفقاء نے زور دیا تھا، جبکہ خود میں مذبذب ہو گیا تھا!)

۱۔ میں نے جب وسط فروری ۷۱ء میں مطب کے خاتمے اور ہمہ وقت دین کی خدمت کے لئے وقف ہو جانے کا فیصلہ کیا، اس وقت میری کل "مالی کائنات" یہ تھی:

(i) کرشن نگر لاہور میں دس مرلے کا ایک دو منزلہ مکان جو پانچ سال قبل -/۴۵۰۰۰ میں خرید کیا تھا۔ لیکن اب کچھ مرمت اور اضافی تعمیر (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) اور گرانی یا افراطِ زر کے باعث اس کی قیمت ڈیڑھ دو لاکھ ہو چکی تھی۔

(ii) منٹگمری میں لگ بھگ بارہ مرلے کے اس مکان کی "نصف ملکیت" جو الاٹ تو والد صاحب کے نام ہوا تھا لیکن محکمہ بحالیات کو اس کی قیمت میں نے اور بھائی اظہار نے ادا کی تھی۔

(iii) مطب کا ساز و سامان، فرنیچر اور کچھ ادویات کا اسٹاک۔

(iv) "دار الاشاعت الاسلامیہ" کا کتابوں کا اسٹاک جس کی قیمت کا اندازہ چالیس پچاس ہزار کے لگ بھگ ہو گا۔

(v) گھر کا ساز و سامان — اور اہلیہ کا کچھ زیور — اور

(vi) چند ہزار روپے نقد جو گھریلو اخراجات کے لئے چند ماہ تک کفایت کر سکتے تھے!

۲۔ حج سے واپس آتے ہی میں نے دو کام فوری طور پر بلا کسی تاخیر کے کئے:

(i) ادویات اور مطب کا کچھ سامان فروخت کر دیا۔ اور کچھ فرنیچر بعض احباب کو ہدیہ

کردیا اور اس طرح گویا مطب کی واپسی کی "کشتیاں" فوری طور پر جلادیں۔
(ii) دو بچیاں جو پرائمری اسکول میں زیرِ تعلیم تھیں انہیں اسکول سے اٹھالیا۔ اور ان کے لئے صرف گھریلو تعلیم پر قناعت کرلی۔ تاکہ (ا) اخراجات میں کمی ہو۔ اور (ب) وہ اسکولوں کے عام چلن اور فیشن اور خصوصاً استانیوں کے عمومی رجحانات سے اثر پذیر نہ ہوں۔ (دونوں بڑے بیٹے اُس وقت سنٹرل ماڈل ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے اور ان کے معاشی مستقبل کے لئے دنیوی تعلیم ناگزیر تھی۔)

۳ــــ اور اس کے بعد جس کامل یکسوئی کے ساتھ دعوتِ تعلّم و تعلیمِ قرآن اور تحریک رجوع الی القرآن کو آگے بڑھانے میں ہمہ وقت اور ہمہ تن منہمک ہوا' اس کی روداد "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" نامی تالیف میں تفصیلاً موجود ہے ــــ بہرحال اس کا یہ ٹھوس نتیجہ تو ظاہر ہی ہے کہ ایک ہی سال میں "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کا قیام عمل میں آگیا۔

۴ــــ معاشی اور مالی اعتبار سے "فتحِ باب" کی پہلی صورت یہ سامنے آئی کہ غالباً وسط ۷۲ء میں برادرم اقتدار احمد میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ "میں آپ کے ساتھ تعاون کا خواہشمند ہوں!" ــــ جس پر بحمد اللہ میں نے ان سے یہی کہا کہ "اگر تم یہ تعاون صرف بھائی ہونے کے ناتے کرنا چاہتے ہو تو میری غیرت کو گوارا نہیں ہے۔ لیکن اگر میرے مشن میں شرکت کے خواہاں ہو تو جو تعاون کرو گے قبول ہوگا!" ــــ اس پر جب انہوں نے کھلے دل' اور واضح الفاظ میں یقین دلایا کہ صورت واقعتاً دوسری ہی ہے تو میں نے ان کے تعاون کو قبول کرنے کی ہامی بھرلی ــــ چنانچہ انہوں نے:
(ا) ایک جانب اپنی ایک نئی کمپنی (احمد کنکریٹ لیمٹڈ) میں' جس کے تحت ایک کارخانہ لگایا جارہا تھا' کچھ حصص اپنی جانب سے میرے نام کردیئے ــــ اور اس کے سالانہ منافع وغیرہ کے حساب میں مجھے (غالباً) پندرہ سو روپے ماہوار ادا کرنا شروع کردیا۔ (کچھ عرصے کے بعد ان کا یہ ماہانہ "زرِ تعاون" دو ہزار تک بڑھ گیا۔)

(iii) دوسری جانب جیسے ہی مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا مجوزہ خاکہ سامنے آیا اس کے "مؤسسین" میں شرکت اختیار کرلی۔ (انجمن میں بحمد اللہ اسی حیثیت سے عزیزم وقار احمد سلمہ بھی شامل ہوگئے۔ چنانچہ بعد میں جب مؤسسینِ انجمن کے نام حروفِ تہجی کی ترتیب سے درج ہوئے تو یہ خوبصورت شکل سامنے آئی کہ اول نام برادرم اقتدار احمد کا تھا اور آخری عزیزم وقار احمد کا ــــ شاید یہی حکمت ہو اس میں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب بھائیوں میں صرف ایک نام "واؤ" سے شروع کرایا!) بعد میں برادرم اقتدار احمد مع جملہ اہل و عیال تنظیم اسلامی میں بھی شامل ہوگئے!

۵ــــ انجمن کے قیام کے بعد تو صورت حال یکدم اور یکسر تبدیل ہوگئی اور میں اچھا بھلا خوشحال ہی نہیں 'اچھا خاصا" سرمایہ دار" بن گیا۔ اس لئے کہ:

(i) "دار الاشاعت الاسلامیہ" کی بساط لپیٹ دی گئی۔ اور اس کا پورا اسٹاک مکتبہ انجمن نے خرید لیا۔ جس سے میرا منجمد سرمایہ واگذار ہوگیا!

(ii) انجمن نے میرے اصرار کے علی الرغم مجھے ۱۲۔ افغانی روڈ سمن آباد پر واقع اپنے مرکز میں "رہائش، بجلی، پانی، گیس اور فون" کی سہولتیں مفت بہم پہنچادیں (انجمن کے ذمہ دار حضرات بالخصوص شیخ محمد عقیل اور چودھری نصیر احمد ورک تو اس پر بھی مصر تھے کہ میں ایک مہمانداری الاؤنس بھی قبول کرلوں ــــ لیکن میں نے اسے منظور نہیں کیا) چنانچہ میرے ذاتی مکان واقع کرشن نگر کا کرایہ میری صافی (NET) آمدنی بن گیا۔ (یہ پہلے بھائی اظہار کا دفتر رہا۔ پھر کچھ عرصہ بھائی اظہار اور برادرم اقتدار کے مشترک کاروبار کا دفتر رہا۔ اور بعد ازاں برادرم اقتدار کے پاس رہا۔)

۶ــــ اس سے قبل میرے حلقہ ہائے درسِ قرآن کے لئے نقل و حرکت کی سہولت کے لئے ایک سوزوکی وین (VAN) کی خرید کا معاملہ اس طور سے ہوچکا تھا کہ اس کے لئے دس ہزار روپے عزیزم وقار احمد نے دیئے تھے اور پانچ پانچ ہزار روپے برادرم ڈاکٹر محمد یقین، ڈاکٹر ظہیر احمد، اور ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ نے Contribute کئے۔

۷ــــ اسی اثنا میں میں نے اپنے منٹگمری والے مکان کا حصہ بھی بھائی اظہار کے ہاتھ فروخت کر دیا!

۸ــــ اس طرح "مطب بند کر دو گے تو کھاؤ گے کہاں سے؟" کی آزمائش جو لگ بھگ دو سال تک نہایت خوفناک اور لاینحل صورت میں درپیش رہی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے ایک ڈیڑھ سال ہی کے اندر اندر اس طرح تحلیل ہو کر رہ گئی کہ اگر یہ کسی اور کے ساتھ ہوا ہوتا اور وہ مجھے اس کی تفصیل سناتا تو خود میں اسے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا۔

۹ــــ چنانچہ وہ دن اور آج کا دن میں بحمد اللہ عہدِ حاضر کی جملہ سہولتوں سے بقدرِ ضرورت بہرہ ور ہوں، چنانچہ متذکرہ بالا جملہ سہولتیں بھی مجھے مسلسل حاصل رہیں، اور چار پہیوں والی سواری بھی ہمیشہ دستیاب رہی، اور ان میں سے کسی چیز کی کمی کے باعث میرے کام میں کبھی کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوئی۔ ۔ "اِک بندۂ عاصی کی اور اتنی مداراتیں!" کے اس ذاتی تجربہ کے بعد بھی اگر مجھے اللہ کی ربوبیت اور اس کی "يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" والی شان پر یقین اور وثوق و اعتماد نہ ہو تو تُف ہے مجھ پر اور میرے قلب و ذہن پر!!

۱۰ــــ البتہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ میں نے اپنے کھانے پینے اور رہن سہن کے معیار کو کبھی لوئر مڈل کلاس کی سطح سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اور اس معاملے میں میں اپنے خیال کے مطابق تو "اَلْقَصْدُ فِي الْفَقْرِ وَ الْغِنٰى" پر عمل پیرا رہا ہوں، لیکن دیکھنے والوں کو شاید "بخل" کا بھی خیال ہوا ہو، چنانچہ ان وضاحتوں میں غالباً کوئی حرج نہیں ہے کہ (i) میرے گھر میں "دوسرا سالن" اور "سویٹ ڈش" کا تصور صرف کسی مہمان داری یا تقریب کے ساتھ وابستہ ہے، ورنہ عام طور پر صرف ایک سالن پکتا ہے۔ (ii) میں نے ۵۵ء کے بعد سے آج تک ایک پیسہ بھی "فرنیچر" پر خرچ نہیں کیا۔ اور آج بھی ہمارے یہاں وہی پلنگ زیر استعمال ہیں جو میں نے ۵۵ء

ہیں بنوائے تھے۔ چنانچہ میرے گھر میں کوئی جدید "BED" نہیں ہے۔ اور میں خود اس پلنگ پر سوتا ہوں جو ۵۵ء میں بنوایا تھا۔ پہلے اس میں نوار لگی ہوئی تھی۔ جب وہ بوسیدہ ہو گئی تو اسی چارپائی پر لکڑی کا تختہ جڑوا لیا گیا اور وہی میری "استراحت گاہ" ہے — یہ لکڑی کا تختہ میری کمر کی تکلیف کے اعتبار سے بھی ضروری تھا! — وَقِس علیٰ ذالک!! — بہرصورت میں نے یہ احتیاط ہمیشہ برتی کہ اپنے گھریلو اخراجات اپنی "ذاتی آمدنی" (جو ایک عرصہ تک کرشن نگر والے مکان کے کرایہ پر مشتمل تھی) کے اندر اندر محدود رکھے، اور جو "تعاون" برادرم اقتدار احمد کی جانب سے ہوتا رہا اسے جمع کرتا رہا (i) اس نیت کے ساتھ کہ اگر کبھی انجمن یا تنظیم کو کوئی ہنگامی ضرورت پیش آئی تو اس میں صرف کردوں گا — اور (ii) اس خیال کے تحت کہ اگر کبھی برادرم اقتدار احمد کے مزاج میں تبدیلی آجائے اور تعاون کا یہ سلسلہ بند ہو جائے تو مجھے اپنے ذاتی اخراجات میں کمی کرنا دشوار نہ ہو جائے!

۱۱ — ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آگیا اور اس میں شمولیت کی شرائط میں انکم ٹیکس وغیرہ کے معاملات میں بھی شدید پابندیاں عائد ہو گئیں تو میں نے برادرم اقتدار احمد سے کہہ دیا اب میں احمد کنکریٹ کا حصہ دار نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے ان حصص کی نقد قیمت ادا کردی جس سے (i) ماڈل ٹاؤن میں ایک کنال کا قطعۂ زمین خرید لیا گیا۔ اور (ii) میری چار پہیوں والی سواری کی سطح بھی سوزوکی وین سے بلند تر ہو کر ٹویوٹا کرولا کو پہنچ گئی۔

۱۲ — اسی زمانے میں بھائی اظہار احمد اور برادرم اقتدار احمد کا دوبارہ کاروباری اشتراک ہوا اور اس میں برادرم اقتدار کے مطالبے پر از سرِ نو سب بھائی جمع ہوئے تو میں نے حصہ داری اور ڈائریکٹری سے تو کچھ سابقہ تجربے، اور کچھ تنظیم اسلامی کی پابندیوں کی بنا پر معذرت کرلی، البتہ ایک یا دو گھنٹے روزانہ کی جزوقتی ملازمت قبول کر لی۔ جس کا مشاہرہ چار ہزار روپے ماہانہ مع "ڈرائیور سمیت کار" تھا۔ اور اس طرح یہ

چند ماہ پھر ایک طرح کی "عیاشی" میں بسر ہوئے۔

۱۳۔۔۔ آج سے چار پانچ سال قبل جب برادرم اقتدار احمد نے بھی اپنا نیا دفتر (واقع لوئر مال) تعمیر کر لیا تو میرے کرشن نگر والے مکان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اسے کسی دوسرے شخص کو کرائے پر دے کر مستقل دردِ سر مول لینے پر آمادہ نہیں تھا' لہٰذا کچھ عرصے تک تو برادرم اقتدار احمد اسے خالی رکھ کر بھی کرایہ ادا کرتے رہے لیکن پھر میرے کہنے پر انہوں نے اسے فروخت کر دیا (اس معاملے میں بھی یہ واقعہ بہت سبق آموز ہے کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں اس مکان کے چھ لاکھ روپے لوں گا' چنانچہ انہوں نے ایک گاہک سے اتنی ہی رقم میں سودا طے کر لیا۔ لیکن جب رجسٹری کا مرحلہ آیا تو خریدار نے اسٹامپ ڈیوٹی کے خیال سے کم قیمت کی رجسٹری کرانی چاہی' جس پر میں نے انکار کر دیا۔ اور اس طرح برادرم اقتدار احمد درمیان میں پھنس گئے کہ ایک جانب مشتری سے وعدہ کر لیا تھا اور دوسری جانب بائع یعنی مجھ سے چھ لاکھ کی کمٹمنٹ تھی۔ چنانچہ انہوں نے رجسٹریشن فیس میں غالباً چالیس ہزار روپے اپنی جیب سے ادا کر کے پورے چھ لاکھ ہی کی رجسٹری کرائی۔۔۔ چنانچہ اتنی رقم کی رجسٹری کرشن نگر کے دس مرلے کے مکان کی شاید ہی کبھی کوئی اور ہوئی ہو۔!)

۱۴۔۔۔ ماڈل ٹاؤن کا متذکرہ بالا ایک کنال کا پلاٹ۔۔۔ اور کرشن نگر کے مکان سے حاصل شدہ چھ لاکھ روپے اب قرآن اکیڈمی کے بالمقابل واقع مکان کی صورت اختیار کر چکے ہیں جو دو منزلوں میں تین تین کمروں کے چار فلیٹوں کی صورت میں ہے جو میں نے اپنے چاروں بیٹوں کو ہبہ کر دیئے ہیں۔ (اگرچہ ماڈل ٹاؤن سوسائٹی میں غالباً پورا مکان عزیزم عارف کے نام ہے۔)

۱۵۔۔۔ لیکن اس کی تفصیلی اور عملی صورت یہ ہوئی ہے کہ جو رقم میرے پاس برادرم اقتدار کے "ماہانہ زرِ تعاون" کے ذریعے جمع ہوئی تھی اس سے میں نے اپنی پانچوں بیٹیوں کے نام ان ہی کی ایک فیکٹری میں حصص خرید دیئے (جس کے بارے میں

ں نے یہ فیصلہ واضح طور پر کر لیا تھا کہ اس کے حسابات بالکل درست رکھے جائیں
'خواہ کچھ بھی ہو جائے!) اور ان کی مالیت سے دگنی رقم تو میں نے متذکرہ بالا فلیٹوں
ضمن میں بیٹوں کو بھی ہبہ کر دی تھی' بقیہ ان کے ذمہ قرض تھا' جو وہ اب قسط وار
ر رہے ہیں جس سے میرا گھریلو خرچ چل رہا ہے!

- قیامت کے روز جو پانچ سوال (ایک حدیث کی رو سے) ہر انسان سے کئے جانے
لے ہیں ان میں سے دو مال سے متعلق ہوں گے یعنی "وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَیْنَ
تَسَبَهٗ وَفِیْمَا اَنْفَقَهٗ" کہ کہاں سے کمایا تھا اور کہاں خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ اس
کے حساب کی سختی سے بچا کر "حِسَابًا یَسِیْرًا" کے دامن میں پناہ دے دے ---
اپنی دعوتی' تحریکی اور تنظیمی زندگی کا یہ "حسابِ کم و بیش" آج اس لئے علیٰ
ں الاشہاد پیش کر دیا ہے کہ (i) اپنوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کا موقع
ان کو حاصل نہ رہے --- اور (ii) غیروں اور دشمنوں کو بھی جھوٹی الزام تراشی
تہمت طرازی پر کچھ شرم تو محسوس ہو!

بہرحال' اپنے اور غیر سب کان کھول کر سن لیں : اس پوری دنیا میں متذکرہ بالا مکان کے سوا جو اَب اصلاً میرے بیٹوں کی ملکیت ہے' میرا نہ کوئی مکان ہے نہ دکان' نہ کوئی پلاٹ ہے نہ فلیٹ' نہ کسی کمپنی میں کوئی حصہ ہے نہ کسی بھی قسم کے دوسرے حصص' نہ میرے پاس کوئی سرٹیفکیٹ ہیں نہ بانڈز ---- اور میری کُل جائیداد یا تو گھر کا ساز و سامان ہے' یا ایک پرانی کار! بینک میں میرے واحد ذاتی (کرنٹ) اکاؤنٹ میں آج کی تاریخ میں کُل ۷۴۴۸ روپے جمع ہیں[1]' اس کے علاوہ اہلیہ کے پاس بھی صرف کچھ تھوڑی سی پس انداز کی ہوئی نقدی

---

[1] اور آج ۹/ مئی ۹۳ء کو وہ بھی صرف -/۱۴۵۹ رہ گئے ہیں۔

ہے، اور پانچ تولے سے بھی کم سونے کا زیور[1] مزید بر آں، اب کوئی ماہانہ "زرِ تعاون" بھی کسی بھائی کی جانب سے مجھے نہیں ملتا!!

۱۷— الحمد للہ کہ بروقت یاد آگیا کہ — دو "جائیدادیں" ایسی بھی ہیں جو قانوناً میری "ملکیت" ہیں لیکن حقیقت میں "وقف" ہیں اور میں ان کا صرف متولی ہوں :-
(ا) گڑھی شاہو میں واقع عمارت جس میں تنظیم اسلامی کے مرکزی دفاتر بھی قائم ہیں اور میرے داماد ڈاکٹر عبد الخالق اور تنظیم کے معتمد چودھری غلام محمد صاحب کی رہائش بھی (اس کا پلاٹ مجھے حاجی عبد الواحدؒ نے ہبہ کیا تھا اور اس کی تعمیر میں اگرچہ بعض دوسرے رفقاء نے بھی حصہ لیا، لیکن اس میں غالب صَرف برادرم اقتدار احمد ہی کا تھا)۔ اور (ii) کراچی میں فلیٹ نمبر ۱۱- داؤد منزل، فریئر روڈ، جس میں تنظیم اسلامی حلقہ سندھ کا دفتر قائم ہے۔ جس کی ملکیت "تام" نہیں، صرف پگڑی کی مالیت تک محدود ہے۔ اس کی خرید میں بڑی رقم سیٹھ عثمان صاحب کی تھی جس کا وعدہ انہوں نے مجھ سے ٹورنٹو (کینیڈا) میں کیا تھا۔ کچھ حصہ بعض رفقاء تنظیم کا تھا۔ اور کچھ خرچ اس پرائیویٹ اکاؤنٹ سے ہوا تھا جس کا ذکر نمبر ۱۹ میں ہوا ہے!

۱۸— یہ بیان نامکمل بھی رہے گا، اور حق تلفی بھی ہوگی اگر عزیزم وقار احمد سلّمہ کے مالی تعاون کا بھی ذکر یہاں نہ ہو جائے۔ کاروباری اعتبار سے ان کی زندگی میں اس اعتبار سے بہت "آمد و رفت" رہی ہے کہ میرے Q.C.C سے علیحدہ ہو جانے کے بعد کچھ عرصہ وہ برادرم اقتدار کے ساتھ رہے، پھر کچھ عرصہ بھائی اظہار کے ساتھ رہے، پھر دوبارہ اقتدار کے پاس آگئے، پھر دوسری بار کے کاروباری اشتراک میں شامل ہو گئے، اور بھائی اظہار اور اقتدار کی علیحدگی کے بعد ایک بار پھر کچھ عرصہ بھائی

---

[1] اور وہ بھی حال ہی میں سب سے چھوٹے بیٹے عزیزم آصف حمید کی جانب سے ان کی دلہن کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے! چنانچہ اب بحمد اللہ میری اہلیہ کے پاس بھی سوائے کانوں کی مختصر سی بالیوں اور ہاتھوں کی دو چوڑیوں کے اور کوئی طلائی زیور نہیں ہے!

رے ساتھ رہے اور پھر بالآخر بالکل آزاد ہو گئے — ان مختلف ادوار میں ان کے
ے ساتھ تعاون کی صورتیں مختلف رہیں۔ مثلاً (۱) میرے ۷۱-۷۰ء کے آمدو
، حجاز مقدس کا ٹکٹ انہوں نے ہی خرید اتھا' (۱۱) جیسے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے
سوزوکی وین کی خرید میں دس ہزار ان کے شامل تھے۔ (۱۱۱) پھر میرے تنظیم
ی کے سلسلے میں طویل اسفار کے لئے نسان ویگن بھی ڈیڑھ لاکھ روپے میں انہوں
ی خرید کر دی تھی (وہ خود بھی تنظیم میں شامل تھے!) (۱۷) اس کے بعد مختلف
ع پر وہ کچھ زکات کی رقوم مجھے دیتے رہے تاکہ اپنی صوابدید کے مطابق ان کے
ی کی حیثیت سے خرچ کر دوں (۷) اب آخر میں میری پرانی ٹویوٹا کار کو نسبتاً بہتر
ے تبدیل کرنے کے لئے بھی انہوں نے ایک لاکھ روپیہ پیش کیا تھا جو میں نے قبول
یا تھا!

- ایک مزید اہم بات یہ کہ عزیزم وقار کی طرح بعض دوسرے حضرات بھی کچھ
م مجھے خالص ذاتی طور پر دیتے رہے ہیں کہ اپنی صوابدید کے مطابق دین کے کام
خرچ کر دوں' جن کے ذریعے میں بعض رفقاء و احباب کی ذاتی ضرورتیں بھی وقتاً
پوری کر دیتا ہوں' اور بعض حضرات کے لئے قرضِ حسنہ کی صورت بھی اختیار
تا ہوں۔ اور اس کا کُل حساب ذاتی طور پر میرے ہی پاس ہے جس کا نہ انجمن خدام
رآن سے کوئی تعلق ہے نہ تنظیم اسلامی سے۔

ب- مالی حساب کتاب کے ضمن میں یہ آخری بات بھی ہرگز کم اہم نہیں ہے کہ
رے بیرون پاکستان اسفار پر جو بہت سے لوگوں کے لئے صرف حیران کن ہی نہیں
رعوب کن بھی ہیں آج تک کوئی ایک پیسہ بھی نہ انجمن خدام القرآن لاہور کا صرف
ا ہے نہ تنظیم اسلامی کا — یہ سارا خرچ وہ لوگ برداشت کرتے ہیں جو مجھے مدعو
رتے ہیں! — اسی طرح میرا آج تک نہ کوئی حج سرکاری خرچ پر ہوا ہے نہ عمرہ'
لادر آں ان پر کبھی کوئی رقم نہ تنظیم کے بیت المال سے خرچ ہوئی ہے نہ انجمن کے'

بعض حج اور اکثر عمرے تو امریکہ جاتے آتے بغیر کسی اضافی خرچ کے ہو گئے اور صرف ایک بار ایک سفرِ حجاز کلیۃً ایک رفیق ڈاکٹر شجاعت علی برنی کے خرچ پر ہوا! اس لئے کہ اس کے لئے خصوصی دعوت ذاتی طور پر ان ہی کی جانب سے تھی! اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل و کرم سے جس درجہ بچائے رکھا ہے' اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ ۸۰ء میں' میں امریکہ میں تھا جب سابق صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق مرحوم کا U.N.O. کی جنرل اسمبلی سے خطاب کا پروگرام بنا۔ انہوں نے سفارت خانوں کے ذریعے مجھے تلاش کرا کے یہ پیغام (جو مجھے مانٹریال' کینیڈا میں ملا) دیا کہ آپ امریکہ ہی سے سرکاری وفد میں شرکت پسند کریں گے یا واپس آ کر یہاں سے شریک ہو سکیں گے۔ جس پر میرا جواب تھا: "کسی صورت میں بھی نہیں!" — چنانچہ میں اس اجلاس میں "سامع" کی حیثیت سے تو موجود تھا لیکن "سرکاری وفد" کے رکن کی حیثیت سے نہیں!

۲۱— اوپر چونکہ آخری کا لفظ استعمال کر چکا ہوں' لہٰذا اب اسے تتمہ قرار دے لیں کہ میں نے انجمن خدام القرآن لاہور سے جو سہولتیں حاصل کیں وہ کلیۃً یک طرفہ نہیں ہیں' اس لئے کہ مکتبہ انجمن کو جو نفع میری تصانیف اور تالیفات' اور آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کے ذریعہ ہو تا رہا ہے وہ انجمن کے حسابات سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور اس حساب میں کبھی کوئی ایک پیسہ بھی میں نے وصول نہیں کیا۔ اور بحمد اللہ میری کسی رائلٹی کی کوئی وراثت ایسی نہیں ہے جو میری اولاد کو منتقل ہو!

۲۲— ایک مزید تتمہ یہ کہ — میں نے شادی بیاہ کی رسومات کے خلاف جو جہاد شروع کیا اس کا یہ نقد فائدہ مجھے حاصل ہوا ہے کہ اپنی کسی بچی کی شادی پر مجھے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا پڑا (سوائے اطلاع عام کے لئے جو اخباری اشتہار شائع کیا گیا اس کے رعایتی معاوضے کے!) — البتہ بیٹوں کی شادیوں پر مہر اور ولیمہ دونوں پر کچھ خرچ ہوا۔ جس کا انتظام اللہ تعالیٰ نے پاکستان ٹی وی کے ذریعے کرا دیا — (اگرچہ یہ دا

ہے کہ ٹی وی پروگراموں کا یہ معاوضہ جبری تھا' ورنہ میرا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے کوئی
ضہ نہ دیا جائے' لیکن جب بات یہاں تک پہنچ گئی کہ اس صورت میں پروگرام ہو
نہیں سکتا تب مجھے ماننا پڑا — اور یہ غالباً اس بنا پر تھا کہ اس صورت میں وہ پروگرام
ی ملکیت قرار پاتے جو کارپردازانِ ٹی وی کارپوریشن کو منظور نہ تھا)
ا— اب حقیقتاً آخری بات یہ کہ مجھے "جنگ" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ
ں میر خلیل الرحمٰن مرحوم نے جبراً دیا تھا' جس کا ایک حصہ میں شیخ جمیل الرحمٰن
حب کو دیتا رہا۔ اس لئے کہ وہ ان کی تسوید و تبییض میں مدد کرتے تھے — آج کل جو
امین "نوائے وقت" میں شائع ہو رہے ہیں وہ خالص بلامعاوضہ ہیں!

بقیہ : الھدٰی

ں بھی آیا چاہتا ہے۔ یہ گویا پیشگی خبر تھی غزوۂ بدر کی جو نقطۂ آغاز ہے ایک طویل سلسلۂ
ل کا جس کے پہلے مرحلے کا اختتام ہوتا ہے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں سفر تبوک
۔ اب ان شاء اللہ آئندہ اس منتخب نصاب کے حصہ پنجم میں صرف ایک تقریر میں کوشش
ی جائے گی کہ اس پورے سلسلۂ قتال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے۔ وآخر دعوانا
نِ الحمد للہ رب العٰلمین!!

قرآن کالج ــــ بعض اہم فیصلے

قرآن کالج سے دلچسپی رکھنے والے قارئین تک یہ اطلاع یقیناً پہنچ چکی ہو گی کہ آئندہ تعلیمی سال سے کالج میں ایف۔ اے تربیتی سال ختم کر دیا جائے گا اور لاہور بورڈ کے نصابی مضامین کے ساتھ کالج کے اضافی مضامین کی بھرپور تدریس ان شاء اللہ دو سال ہی میں مکمل کی جائے گی۔ اس طرح اس سال میٹرک پاس کرنے والے جو طلبہ قرآن کالج میں داخلہ لیں گے وہ دو سال میں ایف اے کر سکیں گے۔ قرآن کالج کے بورڈ آف گورنرز نے اپنے حالیہ اجلاس میں دو مزید اہم فیصلے کئے ہیں جن سے ہم اپنے قارئین کو مطلع کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

آئندہ تعلیمی سال سے اگر اللہ نے چاہا تو قرآن کالج میں ایم۔ اے معاشیات اور ایم۔ اے عربی کی تدریس کا آغاز ہو جائے گا۔ پروگرام یہ ہے کہ ان شاء اللہ جولائی ۹۴ء کے آخر میں ایم۔ اے کی کلاسوں میں داخلہ دیا جائے گا اور اگست ۹۴ء میں تدریس کا باقاعدہ آغاز ہو گا۔ یہ بات بھی طے کی گئی ہے کہ ایم اے کلاسوں میں داخلہ صرف ڈے سکالرز کو دیا جائے گا' تاہم قرآن کالج ہی سے گریجویشن کرنے والے طلبہ اس قاعدے سے مستثنیٰ ہوں گے۔

آئندہ تعلیمی سال سے ان شاء اللہ العزیز بی۔ اے سالِ اول اور سالِ دوم میں دیگر نصابی اور اضافی مضامین کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کی ابتدائی تعلیم (application packages) کا سرٹیفکیٹ کورس بھی مکمل کروایا جائے گا۔ اس طرح قرآن کالج سے گریجویشن کرنے والے طلبہ کو کمپیوٹر کی مبادیات سے بھی بخوبی واقفیت حاصل ہو سکے گی۔ واضح رہے کہ کمپیوٹر کے سرٹیفکیٹ کورس کے لئے نہ تو طلبہ سے کوئی اضافی فیس لی جائے گی اور نہ ہی ان کی ٹیوشن فیس میں کوئی اضافہ کیا گیا ہے' البتہ "لیب" (LAB) چارجز کے طور پر ان طلبہ کو ۵۰ روپے ماہانہ ادا کرنے ہوں گے۔ ایم۔ اے کی کلاسوں میں داخلہ لینے والے طلبہ کو بھی اجازت ہو گی کہ وہ لیب چارجز ادا کر کے کمپیوٹر کے سرٹیفکیٹ کورس میں شمولیت کر سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے حلقہ احباب میں نہ صرف قرآن کالج کو متعارف کروائیں گے بلکہ مذکورہ بالا فیصلوں سے بھی انہیں آگاہ کریں گے۔ مزید تفصیلات جاننے کے خواہش مند حضرات درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں:

قرآن کالج' ۱۹۱۔ اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور۔ فون ۵۸۳۶۳۷

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد کرو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۳

شمارہ: ۷

صفر المظفر ۱۴۱۵ھ

جولائی ۱۹۹۴ء

فی شمارہ -/۷

سالانہ زرِ تعاون -/۷۰

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۴۵ سعودی ریال یا ۱۲ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔	۱۶ امریکی ڈالر
شمالی و جنوبی امریکہ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۲۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر۔	۹ امریکی ڈالر

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰۔ فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال

پاکستان کا سرکاری نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے اور یہ ایک ایسا ملک ہے جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا اور جہاں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے' لیکن کیا پاکستان کو ایک اسلامی ملک یا اسلامی ریاست قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا پاکستان میں اس وقت اسلامی آئین نافذ ہے؟ یہ وہ الجھاؤ ہے جو ہر اس شخص کو بے چین کئے رہتا ہے جو دین کو یہاں سربلند دیکھنا چاہتا ہے اور غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد میں سرگرمِ عمل ہے۔ مسلمانانِ پاکستان کا ایک بڑا حصہ تو وہ ہے جسے دین و مذہب سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے اور اس کے لئے یہ سوال ہی بے معنیٰ ہے کہ کیا ہم پاکستان کے آئین کو اسلامی آئین قرار دے سکتے ہیں یا نہیں! انہیں تو محض اپنے دنیاوی مفادات سے غرض ہے اور بس! — البتہ ایک قابلِ قدر حصہ جو اگرچہ تعداد کے اعتبار سے پہلے حصے کے مقابلے میں بہت کم ہے' ایسا ضرور موجود ہے کہ جو دین و مذہب سے لگاؤ رکھنے والا ہے' اگرچہ اس طبقے کی بھی ایک بڑی اکثریت دین کے ساتھ محض زبانی کلامی وابستگی کے اظہار ہی کو بہت کافی سمجھتی ہے' ان کے ہاں عمل کا خانہ بالکل الگ ہے جس کا ان کے عقیدے اور ایمان سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ ان سب کے بعد تو ایک نہایت قلیل اقلیت ہی بچتی ہے جنہیں ہم باعمل مسلمان کہہ سکتے ہیں۔ ان میں بھی ایک واضح تقسیم موجود ہے اور وہ یہ کہ ان ہی کے ایک طبقے نے جو یقیناً عددی اعتبار سے بڑا ہے' دین کو مذہب کا درجہ دے رکھا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام تو محض انفرادی زندگی کا دین ہے' اجتماعی نظام سے اس کا کیا تعلق! — انسان بس اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال لے' دوسروں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئے تو یہ بہت کافی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر وہ انہی تعلیمات کی دوسروں کو بھی' اپنی انفرادی حیثیت میں' دعوت دیتا رہے یا دینی علوم کے سیکھنے سکھانے میں لگ جائے تو سونے پہ سہاگہ — باقی رہی یہ بحث کہ اللہ کی زمین پر اللہ ہی کے نظام کو غالب و نافذ ہونا چاہئے اور اس کے لئے ہمیں کوئی اجتماعی جدوجہد کرنی چاہئے اور جہاد و مجاہدے کی راہ اختیار کرنی چاہئے' ان کے نزدیک بالکل غیر متعلق ہے۔ تاہم دوسرا طبقہ فی الواقع اسلام کو محض مذہب نہیں' دین سمجھتا ہے۔ اللہ کے دین کو محمد مصطفیٰ ﷺ کے لائے ہوئے نظام کو' اللہ کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو پورے سسٹم پر قائم و غالب کرنا ان کا ہدفِ اولین ہے۔ چنانچہ اس کے لئے تن من دھن سے جدوجہد کرنے اور جان و مال کا ایثار کرنے کو وہ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کے مطابق ایمان کی شرطِ لازم قرار دیتے ہیں جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے :

"مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائیں اللہ پر اور اس کے رسول پر' پھر شک میں نہ پڑیں اور وہ جہاد کریں اپنے اموال کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں' یہی وہ لوگ ہیں جو راست باز ہیں (جو اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں)"

بدقسمتی سے ہمارے علماء کرام کی ایک بڑی اکثریت بھی عملاً اس طبقے میں شامل نظر آتی ہے جن کا تصورِ اسلام مذہب تک محدود ہے۔ دینِ حق کی مغلوبیت اور باطل نظام کا غلبہ انہیں بالعموم مشوش و پریشان

نہیں کرتا، وہ اپنے جمعہ و نماز کی امامت اور دینی علوم (جس میں اصل زور فقہ اور فقہی مسائل پر ہے) کے درس و تدریس میں مگن ہیں، وہ اس بات پر قانع ہیں کہ لوگ ان سے مسئلے مسائل پوچھ لیا کریں اور نکاح پڑھانے اور نماز جنازہ کی امامت کے لئے ان سے رجوع کر لیا کریں۔ دین کو بحیثیت ایک مکمل نظام کے نافذ و غالب کرنے کے لئے اجتماعی مساعی کی کوئی ضرورت و اہمیت وہ بالعموم محسوس نہیں کرتے۔ الا ماشاء اللہ۔ تاہم دینی علوم کے وارث ہونے کی حیثیت سے علماء کرام کا جو مثبت اور مفید کردار ہے اسے کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انہی علماء میں وہ بھی ہیں جنہوں نے آزادی اور حریت کی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا اور وہ بھی ہیں کہ جو غلبہ و اقامتِ دین اور منصبِ امارتِ شرعیہ کے لئے عملی جدوجہد میں پیش پیش رہے — علماء کرام کے بارے میں ہمارے تاثرات میں ایک خوشگوار حیرت کا اضافہ حال ہی میں شائع ہونے والی ایک کتاب کے ذریعے ہوا جس کا عنوان ہے: "مغربی پارلیمانی طریق انتخاب۔ علماء امت کی نظر میں"۔ یہ کتاب تحریک اسلامی انقلاب پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے جس کا مرکزی دفتر کراچی میں ہے۔ کتاب شائع کرنے والے ادارے کا جو پتہ مطبوعہ موجود ہے وہ ہم بھی درج کئے دیتے ہیں: مرکزی دفتر تحریک اسلامی انقلاب، نزد قمرالعلوم فریدیہ، ماری پور روڈ، کراچی، فون ۷-۲۰۵۱۱۔

یہ کتاب دراصل ایک دلچسپ سوال نامے کے گرد گھومتی ہے، جو ۸۸ء کے انتخابات سے قبل استفتاء کی صورت میں مختلف علماء کرام کو ارسال کیا گیا اور پھر ان کے جو جوابات موصول ہوئے انہیں کتابی صورت دے دی گئی۔ استفتاء میں شامل سوالات حسب ذیل ہیں: (i) کیا اس وقت پاکستان میں اسلامی آئین نافذ ہے؟ (ii) اسلامی آئین کے نفاذ کی شرعی حیثیت اور ضرورت کیا ہے؟ (iii) اگر کسی ملک میں اسلامی آئین نافذ نہیں تو اس ملک کے عوام اور علماء پر ازروئے شرع کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، نیز اس ذمہ داری سے عہدہ برآنہ ہونے کی صورت میں ان کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ (iv) اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد کرنا اور تحریک چلانا کس قدر ضروری ہے؟ (v) اگر کسی اسلامی ملک کا سربراہ اسلامی آئین نافذ نہیں کرتا تو اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے، نیز اس سے تعاون یا اس کی مخالفت کرنا ازروئے شرع کیسا ہے؟ اور (vi) کیا مروجہ طریق انتخاب اسلامی ہے یا نہیں؟ — ان تمام سوالات میں ہماری دلچسپی ظاہر ہو رہی ہے۔ تحریک اسلامی انقلاب پاکستان کی جانب سے جن علماء کو یہ سوالنامہ بھیجا گیا وہ تقریباً سب بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ہمیں یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ دین اسلام کے بارے میں ان علماء کا فکر بالکل واضح ہے اور اسلام کے انقلابی فکر سے ان میں سے بعض کی نگاہیں خواہ وقتی طور پر ہٹ گئی ہوں لیکن سوالات کی صورت میں جب انہیں اس جانب توجہ دلائی گئی تو انہوں نے وہی جوابات تحریر فرمائے جو اسلام کے حقیقی انقلابی فکر سے ہم آہنگ ہیں اور جن کو اجاگر کرنے کے لئے تنظیم اسلامی اور اس کے امیر بھرپور طور پر کوشاں ہیں۔ کتاب میں بہت سے علماء کے جوابات شائع کئے گئے ہیں، سردست ہم ان میں سے صرف ایک عالم دین، صاحبزادہ سید محمد جمال الدین کاظمی کی جوابی تحریر زیر نظر شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔

تقسیمِ ہند: برطانوی منصوبہ یا الٰہی تدبیر؟
اور
پاک بھارت کشیدگی: انگریز کی گھناؤنی سازش

ڈاکٹر اسرار احمد

ہندوستان کی تقسیم: برطانوی منصوبہ یا الٰہی تدبیر؟

روزنامہ جنگ لاہور کی ۲۳/ مارچ ۹۴ء کی اشاعت میں صفحہ اول پر تین کالمی سرخی کے ساتھ ایک بھارتی مسلمان دانشور دانیال لطیفی صاحب کی بعض آراء پر مشتمل خبر شائع ہوئی تھی جس کی جلی سرخی یہ تھی: "قائداعظم اور گاندھی متحدہ ہندوستان چاہتے تھے 'انگریز نے تقسیم پر مجبور کر دیا'" اس کے بعد ذیلی سرخی یہ تھی کہ: "کشیدگی ختم کرنے کے لئے وہ زہر نکالا جائے جو انگریزوں نے دو سو سال پہلے انجیکٹ کیا تھا — قائداعظم کے قریبی ساتھی اور ۴۰ء کے منشور کے مصنف سے خصوصی انٹرویو۔" اس کے بعد نیوز رپورٹر کے حوالے سے خبر کا پورا متن حسب ذیل تھا:

"مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کے منشور کے مصنف اور قائداعظم کے قریبی ساتھی دانیال لطیفی نے کہا ہے برصغیر کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم میں بندر بانٹ کی تاکہ دونوں ملک آپس میں لڑتے مرتے رہیں اور اُس وقت کی سپرپاور برطانیہ دوبارہ ہندوستان پر قابض ہو جائے۔ برطانیہ کے زوال کے باعث اگرچہ ماؤنٹ بیٹن کا خواب پورا نہ ہو سکا لیکن دونوں ممالک کے سیاسی لیڈر اپنے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے عوام کو گمراہ کرتے رہے۔ حقیقت کچھ اور تھی اور بتایا کچھ اور جاتا رہا۔ وہ مسلم لیگی رہنما عمر قصوری کی صاحب زادی اور سابق وفاقی وزیر خورشید قصوری کی بھتیجی کی

رسم حنا کے موقع پر "جنگ" کے انجم رشید، رمان احسان اور امین حفیظ پر مشتمل خصوصی پینل کو انٹرویو دے رہے تھے۔ ۷۷ سالہ بیرسٹر دانیال لطیفی نے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم سے قائداعظم اور گاندھی دونوں خوش نہ تھے مگر دونوں بے بس تھے اور یہ تقسیم قبول کرنے پر مجبور تھے۔ دونوں لیڈر متحدہ آزاد ہندوستان چاہتے تھے لیکن انگریزوں نے حالات ہی ایسے بنا دیئے۔ ایک سوال پر انہوں نے کہا قائداعظم اسلامی سیکولر پاکستان چاہتے تھے جس میں مکمل جمہوریت ہو اور تمام مذاہب کے لوگوں کو مکمل آزادی ہو۔ انہوں نے کہا سیکولر کا آئیڈیا اسلام سے لیا گیا ہے اور قائداعظم اس سلسلہ میں اس حدیث پر یقین رکھتے تھے (ترجمہ) : "مظلوم کی پکار سے ڈرو، چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔" انہوں کہا انڈیا اور پاکستان میں کشیدگی ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس زہر کو نکالا جائے جو انگریزوں نے دو سو سال کے دوران دونوں قوموں کی رگوں میں "انجیکٹ" کیا ہے۔ دونوں ملک متحد ہوں یا نہ ہوں، نفرتوں کی دیوار ختم ہونی چاہئے۔ انہوں نے کہا میں قیام پاکستان کے وقت ہجرت کے حق میں نہ تھا۔ اس موقع پر ہونے والی لاکھوں افراد کی قتل و غارت کا ذمہ دار ماؤنٹ بیٹن تھا۔ اس نے بدمعاشی کی اور ہجرت کے بارے لارڈ ویول کے پلان کو تبدیل کر دیا۔"

تو اگرچہ نبی اکرم ﷺ کا قولِ مبارک تو یہ ہے کہ : "یہ نہ دیکھا کرو کہ بات کہنے والا کون ہے، بلکہ یہ دیکھا کرو کہ اس نے کہا کیا ہے!" تاہم اس قسم کی آراء کو، جیسی کہ اس انٹرویو میں سامنے آئی ہیں، اس مسلّمہ قانون کے ذیل میں شمار کیا جانا چاہئے کہ "بعض حالات میں استثنائی مثالوں سے قاعدہ کلیہ مزید ثابت اور محکم ہو جاتا ہے۔" لہٰذا ان آراء پر تبصرہ کرنے سے قبل "صاحبِ رائے" کی شخصیت کا کسی قدر تعارف حاصل کر لینا ضروری ہے۔ خاص طور پر اس لئے کہ پاکستان کے عوام کی عظیم اکثریت نے یہ نام پہلی بار سنا ہے۔ چنانچہ خود میرا اپنا حال یہ ہے کہ اگرچہ میں ۴۷ء

۱۹۴۶ء کے دوران میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا فعال کارکن تھا' یہاں تک کہ ۱۹۴۶ء میں فیڈریشن کا جو اہم اجلاس حبیبیہ ہال' اسلامیہ کالج' ریلوے روڈ' لاہور میں منعقد ہوا تھا' جس سے قائداعظم نے بھی خطاب فرمایا تھا' اس میں ضلع حصار سے شرکت کرنے والے دو مندوبین میں سے ایک میں تھا' اس کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ میں دانیال لطیفی صاحب سے بالکل واقف نہ تھا۔ تاہم چونکہ ان کی باتیں کم از کم "قابل غور" ضرور نظر آئیں لہٰذا میں نے ان کے بارے میں مزید معلومات کچھ تو سینئر صحافی عبدالکریم عابد صاحب سے حاصل کیں' اور مزید لطیفی صاحب کے میزبان جناب عمر قصوری صاحب سے۔ اور ان کی آراء پر تبصرے سے قبل ان کی شخصیت کے بارے میں ان معلومات میں سے بعض کو قارئین کے علم میں بھی لانا مناسب سمجھتا ہوں۔

میرا گمان تھا کہ جب لطیفی صاحب قصوری خاندان کی ایک شادی میں شرکت کے لئے بھارت سے پاکستان تشریف لائے تو یقیناً اس خاندان کے ساتھ ان کا عزیز داری کا تعلق ہو گا لیکن معلوم ہوا کہ میرا یہ اندازہ غلط ہے۔ اور معاملہ صرف اتنا ہے کہ ان کی نہایت گہری ذاتی دوستی میاں محمود علی قصوری مرحوم کے ساتھ تھی' جو انہیں ان کی پوتی کی شادی کے لئے کھینچ لائی۔ ان کے والد ڈاکٹر عالما لطیفی برٹش انڈیا کے اولین ہندوستانی (اور وہ بھی مسلم!) فنانشل کمشنر تھے جو کچھ دیر پنجاب کے ایکٹنگ گورنر بھی رہے تھے۔ خود دانیال صاحب پکے اور سچے مارکسسٹ تھے۔ اور نہایت اعلیٰ تعلیم کے حصول حتیٰ کہ انگلستان سے بیرسٹری کی تکمیل کے بعد انہوں نے کل تیس روپے ماہانہ مشاہرے پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں ایک "ہمہ وقت کارکن" کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر جب عالمی کمیونزم کی سطح پر فیصلہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان کمیونسٹ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان میں شامل ہو جائیں تو پارٹی ڈسپلن کی پابندی کرتے ہوئے وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے' اس وضاحت کے ساتھ کہ جب آپ

ہمیں وہاں بھیج ہی رہے ہیں تو اب ہم وہاں پوری تندہی اور مسلم لیگ کے نظم کی پابندی کے ساتھ کام کریں گے۔ چنانچہ اپنی خداداد صلاحیت و ذہانت اور ایثار و محنت کی بنا پر دانیال صاحب قائداعظم کے قریبی رفقائے کار کے حلقے میں شمار کئے جانے لگے جس کا نمایاں مظہر یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں عام انتخابات سے قبل مسلم لیگ کا جو منشور تیار ہوا اس کے ضمن میں، جیسا کہ اخباری خبر میں بھی وضاحت ہے (اگرچہ وہاں ۱۹۴۶ء کی بجائے غلطی سے ۱۹۴۰ء چھپ گیا ہے!) انہوں نے میاں ممتاز محمد خان دولتانہ وغیرہ کے ساتھ مل کر اہم خدمت سرانجام دی۔ تقسیمِ ہند سے قبل بمبئی میں ہندو مسلم فسادات ہوئے تو انہیں وہاں فسادات کی روک تھام اور بالخصوص ریلوے کے مسلمان ملازمین کی حفاظت اور امداد کے لئے بھیجا گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جب انہوں نے واپس لاہور آنے کا ارادہ کیا تو بمبئی کے مسلمانوں نے ان سے وہیں قیام کرنے کی درخواست کی جو انہوں نے منظور کرلی۔ بنابریں وہ مستقل طور پر بھارتی شہری بن گئے، بعد ازاں وہ دہلی منتقل ہو گئے اور اب وہ نئی دہلی میں سپریم کورٹ آف انڈیا میں وکالت کرتے ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ برِعظیم پاک و ہند کے بگڑتے ہوئے حالات پر سخت مضطرب رہتے ہیں بلکہ آر ایس ایس، بی جے پی، اور وی ایچ ایس قسم کی ہندو فنڈامنٹلسٹ تحریکوں سے بھارت میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو جو شدید خطرات لاحق ہیں ان کے بارے میں بہت پریشان اور متفکر ہیں۔ کمیونزم کے ضمن میں ان کا رجحان اس کے چینی برانڈ کی جانب رہا۔ اور بھارتی بنگال کے موجودہ کمیونسٹ وزیر اعلیٰ جیوتی باسو ان ہی کے رفیق اور تربیت دادہ ہیں۔ تاہم اب جبکہ عالمی سطح پر کمیونزم اور سوشلزم کی عمومی موت واقع ہو چکی ہے، ان کے نظریات میں بھی اعتدال پیدا ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم!

"صاحب رائے" کے بارے میں اس وضاحت کے بعد اب آیئے ان کی آراء کے حسن و قبح اور صواب و خطا کی جانب۔ تو اس سلسلے میں بھی پہلی بات یہ کہ دنیا میں

مدنی صد حق اور درست بات تو یا تو صرف اللہ کے اپنے کلام یعنی قرآن کی ہو سکتی ہے یا اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کی' بشرطیکہ اس کی نسبت آنجناب ؐ کی جانب درست ہو۔ باقی ہر بات میں نہ صرف یہ کہ خطاو صواب' اور صحیح یا غلط کا امکان بہر حال موجود ہوتا ہے' بلکہ اکثر و بیشتر معاملات میں بیک وقت دونوں ہی پہلو موجود ہوتے ہیں' صرف اس فرق کے ساتھ کہ کہیں تو خطا اور صواب تقریباً برابر موجود ہوتے ہیں' کہیں صواب اور درستی کا عنصر غالب ہوتا ہے اور خطا یا غلطی کا پہلو نظرانداز کئے جانے کے قابل ہونے کی حد تک کم' اور کہیں باطل کا عنصر غالب ہوتا ہے اور حق کا حصہ صرف اس قدر کہ باطل اس کا سہارا لے کر کھڑا ہو سکے۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے جناب دانیال لطیفی کی جو آراء محولہ بالا خبر میں رپورٹ ہوئی ہیں' ان پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور ان کا گہرا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان میں بحیثیتِ مجموعی تو حق و باطل تقریباً برابر برابر شامل ہیں' تاہم ایک تو ان کی گفتگو کا اصل حاصل اور مقصود بالکل درست ہے' یعنی یہ کہ بھارت اور پاکستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین منافرت کے کم از کم اس اضافی حصے کو تو زائل کرنے کی کوشش کی جائے جو انگریز نے اپنی سیاسی مصلحت کے تحت پیدا کیا تھا۔ اور دوسرے تقسیمِ ہند کے اسباب کے ضمن میں بھی اس کے باوجود کہ ان کی بعض آراء پاکستان کے عوام ہی نہیں اچھے بھلے پڑھے لکھے بلکہ دانشور شمار ہونے والے لوگوں کو بھی یقیناً بہت نامانوس اور عجیب لگی ہوں گی' لیکن ہیں بہت حد تک صحیح! ۔ صرف اس صراحت کے ساتھ کہ ان میں ایک تو کچھ "واقعاتی خلا" بھی موجود ہے' اور دوسرے ایک "ماورائی حقیقت" سے کُلّی طور پر صرفِ نظر کر لیا گیا ہے اور یہ دوسری بات ایک ایسے شخص کے لئے بالکل قرین قیاس ہے جس کے ذہن پر مارکس کی جدلی مادیت کا غلبہ رہا ہو۔

چنانچہ جہاں تک گاندھی جی سمیت تمام ہندو لیڈروں یہاں تک کہ جملہ ہندو عوام کا تعلق ہے' یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان کی تقسیم انہوں نے بادلِ

ناخواستہ بلکہ مجبوراً ہی تسلیم کی تھی۔ بلکہ ان کے اذہان اور قلوب نے اسے تاحال بھی قبول نہیں کیا ہے۔ خاص طور پر گاندھی جی کا یہ قول تو تقسیم ہند سے چند ہی ہفتے قبل کا ہے کہ "پاکستان صرف میری لاش پر بن سکتا ہے!" —— لہٰذا اس ضمن میں نہ کسی اختلاف کی گنجائش ہے، نہ بحث کی ضرورت۔

خود قائداعظم کے بارے میں دو باتیں تو قطعاً مسلّم ہیں۔ یعنی ایک یہ کہ وہ طویل عرصے تک کانگرس میں شامل رہے تھے اور ایک زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے سفیر اور پیغامبر قرار دیئے جاتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ ۴۶ء میں انہوں نے کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر لیا تھا جس کی رو سے ایک علیحدہ اور آزاد پاکستان کے قیام کا معاملہ کم از کم دس سال کے لئے مؤخر ہو گیا تھا۔

ان دو ناقابل تردید حقائق کے مابین ۱۹۴۱ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری اور پھر اس کے مطابق تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی عظیم جدّوجہد میں جو ذاتی اور فیصلہ کن حصہ قائداعظم کا رہا، اس کے ضمن میں یہ بات تو کم از کم مسلمانانِ پاکستان میں مشہور و معروف ہی نہیں تقریباً متفق علیہ ہے کہ اس کا اصل سبب قائداعظم کی ہندو ذہنیت سے مایوسی اور بیزاری تھی کہ ان سے کسی انصاف کی توقع نہیں رکھی جا سکتی اور یہ رائے انہوں نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر قائم کی تھی اور اس کی بنا پر وہ ہر صورت میں تقسیمِ ہند ہی پر مُصِر اور جازم تھے، لیکن ایک دوسری رائے بھی پیش کی جاتی رہی ہے کہ قیامِ پاکستان اور تقسیم ہند کا مطالبہ اصل میں ہندو قیادت کے ساتھ سیاسی سودے بازی کا مظہر تھا۔ اور قائداعظم ذہناً اور قلباً کسی بھی ایسی صورت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے جس میں ہندوستان کی وحدت بھی برقرار رہتی اور مسلمانانِ ہند کے حقوق کا مناسب تحفظ بھی ہو جاتا۔

اس مؤخرالذکر رائے کی تائید میں ایک بات، جو گزشتہ سال اتفاقاً میرے علم میں آئی، یہ ہے کہ جنوری ۹۳ء میں جب میں امریکہ جا رہا تھا تو ہوائی جہاز میں میری ملاقات

ر وفیسر اقبال احمد صاحب سے ہوئی جو امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں پولٹیکل سائنس
کے استاد ہیں، اور امریکہ کی دوسری یونیورسٹیوں ہی نہیں دور دراز کے ممالک میں
بھی سیاسی و علمی موضوعات پر خطبات کے لئے مدعو کئے جاتے ہیں۔ (ان کا تعلق
چھرہ، لاہور کے ذیلدار خاندان سے ہے!) انہوں نے بتایا کہ ان کے علم میں ایسے
دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ ۱۹۴۶ء ہی میں قائداعظم نے ریاست کلو (جو اب
بھارت کے ہماچل پردیش میں شامل ہے) میں خاصہ وسیع رقبہ خرید فرمایا تھا تاکہ اسے
ایک سیاحت کے مقام کی حیثیت سے بھی ترقی دیں، اور وہیں اپنے لئے ایک رہائش گاہ
بھی تعمیر فرمائیں۔ گویا اُس وقت تک قائداعظم تقسیمِ ہند کو کوئی حتمی اور شدنی بات
نہیں سمجھتے تھے۔

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے ضمن میں بیرسٹر دانیال لطیفی صاحب کا نظریہ دو
حصوں پر مشتمل ہے، یعنی: ایک یہ کہ نہ گاندھی جی اسے پسند کرتے تھے نہ قائدِ
اعظم۔ اور چونکہ یہی دو شخصیتیں انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ میں
فیصلہ کن حیثیت کی حامل اور قیادت و سیادت کے بلند ترین منصب پر فائز تھیں لہٰذا
اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندوستان کی تقسیم کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی ناپسندیدگی
کے علی الرغم جبراً مسلط کی گئی۔ لطیفی صاحب کے نظریئے کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ یہ جبر
انگریزوں کی جانب سے ہوا، اور ہندوستان کی یہ جبری تقسیم ہمارے سابق حکمرانوں
نے اپنے مذموم مقصد یعنی ہندوستان پر دوبارہ قابض ہونے کے لئے کی!

ان میں سے پہلی بات کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرتے ہوئے دوسرے حصے پر
غور کیا جائے تو اس میں تو ہرگز کوئی شک نہیں کہ برعظیم کی تقسیم، اور اس کے نتیجے میں
پاکستان کے قیام، میں ایک جزوی اور بالواسطہ عامل کی حیثیت سے انگریزوں کی "لڑاؤ
اور حکومت کرو" (Divide and Rule!) کی حکمتِ عملی کا کسی نہ کسی حد
تک عمل دخل موجود تھا، لیکن اسے ایک کلی حقیقت یا واحد سبب قرار دینے کے لئے

ایک جانب تو جس قدر مثبت شواہد کی ضرورت ہے وہ موجود نہیں ہیں۔ اور دوسری جانب' جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا تھا' ایک اہم "واقعاتی خلا" بھی اس کی راہ میں حائل ہے۔

یہ بات تو یقیناً اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا اصل سبب ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین بڑھتی ہوئی بے اعتمادی اور نفرت تھی۔ البتہ اس باہمی منافرت اور بد اعتمادی کے بارے میں جہاں یہ کہنا غلط ہے کہ یہ کل کی کل انگریز کی پیدا کردہ تھی' وہاں یہ کہنا بھی حقائق سے گریز کے مترادف ہے کہ اس کی شدت اور گہرائی و گیرائی میں کوئی اضافہ انگریزوں کی مذکورہ بالا حکمت عملی سے نہیں ہوا۔

جہاں تک اس "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی حکمت عملی کا تعلق ہے وہ اولاً تو بجائے خود حاکم و قابض اقوام کے ان مسلّمہ ہتھکنڈوں میں سے ہے جو علامہ اقبال نے سورۂ نمل کی آیت ۳۴ کے حوالے سے بیان کئے ہیں' یعنی ۔

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ "اِنَّ الْمُلُوْکَ"
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادو گری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمودؔ کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

ثانیاً اس کے ضمن میں حقائق و شواہد کا کافی مواد بھی خان عبدالولی خان صاحب انڈیا آفس کے ریکارڈ کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش کے ذریعے وقتاً فوقتاً فراہم کرتے رہے ہیں۔

بد قسمتی سے ہمارے ملک کے بعض دانشوروں نے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین نفرت کے "چلتے ہوئے جھکڑ" اور بد اعتمادی کی "اٹھتی ہوئی

ند مہی" کے ایک سبب کو اس درجہ اچھالا ہے' اور اس شدت کے ساتھ تحریر و تقریر
موضوع بنایا ہے کہ دوسرے جملہ عوامل نگاہوں سے بالکل او جھل ہو کر رہ گئے۔
انچہ عوام کے اَذہان میں اس پوری صورت حال کے واحد سبب کی حیثیت صرف
ردوؤں کی عمومی چھوت چھات' برہمنوں کے سامراجی مزاج' اور بنیوں کی چاپلوسانہ
یاری کی ذہنیت کو حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ ایک جانب یہ پہاڑ جیسی عظیم حقیقت
اہوں سے او جھل ہو گئی کہ ہندو معاشرہ صرف برہمنوں اور بنیوں ہی پر مشتمل نہیں
ہ بلکہ اس میں راجپوت اور شودر بھی موجود ہیں' جو اپنا جداگانہ مزاج رکھتے ہیں'
زید بر آں خود برہمنوں اور بنیوں میں بھی۔ "نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد۔ خدا
نج انگشت یکساں نہ کردا" کے مصداق ہر مزاج اور کردار کے لوگ موجود ہیں۔ اور
دوسری جانب ان دو اہم عوامل سے تو کامل ذہول ہو گیا جن میں سے ایک کا تعلق ماضی
بعید اور اور خود مسلمانوں کے اپنے کردار سے ہے' اور دوسرے کا ماضی قریب اور
انگریزوں کے کردار سے!

ان میں سے مقدّم الذکر سے صرفِ نظر اور غضِّ بصر کا معاملہ تو۔

"وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا!"

کے عین مطابق ہے۔ اس لئے کہ اس تلخ حقیقت کا اعتراف بہت مشکل ہے کہ خود ہم
مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی "ہزار سالہ" حکومت کے دوران اکثر و بیشتر وہی
"اقوامِ غالب" والا کردار اختیار کیا تھا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ
اپنے ان فرائض کو تو سرے سے ادا ہی نہیں کیا تھا جو امتِ مسلمہ اور امتِ محمد (علی
صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہونے کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتے تھے' یعنی اللہ کے پیغام کی
دعوت و تبلیغ' اور اسلام کے عادلانہ نظامِ زندگی اور دینِ حق کے نظامِ عدل و قسط کے
قیام کے ذریعے خلقِ خدا پر اللہ کی رحمانیت و رحیمیت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی

رحمۃ للعالمینی کا عملی مظاہرہ' اور اس طرح اللہ اور رسول ﷺ کی جانب سے ہندوستان میں بسنے والوں پر اتمام حجت! بلکہ بہت سے حکمرانوں نے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ قائم رکھنے کے علاوہ ذاتی عیاشی اور بوالہوسی کے وہ جملہ انداز اختیار کئے جو ہمیشہ سے ملوکیت اور بادشاہی کے لوازم میں سے رہے ہیں۔ اور ان سب کی بنا پر ہندوؤں میں عمومی طور پر وہ انتقامی جذبہ موجود تھا جو سقوطِ ڈھاکہ کے حادثہ فاجعہ کے موقع پر کہ "نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں!" کے مطابق فتحمندی کی سرمستی میں پنڈت موتی لال نہرو جیسے وسیع المشرب انسان کی پوتی اور جواہر لال نہرو جیسے سیکولر اور سوشلسٹ مزاج کے حامل شخص کی بیٹی مسز اندرا گاندھی کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ سے ظاہر ہو گیا کہ: "ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا لیا ہے!"

بہرحال وہ آگ جو اِن دو عوامل یعنی برہمن اور بنیا ذہنیت اور مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کے ردِ عمل نے بھڑکائی تھی اس پر تیل کا کام یقیناً اس تیسرے عامل یعنی انگریزوں کی حکمت عملی نے سرانجام دیا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو ٹھیک وہی کام کیا جو سورۂ نمل کی آیت ۳۴ میں بیان ہوا ہے یعنی مفتوح قوم کے اعلیٰ طبقات کو ادنیٰ (اور ادنیٰ کو اعلیٰ) بنا دیا جائے' چنانچہ ہمارے سابق حکمرانوں نے سوائے پنجاب اور سرحد کے باقی پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو دبایا اور ہندوؤں کو ابھارا۔ اور پھر ان دونوں کے مابین چپقلش کو مسلسل ہوا دی اور نفرت اور بے اعتمادی کے جراثیم کو پروان چڑھایا۔ جسے دانیال لطیفی صاحب نفرت کو "انجیکٹ" کرنے سے تعبیر کر رہے ہیں!

بہرحال' اس عامل کی حد تک تو تقسیم ہند کے ضمن میں انگریزوں کا حصہ لازماً تسلیم کیا جانا چاہئے' لیکن اسے واحد یا سب سے فیصلہ کن عامل قرار دینا ہرگز صحیح نہیں ہے' جیسا کہ دانیال صاحب کے خیالات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس کی راہ میں جو سب سے بڑا "واقعاتی خلا" حائل ہے وہ یہ کہ انگلستان میں دو جماعتی پارلیمانی

سوریت قائم تھی جس میں عام طور پر مخالف سیاسی جماعتوں کے بنیادی مزاج اور
لوی طرزِ عمل میں اختلاف موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ کنزرویٹو پارٹی اور لیبر پارٹی کے
زاج اور پالیسیوں میں بھی بہت فرق اور تفاوت تھا۔ اور "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی
کمت عملی مقدم الذکر کی حد تک تو ایک حقیقتِ موضوعہ کی حیثیت رکھتی تھی لیکن
ؤخر الذکر کے ضمن میں کم از کم اس حد تک نہیں۔ اور یہ بات کہ جب ہندوستان
زاد ہوا اس وقت انگلستان میں لیبر پارٹی بر سر اقتدار تھی جہاں اس اعتبار سے اہم ہے
کہ بصورت دیگر شاید ابھی آزادی کے حصول میں تاخیر ہو جاتی' وہاں مسئلہ زیر بحث
کے اعتبار سے تو نہایت فیصلہ کن ہے۔ اس لئے کہ پہلے بھی یہ راز کچھ ایسا زیادہ خفیہ نہ
ا' اور اب تو وہ طشت از بام بھی ہو چکا ہے کہ انگلستان کے وزیر اعظم لارڈ اٹلی' اور
ندوستان کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن دونوں کو قائد اعظم اور مسلم لیگ دونوں
ے شدید نفرت تھی۔ چنانچہ یہی وہ معروضی صورت حال تھی جس کے پیش نظر قائد
ظم کو کیبنٹ مشن پلان قبول کرنا پڑا تھا' جس کے نتیجے میں کم از کم فوری طور پر
ندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا مسئلہ ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کے بعد بھی ملک
تسیم ہوا اور ایک آزاد اور خود مختار پاکستان وجود میں آیا تو یہ "جبر" تو لازماً تھا لیکن
گریز کا نہیں' بلکہ اس سے بھی کہیں بالاتر اور مقتدر ہستی یعنی اللہ کا! چنانچہ یہی وہ
اورائی "حقیقت ہے جس کا ذکر گزشتہ ہفتے ہوا تھا اور جس کی جانب مارکس کی جدلی
یت کے پھندے میں گرفتار شخص کا ذہن منتقل ہو ہی نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ "جبر" اور قانونِ الٰہی کی یہ کارفرمائی اس سنۃ اللہ کے مطابق ہے
کہ جب کوئی قوم اللہ کی بندگی اختیار کرنے کے لئے آزادی کی طالب ہوتی ہے تو اللہ
س کی خواہش پوری فرما کر اسے ایک لازمی آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے کہ آزادی
و خود اختیاری کے حصول کے بعد وہ اپنا وعدہ پورا کرتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ قرآن کے
عمومی اسلوب کے مطابق کہ اہم مضامین اس میں کم از کم دو بار ضرور بیان ہوتے

ہیں یہ قانونِ الٰہی بھی سورۂ اعراف کی آیت ۱۲۹ میں تو خاص طور پر بنی اسرائیل کی سرگزشت کے ضمن میں وارد ہوا ہے۔ اور سورۂ یونس کی آیت ۱۴ میں عمومی انداز میں مذکور ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام، جس کے لئے تقسیم ہند ناگزیر تھی، سیاست و عمرانیات کے جملہ اصولوں کی رو سے ایک "معجزہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی واحد توجیہہ صرف مذکورہ بالا سنتِ الٰہی ہی سے ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ جب راس کماری سے درۂ خیبر، اور چاٹگام سے کوئٹہ تک پورا برِّعظیم "پاکستان کا مطلب کیا؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ!" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اور جمعوں اور عیدوں کی نمازوں میں گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں کی گئیں کہ "اے اللہ! ہمیں انگریز اور ہندوؤں کی دوہری غلامی سے نجات عطا فرما، تا کہ ہم تیرے نبیؐ کے دین پر عمل پیرا ہو سکیں!" تو حکمتِ خداوندی نے عین لیلۃ القدر کو تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کا فیصلہ صادر فرمادیا۔ "تاکہ ہم دیکھیں کہ اب تم کیا عمل کرتے ہو!" (یونس : ۱۴)

اب ظاہر ہے کہ تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کا یہ "ماورائی عامل" کسی ایسی شخصیت ہی کو نظر آسکتا تھا جو یہ دعویٰ کر سکے کہ ؏ "گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود!" چنانچہ یہ علامہ اقبال تھے جنہوں نے ۱۹۳۰ء ہی میں، جب کہ ابھی قائد اعظم تو صرف چودہ نکات تک ہی پہنچے تھے، اس "تقدیرِ مبرم" کا "مشاہدہ" کر لیا تھا کہ "ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں ایک آزاد مسلم ریاست قائم ہو گی!" یہ دوسری بات ہے کہ اس مردِ درویش نے اس کا جو اصل مقصد معیّن کیا تھا اس کی جانب تا حال کوئی پیش قدمی نہیں ہو سکی۔ تاہم اس سے بھی کوئی حرف حضرت علامہ پر نہیں آتا۔ اس لئے کہ یہ بات انہوں نے ایک امکان اور "موقع" کی حیثیت سے کہی تھی پیشینگوئی کے انداز میں نہیں کہ : "اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں موقع مل جائے گا کہ اسلام کی اصل تعلیمات پر جو پردے عرب ملوکیت کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اس کے اصل روئے روشن کو دنیا کے سامنے پیش کر سکیں!" ـــــ اور ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کو بعض احادیث

نبویہ ؐ کی بنیاد پر یہ یقین حاصل ہے کہ ان شاء اللہ علامہ اقبال کی یہ توقع بھی پوری ہو گی۔ اور خلافتِ اسلامی کا احیاء اسی ارضِ پاکستان اور اس سے ملحق افغانستان سے ہو گا۔ اگرچہ سورۂ انبیاء کی آیت ۱۰۹ میں وارد شدہ الفاظ : "وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَمْ بَعِيدٌ مَّا تُوعَدُونَ ○" "اور میں یہ نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ لیا جا رہا ہے وہ قریب آ چکی ہے یا ابھی کچھ دور ہے!" اور اسی طرح سورۂ جن کی آیت ۲۵ میں وارد شدہ الفاظِ مبارکہ : "قُلْ إِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ مَّا تُوعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّي أَمَدًا ○" یعنی "(اے نبی ؐ) کہہ دیجئے کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آ چکی ہے یا ابھی میرا رب اس میں کچھ دیر فرمائے گا!" کے مطابق نہ یہ کہا جا سکتا کہ یہ مرحلہ ابھی کتنی دور ہے، نہ یہ کہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اب تک کی وعدہ خلافی کی مزید سزا دے گا یا نہیں، اور دے گا تو کیا!

بہرحال جہاں تک دانیال لطیفی صاحب کی اس رائے کا تعلق ہے کہ بھارت اور پاکستان کے مابین نفرت کا خاتمہ کیا جائے تو اس کے ضمن میں عرض ہے کہ اگر فوری طور پر اس کا کُلّی خاتمہ ممکن نہ ہو تو بھی آزادی کے چھیالیس سال بعد ہمیں اس امر پر تو سنجیدگی کے ساتھ لازماً غور کرنا چاہئے کہ اس کے کم از کم اس اضافی حصے کو تو ختم کرنے کی بہرصورت کوشش کریں جو ہمارے سابق غیر ملکی حکمرانوں نے اپنی وقتی حکمت عملی کے تحت پیدا کیا تھا۔ کاش کہ دونوں ملکوں کے دانشور اس جانب توجہ کر سکیں۔ ○

پاکستان کا قیام : برطانوی سازش یا خدائی تدبیر؟

پروفیسر سید عرفانی کے جواب میں

روزنامہ "جنگ" لاہور کی اشاعت بابت ۱۶/ اور ۱۷/ مئی میں میرے اس کالم پر ایک تنقیدی تحریر پروفیسر سید محمد یوسف عرفانی صاحب کے قلم سے شائع ہوئی ہے جو ۲۲/ اپریل کو "قیامِ پاکستان: برطانوی سازش یا الٰہی تدبیر؟" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ میں شخصی اعتبار سے پروفیسر صاحب سے بالکل واقف نہیں ہوں، علم و فضل میں تو وہ یقیناً مجھ سے زیادہ ہیں، ہو سکتا ہے کہ عمر میں بھی زیادہ ہوں۔ بنابریں ان کے "استفسار" کے جواب میں اگر کوئی لفظ نادانستہ طور پر میرے قلم سے ایسا نکل جائے جس میں سوءِ ادب کا احتمال ہو تو پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

مجھے سخت حیرت اور تعجب ہے کہ دو اقساط پر پھیلی ہوئی اس تحریر میں میری گزارشات کے اس حصے کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے جو نہ صرف یہ کہ میرے اصل مدعا اور مقصود کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اس کالم کے عنوان میں بھی جلی طور پر شامل ہے، یعنی : "الٰہی تدبیر!" مزید برآں پروفیسر صاحب نے جناب دانیال لطیفی کے پورے موقف کو میری جانب منسوب کر دیا ہے یعنی یہ کہ تقسیم ہند اور قیام پاکستان اصلاً برطانوی سازش کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ میں نے اس کے صرف ایک جزو کے مبنی بر صداقت ہونے کے احتمال کو تسلیم کر کے کلی اور مجموعی طور پر اس کی پر زور تردید اور نفی کی ہے، اور اس تردید اور نفی کے ضمن میں بعینہٖ وہی دلیل دی ہے جو خود پروفیسر صاحب نے اپنی تحریر کے آخر میں بیان فرمائی ہے۔ اس پر اگرچہ صحیح طرزِ عمل تو یہ ہونا چاہئے کہ ۔ "ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہئے۔" اور "خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے!" کہہ کر خاموشی اختیار کر لی جائے، لیکن چونکہ ہو سکتا ہے کہ پروفیسر

صاحب کی اس تحریر سے بہت سے قارئین کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہوں لہٰذا میں اپنا موقف دوبارہ اختصار کے ساتھ لیکن ریاضی کے سے انداز میں سلسلہ وار درج کر رہا ہوں۔

۱۔ میرے نزدیک پاکستان کا قیام کسی برطانوی سازش کا نتیجہ ہرگز نہیں تھا بلکہ اللہ کی حکمت و مشیت کا مظہر' اور احیاءِ اسلام اور غلبۂ دینِ حق یا بالفاظِ دیگر نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوت کے عالمی سطح پر قیام کے ضمن میں اللہ کے طویل المیعاد منصوبے کی اہم کڑی ہے۔

۲۔ تقسیم ہند کے سلسلے میں "برطانوی سازش" کے عمل دخل کا احتمال جزوی اور بالواسطہ طور پر اس اعتبار سے تو یقیناً ہے کہ عالمِ اسباب میں اس کا اصل سبب یہی بنا کہ مسلمانانِ ہند کو ہندوؤں کی جانب سے ناانصافی اور استحصال ہی نہیں' اپنے جداگانہ ملی و قومی تشخص کے بالکلیہ خاتمے کا شدید "خوف" لاحق ہو گیا تھا۔ اور اس صورت حال کے پیدا ہونے میں جہاں بنیادی طور پر ہندوؤں (بالخصوص برہمنوں اور بنیوں کے عمومی مزاج اور مسلمانوں کی طویل غلامی سے پیدا شدہ ردعمل کو بھی دخل حاصل تھا' وہاں یقیناً انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی حکمتِ عملی نے بھی اس جلتی آگ پر تیل کا کام کر کے اس کی شدت اور اشتعال کو بڑھانے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ اور اگر تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کے وقت برطانیہ میں کنزرویٹو پارٹی کی حکومت ہوتی جس کی پالیسی میں اس "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی حکمتِ عملی کو اصول موضوعہ کی حیثیت حاصل تھی اور جس کے دستاویزی شواہد خان عبدالولی خاں وقتاً فوقتاً پیش فرماتے رہے ہیں' تو شاید اس مفروضے کی تردید مشکل ہو جاتی کہ قیامِ پاکستان برطانوی سازش ہی کا نتیجہ ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور اختیارِ مطلق سے اپنی "تدبیر" کے ضمن میں اس مغالطے کا کلی سدباب اس طور سے کر دیا کہ تقسیم ہند کا فیصلہ برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت کے ہاتھوں کروایا جس کے لیڈروں کی مسلمانانِ ہند

سے بالعموم' اور مسلم لیگ اور اس کے قائد محمد علی جناح سے بالخصوص عداوت اور دشمنی اظہر من الشمس تھی!(چنانچہ یہی دلیل میں نے اپنے کالم میں بھی دی تھی' اور اسی پر پروفیسر عرفانی صاحب کے استدلال کی تان بھی ٹوٹی ہے!)

۳- اوپر احیاءِ اسلام' غلبۂ دینِ حق' اور عالمی نظامِ خلافت کے قیام کے جس طویل المیعاد خدائی منصوبے کا ذکر ہے' راقم کے نزدیک اس کا آغاز "الفِ ثانی" یعنی امتِ مسلمہ کی تاریخ کے دوسرے ہزار سال کے آغاز کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔(اگرچہ یہ صرف اللہ ہی کے علم میں ہے کہ اس کی آخری اور حتمی "تکمیل" میں ابھی مزید کتنی مدت باقی ہے!) چنانچہ عالمِ واقعہ میں اس منصوبے کی تعمیل کے ضمن میں جن اعاظم رجال کی محنتوں اور کاوشوں نے اہم ترین اور فیصلہ کن کردار ادا کیا ان میں سرِفہرست تو گیارہویں صدی ہجری کے مجدِّدِ اعظم حضرت شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدّد الفِ ثانیؒ ہیں جن کے بارے میں علامہ اقبال نے بالکل بجا طور پر فرمایا ہے کہ۔ "وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں۔ اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!"۔ البتہ بعد کی دو صدیوں کے دوران اس خاکے میں ہمارے بہت سے بزرگوں نے اپنے خون اور پسینے سے رنگ بھرا اور اس منصوبے کو درجہ بدرجہ آگے بڑھانے میں اپنا حصہ ادا کیا۔ لیکن چودھویں صدی ہجری میں اس منصوبے کی اہم کڑی یعنی قیام پاکستان جن دو عظیم اشخاص کی مساعی کا مرہونِ منت ہے وہ ہیں علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح۔ جن کے مابین مثالی اتحاد و اتفاق' اور عمومی ہم آہنگی اور باہمی تعاون کے باوصف سوچ اور "اپروچ" کا ایک لطیف فرق بھی موجود ہے۔

۴- چنانچہ علامہ اقبال اصلاً ایک مفکر اور فلسفی اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک "وِژنری" تھے' اور ان کی اصل دلچسپی فکرِ اسلامی کی تجدید اور اس کے نتیجے میں نظامِ اسلام اور ملتِ اسلامی کے احیاء سے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں انہوں نے تقسیمِ ہند یا مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے قیام کی کوئی "تجویز" پیش

نہیں کی تھی بلکہ صرف یہ "پیشینگوئی" فرمائی تھی کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام "تقدیرِ مبرم" ہے۔ اور اپنی اس دلی آرزو کا اظہار کیا تھا کہ "اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی اصل تعلیمات پر جو بدنما پردے عرب ملوکیت (ان کے اپنے الفاظ میں "عرب امپیریلزم") کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اسلام کا اصل رخِ روشن دنیا کے سامنے پیش کر سکیں" یعنی اسلام کے اصل نظامِ عدلِ اجتماعی یا بالفاظِ دیگر نظام خلافت علیٰ منہاج النبوت کو دوبارہ دنیا میں قائم کریں۔ جبکہ قائد اعظم کو اصل فکر مسلمانانِ ہند کے قومی تشخص کے بقا' اور ان کے سیاسی اور معاشی حقوق کی حفاظت کی تھی جس کے لئے وہ کسی بھی قابلِ عمل منصوبے اور دستوری و آئینی تجویز پر غور کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ چنانچہ یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان کے ضمن میں وہ ہندو قوم کے عمومی مزاج' اور انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت کے طرزِ عمل سے رفتہ رفتہ اور تدریجاً ہی مایوس ہوئے۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن پلان کو' جو اصلاً مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہن کی پیداوار تھا' قائد اعظم نے قبول کیا تو جہاں یہ اس اعتبار سے ان کے سیاسی فہم و تدبر کا شاہکار تھا کہ انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد کے تبدیل شدہ عالمی حالات کے پیش نظر برطانوی حکومت ہندوستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر چکی ہے اور اس موقع پر اگر ہم نے کسی نامناسب ضد یا ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تو عین ممکن ہے کہ انگریز ہندوستان کی حکومت یکطرفہ طور پر کانگرس کے حوالے کر کے چلتے بنیں اور پھر یہ عقدہ لاینحل بن جائے۔ (اس پر مفصل بحث میں نے اپنی تالیف "استحکامِ پاکستان" میں کی ہے!) وہاں اس احتمال کی بھی کلی نفی نہیں کی جا سکتی کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک تقسیم ہند ہی ہندو مسلم مسئلے کا واحد ممکن حل نہیں تھا' بلکہ وہ ایسی کسی بھی تجویز پر غور کرنے کے لئے کھلے دل اور ذہن کے ساتھ تیار تھے جس کے ذریعے مسلمانانِ ہند کے قومی تشخص کے بقاء اور ان کے سیاسی اور معاشی حقوق کی

حفاظت کی ضمانت حاصل ہو سکے! چنانچہ اس اعتبار سے جناب دانیال لطیفی کے خیال اور پروفیسر اقبال احمد کی بتائی ہوئی بات قابلِ غور تو ہے ہی جزوی طور پر درست بھی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم! بہرحال میری جانب سے ان کا حوالہ —— صرف اس حد تک تھا۔ جناب دانیال لطیفی کے تمام خیالات کو میرے سر منڈھ دینا بہت بڑی زیادتی ہی نہیں علمی خیانت ہے!

۵- تاہم میرے نزدیک اب ہمارے لئے اصل قابلِ غور چیز یہ تاریخی مباحث نہیں بلکہ یہ نہایت تلخ حقیقتِ واقعی ہے کہ قیامِ پاکستان کی صورت میں علامہ اقبال کی پیشینگوئی کے پورے ہو جانے پر لگ بھگ پونے سینتالیس سال (اور قمری حساب سے سوا اڑتالیس سال) گزر جانے کے بعد بھی اپنی کوتاہیوں اور بے عملی ہی نہیں بد عملی کے باعث ہم نہ ان کی اس آرزو کی طرف کوئی پیش قدمی کر سکے ہیں کہ پاکستان میں اسلام کے عادلانہ نظامِ اجتماعی کو بالفعل قائم کر کے (اور قائداعظم کے الفاظ میں: "اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا ایک عملی نمونہ پیش کر کے") نوعِ انسانی پر اللہ کے دینِ حق' اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی عالمی نبوت و رسالت کی جانب سے "اتمامِ حجت" کر سکیں۔ اور نہ ہی قائداعظم کے اس خواب کی تعبیر دنیا کے سامنے لانے میں کامیاب ہو سکے ہیں کہ تقسیمِ ہند کی صورت میں پاکستان اور بھارت کے مابین تعلقات اسی نوعیت کے ہوں گے جیسے ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے مابین ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس ہم نے اپنے طرزِ عمل سے تاحال تو یہی ثابت کیا ہے کہ تقسیمِ ہند کے ضمن میں جو اندیشے نیشنلسٹ مسلمانوں کو بالعموم اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو بالخصوص لاحق تھے وہ درست ثابت ہوئے۔ اب اگر حکیم سعید صاحب نے پاکستان کے موجودہ عمومی حالات کا آئینہ نہایت دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ قوم کے سامنے رکھ دیا ہے تو اس پر آئینہ کو توڑ دینے اور آئینہ دکھانے والے پر ٹوٹ پڑنے کی بجائے بہتر روش یہ ہے کہ حالات کو سنوارنے اور اس ملک کے قیام سے جو اصل

مقاصد اس کے مصور و مفکر و مجوز (علامہ اقبال) اور بانی و معمار و مؤسس (قائد اعظم) کے پیش نظر تھے ان کے حصول کی جانب پیش قدمی کی جائے!

۶- اسی طرح اگر حکیم صاحب موصوف کی تحریر کو، جو اولاً "نظریۂ پاکستان" کے سب سے بڑے دعویدار روزنامے میں شائع ہوئی تھی، میں نے بھی تحریکِ خلافت پاکستان کے نقیب جریدے "ندائے خلافت" میں اس لئے شائع کر دیا کہ چونکہ حکیم صاحب ایک غیر سیاسی اور غیر متنازعہ شخصیت ہیں، لہٰذا شاید کہ ملک و قوم کے ناگفتہ حالات پر ان کا دردمندانہ "مرثیہ" کچھ لوگوں کو اصلاح حال کے لئے کمربستہ کرنے میں مؤثر ثابت ہو سکے، تو اس کی بنا پر مجھے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم یا مولانا مدنیؒ کا معتقد اور مرید، بلکہ ایجنٹ قرار دے دینا بھی کسی طرح مبنی بر عدل و انصاف نہیں ہے! — جبکہ میں نے ہزار بار اعلان کیا ہے کہ مجھے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک والے ابوالکلام آزاد سے تو بے حد دلچسپی ہے جس نے پہلے "الہلال" اور "البلاغ" ایسے جرائد اور پھر "حزب اللہ" کے قیام کے ذریعے اسلامیانِ ہند کے اس ملی و دینی جذبے کو جو اصلاً علامہ اقبال کی ملی شاعری سے پیدا ہوا تھا ایک دعوت، تحریک اور تنظیم کی اولین صورت عطا کی اور اس اعتبار سے میں انہیں برملا اپنا "دادا پیر" تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد والے "نیشنلسٹ ابوالکلام" سے مجھے کوئی دلچسپی تو کیا سرے سے بحث ہی نہیں ہے۔ اسی طرح مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارے میں بھی میں نے بار بار وضاحت کی ہے کہ میں ان کے دینی علم و فضل، اور تقویٰ و تدین پر مستزاد انگریز کے خلاف ان کے سرفروشانہ جہادِ حریت کا تو یقیناً قائل بھی ہوں اور اس کے بنا پر ان سے ایک گونہ محبت اور عقیدت بھی رکھتا ہوں، لیکن ان کی سیاسی حکمت عملی سے نہ صرف یہ کہ شدید اختلاف رکھتا ہوں بلکہ اسے ان کے استاذ اور مربی اور میرے نزدیک چودھویں صدی ہجری کے مجددِ اعظم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی اس مجتہدانہ بصیرت کے بھی خلاف سمجھتا ہوں جو ان کے ۱۹۲۰ء کے بعض خطبات سے ظاہر

ہوتی ہے (اس موضوع پر مفصل بحث میری تالیف "جماعت شیخ الہند" اور تنظیم اسلامی" میں موجود ہے!) ـــــ تاہم اس اختلاف کے باوجود میں ہرگز نہ انہیں ہندوؤں کا زر خرید سمجھتا ہوں نہ مولانا ابوالکلام آزاد کو' بلکہ دونوں کو اپنی رائے اور موقف میں مخلص سمجھتا ہوں۔ اور اس پر اگر کوئی مجھے گردن زدنی قرار دے تو مجھے ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہے!

۷۔ پروفیسر عرفانی صاحب نے سورۂ مائدہ کی آیت ۵۱ اور سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۹ کے حوالے سے جو باتیں تحریر فرمائی ہیں وہ تو گستاخی معاف' ان کی "سخن فہمی" کے بارے میں کوئی اچھا تاثر پیدا نہیں کرتیں۔ اس لئے کہ ان دونوں آیات میں صراحت کے ساتھ تذکرہ صرف یہود اور نصاریٰ کا ہے۔ گویا ان آیات کا مدلول اور مدّعا یہودیوں اور عیسائیوں کے حق میں تو "نصِ قطعی" کی حیثیت رکھتا ہے' جبکہ ہندوؤں اور دوسری غیر مسلم اقوام کے ضمن میں ان کا اطلاق فرمانِ نبویؐ "اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَاحِدَۃٌ" سے استنباط کے ذریعے ثانوی درجہ میں ہو گا۔ لہٰذا ان آیاتِ مبارکہ سے تو میرے اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ ہمیں اب عالمی صیہونیت کے آلہ کار امریکہ' اور اس کے خانہ ساز ادارے بلکہ خانہ زاد کنیز اقوامِ متحدہ سے صرفِ نظر کر کے مشرقی ایشیا کے مسلم ممالک یعنی ایران' افغانستان' ترکستان' اور ان کے علاوہ بھارت اور چین کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت کی کوشش کرنی چاہئے۔ رہا ان کا یہ فرمانا کہ: "امریکہ پاکستان اور برِّصغیر سے کوسوں دور ہے لہٰذا وہ برصغیر پر مادی تسلط قائم نہیں کر سکتا!" تو یہ ان کے موجودہ عالمی مالیاتی نظام اور اس کے اثر و نفوذ سے ناواقفیت نہیں تو ان تلخ حقائق کی جانب سے صرفِ نظر کا ضرور مظہر ہے۔ اس لئے کہ آج کی دنیا میں اگرچہ فاصلے بھی بے معنی ہو گئے ہیں' تاہم کسی مادی تسلط یا عسکری قبضہ اور براہ راست حکومت کے کھکھیڑ مول لینے کی ضرورت ہی کیا رہ گئی ہے' جبکہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف ایسے اداروں کے ذریعے پوری دنیا پر ریموٹ کنٹرول کی صورت میں

بالواسطہ حکومت بھی کی جا سکتی ہے، اور سودی معیشت اور قرضوں کے جال میں پھنسا کر دور بیٹھے اور عوامی غیظ و غضب سے کلی طور پر محفوظ رہتے ہوئے قوموں اور ملکوں کی خون پسینے کی کمائی کی بالائی بھی با آسانی حاصل کی جا سکتی ہے۔

۸ - "آخری، لیکن کمترین نہیں" کی مصداق وضاحت یہ ہے کہ یہ مجھ پر بہت بڑا بہتان ہے کہ میں پاکستان اور بھارت کے مابین سرحدوں کی دیوار کو گرانا چاہتا ہوں۔ میری تو پوری زندگی کی سعی و جُہد کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کر کے اولاً خود اسے مستحکم کیا جائے اور پھر اس انقلاب کی مشرق و مغرب میں توسیع کے ذریعے خدا کی مخلوق کو انسانی ذہن کے تراشیدہ ظالمانہ اور استحصالی نظاموں سے نجات دلا کر "رَبِّ النَّاس، اِلٰہِ النَّاس اور مَلِکِ النَّاس" کے عادلانہ اور منصفانہ نظامِ اجتماعی کی نعمت سے بہرہ ور کیا جائے۔ البتہ بھارت اور پاکستان کے مابین مخاصمت — اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین منافرت میں کمی کی ہر کوشش میرے نزدیک نہ صرف اصولی اور اخلاقی اعتبار سے مستحسن ہے بلکہ مفکر و مصورِ پاکستان اور بانی و مؤسسِ پاکستان دونوں کے نظریات کے بھی عین مطابق ہے!

پاک بھارت کشیدگی :

انگریزوں کی گھناؤنی سازش

انگریزوں نے برِ عظیم پاک و ہند کے بعض حصوں پر ایک سو برس سے کچھ زائد' اور بعض پر لگ بھگ دو سو برس تک حکومت کی۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ مقدم الذکر علاقہ کا جزوِ اعظم موجودہ پاکستان ہے' اور مؤخر الذکر کا اہم ترین حصہ مشرقی پاکستان تھا جو اَب بنگلہ دیش کی صورت میں موجود ہے۔ بہرحال اس عرصے کے دوران ہندوستان میں بسنے والوں کی چار پانچ سے لے کر آٹھ دس نسلوں تک انگریزوں کی غلامی میں گزریں۔ اب عمرانیات اور اجتماعی نفسیات کا عام قاعدہ تو یہ ہے کہ اگر کسی ملک پر کوئی بیرونی قوم اس طرح اور اتنے عرصے تک قابض و حاکم رہے تو طبعی طور پر محکوم قوم میں اس کے خلاف نفرت اور انتقام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے' جو حصولِ آزادی کے وقت تو لازمی طور پر شدید ترین ہوتا ہے' خواہ بعد میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس میں کمی واقع ہو جائے۔ لیکن یہ ایک عجیب استثنائی معاملہ ہے کہ عین حصولِ آزادی اور تقسیم ہند کے وقت بھی انگریزوں کے خلاف نفرت نہ ہندوستان کے ہندوؤں میں تھی نہ مسلمانوں میں۔ بلکہ بڑے ملک یعنی بھارت نے تو آخری انگریز وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی کو اپنا پہلا گورنر جنرل بھی بنالیا تھا۔ اور یہی معاملہ پاکستان کا بھی ہو جاتا اگر قائد اعظم ماؤنٹ بیٹن کی اس خواہش کو بلا جھجک رَدّ نہ کر دیتے۔ اور یہ بھی میرے نزدیک یقیناً اُس خدائے بزرگ و برتر کی خصوصی مشیّت ہی کے تحت ہوا' جس کی شان یہ ہے کہ : "وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِیْ مِنَ الْحَقِّ" (الاحزاب : ۵۳) یعنی "اللہ کو حق بات کے کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی!" ورنہ کون نہیں جانتا کہ اس صورت میں پاکستان کا بستر ع "اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے" کے مصداق دراز ہوتے ہی تہ

ہو جاتا۔ مزید برآں یہ واقعہ بھی اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ بعد میں بھی دونوں ملک طویل عرصے تک برطانیہ عظمیٰ کے زیرِ سرپرستی دولت مشترکہ میں شامل رہے، اور کافی عرصہ کے بعد ایک جذباتی مرحلے پر پاکستان نے اسے خیرباد کہا بھی تو بہت جلد اس پر اس کی جانب سے پچھتاوے کا اظہار ہوا۔

تو غور کرنا چاہئے کہ ع "ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!" کے مصداق اس کا سبب کیا ہے؟۔

اس ضمن میں جہاں تک عین آزادئ ہند اور تقسیمِ ملک کے وقت کا تعلق ہے اس میں تو ہرگز کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کا اہم ترین سبب یہ تھا کہ ع "یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں!" کے مصداق دونوں قوموں میں نفرت و انتقام کے جملہ جذبات ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی کشت و خون کی صورت میں ڈھل کر تحلیل ہو گئے اور سابق حاکم یعنی انگریز محکوم ہندوستانیوں کے اس طبعی ردِّ عمل سے صاف بچ کر نکل گئے۔ البتہ اس ہندو مسلم منافرت اور بد اعتمادی کے آغاز اور ارتقاء کے مختلف اسباب و عوامل اور ان کے مابین باہمی نسبت و تناسب کے بارے میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں مجموعی اعتبار سے تو جملہ اسباب و عوامل غالباً متفق علیہ ہی ہوں گے، تاہم ان کے تجزیئے کے ذریعے یہ تعیّن کرنا کہ ان میں سے کون سا عامل سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا بہت گہری تحقیق و تفتیش کا محتاج ہے۔

ہندو مسلم منافرت کے وہ ممکنہ متفق علیہ عوامل حسب ذیل ہیں: (i) ہندوؤں کی عمومی تنگ نظری اور الگ تھلگ رہنے کا انداز، خصوصاً ان کا چھوت چھات کا نظام۔ (ii) برہمن کا سامراجی مزاج اور ویش اور کھتریوں کی چاپلوسانہ عیاری اور سود خوری کی وہ عادت جس کی بنا پر بنجمن فرینکلین نے یہودیوں کو خون چوسنے والی چمگادڑوں (VAMPIRES) سے تعبیر کیا تھا۔ (iii) مسلمانوں کی "ہزار سالہ" غلامی کا طبعی ردِّ عمل۔ اور "آخری لیکن کمترین نہیں" کے مصداق (iv) انگریزوں

کی "لڑاؤ اور حکومت کرو کی حکمتِ عملی" جو کنزرویٹو پارٹی کی تو یقیناً عادتِ ثانیہ تھی، البتہ لیبر پارٹی میں اتنی راسخ نہ تھی! ـــــ بہرحال ان میں سے کون سا عامل اہم ترین اور مؤثر ترین تھا اور ان میں سے ہر ایک کا جدا جدا حصہ کتنا تھا، اگرچہ اس سوال کے واضح اور حتمی جواب کو فی الحال مستقبل کے محققین اور مؤرخین کے حوالے کیا جاسکتا ہے، تاہم اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ کم از کم برٹش راج کے آخری دور میں تو یقیناً آخری عامل ہی سب سے زیادہ مؤثر اور فیصلہ کن تھا۔

البتہ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ آزادی کے بعد بھی پاکستان اور بھارت کے مابین مسلسل دشمنی کی فضا اور ایک ایسی سرد جنگ کی کیفیت کیوں جاری رہی جس نے متعدد بار تو بالفعل آگ اور خون کی گرم بازاری کی صورت اختیار کی، اور ان کے علاوہ بہت سے مواقع ایسے بھی آئے کہ دونوں ملک سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے ان الفاظ کے مطابق کہ : "وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ" یعنی "تم آگ کے گڑھے کے بالکل کنارے پر پہنچ گئے تھے!" باضابطہ جنگ کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ رحمتِ خداوندی نے اسی آیت کے اگلے الفاظ کہ "فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا" یعنی "تو اللہ نے تمہیں اس سے نجات دی!" کی سی شان کے ساتھ بچالیا، چنانچہ آج کل پھر اس سرد جنگ کے گرم بھٹی کی صورت اختیار کرنے کا امکان بہت قریب آگیا ہے، اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کے حالات کے پیش نظر پاکستان کے بعض نیم مذہبی اور نیم سیاسی رہنماؤں سمیت بعض صحافی اور دانشور بھی بار بار افواجِ پاکستان کو للکار رہے ہیں کہ "وہ اپنا فرض ادا کریں!" تو اس سوال کا جواب اگرچہ بالکل نوشتۂ دیوار کے مانند واضح ہے، تاہم سرحد کے دونوں جانب طالع آزما سیاستدانوں نے عوام کی جس نفسیاتی کیفیت کو پختہ کر دیا ہے اس کے باعث سب نے اس کی جانب سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اور ضرورت اس امر کی ہے کہ اب جبکہ دونوں قوموں کی وہ نسل جو حصولِ آزادی کے بعد پیدا ہوئی انسان کے ذہنی و نفسیاتی بلوغ کے سخت ترین

آنی معیار یعنی چالیس سال کی عمر سے بھی آگے نکل چکی ہے (سورۂ احقاف: آیت
۱) دونوں جانب کے اصحابِ علم و فہم اور اربابِ دانش و بینش اس امر پر سنجیدگی سے
ر کریں کہ پاک بھارت تعلقات کے "بہتے دریا" میں دونوں ملکوں کے عوام کے
یب کی "سیاہی" ہی نہیں ان کے خون کی سرخی بھی کون گھول رہا ہے؟ اور آیا اس
ے ازالے کی کوئی صورت ممکن ہے یا نہیں؟۔

بھارت کے عوام اور ہمارے مابین تو یقیناً گوناگوں نوعیت کے نفسیاتی حجابات پر
ستزاد بہت سی مادی فصیلیں بھی حائل ہیں' جن کی بنا پر ہماری بات کا ان تک پہنچنا بہت
شکل ہے' لہٰذا کیوں نہ اس سنجیدہ سوچ بچار کا آغاز ہم پاکستانی مسلمان کریں؟ اس لئے
کہ ہمارے لئے تو یہ مسئلہ اس اعتبار سے بھی بہت اہم ہے کہ تقسیم ہند اور قیام پاکستان
کے دونوں سب سے بڑے علمبرداروں' یعنی مصور و مفکرِ پاکستان علامہ اقبال' اور
معمار و مؤسسِ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح' نے تقسیم کے بعد کے حالات کے ضمن
میں جو خواب دیکھے تھے وہ اس صورت حال کے بالکل برعکس تھے۔ چنانچہ اس ضمن
میں قائد اعظم نے تو صرف یہ کہنے پر اکتفا کی تھی کہ "بھارت اور پاکستان کے تعلقات
ایسے ہی ہوں گے جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے مابین ہیں"۔ لیکن
علامہ اقبال نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے خطبہ الٰہ آباد (دسمبر ۱۹۳۰ء) میں یہ
تک فرمادیا تھا کہ "ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع مسلم ریاست ہر نوع کی
جارحیت کے مقابلے میں ہندوستان کے دفاع کا فریضہ بہترین طور پر سرانجام دے گی'
خواہ وہ جارحیت نظریات کی ہو خواہ ہتھیاروں کی!" تو غور طلب بات ہے کہ کیا ہمارے
یہ دونوں مسلّمہ قائد' خاکم بدہن' بالکل بے بصیرت اور کودن تھے؟ کہ انہوں نے ہندو
مسلم مفاہمت اور پاک بھارت تعاون کی جس سحر کی نوید سنائی تھی وہ نہ صرف یہ کہ
فیض کے ان اشعار کے مصداق ابھی تک طلوع نہیں ہوئی بلکہ مستقبل میں بھی دور
دور تک اس کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے :۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے دوست کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں!

اس گھمبیر سوال کا صاف و صریح اور حتمی و قطعی جواب صرف یہ ہے کہ نہ ہمارے قائد بے بصیرت تھے، نہ موجودہ صورت حال تقسیم کے فارمولے کا منطقی نتیجہ ہے، بلکہ اس پوری صورت حال کا واحد سبب مسئلہ کشمیر ہے جو انگریزوں کی عیاری، بد نیتی، خیانت اور بے ایمانی کا عظیم ترین شاہکار ہے۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ انگریزوں کو مسلمانانِ کشمیر کی "قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ" کے ساتھ کیا ازلی بغض اور خدائی بیر تھا کہ لگ بھگ سو سال پہلے تو انہوں نے اس پوری قوم کو ع "قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند" کے مطابق چند لاکھ ٹکوں کے عوض ہندو ڈوگروں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ اور پھر عین تقسیم کے وقت اولاً ایک انگریز یعنی ریڈ کلف نے اپنے بدنامِ زمانہ "اوارڈ" کے ذریعے ریاست جموں و کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کی راہ ہموار کر دی جو نہ صرف یہ کہ تاریخی و جغرافیائی، اور مذہبی اور ثقافتی جملہ اعتبارات سے پاکستان کا جزوِ لاینفک اور خاص طور پر آبی وسائل کے نقطۂ نظر سے پاکستان کی شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے، اور جو اس بنیادی اصول کے مطابق جو تقسیم ہند کے لئے طے ہوا تھا، یعنی یہ کہ مسلم اکثریت والے تمام "ملحق علاقے" پاکستان میں شامل ہوں گے، قطعی طور پر پاکستان کا حصہ بنتی تھی۔ اور بعد میں جب ریاست کے مسلمانوں نے بغاوت کی اور اس صریح بے انصافی اور بد دیانتی کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا، اور پاکستان کے عوام اور بالخصوص قبائلی پٹھانوں نے ان کی مدد کی، اور اس مسئلہ کے آخری حل کے لئے پاکستان کی فوج کی بس ذرا سی امداد کی کسر رہ گئی تھی، تو ایک دوسرے انگریز یعنی افواجِ پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے قائد اعظم

اہش بلکہ حکم ثنے علی الرغم آڑے آکر اس حق تلفی کے فوری ازالے کا راستہ
مدود کر دیا۔ چنانچہ معاملہ یو این او کے سپرد ہوا اور پینتالیس برس سے اس کی فائلوں
ں دفن پڑا ہے۔

وہ دن اور آج کا دن بھارت اور پاکستان کی حکومتیں اور عوام اپنے سابقہ غیر ملکی
لرانوں کے اس کردار کا مزہ چکھ رہے ہیں جو سورۂ بقرہ کی آیات ۲۰۴ اور ۲۰۵ کے
ن الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ
يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا
تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ
وَالنَّسْلَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝

"بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ حیات و معاملات دنیوی میں ان کی (چکنی
چپڑی) باتیں تمہیں بہت اچھی لگتی ہیں اور وہ اپنی نیتوں پر خدا کو گواہ بھی بناتے
رہتے ہیں ' حالانکہ وہ بد ترین دشمن ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ پیٹھ پھیرتے
ہیں (ذرا نوٹ فرمائیں یہ الفاظِ مبارکہ انگریزوں کی ہندوستان سے واپسی پر
کس قدر عمدگی کے ساتھ چسپاں ہو رہے ہیں) تو زمین میں فساد برپا کرنے کی
سعی کرتے ہیں تاکہ (اس کے ذریعے) زمین کی کھیتی اور انسانوں کی نسل کو
ہلاک کر دیں!"

ہنانچہ اس عرصے کے دوران بھارت اور پاکستان کے مابین کئی خونریز جنگیں بھی ہو چکی
ہیں جن میں ہزاروں انسان ہلاک اور معذور ہوئے' لاتعداد عورتیں بیوہ اور بچے یتیم
ہوئے' اور اربہا ارب روپے کے مالی نقصان دونوں ملکوں کو ہوئے۔ مزید برآں
عوام کے خون پسینے کی کمائی کا بڑا حصہ بجائے عوامی بہبود اور تعلیم و ترقی کے مسلسل
بڑی بڑی فوجوں کو "کھڑی" رکھنے اور مہلک اسلحہ کی خرید میں صرف ہوتا رہا۔ پھر ان
کی باہمی چپقلش سے وقت کی دونوں سپرپاورز نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ اگر پاکستان

نے اپنے "بچاؤ" کے لئے امریکہ کی "پناہ" حاصل کی تو بھارت نے روس کا دامن تھاما، اور اس طرح دونوں ملک ان کی سرد جنگ میں ملوث ہو گئے۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ سرد جنگ کے اصل فریقوں یعنی روس اور امریکہ کے مابین تو یہ جنگ ہمیشہ "سرد" ہی رہی، جبکہ بھارت اور پاکستان کے مابین اس کی بھٹی بار بار دھکتی رہی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر "جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے" کا مظہرِ اتم یہ ہے کہ اس پورے عرصے کے دوران بھی انگریز دونوں ملکوں کے نہ صرف مشترک دوست بلکہ مربّی و سرپرست، اور ناصح و ثالث بالخیر بنے رہے، اور آج بھی میر تقی میر کے اس بدنامِ زمانہ شعر کے مصداق کہ۔

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطّار کے "لونڈے" سے دوا لیتے ہیں!

کشمیر کے مسئلے کے حل کے لئے ہمارے یہاں اکثر و بیشتر دہائی دی جاتی ہے انگریز کے سرپرست امریکہ کی، اور حوالہ دیا جاتا ہے ان کے خانہ ساز ادارے یو این او کی قراردادوں کا۔

بہرحال اس ذہنیت اور طرزِ فکر پر تو "بایں عقل و دانش بباید گریست!" کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، لیکن اصل ضرورت اس کی ہے کہ ہم سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کریں کہ آیا ہمیں واقعات و حوادث کے اس دریا میں جس کا رخ ہماری سادہ لوحی پر مبنی خوش اعتقادی اور حسنِ ظن، اور اغیار کی دشمنی اور عیاری کے باعث ایک خاص سمت میں موڑ دیا گیا تھا چاروناچار بہتے ہی چلے جانا ہے، خواہ اس کے نتائج کتنے ہی مضر اور ہولناک ہوں، یا ہمت سے کام لے کر اس کے رخ کو بدلنے کی کوشش کرنی ہے!

پاک بھارت مفاہمت اور مسئلۂ کشمیر کا حل

ہندو مسلم منافرت اور پاک بھارت مخاصمت کے قدیم اور تاریخی اسباب کو بالکل
...م کر دینا تو ظاہر ہے کہ اب ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ "گیا وقت" تو منفی اور مثبت
...نوں کہاوتوں کے اعتبار سے ہماری دسترس سے باہر ہے۔ یعنی ع "گیا وقت پھر ہاتھ
...تا نہیں!" اور "میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں!" لہٰذا پاک بھارت
...اہمت کی کسی بھی کوشش میں ہر اعتبار سے اولیت اور اہمیت موجودہ مسائل ہی کو
...لی ہوگی جن میں سرِفہرست مسئلۂ کشمیر ہے۔

تاہم اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ماضی سے متعلق بعض مزعومہ مسلّمات پر
...بھی کسی قدر تنقیدی نگاہ ڈال لی جائے کہ ان میں حقیقت کتنی ہے اور افسانہ آمیزی
کتنی۔ اس لئے کہ اس سے مفاہمت کے لئے ذہنی تیاری میں مدد مل سکتی ہے۔

برہمن اور بنیئے کے بارے میں ہمارے یہاں جو تصورات پتھر کی لکیر کی مانند پختہ
ہو گئے ہیں انہیں "زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو" کے مصداق اگر کسی درجہ میں تسلیم
کر بھی لیا جائے یعنی یہ کہ برہمن کا عمومی مزاج سامراجی ہے اور وہ یہودیوں کی مانند
اپنے آپ کو ایک بالاتر اور برتر مخلوق گردانتا ہے اور بنیئے کی ذہنیت بھی بالعموم
یہودیوں ہی کی ایک دوسری صفت یعنی سود خوری اور اس سے پیدا شدہ چاپلوسانہ
عیاری کے کردار کا عکس ہے جس کی بہترین تعبیر "منہ میں رام رام بغل میں چھری"
کے الفاظ سے ہوتی ہے، تب بھی ایک جانب تو یہ اٹل اصول ناقابلِ تردید ہے کہ ؎

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!

گویا نہ سب برہمن ایک ہی مزاج کے حامل ہیں نہ تمام بنیئے ایک ہی سی سرشت رکھتے ہیں۔ (خاص طور پر ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال کی صورت میں جو "برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز" عطا فرمایا اس کی مثال بہت ہی نمایاں ہے!) اور دوسری جانب ہندو معاشرے میں کھشتری اور راجپوت بھی تو ہیں جن کی غیرت و حمیت' شرافت و مروت اور وسیع القلبی اور فراخ حوصلگی ضرب المثل ہے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر وہ پسماندہ قومیں بھی تو ہیں جو خود اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی ستم رسیدہ ہیں اور اگرچہ ماضی میں تو وہ "پابندگی خو گرفتہ" اور ع "ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے!" کی مصداقِ کامل بنی ہوئی تھیں لیکن اب ہندوستانی معاشرے میں پوری قوت کے ساتھ ابھر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ شمالی ہند کی یو پی اور بہار جیسی کٹر ہندو ریاستوں میں ان ہی میں سے بعض یعنی "یادو" وزارتِ علیا پر بھی فائز ہو گئے۔ پھر تعداد میں بھی وہ بقیہ تینوں طبقات سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں!

اس ضمن میں لکھنؤ (یو پی' بھارت) سے شائع ہونے والے قدیم اور مؤقر دینی و علمی ماہنامے "الفرقان" کی ایک حالیہ اشاعت کے اداریہ کے حسب ذیل اقتباسات بہت اہم ہیں:

> "ایک غلطی بہت مدت سے ہم ہندوستانی مسلمانوں سے ہو رہی ہے اور اس کے بہت سخت نقصانات ہم اٹھاتے چلے آ رہے ہیں — وہ غلطی یہ ہے کہ ہم ہندوستان میں بسنے والے اکثریتی فرقہ کو ایک "قوم" سمجھتے ہیں' حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں ہے — اس غلطی کا سب سے بڑا نقصان یہ رہا ہے کہ اسی کی وجہ سے ہم اس مرعوبیت اور احساسِ کمتری سے نکل نہیں پا رہے ہیں' جو ایمانی کمزوری کے علاوہ اپنی اور اس "قوم" کی تعداد اور سیاسی اور معاشی پوزیشن کے مابین زبردست فرق کو دیکھ کر ہمارے اوپر چھایا ہوا ہے — واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی سماج وحدت کی کوئی بنیاد نہیں رکھتا — اس کو ایک متحدہ مذہبی تشخص عطا کرنے اور ان سب کو ایک گروہ بنا دینے اور اسے اکثریت کی

خلعتِ فاخرہ پہنا دینے کی سازش اصل میں انگریزوں اور برہمنوں کے اشتراکِ عمل کے نتیجے میں، اور ہماری سادہ لوحی اور یہاں کے سماجی و مذہبی نظام سے براہ راست ناواقفیت کی وجہ سے کامیاب ہوئی ہے — لیکن اب صاف طور پر نظر آ رہا ہے کہ اس ملک کے مظلوم طبقات ذلت و غلامی کے طوق سے اپنی گردن آزاد کرانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہندوستان کے سماجی ڈھانچہ کو بدلنے اور برہمنی جبر و استبداد سے نکلنے کی آواز پہلی بار لگی ہے، پہلے بھی یہ کوشش ہوتی رہی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ معاملہ اب جہاں تک پہنچ گیا ہے وہاں تک کبھی نہیں پہنچا تھا اور شاید اب یہ بات آگے ہی بڑھتی جائے گی۔"

پھر ہمارے لئے تو سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ بھارت میں صرف ہندو ہی تو آباد نہیں ہیں، مسلمان بھی ہیں، اور اگر بھارتی مسلمانوں کی عام رائے کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ بھارت کو دنیا میں سب سے زیادہ آبادی والا مسلمان ملک قرار دیا جا سکتا ہے۔ (عام سرکاری اعداد و شمار کی رُو سے بھی دنیا بھر میں صرف ایک انڈونیشیا ایسا ملک ہے جو بھارت سے زیادہ تعداد میں مسلمان آبادی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔) اور انگریزوں کی آمد سے قبل مسلم انڈیا کی پوری تاریخ کے دوران بعض حکمرانوں اور مقتدر اشخاص کی ذاتی حرص و آز یا بوالہوسی کی بنا پر ہونے والی زیادتیوں اور مظالم کے انفرادی واقعات، اور ان کے ضمن میں بھی حقیقت اور افسانہ کے تناسب کی تحقیق سے قطع نظر واقعہ یہ ہے کہ کبھی کسی بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فساد یا تصادم کی تاریخ موجود نہیں ہے۔ بلکہ صورت حال وہ رہی ہے جس کا نقشہ اسی "برہمن زادہ" نے ان الفاظ میں کھینچا تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ ـ

اے شیخ و برہمن سنتے ہو کیا اہلِ بصیرت کہتے ہیں
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے

— یا باہم پیار کے جلسے تھے' دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے' یا قربانی یا جھٹکا ہے

تو کیا یہ مسئلہ واقعتاً غور طلب نہیں ہے کہ —— "کون" معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں؟۔

اس مقام پر اس بات کا حوالہ بھی یقیناً دلچسپی کا موجب ہو گا کہ بھارت کے ایک ہریجن لیڈر پالانی بابا نے اپنے ایک کتابچے میں' جو ۱۴۔ عزیز ملک اسٹریٹ نمبر۵' مدراس' تامل ناڈو سے شائع ہوا ہے' ہندوؤں کے سرکردہ مذہبی رہنما پوری شنکر آچاریہ کے اس قول کے حوالے سے کہ "اچھوت ہندو نہیں ہیں!" یہ دعویٰ کیا ہے کہ بھارت میں "ہندو" اکثریت میں نہیں بلکہ اقلیت میں ہیں' اس لئے کہ بقول ان کے "بھارت کی کُل آبادی کے ۲۵ فیصد اچھوت ہیں' ۲۰ فیصد مسلمان ہیں' ۳ فیصد عیسائی ہیں' ۲ فیصد سکھ ہیں' اعشاریہ سات فی صد بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ اور اس طرح بھارت کی غیر ہندو آبادی کل آبادی کا لگ بھگ ۵۱ فیصد بن جاتی ہے۔"

مزید بر آں' اس ضمن میں بھی بعض حقائق ایسے بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی کی تاریخ کے حوالے سے ان دونوں قوموں کے مابین تلخی کا زہر گھولنے کا سب سے مؤثر کام بھی بعض انگریز محققین اور مؤرخین ہی نے سرانجام دیا۔ جس کی سب سے نمایاں مثال ایودھیا کی بابری مسجد کا معاملہ ہے' اس لئے کہ اس کے بارے میں یہ تحقیق کہ یہ رام جنم استھان پر بنی ہوئی ہے ایک انگریز ہی کی جانب منسوب ہے۔ اور پھر ایک دوسرے انگریز یعنی سول جج نے بجائے مسئلے کو حل کرنے کے مسجد پر تالا ڈال کر اور مقدمے کو طول دے کر پورے معاملہ کو ایک ٹائم بم بنا کر رکھ دیا جو لگ بھگ سو برس بعد شدید ترین دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ اور ہندو مسلم کشیدگی میں ایک نئے باب کے اضافے کا ذریعہ بن گیا۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ۔ بہرحال ان جملہ حقائق کے علی الرغم یہ بات اپنی جگہ بالکل کوہِ ہمالیہ کے مانند اٹل ہے کہ مسئلہ کشمیر کے

مفانہ حل کے بغیر پاک بھارت تعلقات میں مستقل اور پائیدار بہتری کی کوئی صورت
انہیں ہو سکتی۔ لیکن اصل غور طلب بات یہ ہے کہ خود مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے
رے پاس کون کون سے آپشن موجود ہیں، اور وہ کس کس حد تک قابلِ عمل بھی ہیں
رمتوقع طور پر نتیجہ خیز بھی؟

سب سے پہلے جنگ کو لیجئے جس کی آج کل بار بار دہائی دی جا رہی ہے۔ سوال یہ
ہے کہ کیا یہ فی الواقع اور خصوصاً بحالاتِ موجودہ کوئی قابلِ عمل حل ہے؟ کیا ہم جنگی
ملاحیت کے اعتبار سے بھارت کے مقابلے میں آج کی نسبت ۶۵ء میں کہیں زیادہ بہتر
الت میں نہیں تھے؟ پھر اگر اُس وقت کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی تو آج اس کی
تنی امید کی جا سکتی ہے؟

مسلمانانِ کشمیر پر بھارت کی ننگی جارحیت اور بے پناہ ظلم و بربریت کے خلاف
کستان کی جانب سے کھلا اعلانِ جنگ صرف اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ ہمیں اپنے
وقف کے مبنی بر حق و انصاف ہونے کے ساتھ ساتھ سورۂ آل عمران کی آیت : ۱۶۰
کے ان الفاظ مبارکہ کے مطابق کہ : "اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ"
ینی "اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا" اللہ تعالیٰ کی نصرت و
تائید کا یقین بھی حاصل ہوتا۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سودی معیشت کے نظام کو
جاری رکھنے کے باعث خود ہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ برسرِ جنگ
ہیں، لہٰذا فرمانِ نبویؐ : "وَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِکَ؟" یعنی "ایسے شخص کی دعا
کیسے قبول ہو سکتی ہے؟" کے مطابق ہمیں اللہ کی نصرت و تائید کی امید کیسے ہو سکتی ہے!
بنابریں لے دے کر سارا معاملہ صرف مادی اسباب و وسائل کی کمیت اور کیفیت کا رہ
جاتا ہے، جس کا تقابلی جائزہ اور موازنہ آئے دن اخبارات کی زینت بنتا رہتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اس مستقل سنت کا مظہر ہے کہ: "کُلًّا نُّمِدُّ
ھٰۤؤُلَاۤءِ وَھٰۤؤُلَاۤءِ مِنْ عَطَاۤءِ رَبِّکَ" (بنی اسرائیل : ۲۰) یعنی "ہم انہیں اور

انہیں (یعنی طالبانِ دنیا اور طالبانِ آخرت) سب کی آپ کے رب کے فضل و عطا سے مدد کرتے رہتے ہیں!" کہ اس نے ہمیں اولاًا ۱۹۷ء میں سابق صدر امریکہ ' آنجہانی رچرڈ نکسن کے دل میں وہ بات ڈال کر جسے اُس وقت اندرا گاندھی نے "پرو پاکستان ٹلٹ" سے تعبیر کیا تھا' اس سے روسی وزیر اعظم کوسی جن کو ہاٹ لائن پر الٹی میٹم دلوایا جس کے حکم کے تحت اندرا گاندھی نے "یک طرفہ جنگ بندی" کا اعلان کیا' جس کے نتیجے میں ہمیں بارگاہِ خداوندی سے "مَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ" یعنی مزید مہلتِ عمل مل گئی۔ پھر یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اسی سنت کا مظہر ہے کہ بعد میں اس نے ہمیں اپنے خصوصی فضل و کرم سے خالص معجزانہ طور پر ایٹمی صلاحیت کے ذریعے ایک مؤثر ڈٹرنٹ عطا فرمادیا اور یہ بھی صرف اس لئے کہ اس کی حکمت و مشیت میں ابھی ہمارے "فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ" ("پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو!" الاعراف : ۱۲۹) والے امتحان کی مہلت اور مدّت ختم نہیں ہوئی ہے۔ جس پر ہمیں سورۂ انفطار کے ان الفاظِ مبارکہ کے مطابق کہ "یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الۡكَرِیۡمِ" یعنی "اے انسان تجھے کس چیز نے اپنے مہربان رب (کی جانب سے مہلت کی طوالت کے باعث اس کے مکافاتِ عمل کے قانون) کے بارے میں دھوکہ میں مبتلا کر دیا ہے؟" کے مصداق ہرگز دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ اس لئے کہ سورۂ اعراف کی آیت ۳۴ اور سورۂ یونس کی آیت ۴۹ میں وارد شدہ الفاظ کے مطابق یہ مہلت کسی بھی لمحہ ختم ہو سکتی ہے۔ اور پھر جب یہ اچانک ختم ہو جائے گی تو اس میں مزید توسیع و تاخیر کسی طرح ممکن نہ ہو گی' بمصداقِ : "فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ لَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّلَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ" (الاعراف : ۳۴) یعنی "پھر جب ان کی وہ معینہ گھڑی آجائے گی تو نہ یہ لوگ ایک ساعت آگے بڑھ سکیں گے نہ پیچھے ہی کھسک سکیں گے!"

مزید برآں سب جانتے ہیں کہ یہ ایٹمی صلاحیت بھی صرف "ڈٹرنٹ" ہی ہے۔ یعنی صرف بھارتی جارحیت کے خلاف ڈھال کا کام دے سکتی ہے۔ اسے خود بھارت پر حملہ

ِنے کے لئے استعمال کرنے کا خیال جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔ گویا
ؔ کے اعتبار سے یہ بھی جنگ کے "آپشن" کی نفی کے مترادف ہے!۔

رہا مسلمانانِ کشمیر کا سرفروشانہ اور بے مثال جہادِ حریت تو اس کے ضمن میں بھی
ؔبات سے ہٹ کر عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کہ کسی کھلم کھلا اور ٹھوس
ؔانی امداد کے بغیر آخر وہ اسے حکومت پاکستان کی صرف اخلاقی اور سفارتی مدد اور
ؔض نجی اداروں کی جانب سے چوری چھپے' اور وہ بھی اونٹ کے منہ میں زیرہ کے
ؔدر' امداد کے بل پر کب تک جاری رکھ سکیں گے؟

واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی بہت سے حلقوں' بالخصوص مذہبی گروہوں'
کی جانب سے عوام کو بہت بڑے بڑے مغالطے دیئے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اولاً جہادِ
افغانستان کا حوالہ دیا جاتا ہے' حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس معاملے میں ایک سپر پاور
کی کھلم کھلا' اعلانیہ اور فیصلہ کن مالی اور جنگی مدد حاصل تھی (جس کی بہتی گنگا میں خود
پاکستان کے بہت سے مقتدر افراد اور مذہبی جماعتوں نے خوب خوب ہاتھ دھوئے!)۔
لہذا کشمیر کے معاملے میں افغانستان کا حوالہ قیاس مع الفارق کی حیثیت رکھتا ہے۔ ثانیاً
اس کے ضمن میں سورۂ نساء کی آیت ۷۵ کا حوالہ بھی بہت شدّ و مد کے ساتھ دیا جاتا
ہے' یعنی :

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝

"(اے مسلمانو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزور و مجبور
مردوں' عورتوں اور بچوں (کی مدد) کے لئے جنگ نہیں کرتے جو دعا کرتے
رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے لوگ
ظالم ہیں اور ہمارے لئے خاص اپنے پاس سے حامی اور مددگار پیدا فرما!"

لیکن اس حقیقت کو جان بوجھ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ اس آیت کے مخاطب مدینہ منورہ کے وہ مسلمان تھے جنہوں نے خود اپنی ذات اور اپنے دائرۂ اختیار' اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے پورے معاشرے میں اللہ کے دینِ حق کے عادلانہ نظام کو بالفعل قائم' اور اس کی شریعت کے احکام کو بہ تمام و کمال نافذ کر دیا تھا۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ایک جانب تاحال ہم کتاب و سُنّت کی کامل بالادستی کا قولِ ثقیل زبانی کلامی طور پر بھی' اور اس دور میں بھی ادا نہیں کر سکے جبکہ ہمارے ملک میں اس نام نہاد "اسلامی جمہوری اتحاد" کی حکومت قائم تھی جس میں ملک کی تقریباً تمام قابلِ لحاظ مذہبی جماعتیں شامل تھیں اور اس حکومت کو پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت بھی حاصل تھی جس کے ذریعے دستور میں بآسانی مطلوبہ ترمیم کی جا سکتی تھی۔ دوسری جانب خود ہمارے عوام کی عظیم اکثریت ایک طرف جاگیرداروں اور وڈیروں کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہی ہے تو دوسری طرف سودی معیشت کی پیدا کردہ شدید مہنگائی' افراطِ زر' اور بے کاری کی آگ میں جل رہی ہے' اور تیسری جانب سیاسی عدم استحکام نے ملک کی سلامتی اور سالمیت کو مخدوش' اور مہیب و ہولناک کرپشن اور کروڑوں اور اربوں کے غبن اور خرد برد نے ملک کو دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچا دیا ہے۔

ان حالات میں سورۂ نساء کی متذکرہ بالا آیت کے حوالے سے "جہادِ کشمیر" کا غلغلہ بلند کرنے والوں کو یا تو عوامی چندوں میں سے اپنے کمیشن کے حصول کا لالچ ہو سکتا ہے' یا اولاً اپنی ذات اور اپنے دائرۂ اختیار میں شریعت کے بالفعل نفاذ' اور پھر اپنے پورے ملک اور معاشرے میں اسلام کے نظامِ عدل و قسط کو قائم کرنے کے لئے تن من دھن قربان کرنے کا کھکھیڑ مول لئے بغیر ع "کتنا حسیں فریب ہے جو کھا رہے ہیں ہم!" کے مصداق "جہاد و قتال فی سبیل اللہ" کے بلند و بالا مرتبہ و مقام پر فائز ہونے کا "حسین فریب" کھانے کا شوق ہو سکتا ہے ـــــ ورنہ ع "پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی!" کے مصداق کہاں سورۂ نساء کی اس آیتِ مبارکہ کے مخاطب اصحابِ رسول

(صلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہم) اور کہاں ہم پاکستانی مسلمان! ع "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!"

پاکستان اور بھارت کی کھلی جنگ یا مسلمانانِ کشمیر کے مسلح جہادِ حریت کے بعد مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے دوسرا آپشن یا متبادل راستہ یہ ہے کہ یو این او کے ذریعے، اور اس کی پینتالیس سال پرانی قراردادوں کے مطابق کشمیر میں استصواب کرانے کی کوشش کی جائے اور اس کے لئے خود بھی ایک جانب براہِ راست دوبارہ یو این او کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے اور دوسری جانب اس کے ذیلی اداروں، جیسے مثلاً حقوقِ انسانی کے کمیشن وغیرہ کے ذریعے عالمی رائے عامہ کو ہموار کر کے بھارت پر دباؤ بڑھایا جائے۔

یہ راستہ نظری اعتبار سے تو سب سے سیدھا اور اس قضیئے کے حل کے لئے بظاہر بالکل "صراطِ مستقیم" اور "سواء السبیل" کے مصداق نظر آتا ہے، لیکن اب سے تین چار سال قبل تک تو اس کی راہ میں یو ایس ایس آر کا ویٹو بھی حائل تھا اور امریکہ کی عدم دلچسپی بھی سدِ راہ تھی، لیکن اب چونکہ ایک جانب خلیج کی جنگ اور یو ایس ایس آر کی تحلیل بلکہ تجہیز و تکفین کے بعد بظاہر ویٹو کا خطرہ بھی ٹل گیا ہے اور دوسری جانب امریکہ نے بھی گہری دلچسپی لینی شروع کر دی ہے، لہٰذا اس کا منطقی نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہم ساری امیدیں اسی آپشن سے وابستہ کر دیں، لیکن نئی عالمی صورت حال میں یہ آپشن ہمارے لئے نہایت مہلک اور خطرناک بن گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ، جیسے کہ ع "جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے!" کے مصداق عالمی حالات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے، اب امریکہ کو "سول سپریم پاور آن ارتھ" یعنی روئے ارضی کی واحد عظیم ترین قوت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور وہ اپنی اس حیثیت کو پوری طرح بروئے کار لانے کے لئے "نیو ورلڈ آرڈر" کے قیام کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہا ہے، جس کے لئے یو این او اس کے

ساز بلکہ "خانہ زاد" ادارے کی حیثیت سے آلۂ کار کا کام کر رہا ہے۔ اور چونکہ
س نیو ورلڈ آرڈر کے کلی تسلط کی راہ میں واحد عظیم طاقت جو کسی حد تک بالفعل
راہ بنی ہوئی ہے وہ تو صرف چین ہے' البتہ ایک غیر اہم درجہ میں شمالی کوریا بھی
'اور سودے بازی اور بلیک میلنگ کی حد تک بھارت بھی' پھر عوامی جذبات کے
رسے پاکستان بھی کسی حد تک سدِ راہ ہے' اور حکومت کی سطح پر فنڈامنٹلسٹ
نے کے ناتے ایران بھی۔ مزید برآں مستقبل کے اندیشوں کے اعتبار سے افغانستان
امریکہ کے لئے "توجہ طلب" ہے تو روسی ترکستان کی حال ہی میں آزاد ہونے والی
لم ریاستیں بھی' لہٰذا امریکہ کو اس پورے علاقے میں "پولیس مین" کا کردار ادا
نے کے لئے ایک دوسرے "اسرائیل" کی شدید ضرورت ہے!

اس تناظر میں اندھے کو بھی نظر آسکتا ہے کہ۔ "الٰہی خیر میرے آشیاں کی۔
میں پر ہیں نگاہیں آسماں کی!" کے مصداق چچا سام کی نظریں کشمیر پر مرکوز ہو گئی ہیں
نہ اسے بھارت اور پاکستان دونوں سے "واگزار" کرا کے یا تو ایسی "آزادی" عطا کر
ی جائے جو۔ "اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا۔ کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے!" کی مصداقِ
امل ہو۔ یا انتداب کے نام سے کشمیر کے "میر" کو یو این او کی "زلفوں کا اسیر" بنا دیا
بائے۔ اور اس طرح مشرقی ایشیا کے عین قلب میں ایک دوسرا "اسرائیل" قائم کر
دیا جائے' جہاں سے بیک وقت چین' بھارت' پاکستان' افغانستان اور ترکستان سب کو
کنٹرول کیا جا سکے۔

کشمیر کے بارے میں امریکہ کے یہ عزائم اگرچہ چند ماہ قبل امریکہ کی نائب وزیر
خارجہ برائے جنوبی ایشیا مسز رابن رافیل کے بیان ہی سے طشت از بام ہو گئے تھے تاہم
اس سلسلے میں تفصیلی حقائق حال ہی میں بھارت کی دفاعی ریسرچ ٹیم کے سربراہ میجر
جنرل (ریٹائرڈ) افسر کریم کی مرتب کردہ رپورٹ کے ذریعے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ جس
کے مطابق امریکہ کے "خود مختار کشمیر" کے اس منصوبے میں مقبوضہ کشمیر اور آزاد

کشمیر کے علاوہ لدّاخ کے کچھ علاقے بھی شامل ہیں' اور یہ کہ: "اس سلسلے میں امریکہ نے بھارتی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے اپنی ایک خصوصی ٹیم جو ماہرین پر مشتمل ہے بھارت بھجوادی ہے!" چنانچہ فوری طور پر امریکہ کے ان "ماہرین" کا یہ کارنامہ بھی منصّہ شہود پر آچکا ہے کہ "آل پارٹیز حریت کانفرنس" کے نام سے کشمیری مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتوں اور گوریلا گروپوں کا جو مشترکہ پلیٹ فارم وجود میں آیا ہے اس کے دستور میں "آزاد و خود مختار کشمیر" کو بھی ایک متبادل آپشن کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا ہے! مزید بر آں' ہوا کے نئے رخ کا اندازہ درگاہ حضرت بال سرینگر میں ۳۱ دن محصور رہنے والے کشمیری لیڈر اور حریت پسند تنظیم "آپریشن بالاکوٹ" کے کمانڈر انچیف عمر خالد کے اس انٹرویو کے تیکھے انداز سے بھی بخوبی ہو سکتا ہے جو روزنامہ جنگ لاہور کی ۱۱/ مئی کی اشاعت میں شائع ہوا ہے' جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ: "کشمیری پاکستان سے مایوس ہو گئے ہیں اور مقبوضہ کشمیر میں خود مختاری کا نظریہ فروغ پانے لگا ہے" اور "پاکستان اقوامِ متحدہ کی قراردادوں پر عمل نہیں کرا سکتا تو اس سے الحاق کے لئے قربانیاں دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے!" وقِس علیٰ ذٰلک! جس پر حزب المجاہدین کے سپریم کمانڈر غلام محمد صفی صاحب کو بھی کچھ بے بسی کے سے انداز میں کہنا پڑا کہ "کشمیری مجاہدین کی تنظیموں میں بھارتی ایجنٹ داخل ہو گئے ہیں!" بہرحال ع "قیاس کُن ز گلستانِ من بہار مرا!" کے مطابق اس سے حالات کی سنگینی کا پورا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس صورت حال میں عافیت اسی میں ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے اس دوسرے اور بظاہر سیدھے آپشن کا خیال قطعی طور پر ذہن سے نکال دیا جائے۔ ورنہ استصوابِ رائے کے لئے بھارت اور پاکستان دونوں کی افواج کے دونوں کشمیروں سے انخلاء کے بعد ظاہر ہے کہ کشمیر کا مستقبل کُلی طور پر یو این او کے رحم و کرم پر ہو گا جس کے پردے میں امریکہ اس بندر کارروائی کردار بآسانی ادا کر سکے گا جس نے دو بلیوں کے مابین روٹی

کی "منصفانہ تقسیم" کے بہانے پوری روٹی خود ہضم کرلی تھی جبکہ دونوں بلیاں منہ دیکھتی رہ گئی تھیں!

گویا مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ہمیں تھرڈ آپشن کو اختیار کرنا ہوگا جو بھارت یا پاکستان میں سے کسی کے ساتھ الحاق کے ساتھ "آزاد و خود مختار کشمیر" کا تھرڈ آپشن نہیں' بلکہ پاک بھارت جنگ یا یو این او کی ثالثی کی بجائے پاکستان اور بھارت کے مابین براہِ راست مذاکرات کے ذریعے مفاہمت کی کوشش کا تھرڈ آپشن ہو! جس کے لئے دونوں ملکوں کے اصحابِ دانش و بینش کی حد تک تو زمین بہت کچھ ہموار ہو چکی ہے' لیکن دونوں ملکوں میں قائم انگریز کا موروثی پارلیمانی نظام سب سے بڑی سدِ راہ ہے۔ اس لئے کہ حکومتیں اگر مفاہمت اور اصلاحِ حال پر آمادہ ہوتی بھی ہیں تو دونوں ملکوں کی اپوزیشن پارٹیاں سینتالیس سال کے دوران سرحد کے دونوں جانب کے عوام کی راسخ ہو جانے والی اجتماعی نفسیات کو مشتعل کرکے کسی اقدام کو ناممکن بنا دیتی ہیں! جس کا سب سے نمایاں مظہر یہ ہے کہ متعدد دو طرفہ مسائل کے ضمن میں معاہدات کی جملہ تفاصیل طے ہو جانے اور ان پر جانبین کے پوری طرح متفق ہو جانے کے باوجود ان پر دستخطوں کی نوبت نہیں آپاتی!

کاش کہ پاکستان اور بھارت دونوں کے عوام و خواص سب کو اس صورت حال کا صحیح صحیح اندازہ ہو جائے اور یہ دونوں ملک سو سالہ ہندو مسلم منافرت اور سینتالیس سالہ پاک بھارت مخاصمت کی "دیوارِ برلن" میں کوئی فیصلہ کن شگاف ڈالنے کا انقلابی قدم اٹھا سکیں۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کیا اس وقت پاکستان میں اسلامی آئین نافذ ہے؟ اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد اور تحریک چلانا ضروری ہے یا نہیں؟

تحریک اسلامی انقلاب پاکستان کے استفتاء کے جواب میں

مولانا سید جمال الدین کاظمی کی مبسوط تحریر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

○ سوال : کیا پاکستان میں اسلامی آئین نافذ ہے یا نہیں؟

☆ جواب : فمنه الصدق والصواب

الحمدُ للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خاتم النبیین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ---- امابعد :

اس سوال میں دو لفظ قابل غور ہیں جن کو سمجھنے پر سوال کا جواب موقوف ہے۔

(۱) آئین (۲) نفاذ

آئین

آئین کسی ملک کے وہ بنیادی اصول ہوتے ہیں جن پر ملک کے تمام معاملات کا انحصار ہوتا ہے۔ آئین ملکی منافع و مصالح، اندرونی معاملات و بیرونی تعلقات، حاکم و رعایا کے تعلقات اور حقوق رعایا کی بہبود اور ان کے آپس کے معاملات و تنازعات، کاروبار معیشت و معاشرت وغیرہ کے اصولوں کا مجموعہ ہے۔

اسلامی آئین سے مراد وہ اصول و ضوابط ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے مقرر فرمائے ہیں، جن کی تشریح و توضیح معلم کائنات سید العالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ اسلامی آئین کے قرآن و سنت دو بنیادی ماخذ ہیں، ان ہی کی روشنی میں اجماع و قیاس دیگر ماخذ شروع ہیں، لیکن قیاس و اجماع بہرحال و بہرصورت قرآن و سنت کے تابع ہوں گے تو مقبول اور صحیح ہوں گے ورنہ ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہوگی۔

نافذ

نافذ لغت عربی کا لفظ ہے جس کا معنی یہ ہے: ایسا حکم جس کی فرمانبرداری کی جائے۔ [1]
اس وضاحت کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آچکی ہے کہ نفاذ اور تدوین میں فرق ہے۔

اولاً: آئین پاکستان اسلامی نہیں ہے بلکہ عامۃ المسلمین کو محض دھوکہ دینے کے لئے اس میں قرارداد مقاصد وغیرہ کے رنگین الفاظ کو شامل کرکے اور چند لچھے دار عبارتیں لکھ کر اسلامی آئین کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والے لوگوں کو گمراہ کرنے اور ان کی زبان بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ ضرورت تدوین و ترتیب کی نہیں بلکہ نفاذ کی ہے کیونکہ اسلامی آئین قرآن و سنت کی صورت میں مدون و مرتب موجود ہے، اس کی تشریحات فقہاء اور ائمہ مجتہدین کرچکے ہیں، کیونکہ قانون اصولوں کے ایک ایسے مجموعہ کا نام ہے جس کو قومیں اپنی ضرورت کے مطابق ترتیب دیتی رہتی ہیں، ذہنی اور فکری ارتقاء کے ساتھ وہ بھی بہتر ہو جاتا ہے اور علمی و فکری انحطاط سے وہ بھی کمزور اور خراب ہو جاتا ہے، یعنی عام قوانین عام لوگوں کی حالت پر موقوف ہوتے ہیں، قومی تہذیب و تمدن اور فکری عروج و زوال کی علامت ہوتے ہیں، اس طرح ان میں ہر وقت رد و بدل ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ وہ انسانی دماغوں کی تخلیق ہوتے ہیں اس لئے وہ ان کے ہی تغیر و تبدل اور ثبات کے عکاس ہوتے ہیں۔ جبکہ اسلامی آئین و قوانین اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ہیں جو خالق و مالک ہے، ہر قسم کے حوادث اور تغیرات سے پاک ہے، جس سے کوئی چیز غیب

---

[1] المنجد، ص ۱۳۰۱، مفردات امام راغب ص ۵۲۰، مقاییس اللغہ ص ۴۵۸۔

بلکہ وہ علیم و خبیر ہے۔ ایسی ذات جو علم و حکمت کی خالق ہے اس کے مقرر کردہ اصول اور وہ بھی اپنی مخلوق کے لئے' تو کیا ان میں کوئی کمی یا خرابی رہ گئی ہو گی یا واقع ہو سکتی ہے۔ اپنی مخلوق کی ضروریات' احوال اور تقاضوں کو اس سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ لہٰذا ایسا کہنے والے لوگ کہ اسلامی نظام ترقی پذیر دور کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا' نعوذ اللہ' اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کے منکر ہیں۔ دور کی ترقی کیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کو ہوائی جہاز کے بننے کا پہلے علم نہیں تھا؟ اور وہ دماغ جس نے ہوائی جہاز بنایا ہے اسے کس نے بنایا؟[1] اور پھر بھی اگر کوئی کور باطن اپنی ضد پر رہے تو بتایئے کہ جہاز اگر ترقی یافتہ دماغوں نے بنایا ہے تو اسے گراتا کون ہے' ترقی یافتہ دماغ اس کو حادثات سے محفوظ کیوں نہ کر سکے اور ایسے ہی ترقی یافتہ لوگ ابھی تک تقدیر سے کیوں محفوظ نہ ہو سکے؟ کیا موت کا علاج دریافت کر لیا گیا ہے یا بارش برسالی ہے؟ کیا چاند اور سورج کی رفتار میں فرق لا سکے؟ کیا بے نور آنکھوں کو انہوں نے منور کر لیا؟ اگر یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے تو ترقی اور تنزلی کا خالق بھی وہی ہے۔ اور کوئی زمانہ اور اس کے معاملات اس سے کیسے پوشیدہ رہ سکتے ہیں جبکہ ان کو وجود ہی اس نے عطا کیا۔ لہٰذا شریعت محکم ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا اور وہ ہی ہر دور ہر معاشرے کی ضروریات پر پوری اترتی ہے۔ اسے انسان کیا مدون کرے گا' وہ قرآن و سنت کی صورت میں مکمل مدون موجود ہے۔ اگر انسان اپنی ذہنی کمزوری کے باعث اس سے کسی معاملے کا حل نہیں سمجھ سکتا یا تلاش نہیں کر سکتا تو ان کی روشنی میں اجماع و قیاس کا راستہ موجود ہے لیکن وہ بھی قطعاً محدود جس کو قرآن و سنت کی حدود و قیود اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہوں۔ ایسی صورت میں کسی نئے آئین کی تدوین کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی اور اگر تدوین اپنی کمزوری کے باعث ضروری بھی سمجھی جاتی ہے تو عین قرآن و سنت کے مطابق کر لی جائے۔ لیکن آج تک پاکستان میں اسلامی آئین کی تدوین نہیں ہو سکی' چند دفعات میراث وغیرہ کے سلسلہ کی نافذ ہیں' اس کے علاوہ کچھ بھی اسلامی آئین نافذ نہیں۔ ضرورت تدوین کی نہیں بلکہ نفاذ کی ہے۔ اور نفاذ کا معنی جس طرح بیان کیا جا چکا ہے اس کے مطابق چند دفعات کے علاوہ پاکستان

---

[1] وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (الصافات : ۹۶)

ں احکام خداوندی کی فرمانبرداری نہیں کی جا رہی بلکہ ان کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ اور ظلم یہ
لہ حدود اللہ میں بھی آج کے حکام ردوبدل کر رہے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ پاکستان میں اسلامی
ظام نافذ نہیں ہے بالکل درست اور واقعہ کے مطابق ہے۔ کیونکہ جہاں اقامتِ صلوٰۃ کے
ہتمام کی بجائے تضییعِ صلوٰۃ کا اہتمام کیا جاتا ہو' جہاں عشر و زکوٰۃ کی بجائے ظالمانہ ٹیکسوں
سے عوام کی کمر توڑی جا رہی ہو' جہاں پردہ کا قانون نافذ نہ ہو' بے حیائی اور عریانی' فحاشی
اور بے غیرتی کو سرکاری ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ترقی دی جا رہی ہو' جہاں غرباء و مساکین'
یتامیٰ اور بیواؤں تک کے حقوق کا خیال نہ رکھا جاتا ہو' جہاں ارکان حکومت رمضان
المبارک کی بے حرمتی کرنے میں جری ہوں' جہاں نظام عدل اور اکثر قوانین یہود و نصاریٰ
کے جاری ہوں' ملک کے اعلیٰ مقتدر لوگ بے پردہ خواتین کی محفلوں میں شرکت کرتے
ہوں' جہاں ثقافت کے نام پر تہذیب اسلامی کو تباہ کیا جا رہا ہو' جس ملک میں مخلوط تعلیم و
ملازمتیں جاری ہوں' جہاں بناتِ قوم کو لالچ کے ذریعہ بے پردگی پر مائل کیا جا رہا ہو' ترقی
کے نام پر اسلامی اقدار و اخلاق کو پامال کیا جا رہا ہو' جس ملک کی پالیسیاں بے دین اقوام بناتی
ہوں' جہاں نہ جہاد ہو اور نہ جہاد کی اسلامی شرائط' جہاں اعلاءِ کلمۃ اللہ کا اہتمام نہ ہو' جہاں
کے حاکم اور عادل فساق معلن ہوں' عوام کی جان و مال محفوظ نہ ہو' ارکان حکومت
عیاشیوں اور فضول خرچیوں میں مبتلا ہوں' مساوات اور بنیادی انسانی حقوق کو تاخت و
تاراج کیا جا رہا ہو۔ رشوت' سفارش اور سود کی حکمرانی ہو' عدل و انصاف نیلام ہو رہا ہو'
غیرت اسلامی کی بجائے کسل و جبن' خوف اور بخل کی بادشاہت ہو' قومی نفرتوں' لسانی اور
صوبائی عصبیتوں کی خون آشامیاں عروج پر ہوں۔ جہاں سیاست مکاری اور فریب کاری'
جبر و تشدد' جھوٹ اور وعدہ خلافی کے ستونوں پر قائم ہو' جہاں محبت کی جگہ نفرتوں نے لے لی
ہو' جہاں اطاعت کی بجائے سرکشی اور تمرد کا راج ہو' ایسے ملک کے متعلق یہ کہنا کہ یہاں
اسلامی نظام نافذ ہے کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ اگر اسلامی نظام نافذ ہوتا تو ملک و قوم اور
حاکم و محکوم کی یہ حالت ہرگز نہ ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول [1] ہوتا اور
عدل و انصاف کا بول بالا ہوتا۔

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

۱۹۷۳ء کے آئین کی غیر اسلامی دفعات

۱۹۷۳ء کے آئین میں یوں تو اکثر غیر اسلامی دفعات ہیں' ہم نے سرسری جائزہ لینے کے بعد یہاں صرف چند ایسی دفعات کا ذکر کرنا مناسب سمجھا ہے تاکہ سوال کے جواب میں مزید تقویت پیدا ہو سکے۔

عوام کی معاشرتی اور معاشی بہبود کے ذیل میں یہ شق ہے۔

"تمام ملازمین کے لئے بیمہ لازمی قرار دیا جائے گا"۔ ؎۴

بیمہ کا غیر اسلامی ہونا' ملک کے مقتدر اہل فتویٰ علماء کی تصریحات سے واضح ہے' پھر ایک ناجائز چیز کو لازم قرار دینا کس قدر تکلیف دہ اور قابل مذمت ہے۔ بیمہ کے علاوہ بھی تو مزدوروں کی بہبود کے کئی اور ذرائع اختیار کئے جا سکتے تھے جو بیمہ سے زیادہ مفید بھی ہوتے ہیں اور اسلامی بھی۔

صدر مملکت کے انتخاب کی اہلیت کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ذکر کی گئی ہیں :

- عمر ۴۵ سال سے کم نہ ہو۔
- پاکستان کا شہری ہو۔
- اس کا نام انتخابی فہرست میں موجود ہو۔
- اسے کسی با اختیار عدالت نے دماغی مریض نہ قرار دیا ہو۔ ؎۵

؎۳ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (الاعراف : ۹۶)

ترجمہ :۔ "اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ضرور ہم کھول دیتے ان پر برکتیں آسمان کی اور زمین کی"۔

؎ هٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الانعام : ۱۵۶)

ترجمہ :۔ "اور یہ (قرآن) کتاب ہے جسے ہم نے اتارا ہے' بابرکت ہے' سو پیروی کرو اس کی اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔

؎۴ آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان' ص ۴۴ و ۴۵' مطبوعہ مکتبہ فریدی کراچی

؎۵ آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان' ص ۴۵

ایک اسلامی ریاست کے سربراہ کے لئے یہ شرائط قطعاً ناقص اور ناکافی ہیں۔ ان شرائط میں صدر کی تعلیمی اہلیت کے بارے میں کوئی شرط نہیں رکھی گئی۔ یعنی اگر کوئی انگوٹھا چھاپ شخص بھی منتخب ہو جائے تو وہ صدر بن سکتا ہے۔ ایک بینک کے ایڈمنسٹریٹر کے لئے بھی کم از کم گریجویشن شرط ہوتی ہے لیکن اسلامی ملک کے سربراہ کے لئے تعلیم کی کوئی شرط نہیں۔ جس شخص کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ اپنے ایک حکم کے ذریعے کسی بھی قانون کو نافذ کر سکتا ہو یا کسی بھی قانون کو کالعدم کر سکتا ہو اس کے لئے احکام شرعیہ کا علم از بس ضروری ہے۔ احکام شرعیہ کے علم سے بے خبری کے بھیانک نتائج کی ایک مثال یہ ہے کہ چند سال قبل جب ٹی وی والوں نے "الہدیٰ" کے پروگرام میں مردوں اور عورتوں کی بے حجاب مخلوط نشست سے "الہدیٰ" کے مقرر ڈاکٹر اسرار احمد کو خطاب کی دعوت دی اور انہوں نے اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ میں غیر شرعی اجتماع سے خطاب نہیں کروں گا اور عورتوں نے اس پر جلوس نکالا اور جلسے کئے تو سابق صدر نے یہ کہہ کر ٹی وی کے مجوزہ پروگرام کی تصدیق کر دی کہ پاکستان میں ڈاکٹر اسرار کی حکومت نہیں ہے' میری حکومت ہے۔ل

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ "اسلام میں حکم دینے کا حق صرف اللہ کا ہے"۔

ل اخبارات نے بالعموم اس واقعے کو جس انداز میں رپورٹ کیا اس سے بہت سے لوگوں نے یہ تاثر لیا کہ خواتین نے محترم ڈاکٹر صاحب کے خلاف جلوس اس لئے نکالا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے مخلوط نشست سے خطاب کرنے سے انکار کیا تھا۔ یہ دراصل دو الگ الگ واقعات ہیں جن کو جوڑ کر ایک واقعے کی شکل دی گئی۔ اصل بات یہ تھی کہ روزنامہ "جنگ" میں ڈاکٹر صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا جس میں ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے صاف الفاظ میں یہ کہا تھا کہ "عورت کا اصل دائرہ کار گھر کی چار دیواری ہے' خواتین کا ایسے دفاتر میں کام کرنا جہاں مرد بھی کام کرتے ہوں' صریحاً خلاف اسلام ہے۔" ان دنوں ٹی وی پر "الہدیٰ" پروگرام بھی چل رہا تھا۔ کچھ مغرب زدہ خواتین نے اس انٹرویو کے ردعمل کے طور پر کراچی میں ڈاکٹر صاحب کے خلاف جلوس نکالا اور "الہدیٰ" کی بندش کا مطالبہ کیا۔۔۔ باقی یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ "الہدیٰ" پروگرام کے آغاز میں ٹی وی انتظامیہ کا تقاضا تھا کہ سامعین میں مردوں کے ساتھ خواتین کو بھی شریک کیا جائے لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایسے مخلوط ماحول میں درس دینے سے معذرت کی' بالآخر ٹی وی انتظامیہ نے ڈاکٹر صاحب کے اس موقف کے آگے [illegible]

اِن شرائط کے تحت منتخب ہونے والے صدور رچہ سقا کے قبیل سے ہی ہو سکتے ہیں۔
اتنا ناقص آئین تو شاید غیر اسلامی ممالک میں بھی نافذ نہ ہو گا' چہ جائیکہ اسلامی ریاست کا آئین۔

صدر کے فرائض و اختیارات کے تحت لکھا ہے :

"صدر مملکت کو تنخواہ' رہائش اور دیگر ایسی سہولیات کے علاوہ.........وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں کسی عدالت کے سامنے جواب دہ نہیں۔ اس کے عہدے کی مدت کے دوران میں اس کے خلاف سول یا کریمینل کارروائی نہیں ہو سکتی' نہ ہی اسے مجرم گردانا جا سکتا ہے اور نہ اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے جا سکتے ہیں"۔ [۷]

وزیر اعظم کے بارے میں لکھا ہے :

"وزیر اعظم اپنے اختیارات اور فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں کسی عدالت کے سامنے جواب دہ نہیں ہو گا۔" [۸]

گورنر کے بارے میں لکھا ہے :

"گورنر اپنے فرائض کی ادائیگی کے ضمن میں کسی عدالت میں جواب دہ نہیں ہو سکتا۔" [۹]

نیز لکھا ہے :

"گورنر کے خلاف کسی عدالت میں ایسی کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی جس میں اسے مجرم گردانا گیا ہو اور نہ اس کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو سکتے ہیں دیوانی مقدمات میں بھی گورنر کے خلاف کارروائی نہیں ہو سکتی۔" [۱۰]

وزیر اعلیٰ کے بارے میں لکھا ہے :

۷۔ آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان' ص ۵۰
۸۔ آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان' ص ۴۵
۹۔ آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان' ص ۷۰
۱۰۔ آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان' ص ۷۱

"وزیر اعلیٰ اپنے فرائض کی انجام دہی اور اختیارات کے استعمال کے لئے کسی عدالت میں جواب دہ نہیں ہو گا۔"[۱۱]

سلامی قانون کی گرفت سے کوئی شخص بالاتر نہیں ہے' خواہ وہ صدر ہو' وزیر اعظم ہو' ور نر ہو یا وزیر اعلیٰ ہو۔ صدر کو عدالت سے تحفظ دینے کے سلسلے میں آئین کے اندر یہ جیہہ لکھی ہے :

"یہ مراعات روایتی قسم کی ہیں اور ہمیشہ ہر دستور میں سربراہ مملکت کو دی جاتی ہیں۔ گویا اس صورت میں اس کی حیثیت برطانوی سربراہ مملکت کی سی ہے۔"[۱۲]

، اسلامی ریاست کا آئین ہے' برطانوی ریاست کا آئین نہیں' اس لئے اس آئین کے ت صدر وغیرہ کو صرف وہی مراعات ملنی چاہئیں جو کسی اسلامی مملکت کے سربراہ کو مل سکتی ں۔

قومی اسمبلی کے بارے میں لکھا ہے:

"پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں سے قومی اسمبلی زیادہ بااختیار ادارہ ہے اور اسے قانون سازی اور مالی امور میں تقریباً فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔"[۱۳]

، ایسا بااختیار ادارہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے ماہر علماء اور دانشوروں کے مرتب کردہ قوانین کو بھی منسوخ کر سکتا ہے۔ اور قومی اسمبلی کے وہ ممبران جن کی رائے سے ک میں کوئی قانون بن سکتا ہے یا کوئی قانون منسوخ ہو سکتا ہے ان کی اہلیت کی شرائط آئین ں حسب ذیل بیان کی گئی ہیں۔

- پاکستان کا شہری ہو۔
- عمر اٹھارہ سال سے کم نہ ہو۔

---

۱۱ آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان' ص ۴۷

۱۲ آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان' ص ۵۱

۱۳ آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان' ص ۵۵

○ اس کا نام انتخابی فہرست میں شامل ہو۔
○ کسی بااختیار عدالت نے اسے دماغی مریض نہ قرار دیا ہو۔ [۱۸]

ان شرائط میں تعلیمی قابلیت اور اسلامی علوم کا کوئی ذکر نہیں۔ کلرک بننے کے لئے بھی کم از کم میٹرک کی شرط ہے لیکن ملک کے سب سے زیادہ بااختیار قانون ساز ادارے کیلئے میٹرک پاس ہونے کی بھی شرط نہیں ہے اور پیسے اور اثر و رسوخ کے بل پر ایک انگوٹھا لگانے والے شخص کو بھی اس آئین میں کسی چیز کو جائز یا ناجائز قرار دینے کا حق دے دیا ہے۔

○ دوسرا سوال : اسلامی آئین کے نفاذ کی شرعی حیثیت اور ضرورت کیا ہے؟
☆ جواب :

قرآن مجید سے اسلامی آئین کی اہمیت

قرآن مجید کی حسب ذیل آیات سے اسلامی آئین کی شرعی حیثیت اور ضرورت واضح ہو جاتی ہے :

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج : ۴۱)

"وہ لوگ (ایسے ہیں کہ) اگر ہم انہیں زمین میں سلطنت عطا فرمائیں تو وہ نماز کا نظام قائم کریں' زکوٰۃ کا نظام قائم کریں' امر بالمعروف و نہی المنکر (احکامِ شرعیہ) کی تبلیغ کا نظام قائم کریں۔"

وَاِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ○... (المائدہ : ۴۲)

"اور جب آپ حکم بنیں تو عدل کے حکم ساتھ دیں' اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں کو

---

[۱۸] آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان' ص ۵۴

پسند کرتا ہے۔"

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ---(المائدہ : ۴۸)

"ان لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکامات کے مطابق حکم نافذ کیجئے اور اس حق (احکام الٰہیہ) سے تجاوز کر کے ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے۔"

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ هُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُوْنَ ○ ---(المائدہ:۴۹)

"ان لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے نازل شدہ احکامات کے مطابق احکام نافذ کیجئے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے اور ان سے اجتناب کیجئے کہیں وہ آپ کو آپ پر نازل کردہ بعض احکام الٰہیہ سے پھیر نہ دیں۔ اور اگر یہ روگردانی کریں تو جان لیجئے کہ اللہ انہیں ان کے بعض گناہوں کی سزا دینا چاہتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں۔"

يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ○ ---(ص : ۲۶)

"اے داؤد ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنا دیا پس آپ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ احکام دیجئے اور خواہش کی پیروی نہ کریں (کیونکہ خواہش کی پیروی) آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے بہکا دے گی۔ بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لئے عذابِ شدید ہے کیونکہ وہ یوم حساب کو بھول گئے۔"

اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ ○ ---(التین : ۸)
"کیا نہیں اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم؟"

اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ---(الانعام : ۵۷)
"حکم صرف اللہ کا ہے۔"

یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ ---(النساء : ٦٠)
"کیا یہ لوگ شیطان کو حاکم بنانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ شیطان کے ساتھ کفر کریں۔"

اَفَحُکۡمَ الۡجَاہِلِیَّۃِ یَبۡغُوۡنَ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکۡمًا لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ○ ---(المائدہ : ۵۰)
"کیا یہ لوگ جاہلیت کے احکام (نافذ کرنا) چاہتے ہیں اور یقین کرنے والوں کے لئے اللہ کے احکام سے بہتر کس کے احکام ہو سکتے ہیں؟"

وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ○
(المائدہ : ۴۴)
"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق احکام نافذ نہ کریں وہ کافر ہیں۔"

وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ○
---(المائدہ : ۴۵)
"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق احکام نافذ نہ کریں وہ ظالم ہیں۔"

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ○---(المائدہ : ۴۷)

"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق احکام نافذ نہ کریں وہ فاسق ہیں۔"

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ---(الاعراف : ۵۴)

"سن لو! اسی کے لئے خاص ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔"

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ ---
(النساء : ۶۵)

"پس (اے مصطفیٰ) تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حاکم بنائیں آپ کو ہر اس جھگڑے میں جو پھوٹ پڑا ہے ان کے درمیان، پھر نہ پائیں اپنے نفسوں میں تنگی اس سے جو فیصلہ آپ نے کیا۔"

وَإِذَا دُعُوْا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○---(النور ۴۸)

"اور جب انہیں اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ رسول ان میں (اللہ کے احکام) نافذ کریں تو اس وقت ان میں سے ایک فریق روگردانی کرتا ہے۔"

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوْا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○---(النور : ۵۱)

"اور جب مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ رسول ان میں احکام (الٰہیہ) نافذ کریں تو وہ کہتے ہیں ہم نے حکم سنا اور اس کو تسلیم کیا۔ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

احادیث سے اسلامی آئین کی اہمیت

حسب ذیل احادیث اور آثار سے اسلامی آئین کی ضرورت اور اہمیت واضح ہوتی ہے۔

عن نافع بن عمرو الطائی قال شهدتُ ابا بکر وهو عَلَی المنبر يقول: مَن ولیّ من اَمر امةِ محمدٍ شيئًا فلم يقم فيهم بکتاب الله فعليه لعنة الله[۱۵]

"نافع بن عمرو طائی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا درآنحالیکہ وہ منبر پر فرما رہے تھے: جو شخص امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانروا ہوا اور اس نے ان میں کتاب اللہ کے احکام نافذ نہیں کئے اس پر اللہ کی لعنت ہو۔"

عن رافع الطائی عن ابی بکرٍ الصديق انه خطب الناسَ فذکر المسلمين فقال: من ظلم منهم احدًا فقد اخفر ذمةَ الله ومن وَلیّ مِن امور المسلمين شيئًا فلم يعطهم کتابَ الله فعليه لعنتُ الله[۱۶]

"رافع طائی بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خطبہ دیتے ہوئے مسلمانوں کا ذکر کیا اور فرمایا: جس شخص نے کسی بھی مسلمان پر ظلم کیا اس نے اللہ کے ذمہ کو توڑ ڈالا اور جو شخص مسلمانوں کے کسی منصب پر فائز ہوا اور اس نے کتاب اللہ کے احکامات نافذ نہیں کئے اس پر اللہ کی لعنت ہو۔"

عن علی قال: حقٌّ علَی الامام ان يَحکم بمَا انزل الله

۱۵ل علامہ متقی بن حسام الدین، متوفی ۹۷۵ھ، کنز العمال ج ۵ ص ۷۵۲، مطبوعہ موسسہ الرسالہ بیروت

۱۶ل علامہ متقی بن حسام الدین، متوفی ۹۷۵ھ، کنز العمال ج ۵ ص ۷۵۴،

وانّ یؤدی الامانۃ فاذا فعل فحقٌ علی الناس ان یسمعوا لہ وان یطیعوا وان یجیبوا اذا دعوا[۱۷]

"حضرت علی ؓ فرماتے ہیں کہ سربراہ مملکت پر فرض ہے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق احکام نافذ کرے اور امانت ادا کرے' جب ایسا کر لے تو لوگوں پر واجب ہے کہ اس کی بات سنیں' اس کا حکم مانیں اور اس کی پکار پر لبیک کہیں۔"

○ تیسرا سوال : اگر کسی اسلامی ملک میں اسلامی آئین نافذ نہیں تو اس ملک کے عوام' علماء اور مشائخ پر از روئے شرع کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے' نیز اس ذمہ داری سے عہدہ بر آنہ ہونے کی صورت میں ان کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟

☆ جواب :

اجتماعی نظام اور انفرادی عبادت میں فرق

اسلامی آئین اسلامی ملک کے قوانین اسلامیہ کی اساس ہے۔ اسلامی آئین نافذ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس اسلامی ملک میں وہ احکام شرعیہ نافذ نہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے اجتماعی معاشرے سے ہوتا ہے۔ مثلاً جمعہ اور جماعت کو قائم کرنے کے لئے حکومت کا انتظام کرنا' زکوٰۃ کی وصولیابی کا انتظام کرنا' زکوٰۃ کو ان کے مصارف میں خرچ کرنے کا انتظام کرنا' حدود الٰہیہ کو قائم کرنا۔ جس میں شرابی پر اسی کوڑے' تہمت لگانے والے کو اسی کوڑے' غیر شادی شدہ زانی یا زانیہ کو سو کوڑے لگائے جائیں اور شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا جائے' چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا جائے' مرتد کو قتل کیا جائے۔ ڈاکوؤں کے لئے اسلام نے چار سزائیں مقرر کی ہیں۔ قتل اور سولی' صرف قتل' ہاتھ

۱۷۔ علامہ متقی بن حسام الدین' متوفی ۹۷۵ھ' کنز العمال ج ۵ ص ۷۵۲' مطبوعہ موسسہ الرسالہ بیروت

ؤں کو کاٹنا اور شہر بدر کرنا ' ڈاکوؤں کی مختلف نوعیتوں کے اعتبار سے جاری ہوتی ہیں۔
ی طرح قتل کے بدلے قتل کا نظام جاری کرنا' جس کو اصطلاح شرع میں قصاص سے تعبیر کیا
جاتا ہے۔ قتل خطایا صلح عن عمد کی صورت میں دیات کا نظام' ان کے علاوہ اور دیگر دیوانی
ور فوجداری معاملات میں ظالموں سے مظلوموں کے حقوق دلوانے کے لئے قضاء کا نظام
ائم کرنا۔ یہ اسلام کے وہ احکام ہیں جن کا اجتماعی نظام کے ساتھ تعلق ہے۔

یاد رکھئے اسلام صرف انفرادی عبادات اور معاملات کا نام نہیں ہے۔ اسلام اجتماعی
ام کو لے کر چلتا ہے۔ یہ نظام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک اسلامی حکومت
ئم نہ کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں اسی لئے
لامی حکومت قائم کی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جنازۂ رسول ﷺ کی
فین اس لئے مؤخر کر دی تھی تاکہ مسلمانوں کی اجتماعیت اور مرکزیت فوت نہ ہو جائے۔
صغیر کی تقسیم بھی اسی لئے عمل میں لائی گئی تھی۔ اگر انفرادی طور پر نماز' روزہ کافی ہوتا تو
انگریز کی حکومت میں کیا بُرے تھے یا ہندوؤں کے ساتھ متحدہ وطن حاصل کرنے میں کیا
ت تھی؟ بات صرف یہی تھی کہ دین اسلام ہم سے اجتماعی نظام کے قیام کا مطالبہ کرتا
ہے' حدود' قصاص اور تعزیرات کے نفاذ کا تقاضا کرتا ہے اور اسلام کا یہ مطالبہ اور تقاضا ہم
س وقت تک پورا نہیں کر سکتے جب تک کہ مسلمان ایک اسلامی حکومت قائم نہ کر لیں۔
ر اگر اسلامی حکومت قائم کرنے کے بعد بھی اسلام کے اس اجتماعی نظام کو قائم نہ کیا جائے
اس حکومت کا کوئی مقصد نہیں۔

ائی نظام کا شرعی حکم

جہاد اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ اعلاءِ کلمۃ اللہ کیا جائے' ہجرت اسی لئے فرض ہے کہ
روں کے ملک میں رہ کر مسلمان اجتماعی نظام قائم نہیں کر سکتے۔ پس جس طرح مسلمانوں
جرت فرض ہے' جس طرح جہاد فرض ہے' اسی طرح مسلمانوں پر اجتماعی نظام کے لئے
اور جدوجہد کرنا فرض ہے' خواہ عوام ہوں یا علماء۔ اور جو لوگ اس فرض کے تارک
لوگ ایک عظیم اور اہم فرض کے تارک ہیں۔ اب ہم ایسی احادیث کو پیش کر رہے

ہیں جن سے حدود و تعزیرات اور اسلام کے اجتماعی نظام کی اہمیت واضح ہو گی۔

عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اقيموا حدود الله فى القريب والبعيد ولا تاخذ كم فى الله لومة لائم ---- (رواه ابن ماجه)[۱۸]

"حضرت عبادہ بن صامت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریب اور بعید میں اللہ کی حدود قائم کرو اور اللہ کی حدود قائم کرنے سے تمہیں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت باز نہ رکھے"

عن ابن عباس رضى الله عنهما: اذا ظهر الزنا والربوٰ فى قرية فقد احلوا بانفسهم عذاب الله[۱۹]

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ جب کسی شہر میں زنا کھلے عام ہونے لگے اور علی الاعلان سود کھایا جائے یا کھایا جائے تو وہ لوگ اپنے اوپر اللہ کے عذاب کو حلال کر دیتے ہیں۔"

○ چوتھا سوال : اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد اور تحریک چلانا کس ضروری ہے یا نہیں؟ اور اس جدوجہد میں مجروح یا مرجانے والے کا شرعی حکم کیا

☆ جواب : جب کسی اسلامی ملک میں کھلے عام حدود الٰہیہ کو پامال کیا جا رہا ہو، الٰہیہ سے علی الاعلان بغاوت ہو رہی ہو، جوا، شراب، زنا، سود، قتل و غارت گری، لوٹ ڈکیتی، رشوت، بے پردگی اور بے حیائی عام ہو جائے تو ضروری ہے کہ کچھ لوگ اقامت دین کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، ورنہ پوری قوم گناہگار ہو گی اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کی مستحق قرار پائے گی۔ اسلامی نظام کیلئے تحریک چلانے والوں کی موت شہادت ہے۔

---

۱۸ شیخ ولی الدین عراقی، متوفی ۷۴۲ھ۔ مشکوٰۃ ص ۳۱۳، مطبوعہ اصح المطابع دہلی

۱۹ علامہ متقی بن حسام الدین ہندی، متوفی ۹۷۵ھ، کنز العمال ج ۵ ص ۳۱۴، مطبوعہ بیروت

عن جابر رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: سید الشہداء حمزۃ بن عبد المطلب ورجلٌ قام الی امام جائرٍ فأمرہٗ ونہاہ فقتلہ۔ صحیح الاسناد ولم یخرجاہ۔[۲۰]

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سید الشہداء حمزہ بن عبد المطلب ہیں اور وہ شخص جو ظالم حاکم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور اس کو نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا اور اس ظالم حاکم نے اس کو قتل کر دیا"

یہ حدیث صحیح ہے، امام بخاری اور مسلم نے اس کی تخریج نہیں کی۔

---

[۲۱] الہیثمی طبرانی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

عن معاذ بن جبل قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: الا انہ سیکون علیکم امراء یقضون لانفسہم مالا یقضون لکم فان عصیتموہم قتلوکم وان اطعتموہم اضلوکم، قالوا یارسول اللہ کیف نصنع قال: کما صنع اصحاب عیسی بن مریم، نشروا بالمناشیر وحملوا علی الخشب، موتٌ فی طاعۃِ اللہ خیرٌ من حیاۃٍ فی معصیۃِ اللہ[۲۱]

"حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب تم پر ایسے حاکم مسلط ہو جائیں گے جو اپنے لئے ایسے فیصلے کریں گے جو تمہارے لئے نہیں کریں گے اور اگر تم ان کی مخالفت کرو تو وہ تم کو قتل کر دیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ہم اس وقت

۲۰۔ حافظ نور الدین علی بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ، المستدرک ج ۳ ص ۱۹۵، مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ

۲۱۔ حافظ نور الدین علی بن الہیثمی متوفی ۸۰۷ھ، مجمع الزوائد، ج ۵ ص ۲۳۸، مطبوعہ بیروت

کیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس طرح حضرت عیسیٰ ابن مریم کے صحابہ نے کیا تھا، انہیں آروں سے چیر دیا گیا اور سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مرنا اس کی نافرمانی میں زندہ رہنے سے بہتر ہے"۔

ظالم اور فاسق حکمرانوں کے خلاف سب سے پہلے تحریک چلانے والے سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے مقام بیضاء پر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

یا ایھا الناس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال : من رأی سلطاناً جائراً مستحلاً لحرام اللہ ناکثاً لعھد اللہ مخالفاً لسنۃِ رسولِ اللہ یعمل فی عباد اللہ بالاثم والعدوان فلم یغیر ما علیہ بفعلٍ ولا قولٍ کان حقاً علی اللہ ان یُدخِلہ مدخلہٗ الاوان ھولاء قد لزموا طاعۃَ الشیطان وترکوا طاعۃَ الرحمان واظھروا الفساد وعطلو الحدود واستاثروا بالفیء واحلوا حرام اللہ وحرموا حلالہ.........وانکم لاتسلمونی ولاِ تخذلونی، فان اقمتم علی بیعتکم تصیبوا رشدکم، وانا الحسین بن علی ابن فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

"اے لوگو! بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے ظالم حاکم کو دیکھا جو اللہ کے حرام کو حلال کرتا ہو، اللہ کے عہد کو توڑتا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف کرتا ہو، اللہ کے بندوں میں ظلم اور زیادتی کرتا ہو، اس کے بعد وہ شخص اپنے قول اور فعل سے اس ظالم حاکم کو بدلنے کی کوشش نہ کرے تو اللہ اس شخص کو اس کے ٹھکانے میں داخل کردے گا۔ سنو ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت کو لازم کر دیا اور رحمٰن کی اطاعت چھوڑ دی اور فساد ظاہر کیا اور حدود پامال کر دیں اور مال غنیمت کو اپنے ساتھ خاص کر لیا اور اللہ کے حرام کو حلال کر لیا۔ اور میں (اس حاکم کو بدلنے پر) دوسروں کی بہ نسبت زیادہ مستحق ہوں، خصوصاً جبکہ تمہارے خطوط

اور پیغامات بھی میرے پاس آئے اب تم مجھے نقصان نہ پہنچاؤ اور مجھے رسوا مت کرو۔ اگر تم میری بیعت پر قائم رہے تو ہدایت پالو گے۔ میں علیؓ اور فاطمہؓ بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا حسین ہوں۔"

○ **پانچواں سوال :** اگر کسی اسلامی ملک کا سربراہ اسلامی آئین نافذ نہیں کرتا تو اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ نیز اس سے تعاون کرنا یا اس کی مخالفت کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟

☆ **جواب :**

اسلامی نظام نافذ نہ کرنے والے حاکموں کا شرعی حکم

دیکھنا یہ چاہئے کہ اس سربراہ کے پاس نظام اسلام کے نفاذ کے لئے طاقت، وسائل اور اختیارات ہیں یا نہیں۔ اگر اس کے پاس ایسی طاقت، وسائل اور اختیارات نہیں ہیں جن سے وہ نظام اسلام کو نافذ کر سکے تو از خود اس عہدے سے سبکدوش ہونا لازم ہے اور اس پر یہ لازم ہے کہ وہ یہ منصب کسی ایسے اہل شخص کے لئے خالی کر دے جو طاقت، اختیارات اور وسائل مہیا کر کے نظام اسلام کو نافذ کر دے۔ اور اگر وہ سبکدوش نہیں ہوتا تو مسلمانوں پر لازمی ہے کہ اس کو اس منصب سے اتار کر کسی اہل شخص کو اس منصب پر بٹھائیں اور اگر کسی اہل شخص کے ہوتے ہوئے مسلمانوں نے اس کو معزول کر کے اہل شخص کے ذمہ یہ منصب تفویض نہ کیا تو وہ سب گنہگار ہوں گے۔ امام حاکم نیشاپوری نے اپنی سند کے ساتھ یہ حدیث روایت کی ہے :

> عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : من استعمل رجلا على عصابة وفى تلك العصابة من هو ارضى لله عنه، وفى رواية الطبرانى : وهو يعلم ان فيهم من هو اولى بذلك واعلم منه

بكتاب الله وسنة رسوله فقد خان اللهَ ورسولَه وجماعةَ المسلمين[۲۲]

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کسی شخص کو ایک جماعت کا امیر مقرر کیا اور اس جماعت میں اس سے بہتر شخص موجود تھا جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو زیادہ جانتا تھا اور اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ تھا تو اس نے اللہ اور اس کے رسول اور جماعت مسلمین سے خیانت کی۔"

دوسری صورت یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے حاکم کے پاس نظام اسلام نافذ کرنے کا پورا پورا اختیار ہو۔ کوئی رکاوٹ یا مانع نہ ہو لیکن وہ ہوائے نفس کی بناء پر نظام اسلام کو نافذ نہ کرے۔ پس مسلمانوں پر لازم ہے کہ اجتماعی کوشش اور جدوجہد سے ایسے حاکم کو معزول کر دیں اور اپنے کندھوں سے اس کی طاقت کا جوا اتار پھینکیں۔ ایسے حاکم سے تعاون کرنا اور اس کی حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے اس کے ہاتھ بٹانا اور اس سے نفرت اور عداوت نہ رکھنا شرعاً حرام ہے۔

اسلام کے احکام نافذ نہ کرنیوالے اور جبراً حکومت کرنیوالوں کے متعلق احادیث:

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : انها ستكون امراء يعرفون وينكرون، فمن نابذهم نجا ومن اعتزلهم سلم ومن خالطهم هلك[۲۳]

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عنقریب ایسے حکمران ہوں گے جو اچھے اور برے کام کریں گے سو جس شخص نے ان سے دشمنی رکھی وہ نجات پا گیا جو ان سے الگ رہا وہ سلامت رہے گا اور جو ان سے مل جل کر رہے گا وہ ہلاک ہو جائے گا"

حافظ الہیثمی طبرانی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

---

۲۲ امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری، متوفی ۴۰۵ھ، المستدرک ج ۴ ص ۹۳

۲۳ المستدرک، ج ۴ ص ۸۶

عن اوس بن شرحبیل احد بنی اشجع انه سمع رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول : من مشی مع ظالم لیعینه وهو یعلم انه ظالم فقد خرج من الاسلام [۲۴]

"حضرت اوس بن شرجیل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ظالم کے ساتھ مدد کرنے گیا اور جانتا تھا کہ یہ ظالم ہے وہ اسلام سے نکل گیا۔"

عن حذیفة بن یمان رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : اهل الجور واعوانهم فی النار [۲۵]

"حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظالم (حاکم) اور ان کے مددگار جہنم میں ہوں گے۔"

عن عائشه رضی الله عنها قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : ستة لعنتهم لعنهم الله وکل نبی یجاب : المکذب بقدر الله والزاید فی کتاب الله والمتسلط بالجبروت لیذل ما اعز الله ویعز ما اذل الله والمستحل لحرام الله والمستحل من عترتی ما حرم الله والتارک لسنتی [۲۶]

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھ شخصوں پر میں نے لعنت کی ہے، اللہ ان پر لعنت کرے اور ہر نبی مستجاب الدعوات ہوتا ہے (۱) تقدیر کا انکار کرنے والا (۲) کتاب اللہ میں زیادتی کرنے والا (۳) جبراً حکومت کرنے والا تاکہ اسے عزت دے جس کو اللہ نے ذلیل کیا اور اس کو ذلیل کرے جس کو اللہ نے عزت دی (۴) اللہ کے حرام کو حلال کرنے والا (۵) میرے اہل بیت میں جن کاموں کو اللہ نے حرام کیا ان کو حلال کرنے والا (۶) میری سنت کو ترک کرنے والا"۔

---

۲۴ کنزالعمال، ج ۵ ص ۷۹۳ ۲۵ مجمع الزوائد، ج ۴ ص ۲۰۵

۲۶ المستدرک، ج ۴ ص ۹۰

○ **چھٹا سوال** : کیا پاکستان میں مروّجہ طریقہ انتخاب اسلامی ہے یا کہ نہیں؟ اس میں امیدوار اپنے آپ کو عہدے کے لئے پیش کرتا ہے' اپنی کامیابی کے لئے مہم چلاتا ہے اور اس مقصد کے لئے دھاندلی' جعلی ووٹنگ' ووٹوں کی خرید و فروخت' نتائج کی تبدیلی جیسے امور سے کام لیتا ہے۔ نیز اسلامی طریقہ انتخاب کیا ہے؟

☆ **جواب** :

بدعنوانیوں پر مشتمل طریقہ انتخاب پر شرعی حکم

یہاں دو چیزیں قابل غور ہیں' ایک پاکستان کا آئینی اور اصولی طریقہ انتخاب اور ایک وہ طریقہ جو پاکستان میں عملاً رائج رہا ہے۔ ہرچند کہ پاکستان کے آئینی طریق انتخاب میں دھاندلی اور جعلی ووٹنگ اور دیگر بدعنوانیوں کی اجازت نہیں ہے لیکن چالیس سال کے دوران جو انتخاب ہوتے رہے ہیں ان کی عملی صورت کم و بیش یہی رہی ہے اور اس کے ناجائز اور غیر اسلامی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

پاکستان کے آئینی طریقہ انتخاب کا شرعی حکم

پاکستان کے آئینی طریقہ انتخاب میں دو چیزیں لائق بحث ہیں۔ ایک یہ کہ امیدوار اپنے آپ کو قومی یا صوبائی اسمبلی کے لئے پیش کرتا ہے اور اس کے لئے مہم چلاتا ہے اور اس چیز کو آئینی اور قانونی تحفظ حاصل ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ امیدوار کے لئے تعلیمی اہلیت اور صالحیت کی کوئی شرط نہیں ہے جس کے نتیجہ میں ایک جاہل اور چھٹا ہوا بدمعاش بھی پیسے اور اثر و رسوخ کے زور پر اسمبلی میں پہنچ کر قانون ساز اتھارٹی بن جاتا ہے۔ اور ملک کے بہترین علماء جس قانون کے جائز یا ناجائز ہونے کی سفارش کرتے ہیں اس کے منظور ہونے یا مسترد ہونے کا فیصلہ جاہل اور فاسق و فاجر ممبروں کی رائے پر موقوف ہوتا ہے۔ اس لئے پاکستان کے مروجہ انتخاب میں امیدوار کے لئے تعلیمی قابلیت اور صالحیت کی شرط نہ لگانا اس کے غیر اسلامی اور غلط اور باطل ہونے کی واضح دلیل ہے۔

طلبِ منصب کی تحقیق

رہا دوسرا امر یعنی امیدوار کا اپنے آپ کو منصب کے لئے پیش کرنا تو یہ اسلام میں جائز نہیں ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو اپنے آپ کو مصر کی حکومت کے منصب کے لئے پیش کیا تھا اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں' کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نبی تھے اور نبی معصوم ہوتے ہیں۔ ان کا تقویٰ قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔ نبی کو وحی کی تائید حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے افعال اور مراتب و مدارج کے متعلق اللہ تعالیٰ کی رضا سے مطلع رہتے ہیں' جب کہ عام آدمی کا تقویٰ یقینی و قطعی نہیں ہوتا بلکہ وہ ظنی ہوتا ہے اور ظن و تخمین کی بنیاد پر قطعی امر پر قیاس درست نہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے طلب مرتبہ پر قیاس یوں بھی صحیح نہیں کیونکہ وہ اسلام سے پہلے کی شریعت تھی' جب کہ ہماری شریعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور یہ ممانعت بکثرت احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

> عن ابی موسٰی قال: دخلتُ علی النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم انا ورجلان مِن بنی عمی فقال احدُ الرجلین: یارسول اللہ اَمِّرنا علٰی بعض ماولاک اللہ عزوجل' وقال الاخر مثل ذٰلک' فقال: انا واللہ لانولی علی ھذا العمل احدا سالہ ولا احدا حرص علیہ ۲۷

"حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اور میرے دو عم زاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دونوں میں سے ایک نے کہا: یارسول اللہ' اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں آپ کی ولایت میں دی ہیں ان میں سے بعض کا امیر ہمیں بنا دیں۔ دوسرے نے بھی اسی طرح کہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بخدا ہم کسی ایسے شخص کو امیر نہیں بنائیں گے جو اس کا سوال کرے گا یا امارت کی حرص کرے گا۔"

۲۷ امام مسلم بن الحجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۲۰' مطبوعہ اصح المطابع کراچی

یہ کہا جاتا ہے کہ ضرورت کے وقت جب کوئی منصب کا اہل نہ ہو تو جو اہل ہے اس کا برائے خدمت منصب طلب کرنا جائز ہے۔ ہمیں اس قاعدہ کی صحت سے انکار نہیں ہے کیونکہ یہ نظریہ ضرورت پر مبنی ہے۔ لیکن جو چیز ضرورت کی بنا پر جائز کی گئی ہو اس کو ضرورت کی حد تک رکھنا صحیح ہے' اس کو عام رواج بنالینا صحیح نہیں ہے۔ مثلاً جب کوئی اور کھانے کی چیز نہ ملے تو ضرورت کی وجہ سے خنزیر اور شراب کی حرمت ساقط ہو جاتی ہے لیکن اگر کوئی شخص خنزیر اور شراب کو کھانے پینے کا عام معمول بنالے اور ضرورت کا حوالہ دے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اور ہمارے یہاں یہی صورت حال ہے کہ پاکستان میں جتنے بھی حلقہ ہائے انتخاب ہیں ہر حلقہ سے بکثرت امیدوار از خود کھڑے ہوئے ہیں' تو کیا ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ چونکہ اور کوئی اہل نہیں تھا اس لئے یہ دس کے دس کھڑے ہوگئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات زیادہ سے زیادہ صرف ایک کے لئے کہی جاسکتی ہے اور باقی نو کا منصب کو طلب کرنا ناجائز ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان کے آئین میں انتخاب میں طلبِ منصب کی اجازت دینا غیر اسلامی ہے اور بکثرت احادیث صحیحہ کے خلاف ہے۔ اسلامی انتخابات سے اگر یہ مراد ہے کہ خلفاء راشدین کا جس طرح انتخاب ہوا اس طرح سے انتخابات کروائے جائیں تو اس اعتبار سے یہ طریق انتخاب غیر اسلامی ہے کیونکہ خلفاء راشدین کے دور میں صرف سربراہ مملکت کا انتخاب ہوا ہے اسمبلیوں کا نہیں' اور انتخاب کرنے والے ارباب حل وعقد تھے جب کہ ہمارے ہاں پاکستان میں براہ راست قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کا انتخاب ہوتا ہے اور یہ لوگ ارباب حل وعقد ہوتے ہیں نہ اسلامی علوم اور صالحیت سے متصف ہوتے ہیں۔

یاد رہے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے مؤثر ذرائع اختیار کرنا ضروری ہے جن کے ذریعہ اسلامی نظام کا نفاذ یقینی بن جائے' لیکن مروجہ طریقہ انتخاب جس کو چالیس سال سے بار بار آزمایا جاچکا ہے اور اس کے ذریعہ آج تک اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکا اسی کو ذریعہ بنائے رکھنا عقلاً بھی باطل ہے' کیونکہ یہ انتخابات خرابیوں کا مجموعہ ہیں' بے شمار ناجائز کام ان میں پائے جاتے ہیں۔ اسلام نے کبھی بھی ہر کس و ناکس کو ووٹ کا حق نہیں دیا بلکہ کبھی

ی عمومی انتخابات نہیں ہوئے۔ اسلامی جمہوریت میں بھی صرف اس قدر ہوا کہ خلیفہ کو
ل حل و عقد نے اپنی رائے سے منتخب کیا اور ان کے اتفاق کے بعد خلیفہ کے لئے عمومی
بعت لی گئی۔ کچھ لوگ نا سمجھی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ بیعت اور ووٹ ایک ہی چیز ہیں
الانکہ یہ بالکل غلط ہے' کیونکہ ہر ووٹر کو اپنی رائے دینے کا اختیار ہوتا ہے اور وہ کسی فرد کو
نظور یا مسترد کر سکتا ہے' جس طرح آج کل کے ووٹوں میں ہر ووٹر کو اختیار حاصل ہوتا
ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت کے طریقہ میں کیا کسی شخص کی خلافت پر اہل حل و عقد یعنی اہل
لرائے حضرات کے اتفاق کے بعد کسی کو بیعت نہ کرنے کا اختیار بھی حاصل ہوتا ہے؟ ہرگز
ہیں' ہرگز نہیں! بلکہ اہل الرائے کے اتفاق کے بعد تمام لوگوں کو خلیفہ کی بیعت کرنا لازمی
و جاتا ہے اور جو شخص بیعت نہیں کرتا وہ گناہگار ہوتا ہے۔ پھر عمومی بیعت بالواسطہ یا
لاواسطہ تمام رعایا سے لی جاتی ہے اور انکار کی کسی کو اجازت نہیں ہوتی۔ بیعت علی الاعلان
وتی ہے جب کہ ووٹ خفیہ استعمال ہوتا ہے۔ کسی منتخب ہونے والے کے خلاف ووٹ
ستعمال کرنے والا آئندہ اس کی مدت عہدہ مکمل ہونے تک اس کی مخالفت پر کمربستہ رہتا
ہے۔ لیکن بیعت میں اس قسم کا کوئی جواز نہیں۔ ایسی صورت میں کیا ووٹ اور بیعت میں
اضح فرق ہے یا نہیں؟ اتنے عظیم فرق سے آنکھیں موند لینا کہاں کی دیانت ہے۔ آج کی
یاسی پارٹیاں اقتدار کی کرسی کو دیکھتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہیں اور پھر اتحادوں کا
سیلاب آجاتا ہے۔ ایسی پارٹیاں جو اسلام کے نام پر قائم ہیں' کچھ نے تو اپنی پارٹیوں کے نام
بھی اسلامی رکھ دیئے ہیں اور ایسی پارٹیوں سے کچھ لوگ منتخب ہو کر ایوانوں تک پہنچے اور
وزارتوں تک بھی پہنچے' کیا انہوں نے اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے کیا خدمات انجام دیں؟
اب ایسی جماعتوں کے اتحادوں کا زور ہے جس میں ایک اشتراکی ہے اور دوسری اسلام کی
دعویدار' معلوم نہیں ان کا اتحاد کس نقطہ پر ہوا۔ واضح ہے کہ وہ نقطہ صرف اور صرف
حصول اقتدار ہے یہ وہ دھوکہ ہے جو عوام کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کو بھی دینے کی کوشش
کی جارہی ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ تو دھوکہ بازوں کی چالوں سے باخبر ہے۔ اسلام کے پاکیزہ
نام کو محض اقتدار کے لئے استعمال کرنے والوں سے انتہائی ہمدردانہ عرض کرتا ہوں کہ

امیرِ تنظیمِ اسلامی کا دورۂ کراچی

حق کے ساتھ اگر باطل کا وجود نہ ہو تو حق نمایاں نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح صحت کے ساتھ
ہاری نہ ہو تو صحت پر انسان شکر ادا نہیں کر سکتا۔ جس طرح ایک فرد بیمار ہوتا ہے تو اس کے علاج
ی فکر ہوتی ہے اسی طرح جماعتوں میں بھی جب کوئی بیماری آجاتی ہے تو اس کے سربراہ کا فرض
ہے کہ وہ چوکنا ہو جائے اور اس کا فوری تدارک کرے۔ چونکہ افراد سے جماعت بنتی ہے اس
لئے ایک فرد کے بیمار ہونے سے جماعت پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بعض بیماریاں
تعدی ہوتی ہیں لہٰذا ان پر فوری توجہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ ذرا سی غفلت سے یہ مرض جماعت
کے افراد میں پھیل جاتا ہے جس سے جماعت زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ افراد میں مایوسی اور بددلی
پھیل جاتی ہے جس کی وجہ سے انتشار برپا ہو جاتا ہے۔

انسانی سوچ پر کوئی پہرہ نہیں بٹھا سکتا۔ پھر جس معاشرے میں ہم لوگ آباد ہیں ہمیں وراثت
ں میں کچھ ایسی بیماریاں معاشرے سے ملی ہیں، پھر شیطان یہ کب گوارا کرتا ہے کہ کوئی اسلامی
تحریک معاشرے میں اثر و نفوذ کرے۔ لہٰذا وہ بھی بیماریوں کے جراثیم جماعت کے افراد میں
نجیکٹ کرتا رہتا ہے۔ امیر جماعت کی یہ بالغ نظری ہے کہ وہ اس بیماری کو ابتدا ہی میں بھانپ لیتا
ہے اور فوری طور پر اس کا تدارک کرتا ہے۔ اس دورے کا اصل مقصد یہی تھا کہ تنظیم کے افراد
یں اگر کچھ جراثیم داخل ہو گئے ہیں تو ان کی نشاندہی کی جائے اور ان کا علاج کیا جائے، کیونکہ
بروقت علاج ہی ان کا بہترین تدارک ہے۔

ملتزم رفقاء جو تنظیم کی ریڑھ کی ہڈی ہیں ان کا اجلاس بعد نماز مغرب تنظیم اسلامی ضلع
سطی کے دفتر میں بلایا گیا تھا۔ اس سے قبل نماز عصر جامع مسجد فاروق اعظم میں ادا کی گئی۔ اور بعد
ماز امیر محترم نے جناب قاضی عبد القادر صاحب کی دختر نیک اختر کا نکاح پڑھایا اور اس ضمن میں
یک مختصر خطبہ بھی موقع کی مناسبت سے دیا۔

شادی اور بیاہ کی تقریبات کو سنت کے مطابق ادا کرنے کی جو تحریک آپ نے آج سے پندرہ
سال پہلے شروع کی تھی اب وہ برگ و بار لا رہی ہے۔ رفقائے تنظیم تو اس کی عموماً پابندی کر ہی
رہے ہیں اب دوسرے لوگ بھی اس کی افادیت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ محترم قاضی صاحب
نے شرکاء مجلس کو امیر محترم کا کتابچہ "ایک اصلاحی تحریک" خوبصورت سرورق کے ساتھ تحفہ
یں دیا۔

مغرب سے قبل امیر محترم تعزیت کے لئے چودھری عبدالمقتدر مرحوم کے گھر گئے۔ ملتزم رفقاء کی نشست بعد مغرب شروع ہوئی جس کا اختتام رات ساڑھے گیارہ بجے ہوا۔ جس طرح انسان اپنی صحت کے لئے چوکنا رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً مختلف ٹیسٹ کراتا رہتا ہے تاکہ کوئی بھی وائرس چپکے سے اس کے جسم میں داخل ہو کر اس کے صحت کے نظام کو چوپٹ نہ کر دے' اسی طرح جماعتوں میں بھی مختلف "وائرس" چپکے سے داخل ہو جاتے ہیں اور اس کے اندرونی نظام کو مفلوج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ابتداء نجویٰ سے ہوتی ہے۔ یہ "نجویٰ" یعنی سرگوشی بڑے معصومانہ انداز سے شروع ہوتی ہے اس کے زہر کے اثرات کو بعض اوقات محسوس نہیں کیا جاتا مگر یہ چپکے چپکے "سرطان" کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ "روگ" خیر خواہی کے نام پر بھی داخل کیا جاتا ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ نئی بات کو فوراً قبول کر لیتا ہے' پھر اشکالات تو ذہنوں میں اس طرح راہ پاتے ہیں جس طرح سیلاب زمین میں پھیل جاتا ہے اور زمین کے کونے کونے کو متأثر کرتا ہے۔ اکثر اوقات انسان کسی بھی بات کے تصدیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا اور رفتہ رفتہ اس کا ذہن اشکالات کا آماجگاہ بن جاتا ہے۔ انسان کے خالق کو معلوم تھا کہ یہ انسانی کمزوری ہے لہٰذا اس نے متنبہ کر دیا ہے کہ اے مسلمانو! دیکھو کوئی بھی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تصدیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم جہالت میں اسی خبر کی بنا پر اقدام کر بیٹھو اور بعد میں تمہیں ندامت کا سامنا کرنا پڑے۔

انسان کی یہی کمزوری دورِ اول میں بھی ظاہر ہوئی تھی جبکہ نبی اکرم ﷺ بہ نفس نفیس موجود تھے اور جب تک اس روئے زمین پر انسان آباد ہے ان واقعات کے ظہور کا ہر وقت امکان ہے۔ انسان کی اس کمزوری کو ہم "روگ" کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ "روگ" آہستہ آہستہ منافقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور انسان جب منافقت میں پختہ ہو جاتا ہے تو مخالفت پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے انسانی نفسیات کے اس پہلو کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ قرآن مجید نے اسے مختلف انداز سے بیان کیا ہے اس لئے کہ اجتماعیت میں اس کا ظہور فطری امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر محترم اپنے دروس میں ابتداء ہی سے اس "مرض" کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے دروس میں قرآن مجید کے حوالے سے اس کے ہر ہر جزو کی وضاحت کی ہے تاکہ رفقاء ہر وقت چوکنا رہیں' خبردار رہیں' نگران رہیں تاکہ جماعت کے اندر فوراً اس کی نشاندہی ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تنظیم اسلامی نے اپنے "نظام العمل" میں توسیعی مشاورت کا نظام رکھا ہے اور اس کے اجلاس سال میں دو بار منعقد کئے جاتے ہیں۔

یہ مشاورت اس لئے منعقد کی جاتی ہے کہ رفقاء اپنے اشکالات دائیں بائیں ظاہر کرنے کے بجائے خود امیر محترم کے سامنے پیش کریں۔ امیر محترم سامع ہوتے ہیں اور کسی رفیق پر کوئی

پابندی نہیں کہ وہ "یہ" بیان اور "وہ" بیان نہ کرے۔ اپنی رائے کے اظہار میں وہ پورا آزاد ہوتا ہے۔ اس مشاورت کا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ رفقاء کا ذہن امیر محترم کے سامنے آجاتا ہے اور انہیں آئندہ کے اقدام میں اس سے مدد ملتی ہے۔ اسے ہم "فیڈ بیک" کا نظام کہتے ہیں۔ میرے علم کی حد تک پاکستان کی کسی بھی جماعت میں، خواہ وہ دینی ہو، یا سیاسی ہو، یا مذہبی ہو، یہ نظام رائج نہیں ہے۔ اس نظام کو رائج کرنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ عموماً دوسری تنظیمیں یا اداروں کے سربراہ معمولی تنقید بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ چہ جائیکہ وہ خود کو تنقید کے لئے پیش کریں ---- اس اہتمام کے باوجود بعض ان کہی باتیں جب امیر محترم تک پہنچیں تو آپ نے فوراً ہی اس کے ازالے کا بندوبست کیا۔ ملتزم رفقاء کی یہ نشست اسی مقصد کے لئے تھی... الحمدللہ غلط فہمیاں دور ہوئیں اور رفقاء کو نیا عزم سفر ملا۔

۲۷/ مئی کو جمعہ کا دن تھا۔ امیر محترم کو جمعہ کا خطاب بھی کرنا تھا اور اس سے قبل صبح ۹ بجے رفقاء کو قرآن اکیڈمی میں بلایا گیا تھا۔ خطاب سے قبل ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے نظام العمل کے حوالے سے مختصر وقت میں کچھ باتیں بیان کیں۔

امیر محترم نے اپنے خطاب کا جو عنوان دیا تھا وہ حزب اللہ بمقابلہ حزب الشیطان تھا۔ سورۃ مجادلہ کے حوالے سے آپ نے فرمایا کہ نظام عدل و قسط کو قائم کرنے کے لئے مقابلہ ہو گا، مجادلہ ہو گا، ٹکراؤ ہو گا، حزب اللہ اور حزب الشیطان میں۔ جس معاشرے میں حزب اللہ کا وجود نہ ہو گا، یعنی ایسی جماعت کا وجود نہ ہو گا جو نظام عدل و قسط قائم کرنے کے لئے اٹھی ہو تو وہاں ٹکراؤ کا کیا سوال ہے؟ حزب الشیطان دو اجزاء پر مشتمل ہے، ایک وہ جو کھلا دشمن ہے اور خم ٹھوک کر سامنے آگیا ہے جیسے مقابلہ میں کفار۔ دوسرا جزو ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو بظاہر دوست ہوتے ہیں مگر اندر سے دشمن، جیسے منافقین کا گروہ تھا۔ اس دوسرے گروہ کی پہچان کے لئے کچھ علامات ہیں۔ یعنی وہ سرگوشی میں بات کریں گے، جسے قرآن کی اصطلاح میں "نجویٰ" کہتے ہیں۔ کھل کر بات نہیں کریں گے۔ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہیں، مگر دوستیاں دوسروں سے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گروپ بنا کر رازدارانہ انداز میں بات کریں گے۔ یہ پہچان بھی انہی کی ہے کہ اجتماع میں بات نہیں کریں گے بلکہ کونے کھدروں میں جا کر سرگوشی کریں گے اور دوسروں میں بدگمانیاں پیدا کریں گے، بددلی پھیلائیں گے۔ یہ بات جان لیں کہ اہل ایمان کی دوستی اللہ کے دشمنوں کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ ایسے کام کرنے والے حزب الشیطان کا رول ادا کر رہے ہیں۔ دین کا جتنا بڑا اجتماعی کام ہو گا اس کا امتحان بھی اتنا ہی بڑا ہو گا۔ آپ نے قرآن مجید کی آیات کے حوالے سے دونوں گروہوں کو ممیز کیا۔ اس خطاب میں رفقاء کو چونکا دینے والی باتیں تھیں۔ حزب اللہ اور حزب الشیطان کے حوالے سے خود احتسابی کی دعوت بھی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں

ہے کہ ہم اپنی غفلت کی وجہ سے یا اپنی سادگی کی بنا پر حزب الشیطان کے مددگار بن رہے ہوں۔ یہ لمحہ فکریہ تھا جسے ہر رفیق نے محسوس کیا۔

امیر محترم کی اس تقریر کے بعد جناب عبدالرحمٰن ممنکورہ صاحب نے کچھ اعلانات کئے۔ اس کے بعد ناظم حلقہ جناب نسیم الدین صاحب رفقاء سے مخاطب ہوئے کہ میں مہینے میں ایک مرتبہ ہر تنظیم کے اجتماع میں شریک ہوں گا، امراء تنظیم کو چاہئے کہ وہ آئندہ آنے والی چھٹیوں کو بامقصد بنائیں اور اس میں دو روزہ پروگرام ترتیب دیں۔ میں چاہوں گا کہ اگر کسی رفیق کو حلقہ کی جانب سے کوئی شکایت ہے تو وہ ضرور بتائیں۔ میں اپنی ذات کو بھی آپ کے آگے پیش کرتا ہوں کہ آپ مجھ کو میری خامیاں، میری غلطیاں بتائیں۔ ناظم حلقہ گلوگیر ہو گئے، آواز بھرا گئی۔ اپنے آپ قابو پاتے ہوئے کہا کہ ۱۹۹۰ء میں کراچی میں صرف ایک دفتر تھا، آج چھ دفاتر ہیں، میری خواہش ہے کہ کراچی کے ہر محلے میں ہمارے دفاتر موجود ہوں۔

جمعہ کے خطاب کے لئے امیر محترم نے تین موضوعات کا انتخاب کیا تھا، قرآن حکیم کا فلسفۂ شہادت، شہادتِ عثمان غنیؓ اور دعوت رجوع الی القرآن کی اہمیت۔ آپ نے پہلے شہادت کے اصل مفہوم کو واضح کیا۔ شہادت کا جو رائج مفہوم ہے اس سے ہٹ کر قرآن کے منشاء اور اس کے فلسفہ کو نہایت شرح و بسط سے بیان فرمایا۔ اسی ذیل میں شہادتِ عمرؓ شہادتِ عثمانؓ اور شہادتِ حسینؓ کا ذکر آیا۔ شہادت کا لفظ دین کے فلسفہ میں گواہی دینے کے معنی میں آیا ہے، قول کے ساتھ عمل کی گواہی۔ یہ گواہی پوری زندگی کی گواہی ہے، اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کے بغیر یہ گواہی بے معنی ہے۔ جو اس جدوجہد میں لگا ہوا ہے وہ زندہ شہید ہے۔

آپ نے دعوت رجوع الی القرآن کے ذکر کے ساتھ قرآن اکیڈمی کراچی میں ۹ ماہ کے کورس کا ذکر کیا اور سامعین کو پرزور انداز میں شرکت کی دعوت دی۔ ہم نے زندگی کا بیشتر حصہ دنیاوی علوم کے حصول میں صرف کر دیا ہے اور اللہ کی کتاب کی طرف سے منہ پھیر لیا ہے۔ اللہ کے حضور پیشی کے وقت ہمارے پاس اس کے لئے کیا جواب ہو گا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو حساس دلوں میں تیر بن کر اترتا ہے۔ مگر ہماری قوم کی حالت یہ ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس نے حق پہچاننے اور سمجھنے کی طرف سے منہ موڑ لیا ہے۔ امیر محترم کے اس خطبہ جمعہ کے بعد بھی اگر سامعین میں کوئی عملی حرکت پیدا نہ ہوئی تو یہی سمجھا جائے گا کہ اب زمین بالکل بنجر ہو چکی ہے اور اس میں روئیدگی کی کوئی رمق موجود نہیں ہے۔

اس دورہ کے آخر میں امیر محترم نے عصر کے بعد انجمن خدام القرآن کی مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں شرکت فرمائی۔

(مرتب : نجیب صدیقی کراچی)

دعوتِ فکر

اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ؟؟

——— نجیب صدیقی ———

ہمارے ملک کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے آج تک تعمیر ملک و ملت کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔ ملک و ملت کی تعمیر کے لئے فرد کی تعمیر ضروری ہے۔ جس طرح ایک پختہ مکان کے لئے ایک ایک اینٹ کا پختہ ہونا ضروری ہے اسی طرح ملک و ملت کی تعمیر کے لئے پختہ بنیادوں پر فرد کی تعمیر ضروری ہے۔

فرد کی تعمیر کے لئے سب سے پہلے ہمیں مقصد متعین کرنا ہوگا۔ مقصد ہی منصوبہ بندی کے خدوخال کو ہمارے سامنے اجاگر کرے گا۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا مقصد ہمارے رب نے متعین کر دیا ہے۔ یہی وہ "ہدف" ہے جس کے حصول کے لئے ہم نے پاکستان بنایا تھا۔ روز اول سے ہم نے اس ہدف سے اعراض کیا ہے جس کی وجہ سے آج ہماری حالت ہر سطح پر دگرگوں نظر آتی ہے۔ اس ہدف سے ہم نے اعراض ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس مقصد کو تباہ کرنے والے راستے پر ہمارا سفر جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری ہے۔ وہ قوم جس کے پاس انسانیت کو دینے کے لئے ایک اعلیٰ تصور موجود تھا وہ آج خود پارہ پارہ ہو رہی ہے۔ آج ایک فرد جس گھناؤنے کھیل میں مصروف ہے اجتماعیت بھی اس کی بھرپور لپیٹ میں ہے کیونکہ فرد سے ہی اجتماعیت بنتی ہے۔

ہم جب فرد کا جائزہ لیتے ہیں تو ہر سطح پر مایوسی اور اندھیرا نظر آتا ہے۔ نچلی سطح سے اوپر کی سطح تک سوائے کرپشن کے کچھ نظر نہیں آتا۔

○ فرد ایک تاجر کی حیثیت سے ملاوٹ، دھوکہ، جھوٹ اور لوٹ کھسوٹ میں بری طرح ملوث ہے۔

○ فرد ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے رشوت، اقرباپروری اور تاخیری حربے سے لوگوں کا شکار کرتا ہے۔

○ فرد ایک آفیسر کی حیثیت سے اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کرتا ہے۔ وہ لوٹ کھسوٹ میں اپنے نیچے والوں کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔

○ فرد ایک پولیس مین ہونے کی حیثیت سے جو کچھ کر رہا ہے اس کی وجہ سے معاشرہ ایک

ب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ چور اور ڈاکوؤں سے لوگ اتنے خوف زدہ نہیں ہیں جتنے اپنے محافظوں
ہیں۔

○ فرد ایک طالب علم کی حیثیت سے علم کے حصول کے بجائے ڈگری حاصل کرنے کی فکر
لگا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نقل ایک وبا کی شکل اختیار کر چکی ہے اور اس پر قابو پانا مشکل
یا ہے۔

○ فرد ایک استاد کی حیثیت سے معلم کم اور تاجر زیادہ نظر آتا ہے۔ وہ ٹیوشن کے چکر میں
ء کو ڈال دیتا ہے تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے۔

○ فرد ایک وکیل کی حیثیت سے معاشرہ کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ محض چند سکوں کی خاطر
ں کو بچانے کے لئے اپنی تمام صلاحیت صرف کر دیتا ہے۔ بے گناہوں کے خون میں نہائے
ے ہاتھ اسے معصوم نظر آتے ہیں۔ جھوٹے حلف نامے داخل کرتے ہوئے اس کے ضمیر پر
ی بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ اس کا کام عدالت کو دھوکہ دے کر اپنے حق میں فیصلہ حاصل کرنا
۔

○ فرد ایک ٹھیکیدار کی حیثیت سے افسران بالا کی ملی بھگت سے جو تعمیر کرتا ہے وہ بودی اور
ئیدار ہوتی ہے۔

○ فرد ایک مزدور کی حیثیت سے کام چور اور کم محنت کر کے زیادہ اجرت کا طالب رہتا
۔

○ فرد ایک صنعت کار یا مل مالک کی حیثیت سے کام زیادہ لینے اور اجرت کم دینے کے لئے
نئی پلاننگ کرتا رہتا ہے اور افسران سے مل کر ٹیکس کی چوری میں ملوث ہوتا ہے۔

○ فرد ایک اسمبلی کا ممبر ہونے کی حیثیت سے ملک کی تعمیر کے بجائے اپنی دنیا بنانے میں
ری طرح مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ جو کچھ خرچ کر کے اسمبلی میں پہنچتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ
ول کرنے کے چکر میں دن رات لگا رہتا ہے۔ کاروبار کا یہ بھی ایک انداز ہے اور دراصل
رے ملک میں سیاست نے ایک کاروباری حیثیت اختیار کر لی ہے۔ یہ ایک ایسی صنعت ہے
ں میں گھاٹا نہیں ہے نفع ہی نفع ہے۔

○ فرد ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے اپنے لیڈر کے لئے جو کچھ کرتا ہے اسے نقد وصول
رنے کی فکر ہر دم دامن گیر رہتی ہے۔

○ فرد ایک زمیندار اور جاگیردار کی حیثیت سے "فرعون" سے کم نہیں ہے۔ اپنے
ر دستوں کا وہ حاکم ہوتا ہے۔ اگر حقیقی عکاسی کی جائے تو وہ ان کا خدا ہوتا ہے۔ ایک ہاری کی
زت، ذلت اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے ان سے سلوک کرتا ہے۔
نظام بھی [illegible] کے آگے بے بس ہے۔ قانون [illegible] کے گھر کی لونڈی [illegible]

○ ہاری ایک فرد کی حیثیت سے کولھو کے بیل کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اپنے زمیندار آقا کے لئے ڈھور ڈنگر بن جاتا ہے۔ اس کی عزت نفس ابتدائے ایام ہی میں کچل دی جاتی ہے۔ تعلیم سے محرومی اس کی قسمت میں ہے۔

ہمارے معاشرے کی یہ انتہائی چھوٹی تصویر ہے۔ یہ تمام باتیں اجنبی نہیں ہیں۔ سبھی جانتے ہیں' ہر ایک سے دن رات سابقہ ہے۔ شاید اسے ہی دیکھ کر ہمارے ایک صدر مملکت نے اپنے ایک بیان میں فرمایا تھا کہ ہمارا پورا معاشرہ کرپٹ ہو چکا ہے۔ کیا صرف اتنا کہہ دینے سے ان کے منصب کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ جن کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہے کیا وہ اتنے بے بس ہیں کہ تعمیر معاشرہ کے لئے کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے۔ آج کل کے دور میں الیکٹرانک میڈیا اتنا اثر انگیز ہے کہ وہ چند ثانیوں میں اذہان کے رخ کو موڑ دیتا ہے۔ نوجوان نسل اس کی پوری گرفت میں ہے۔ صدر مملکت کی ایک جنبش قلم سے الیکٹرانک میڈیا کا قبلہ درست ہو سکتا ہے۔

میرے نزدیک تعمیر معاشرہ کے لئے دو ذرائع اختیار کرنا ضروری ہیں' جنہیں ہم نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے' پہلا "ہدف کا تعین" اور دوسرا "قانون کی حکمرانی"۔ ہدف کے تعین کے لئے کوئی کمیشن بٹھانے کی ضرورت نہیں ہے' ہمارے پیدا کرنے والے نے ہدف کا تعین کر دیا ہے۔ اب ہمارا کام ہے کہ اس ہدف کی طرف رخ کر لیں۔ ہمارا ہر قدم اسی طرف ہو۔ بغاوت کا انجام ہم نے دیکھ لیا ہے۔ ہمارا چمن کانٹوں سے بھر گیا ہے۔ بے سکونی و بے اطمینانی ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ دنیا کی ذلت و رسوائی اس پر مستزاد ہے۔ اس ہدف کو قرآن مجید نے ایک جملے میں بیان کر دیا ہے: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" "ہم نے جنوں اور انسانوں کو اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا ہے"۔ گویا ہمارا مقصد وجود بندگی رب ہے۔ کامل بندگی' ہمہ تن بندگی' ہمہ وجود بندگی ہی مطلوب ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی کام میں بندگی کی جائے اور کسی کام میں اپنی مرضی چلائی جائے۔ بندہ تو بندہ ہے' ہر وقت بندہ ہے' ہر لحہ بندہ ہے' گھر میں ہے تو بندہ ہے' دفتر میں ہے تو بندہ ہے' دکان پر ہے تو بندہ ہے۔ حکومت کی کرسی پر ہے تو بندہ ہے' عدالت کی کرسی پر ہے تو بندہ ہے۔ اس بندگی سے اسے مفر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے رب نے زندگی کے جملہ شعبوں کے لئے تفصیلی احکام بتا دیئے ہیں' اس کے بھیجے ہوئے رسول ﷺ نے ان احکام پر عمل کر کے رہتی دنیا تک کے لئے ایک اسوہ اور نمونہ چھوڑا ہے تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں اس سے اپنے لئے رہنمائی حاصل کریں۔

بندہ اپنے آقا کے بتائے ہوئے جملہ احکامات کا پابند ہے' اس سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا' اسے اپنے آقا کو ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہے۔ یہ تصور انسان کو سیدھا رکھتا ہے۔ اس کا نام "ایمان" ہے۔ ایمان یقین کے درجہ میں آئے بغیر انسانی کردار میں تغیر نہیں آ سکتا۔ یہ یقین کہ جس رب نے ہمیں پیدا کیا ہے' جس نے ہمیں زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا ہے' جس نے ہمارے

لئے ایک ہدف مقرر کیا ہے وہ ہر لمحہ ہر آن ہمیں دیکھ رہا ہے۔ ہم ہر وقت اس کی نظروں میں ہیں۔ وہ ہمارے دل کے وساوس سے بھی واقف ہے، ہمارے خیالات سے بھی واقف ہے اور ہماری ہر حرکت کی قلم بندی ہو رہی ہے جسے قیامت کے دن کتاب کی صورت میں ہمارے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اپنی کتاب خود پڑھ، اپنے کرتوت کا خود جائزہ لے، تو اپنا حساب لینے کے لئے خود کافی ہے۔ یہ تصور آخرت ہی فرد کو سیدھا رکھ سکتا ہے۔ اس کے بغیر وہ بے لگام جانور کے مانند ہے۔ جہاں سینگ سمائے چلا جائے۔ جس کھیت میں چاہے منہ مارے۔ اسے اس بات کا واضح شعور ہونا چاہئے کہ بے لگامی کی ایسی ہولناک سزا ہو گی جس کا وہ تصور نہیں کر سکتا۔ بغاوت کے انجام کا شعور ہی اسے برائی سے روک سکتا ہے۔ ٹریفک کے قوانین کو سمجھنے کے لئے کتابیں شائع کی جاتی ہیں، اشاروں سے مڑنے، رکنے، اور چلنے کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ پھر ہر چوراہے پر باوردی پولیس والا کھڑا ہو کر ان قوانین کی نگرانی کرتا ہے۔ سڑک پر گاڑی چلانے کے لئے امتحانات میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب تک وہ اپنی "فٹنس" پیش نہیں کرتا اسے ڈرائیونگ لائسنس نہیں ملتا۔ اس کے باوجود حادثے ہوتے رہتے ہیں اور حکومت کو ان کے لئے قوانین وضع کرنے پڑتے ہیں۔ ان قوانین کے نفاذ اور فیصلے کے لئے باقاعدہ فورسز اور عدالتیں قائم کی گئی ہیں۔ کیا انسانی زندگی کے اس طویل سفر کے لئے کوئی ہدایت اور کوئی قانون مقرر نہیں؟ ایسا کیسے ممکن ہے؟ یقیناً ہے۔ ہمارے پیدا کرنے والے نے ہمیں کتاب بھی دی ہے، رہنما اصول بھی دیئے ہیں اور انبیاء نے اس پر چل کر انسانیت کو راہ دکھائی ہے۔

دنیا میں منصوبہ بندی کے بغیر کوئی کام احسن طریقہ پر انجام نہیں پاتا۔ حکومتیں بغیر منصوبہ بندی کے ایک دن بھی نہیں چل سکتیں۔ کیا ہم نے اپنی زندگی گزارنے کے لئے اپنے رب کی نازل کی ہوئی ہدایت پر چلنے کی کوئی منصوبہ بندی کی ہے۔ یہ دور پتھر کا دور نہیں ہے، نہ اب لوگ غاروں میں رہتے ہیں، اجتماعیت نے زندگی کے ہر شعبے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اس سے مفر نہیں ہے۔ اب جو بھی منصوبہ بندی ہو گی وہ اجتماعیت کے پیش نظر ہو گی، ہدف کو سامنے رکھ کر ہو گی۔

صدر مملکت کا یہ کہنا کہ پورا معاشرہ کرپٹ ہو چکا ہے کیا یہ آخرت کی نجات کے لئے کافی ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے تو ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ آخرت میں سرخروئی حاصل ہو، لیکن وہ شخص جو ملک کے سیاہ و سفید کا مالک ہو اپنے رب کے حضور کیا عذر پیش کر سکتا ہے۔

تعمیر معاشرہ کے ہدف کے تعین کے بعد دوسری اہم بات قانون کی حکمرانی ہے۔ قانون بنایا ہی اس لئے جاتا ہے کہ چھوٹا بڑا، امیر و غریب، حاکم و محکوم سب کو اسی ترازو سے تول کر ملے۔ عدل کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس میں استثناء نہ ہو۔ حضور ﷺ نے دو جملوں میں نظام عدل اجتماعی کو اس

طرح بیان کیا ہے: "پچھلی قومیں اس لئے ہلاک ہو گئیں کہ جب ان میں سے کوئی غریب فرد جرم کرتا تو حد جاری کر دی جاتی اور اسی قوم کا امیر اور سو بر آور دہ شخص جرم کرتا تو وہ سزا سے بچ جاتا۔ خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔" قانون کی حکمرانی اسے کہتے ہیں۔ کیا ہماری پوری قوم اس شعور سے دست بردار ہو گئی ہے یا ہمارے حکمرانوں میں کوئی ایسا نہیں رہا جسے قرآن کی زبان میں کہا جائے:
"اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ؟؟"

بقیہ: ایک استفتاء اور اس کا جواب

اسلامی انتخاب کا طریقہ خلفاء راشدین کے انتخابات کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ جب تک وہی طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا اسلامی نظام کبھی بھی نافذ نہیں ہو سکتا۔ پہلے انتخابات کا طریقہ تبدیل کرائیں' اس کے بعد اسلامی نظام کا نفاذ یقینی ہو جائے گا۔...

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

محمد جمال الدین کاظمی عفی عنہ

مہتمم قمر العلوم فریدیہ' ماری پور روڈ' دریا آباد' کراچی ۵۳

ضرورت رشتہ

(۱)

ایک لڑکی تین سالہ انڈسٹریل ٹیچنگ ڈپلومہ ہولڈر (خلع یافتہ) عمر 33 سال اور ایک لڑکے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ عمر 35 سال تنخواہ 12000/- روپے باریش (عقد ثانی سابقہ بیوہ مطلقہ) پابند صوم و صلوٰۃ کے لئے دینی مزاج کے حامل تعلیم یافتہ گھرانوں سے رشتے مطلوب ہیں۔

(۲)

متوسط گھرانے کی راجپوت فیملی سے متعلق 21 سالہ پابند صوم و صلوٰۃ لڑکی (دینی و دنیاوی تعلیم سے بہرہ مند) کے لئے دینی مزاج کے حامل گھرانے سے رشتہ مطلوب ہے۔ رفیق تنظیم کو ترجیح دی جائے گی۔

پتہ برائے رابطہ: مرکزی دفتر تنظیم اسلامی A-67 علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور

ضرورت رشتہ

(۱)

تحریک اسلامی کا ذہن رکھنے والے 47 سالہ ہومیو ڈاکٹر ملتان میں ذاتی کاروبار / رہائش، پہلی بیوی وفات پا چکی ہے، کے لئے پابند شریعت ترجیحاً غیر شادی شدہ اردو / پنجابی سپیکنگ مناسب تعلیم یافتہ کا رشتہ درکار ہے۔ اعتماد کے ساتھ درج ذیل پتے پر تفصیل سے لکھیں۔

پتہ : (ڈاکٹر) منظور حسین، قرآن اکیڈمی، 25۔ آفیسرز کالونی ملتان فون : 520451

(۲)

تنظیم اسلامی سے تعلق رکھنے والے ارائیں برادری کا 25 سال حافظ قرآن، تعلیم ایف اے۔ لاہور میں نیا کاروبار، کے لئے دینی مزاج کی حامل لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ ارائیں برادری کو ترجیح دی جائے گی۔

برائے رابطہ : دفتر تحریک خلافت حلقہ لاہور A-4۔ مزنگ روڈ نزد فیملی ہسپتال لاہور

(۳)

تنظیم اسلامی کی پیرس شاخ سے وابستہ ایک پاکستانی کے لئے رشتہ درکار ہے، لڑکی دینی گھرانے سے صوم و صلوٰۃ اور پردے کی پابند ہو اور تحریکی مزاج کی ہو۔ غریب گھرانے کو ترجیح دی جائے گی۔ ذات پات اور عمر کی قید نہیں۔ اعتماد سے لکھیں۔

MrSADIQMohamed,18AvenueD.Casanova94500

Champignysurmarne,FRANCE

(۴)

ایم بی بی ایس ڈاکٹر عمر 28 سال۔ رہائش شاہدرہ لاہور، دینی مزاج کا حامل، مستحکم حیثیت کا حامل، کاروباری ارائیں گھرانہ، کیلئے ترجیحاً ایم بی بی ایس یا بی اے کی سطح کی تعلیمی قابلیت کی حامل دینی مزاج رکھنے والی ہم پلہ فیملی کی لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ ذات ترجیحاً ارائیں، مگر لازم نہیں۔

برائے رابطہ : اختر عدنان، مرکزی دفتر تنظیم اسلامی A-67 علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو، لاہور

ملکی وملی مسائل کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی کا موقف

۱۰/جون ۹۴ء کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز

لاہور، ۱۰/جون: امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ اس اندیشے پر مجھے تو قنوطی قرار دے دیا جاتا ہے کہ اسلام نہ آیا تو پاکستان ختم ہو جائے گا لیکن کثیر تعداد میں پائے جانے والے ان تجزیہ نگاروں کو کیا کہا جائے گا جو کھل کر یہ کہہ رہے ہیں کہ آج ہماری سیاسی صورت حال وہی ہے جو ۱۹۷۱ء میں تھی۔ جیسے مجیب الرحمٰن اور بھٹو کے درمیان محاذ آرائی نے ملک کو دو لخت کر دیا تھا ویسے ہی نواز شریف اور بے نظیر میں مفاہمت نہ ہونے کا نتیجہ ایک اور المناک حادثے کی شکل میں رونما ہو سکتا ہے جو سنگینی کے اعتبار سے شاید سقوط ڈھاکہ سے کم تر نہ ہو۔ مسجد دار السلام باغ جناح کے اپنے خطاب جمعہ میں ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ واقعہ یہ ہے کہ ملک میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی کشمکش وہی صورت حال اختیار کر چکی ہے جو افغانستان میں صدر برہان الدین ربانی اور حکمت یار کے دھڑوں نے اختیار کر رکھی ہے کہ کسی ایک کے تھک کے چور ہو جانے اور صفحہ ہستی سے مٹ جانے تک دوسرا ہتھیار نہیں رکھے گا۔ وہاں افغانستان کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے اور یہاں ملک کا سیاسی نظام بے یقینی کی بھینٹ چڑھنے پر آگیا ہے۔ لیکن نواز شریف بے نظیر مفاہمت ناممکن العمل نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہم بار بار ایسے حادثات سے صرف اس لئے دوچار ہوتے ہیں کہ ہم نے اسلام کو، جو پاکستان کی واحد وجہ جواز ہے، نہیں اپنایا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام صرف عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ معاشی، سماجی اور سیاسی عدل و انصاف کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے ہوتے ہوئے بعض مذہبی ظواہر کی نمائش سے یہ سمجھنا کہ ہمارے معاشرے کو اسلام کی برکات حاصل ہو جائیں گی محض خام خیالی ہے۔ اسلام کا نظام جس نوع کی انقلابی جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے اس سے بچنے کے لئے نفاذ اسلام کے جو سیاسی اور انتخابی راستے اختیار کئے گئے وہ بری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ اس کے لئے اصل ضرورت قوت ایمانی پیدا کرنے کی ہے اور اس کا واحد ذریعہ قرآن حکیم ہے۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ معاشرے کے فعال عناصر میں شعوری ایمان پیدا کرنے کے لئے اعلیٰ ترین سطح پر قرآن مجید کی نشر و اشاعت ضروری ہے۔ اس کے لئے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اس کے بغیر نہ حقیقی معنوں میں اسلام کا نفاذ ممکن ہے اور نہ ہی پاکستان کا استحکام اور اس کی بقاء کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۳

شمارہ: ۹

ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ

ستمبر ۱۹۹۴ء

فی شمارہ -/۷

سالانہ زرِ تعاون -/۷۰

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۴۵ سعودی ریال یا ۱۲ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔	۱۶ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۲۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر۔	۹ امریکی ڈالر

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقامِ اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴-۸

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ۱۵/ اگست کو امریکہ اور لندن کے سفر سے پاکستان واپس پہنچے۔ امیر تنظیم کا یہ دورہ اگرچہ دو ماہ کے طویل دورانیئے پر مشتمل تھا لیکن اس اعتبار سے نہایت "محدود" تھا کہ یہ مغربی دنیا کے صرف دو مقامات بلکہ دو شہروں میں منحصر رہا۔ ابتدائی ڈیڑھ ماہ امیر محترم کا امریکہ میں نیویارک / نیو جرسی کے علاقے میں گزرا جہاں ٹی نک کی جامع مسجد میں لگاتار تیس دن دو دو اور تین تین گھنٹے روزانہ درس قرآن دے کر امیر محترم نے مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کی انگریزی زبان میں منتقلی اور ان کے دروس کو ریکارڈ کروانے کا نہایت مشقت آمیز اور کٹھن کام سرانجام دیا جس کا تقاضا بار بار امریکہ میں مقیم رفقاء و احباب کی جانب سے شدت کے ساتھ آتا تھا۔ بعد ازاں قریباً دس دن امیر تنظیم کا لندن میں قیام رہا جہاں انہیں ۷/ اگست کو عالم عرب کی انقلابی تحریک "حزب التحریر" کے زیر اہتمام انٹرنیشنل خلافت کانفرنس سے خطاب کرنا تھا۔

یہ کانفرنس اس اعتبار سے بہت اہمیت اختیار کر گئی تھی کہ یہودیوں نے اسے رکوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ یہود کے علاوہ بعض مسلمان اور کچھ غیر مسلم حکومتیں بھی کانفرنس کے انعقاد کی راہ میں روڑے اٹکاتی رہیں۔ چنانچہ آخری وقت تک غیر یقینی کی فضا برقرار رہی۔ تاہم اس سب کے علی الرغم کانفرنس اپنے مقررہ وقت پر منعقد ہوئی اور حسب توقع نہایت بھرپور اور کامیاب رہی۔ "حزب التحریر" سے وابستہ نوجوانوں کے جوش و جذبے اور ولولہ انگیز تقاریر نے لندن ہی کو نہیں پوری مغربی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ (اس کانفرنس کے انعقاد پر مغربی پریس نے جس انداز میں تبصرے کئے اور جہاد و انقلاب کی باتیں کرنے والوں سے جس طرح اپنے لئے خطرہ محسوس کیا' اس کی تفصیل ایک مبسوط رپورٹ کی صورت میں ندائے خلافت کے تازہ شمارے میں جس پر ۲۹/ اگست کی تاریخ درج ہے' شائع ہو گئی ہے)۔ اس کانفرنس میں امیر تنظیم نے اپنے پچاس منٹ کے خطاب میں انقلاب کے طریق کار (Methodology) اور نبوی منہج انقلاب پر روشنی ڈالی۔ لندن آمد کا اصل مقصد تو اگرچہ اس کانفرنس میں شرکت ہی تھا' تاہم امیر محترم کے اس

دورے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں کے رفقاء و احباب نے لندن اور اس کے نواحی علاقوں میں دروس و خطابات کے کئی پروگرام ترتیب دیئے۔ اس موقع پر کئی نئے ساتھی تنظیم میں شامل ہوئے جن کی شمولیت سے مقامی تنظیم کو خاصی تقویت ملی۔ امریکہ اور لندن کے اس حالیہ دورے کی قدرے مفصل رپورٹ "رودادِ سفر" کے عنوان سے زیرِ نظر شمارے میں شامل ہے۔

پاکستان کی داخلی سیاست میں اپوزیشن لیڈر جناب نواز شریف صاحب کے اس اعلان سے کہ ہم ایٹم بم بنا چکے ہیں 'ایک زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ عالمی پریس میں بھی اس حوالے سے بھانت بھانت کی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ نواز شریف صاحب کے بیان کے حق میں اور اس کی مخالفت میں بیانات کا ایک انبار جمع ہو چکا ہے جس کے لئے اخبارات کے صفحات ناکافی ثابت ہو رہے ہیں۔ ۲۶/اگست کے خطابِ جمعہ میں امیر تنظیم اسلامی نے بیرون ملک سفر سے واپسی کے بعد پہلی بار ملکی حالات کے بارے میں اظہارِ خیال فرمایا اور نواز شریف صاحب کے اس بیان پر بھی نہایت بھرپور اور متوازن تبصرہ کیا۔ قارئین یقیناً اس بارے میں امیر تنظیم کے خیالات جاننے کے مشتاق ہوں گے۔ ان کی سہولت کے لئے ہم ذیل میں اس خطاب جمعہ کا مکمل پریس ریلیز درج کئے دیتے ہیں کہ ملکی حالات کے بارے میں تنظیم اسلامی کے موقف کی ترجمانی بھی اسی پریس ریلیز کے ذریعے ہوتی ہے :

> لاہور : ۲۶/اگست۔ امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ سابق وزیر اعظم نواز شریف نے ایٹم بم کی موجودگی کا دھماکہ خیز اعلان کر ہی دیا ہے تو اب حکومت پاکستان کو بھی اس حقیقت کا کھل کر اعتراف کر لینا چاہئے کیونکہ بارہ کروڑ مسلمانوں کے ملک کو قومی سطح پر جھوٹ بولنا زیب نہیں دیتا۔ مسجد دار السلام باغ جناح میں اجتماع جمعہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہم کیاولی اور چانکیہ کے پیروکار نہیں جن کے نزدیک سیاست میں جھوٹ اور دھوکہ روا ہے بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنے والے ہیں جنہوں نے دشمنوں سے اپنے منصوبوں کو خفیہ رکھنے کی تو ہدایت بھی فرمائی ہے لیکن راز کھل جائے تو جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں دی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ میں تو پہلے ہی اس بنیاد پر ان حضرات سے اتفاق کا اظہار کر چکا تھا جو پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کا اعتراف کرنے کا مشورہ دیتے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے کھلے اور چھپے

(باقی صفحہ ۷۵ پر)

تذکرہ وتبصرہ

عالمی احیاءِ خلافت کانفرنس

کی رُوداد اور اس کی رُوحِ رواں عالمِ عرب کی نئی احیائی تحریک

"حزب التحریر" کے افکار و نظریات

امیر تنظیم اسلامی کا ۱۹/اگست کا خطاب جمعہ

خطبۂ مسنونہ 'سورۃ النور کی آیت ۵۵ اور سورۂ آل عمران کی آیت ۶۴ کی تلاوت کے بعد فرمایا :

آپ حضرات سے اس مسجد میں آخری ملاقات ۱۰/ جون کو ہوئی تھی۔ گویا کہ آج پورے سوا دو ماہ کے بعد اس مسجد میں پھر ملاقات ہو رہی ہے۔ ۱۷/ جون کا جمعہ میں نے جامع القرآن قرآن اکیڈمی کراچی میں پڑھایا تھا۔ الحمد للہ اب وہاں مسجد کا ہال تیار ہو گیا ہے جو اپنے سائز میں یہاں کی قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد سے تین گنا بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہمارا یہ دعوتِ قرآنی کا سلسلہ بھی تدریجاً آگے بڑھ رہا ہے' اور اسی کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اب جبکہ کراچی میں بھی قرآن اکیڈمی پوری طرح فنکشنل ہو گئی ہے تو وہاں دینی تعلیم کا ایک سالہ کورس بھی باضابطہ جاری ہے اور مسجد بھی نہایت عالی شان بن گئی ہے۔ ۱۸/ جون کو میں کراچی سے نیویارک گیا تھا۔ چنانچہ ۶ جمعے نیویارک یا نیو جرسی کے علاقے کی مختلف مساجد اور اسلامک سینٹرز میں ادا ہوئے اور وہاں جمعہ کی نماز میں خطاب ہوا۔ پھر ۵/ اور ۱۲/ اگست کے دو جمعے لندن کی دو مساجد میں ادا ہوئے۔

حالیہ دورۂ امریکہ کی خصوصی نوعیت

میرا اس مرتبہ کا سفرِ امریکہ بہت ہی مخصوص نوعیت کا تھا۔ اگرچہ یہ میرا وہاں کا سولہواں یا سترہواں سفر تھا۔۔۔ کیونکہ ۱۹۷۹ء میں پہلی مرتبہ جانا ہوا تھا' اور پھر قریباً ہر سال

ہی جانا ہوا ہے' غالباً دو مرتبہ ایسا ہوا کہ جانا نہیں ہوا اور دو یا تین مرتبہ سال میں دو دو مرتبہ جانا ہوا' اس اعتبار سے یہ سولہواں یا سترہواں سفر تھا---- لیکن ایک تو اس اعتبار سے یہ بہت ہی مختلف نوعیت کا تھا کہ میں صرف ایک شہر میں مقیم رہا' ورنہ اس سے پہلے مشرق' مغرب' شمال اور جنوب میں امریکہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں میں جانا ہوتا تھا' لیکن اِس دفعہ میں ارادہ ہی یہ لے کر گیا تھا کہ مطالعۂ قرآنِ حکیم کے جس منتخب نصاب پر ہم نے اپنی اس پوری تحریک اور دعوت کی بنیاد رکھی ہے' اس کا انگریزی میں ایک درس ریکارڈ کرا دیا جائے۔ اس کا مطالبہ وہاں بہت عرصہ سے تھا' اس لئے کہ ایک تو وہاں پر مختلف علاقوں اور نسلوں کے مسلمان آباد ہیں' عرب مسلمان بھی ہیں' لوکل افروامریکن بھی ہیں' American Converts بھی ہیں یعنی گورے جو ایمان لائے ہیں' اگرچہ یہ تعداد میں کم ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اردو میں ان سب تک اپنی بات پہنچانی ممکن نہیں ہے۔ پھر جو لوگ پاکستان اور ہندوستان سے وہاں جاکر آباد ہوئے ہیں یہ لوگ تقریباً ساٹھ کی دہائی سے جانے شروع ہوئے تھے اور ساٹھ اور ستر کی دو دہائیوں میں بڑی کثرت کے ساتھ لوگ یہاں سے وہاں گئے ہیں اور اب ان کی اگلی نسل جو وہاں پر تعلیم پاکر پروان چڑھی ہے وہ اردو سے بس اتنی سی واقفیت رکھتی ہے جتنی گھر کی چار دیواری میں روز مرہ کی ضروریات کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔ مثلاً کھانا کھالو اور پانی پی لو۔ اس سے زیادہ اردو تو ان کو آتی ہی نہیں۔ کجا یہ کہ اردو میں کوئی ادبی یا دینی بات اور وہ بھی ثقیل دینی اصطلاحات کے ساتھ سمجھنا' یہ ان کے لئے ناممکن ہے۔ چنانچہ ان کی طرف سے انگریزی میں درسِ قرآن کا شدید تقاضا تھا' لیکن میری طبیعت اس پر آمادہ نہیں ہوتی تھی' اس لئے کہ مجھے تو انگریزی میں گفتگو کا بھی محاورہ نہیں ہے' کجا یہ کہ درس و تقریر کا معاملہ ہو۔ لیکن پچھلی مرتبہ جو میرا امریکہ جانا ہوا (اور یہ سال ان سالوں میں سے تھا جن میں میرا دو بار امریکہ جانا ہوا) تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خصوصی بات یہ ہوئی کہ میں نے محسوس کیا کہ میں کسی نہ کسی درجے میں انگریزی میں اپنی بات لوگوں تک پہنچا سکتا ہوں' اگرچہ جو اطمینان اردو میں اپنی بات منتقل کرکے اور اپنا مافی الضمیر واضح کرنے میں ہوتا ہے وہ انگریزی میں نہیں ہو سکتا۔ بہرحال میں نے سوچا کہ "Some thing is better than nothing" کے مصداق اگر کسی

درجے میں بھی قرآن کا بنیادی فکر اور اس کی اصل حکمت مطالعۂ قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب کے حوالے سے ایک مربوط انداز میں لوگوں کے سامنے آجائے اور قرآن کی دعوت لوگوں تک پہنچے تو یہ نہ ہونے سے تو بہتر ہوگا۔

اِس سال چونکہ میں خاص طور پر اسی پروگرام کے تحت گیا تھا لہٰذا ڈیڑھ ماہ میں صرف نیویارک ہی میں مقیم رہا ہوں اور وہاں ایک مسجد میں، جو باقاعدہ مسجد ہی کے طور پر تعمیر ہوئی ہے، یہ پروگرام رکھا گیا تھا۔ وہاں عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ ابتداء میں کسی مکان ہی کو مسجد بنا لیتے ہیں، یا کوئی چرچ خریدا اور اسے مسجد میں "Convert" کر لیا گیا۔ لیکن اب بہرحال امریکہ میں بھی اور انگلستان میں بھی باضابطہ مساجد موجود ہیں جو مساجد ہی کے طور پر تعمیر ہوئی ہیں۔ تو ہمارا یہ پروگرام ٹی نیک (Teaneck) جو مین ہٹن کے ساتھ ملحق مقام ہے، وہاں کی مسجد میں رہا جو بہت ہی عمدہ مسجد ہے۔ الحمد للہ کہ وہاں ابتداء میں میرے دو درس روزانہ اور اس کے بعد تین درس روزانہ ہوتے رہے اور اس طرح مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب تقریباً تین چوتھائی مکمل کر لیا گیا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس سے ہماری اس دعوتِ قرآنی کو بھی تقویت حاصل ہوگی۔ اور چونکہ امریکہ کو اِس وقت دنیا میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور تمام دنیا کے لوگ وہاں موجود ہیں، مثلاً اس مرتبہ بہت سے افریقی نوجوان ہمارے بہت قریب آئے ہیں اور انہوں نے اپنے اپنے ملکوں میں اس بات کو پہنچانے کا عزم ظاہر کیا ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ انگریزی میں یہ دروس کا یہ سلسلہ اس کا ذریعہ بن جائے گا کہ ہمارا یہ پیغام بڑے پیمانے پر دنیا کے کونے کونے تک پہنچ سکے۔

عالمی احیاءِ خلافت کانفرنس میں شرکت

اس کے بعد جو میری لندن واپسی ہوئی ہے وہ اصل میں ایک خصوصی دعوت کے نتیجے میں تھی۔ کئی ماہ پہلے سے مجھ سے وہاں منعقد ہونے والی "عالمی احیاءِ خلافت کانفرنس" میں شرکت کا وعدہ حاصل کر لیا گیا تھا جس کا اب یہاں پر بھی کافی شہرہ ہو چکا ہے۔ تو مجھے دراصل امریکہ سے فوری طور پر لندن اس کانفرنس ہی کی وجہ سے واپس آنا پڑا، اس لئے کہ ۷/ اگست کو وہاں کانفرنس تھی، ورنہ امریکہ میں میرے گھٹنوں کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی اور

آپریشن کا پروگرام بن گیا تھا، لیکن آپریشن کے بعد بڑی غیر یقینی سی بات ہوتی ہے۔ ویسے تو مجھے امید تھی کہ آپریشن کے بعد میں واپس لندن آسکوں گا، لیکن مشورہ یہی دیا گیا کہ ہو سکتا ہے آپریشن کے بعد کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے، تو پھر اس کانفرنس میں شرکت ممکن نہیں رہے گی۔ میرا چونکہ ان حضرات سے پختہ وعدہ تھا جو یہ کانفرنس منعقد کر رہے تھے، لہٰذا میں نے اپنے اس آپریشن کو ملتوی کیا اور اپنے وعدے کو پورا کرنے کے لئے بروقت لندن پہنچا۔

اِس عالمی خلافت کانفرنس کا انعقاد "حزبُ التحریر" کی جانب سے کیا گیا تھا جو ایک نئی دینی احیائی تحریک ہے جس کے بارے میں، میں آج کچھ باتیں بعد میں عرض کروں گا۔ ان حضرات سے میرا تعارف امریکہ ہی میں آج سے چار یا پانچ سال قبل ہوا تھا، لیکن اُس وقت تک جو بات میں نے سمجھی تھی وہ کچھ یہ تھی کہ یہ زیادہ تر عرب نوجوان ہیں، اور عربوں میں بھی خاص طور پر فلسطینی اور اردنی نوجوان اس میں شامل ہیں۔ ان حضرات میں دین کے لئے جوش و جذبہ بے پناہ ہے۔ ان بہت سی باتوں میں جن سے مجھے ان حضرات کے ساتھ اتفاق تھا اہم ترین یہ تھی کہ ان کا بنیادی فکر تقریباً وہی تھا جو ہمارا ہے۔ البتہ بعض چیزوں میں اختلاف بھی تھا، اور وہ اختلاف بھی میں بیان کروں گا لیکن اس کی نوبت شاید آج نہ آسکے اور اسے اگلے جمعہ تک ملتوی کرنا پڑے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اتفاق کی باتیں بھی واضح ہو جائیں اور اختلاف بھی واضح ہو جائے۔ اس سلسلے میں بعض امور پر میں ان کے ذمہ دار لوگوں سے گفتگو بھی کر کے آیا ہوں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک جوش و جذبے اور خلوص و اخلاص کا تعلق ہے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ یہ سب کے سب یا تو یونیورسٹیوں کے طالب علم ہیں یا اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ہیں اور ان میں دین کے لئے شدید تڑپ موجود ہے۔ ان لوگوں کو دین کے ساتھ صرف زبانی کلامی نہیں عملی لگاؤ بھی ہے۔ ان کی وضع قطع، شکل و صورت اور گفتگو میں نظر آتا تھا کہ دین کے ساتھ ان کی بڑی گہری وابستگی ہے۔

اس کانفرنس پر مخالفانہ ردعمل بھی میرے علم میں بہت جلد آچکا تھا۔ چنانچہ ایک صاحب جو میرے عزیز بھی ہیں اور بہت پرانے تعلق والے بھی، اور سعودی عرب کی طرف سے مبعوث ہو کر انگلستان میں دینی خدمت پر مامور ہیں وہ خاص طور پر مجھ سے ملنے کے لئے آئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ اس کانفرنس میں شرکت نہ کریں، اس لئے کہ ان

گوں کے عقائد درست نہیں ہیں اور یہ بہت تخریبی قسم کے لوگ ہیں۔ وہ اپنے ہمراہ ان کے بارے میں عربی زبان میں ایک تحریر بھی لے کر آئے تھے جو ان کے عقائد کے بارے یں چھپی تھی۔ اسے سرسری طور پر دیکھنے سے مجھے محسوس ہوا کہ اس میں کوئی بات بنیادی نہیں ہے' بلکہ محض تعبیرات کے اختلافات ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بڑی بات مجھے نظر نہیں ائی۔ چنانچہ میں نے ان صاحب سے یہی عرض کیا کہ ان لوگوں نے مجھے دعوت دی ہے جو یں نے قبول کی ہے۔ اور مجھے تو وہاں جاکر اپنی بات کہنی ہے۔ فرض کیجئے کہ ان کی کوئی بات اگر غلط بھی ہے تو میں اس کی تردید کروں گا۔ میں ان کی بات کہنے کے لئے نہیں' بلکہ ان کی دعوت پر جارہا ہوں اور اس ضمن میں جو میری رائے ہے میں وہی پیش کروں گا۔ بہرحال وہ کچھ بددل سے بھی ہوئے' کیونکہ ان کا خیال تھا کہ میں ان کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے اس کانفرنس میں شریک نہیں ہوں گا۔ اس کے بعد ہمارے ایک ساتھی کو ایک خط موصول ہوا۔ چھ سات صفحات پر مشتمل انگریزی زبان میں تحریر شدہ یہ خط دراصل ان کے ایک دوست کو آیا تھا ان کے کسی اور دوست کی طرف سے جو انگلستان میں ہیں۔ انہوں نے بھی اسی طرح کی باتیں بڑی تفصیل کے ساتھ زوردار انداز میں لکھی تھیں کہ یہ کانفرنس جن لوگوں کے زیر اہتمام ہو رہی ہے یہ بہت غلط قسم کے لوگ ہیں' ان کے ساتھ آپ کا تعاون صحیح نہیں ہے اور آپ کو اس کانفرنس میں شرکت نہیں کرنی چاہئے۔ انہوں نے بھی جو باتیں لکھیں وہ تقریباً وہی تھیں' یعنی بعض اعتقادی معاملات سے متعلق' جن کی حیثیت میرے نزدیک تعبیرات کے فرق سے زیادہ نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بنیادی بات نظر نہیں آئی۔ لیکن یہ دیکھ کر ماتھا ٹھنکا کہ انہوں نے لکھا تھا کہ میرا نام کہیں ظاہر نہ کردیا جائے ورنہ یہ لوگ مجھے قتل کردیں گے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ معاملہ کچھ بہت ہی خطرناک ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ کچھ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں "حزب التحریر" کے نوجوانوں' اور دوسرے مذہبی حلقوں (جو رابطہ عالم اسلامی وغیرہ کے زیر اثر ہیں) کے درمیان بڑی چپقلش اور تصادم کی فضا پائی جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف تنظیم اسلامی لندن کے رفقاء' جو اگرچہ معدودے چند ہیں' ان کی طرف سے بار بار پیغام آرہا تھا کہ آپ کانفرنس میں ضرور شریک ہوں اور یہ کہ "حزب التحریر" کے بارے میں جو پروپیگنڈہ ہے وہ غلط ہے' ہم نے

ان نوجوانوں کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کا جوش و جذبہ اور خلوص و اخلاص ان چیزوں سے بالاتر ہے۔ تو اس طرح کی متضاد باتیں تھیں جو میرے سامنے آ رہی تھیں۔ بہرحال میں تو ان سے بہت پہلے وعدہ کر چکا تھا جو اپنے اس تعارف کی بنیاد پر تھا جو پچھلی مرتبہ امریکہ میں ان کے قائدین سے براہ راست مل کر ہوا تھا۔ یہ ساری "Controverry" تو بعد میں میرے علم میں آ رہی تھی۔

پھر میں ابھی امریکہ ہی میں تھا کہ معلوم ہوا کہ پاکستان کے اخبارات میں بھی بڑا چرچا ہے کہ اس کانفرنس کی بڑی مخالفت ہو رہی ہے، شاید اس پر پابندی لگ جائے۔ پھر امریکی اخبارات میں بھی اس کا تذکرہ آنا شروع ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی بہت ہی اہم معاملہ بن گیا ہے جو اس طریقے سے بین الاقوامی سطح پر اس کا مثبت یا منفی انداز میں نوٹس لیا جا رہا ہے۔ میں کچھ حیران بھی تھا کہ مسئلہ ہے کیا؟ تفاصیل کا علم نہیں تھا۔ تو اس طرح کی کیفیت میں میں لندن پہنچا۔

دورۂ لندن کے بعض خوشگوار تاثرات

میں چار اگست کو لندن پہنچا تھا۔ لندن کے بارے میں چند باتیں میں اس کانفرنس سے ہٹ کر بھی عرض کرنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ میرا لندن کا یہ سفر چار سال بعد ہوا ہے۔ اس عرصہ میں امریکہ آمد و رفت رہی ہے لیکن لندن جانا نہیں ہوا۔ اور یہ بات بتا دینے میں بھی مجھے کوئی عار نہیں ہے کہ چونکہ یورپ بالخصوص انگلستان میں مسلمان آپس میں فرقہ وارانہ اختلافات میں مبتلا ہیں، اس وجہ سے میرا جی وہاں جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ پھر یہ کہ میرا جب بھی وہاں جانا ہوا ہے وہاں کے "Intellectual" طبقے سے رابطے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی تھی، لہٰذا کچھ انقباض سا تھا اور میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اب اس کانفرنس کے موقع پر جو لندن گیا ہوں تو میں نے چند اہم باتیں نوٹ کی ہیں جو میں آپ کے علم میں لا رہا ہوں۔

پہلی بات میں نے یہ محسوس کی کہ چار سال کے عرصہ میں لندن کی قلبِ ماہیت اس معنی میں ہو چکی ہے کہ اب وہ انگریزوں کا شہر نظر نہیں آتا۔ اگر آپ لندن شہر سے باہر

مضافاتی بستیوں (suburbs) میں نکل جائیں تب تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ انگلستان میں ہیں' لیکن لندن میں رہتے ہوئے قطعاً احساس نہیں ہو تا کہ آپ انگلستان میں یا انگریزوں کے ملک میں ہیں' بلکہ اب وہاں پر ہر طرح کے لوگ آباد ہیں' خاص طور پر ہندوستانی' پاکستانی' ترک اور افریقی ممالک اور ویسٹ انڈیز کے لوگ ہیں' اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت لندن میں بحیثیت مجموعی ان کا غلبہ ہو چکا ہے۔

دوسری بات یہ نظر آئی کہ اب وہاں مساجد باقاعدہ مساجد کی حیثیت سے تعمیر ہو رہی ہیں۔ اس سے پہلے وہاں صرف دو مساجد ایسی تھیں۔ ایک تو "ووکنگ" کی بہت پرانی مسجد جو لندن سے تقریباً بیس میل باہر ایک suburb میں ہے۔ یہ بھوپال کی نواب صاحبہ نے بنوائی تھی' جو بڑی چھوٹی سی مسجد ہے۔ اس مسجد پر قادیانیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور وہاں بہت عرصہ تک قادیانیوں کا مرکز رہا ہے' لیکن مجلس تحفظ ختم نبوت کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے کوشش کر کے یہ مسجد واگزار کرائی اور اس پر سے قادیانیوں کا قبضہ ختم کرایا۔ اب یہ مسجد اہل سنت خاص طور پر تحفظ ختم نبوت کے کارکنوں کے زیر تحویل ہے۔ اس مرتبہ میں خاص طور پر سفر کر کے وہاں گیا اور ظہر کی نماز اس مسجد میں ادا کی۔ اس کے علاوہ ایک "ریجنٹ پارک" کی مسجد تھی' جو دراصل حکومتی سطح پر مختلف مسلمان ممالک نے چندہ جمع کر کے تعمیر کی تھی۔ وہ بہرحال مرکزی مقام پر بڑی شاندار مسجد ہے۔ لیکن اس کا انتظام و انصرام سعودی عرب اور مصر کی حکومتی پالیسی کے مطابق چل رہا تھا۔ مقامی لوگ چاہیں تو وہاں جا کر نماز پڑھ لیں اور کبھی کبھی ان کی اجازت سے کوئی خاص اجتماعات منعقد کر لیں' لیکن اس کے انتظامی معاملات میں وہاں کے لوکل مسلمانوں کو کوئی عمل دخل حاصل نہیں تھا۔ اس کے علاوہ تو یہی تھا کہ کہیں کسی Basement میں اور کہیں کسی فلیٹ کے اندر نماز کے لئے جگہ مخصوص کر کے اسے مسجد کی حیثیت دے دی گئی۔ لیکن اس مرتبہ میں وہاں کی مساجد دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور ان کے لئے وہاں خاص طور پر "Purposely built Mosques" کی اصطلاح سننے میں آئی۔ یعنی ایسی مسجدیں جو باقاعدہ طور پر مسجدوں ہی کی حیثیت سے تعمیر ہوئی ہیں۔ ان میں سے چار کو تو میں نے بھی دیکھا' جو نہایت شاندار مسجدیں نظر آئیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ میں تصور نہیں کر سکتا تھا کہ

لندن میں اب اس طرح کی مساجد بھی ہیں۔ اس وقت وہاں پر چرچ تو بالکل نہ ہونے کے برابر ہیں، اور جو ہیں بھی تو وہ بالکل غیر آباد ہیں، لیکن اس کے برعکس مسجدوں کے اندر حرکت ہے، ان میں مسلمانوں کی آمد و رفت ہے، جس کو وہاں "Throbbing" کہا جارہا ہے۔ وہاں کی باقاعدہ مساجد بڑے بڑے گنبدوں کے ساتھ تعمیر ہو رہی ہیں۔ "کرائیڈن" اور "فنز بری پارک" کی مساجد کو دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا۔ اسی طرح ساؤتھ آل کی مسجد میں اگرچہ میں جا نہیں سکا، لیکن سنا ہے کہ وہ بھی بڑی شاندار مسجد ہے۔ "ولسڈن گرین" کی عظیم الشان مسجد بھی زیر تعمیر ہے، اس کا ابھی بیسمنٹ بنا ہے، لیکن اس کا ماڈل دیکھ کر میں حیران رہ گیا، بڑے اونچے مینار کے ساتھ وہ مسجد بننے والی ہے۔

تیسری چیز جو خاص طور پر "حزب التحریر" کی میں نے دیکھی وہ یہ ہے کہ نوجوانوں کا ایک طوفان سا نظر آتا ہے۔ اپنے ملک کے حالات سے اگر موازنہ کیا جائے تو یہاں کی صرف دو تحریکیں ایسی ہیں کہ اگرچہ ان کی نوعیت اور ان کا مزاج علیحدہ ہے، لیکن وہ اسی تیزی کے ساتھ آگے بڑھی ہیں۔ میری مراد سپاہ صحابہؓ اور ایم کیو ایم سے ہے۔ سپاہ صحابہؓ ہمارے ہاں جس طرح دیکھتے ہی دیکھتے اٹھی ہے یہ بالکل سامنے کی بات ہے۔ کوئی بیس تیس برس نہیں بلکہ پانچ چھ سال کے اندر اندر یہ ایک قوت بن کر اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ یہ بھی ایک "Spectecular Phenomenon" ہے، جس کی ہمارے ہاں عام طور پر مثال نہیں ملتی۔ یا یہ کہ بالکل دوسرے انداز میں ایک قومیت کی بنیاد پر یا اپنے دنیوی حقوق کے حصول کے لئے کراچی میں ایم کیو ایم کی تحریک ابھری۔ اس میں بھی نوجوانوں کا عنصر ہے، بزرگوں کا معاملہ نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا کہ انتخابات ہوتے ہیں تو کراچی سے نوجوان ہی منتخب ہو کر آتے ہیں، جن کی نہ تو کوئی سرمایہ دارانہ حیثیت ہوتی ہے اور نہ ہی وہ خاندانی یا پشتینی قسم کے کوئی سیاستدان ہیں۔ تو یوں سمجھئے کہ یہ "حزب التحریر" بھی انگلستان میں بالکل اسی انداز میں جنگل کی آگ کی طرح بڑھی ہے۔ اس کی یہ شکل ابھی نہ امریکہ میں ہے، نہ کسی اور ملک میں۔ لیکن انگلستان کا کوئی خاص معاملہ ہے کہ وہاں پر اس تحریک نے باقاعدہ طور پر بڑے ہی پر جوش انداز میں اور بہت بڑے پیمانے پر نوجوانوں کو متحرک کیا ہے اب اس مرتبہ میں نے اس میں ہندوستانی اور پاکستانی نوجوانوں کا غلبہ دیکھا ہے۔ اس کی

نیارت عرب ہے، یا کچھ "Local Converts" ہیں۔ قائدین میں ایک کینیڈین مسلمان جمال ہارووڈ اور ایک برطانوی فرید قاسم ہے۔ وہ بیچارا اگرچہ مفلوج بھی ہے لیکن اس کا جوش اور جذبہ ہم جیسے صحیح سالم لوگوں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھایا جاتا ہے اور وہ وہیل چیئر پر آتا جاتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جوش و جذبہ کے اعتبار سے تو معلوم ہوتا کہ ہے اس کے اندر کوئی لاوا ابھرا ہوا ہے، یا بپھرا ہوا طوفان ہے۔ وہ محض روایتی (Traditional) اسلام کے پیروکار نہیں ہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے علم کی حد تک اس وقت عالم اسلام میں انقلابی (Radical) اسلام کا سب سے زیادہ پُرجوش مظہر یہی حزب التحریر کے نوجوان ہیں۔ باقی یہ کہ "جماعہ اسلامیہ" جو مصر میں سرگرم ہے یا یہ کہ جو کچھ الجزائر میں ہو رہا ہے میں اس کے بارے میں میں اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لئے کہ ان کا میرا مشاہدہ حال کا نہیں ہے، بڑا پرانا ہے۔ "جماعہ اسلامیہ" کے نوجوانوں کے ساتھ میرا تعارف ۱۹۷۹ء میں ہوا تھا اور ان سے بھی میں بڑا متاثر ہو کر آیا تھا۔ لیکن اپنی اس وقت کی معلومات کے مطابق میں سمجھتا ہوں کہ "Radical" اسلام، اس کا جوش و جذبہ اور زوردار عمل کی کیفیت مجھے سب سے زیادہ نمایاں "حزب التحریر" کے ان نوجوانوں کے اندر نظر آرہی ہے۔

احیاءِ خلافت کانفرنس اور اس کے تہلکہ خیز اثرات

اب آیئے کانفرنس کے بارے میں چند باتیں میں آپ کو بتا دوں۔ "ویمبلے ایرینا" جہاں پر یہ کانفرنس ہوئی ہے ایک بہت بڑا کنونشن سنٹر ہے، لیکن اس کے بارے میں بھی کچھ لوگ دھوکا کھاجاتے ہیں۔ اس لئے کہ جس طرح ہمارے ہاں "الحمرا" ہے، اس میں چھوٹا ہال بھی ہے اور بڑا ہال بھی ہے، اب کوئی پروگرام کون سے ہال میں ہو رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجتماع کتنا بڑا ہے۔ تو ویمبلے ایرینا کے بھی چھوٹے ہال بھی ہیں۔ اور چھوٹے ہال ہی میں ہمارے ہاں سے ایک دینی شخصیت نے ایک زمانے میں جلسہ کیا تھا جس کی بڑی شہرت ہوئی تھی اور پاکستان سے بھی بہت سے لوگ اس میں شریک ہوئے تھے۔ لیکن یہ خلافت کانفرنس اصل "ایرینا" میں تھی، جو یوں سمجھئے کہ ایک بہت بڑا

covered سٹیڈیم ہے' جس میں بارہ ہزار تو نشستیں ہیں اور اس میں چار ہزار کی مزید گنجائش ہے۔ گویا اس کی capacity سولہ ہزار کی ہے۔ اس کا ایک دن کا کرایہ ۳۶ ہزار پونڈز یعنی قریباً سترہ لاکھ پاکستانی روپے ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ یہودیوں کی ملکیت ہے اور انہوں نے ہی یہ کرایہ پر دیا تھا۔ اس سے آپ کو یہودی ذہنیت کا اندازہ ہو جائے گا کہ کانفرنس کے شدید ترین مخالف بھی وہی تھے اور حکومت پر دباؤ بھی وہی ڈال رہے تھے کہ اس پر پابندی لگائی جائے' لیکن اس کے لئے اپنا ایرینا بھی انہی نے کرایہ پر دیا۔ یعنی "دھندہ اپنی جگہ اور نظریہ یا مذہب اپنی جگہ" کا جو خاص اصول دنیا میں رائج ہے اس کا یہ بڑا عجیب نمونہ سامنے آیا۔ "حزب التحریر" والوں نے اس میں شرکت کے لئے تین پونڈ کا ٹکٹ رکھا تھا اور اس کے بارہ ہزار ٹکٹ پیشگی فروخت ہو گئے تھے۔ اس طرح ۳۶ ہزار پونڈز کرایہ تو انہیں وصول ہو چکا تھا۔ ابھی مزید لوگ شرکت کے خواہش مند تھے اور ٹکٹ مانگ رہے تھے' لیکن ظاہریات ہے کہ وہ اس سے زیادہ ٹکٹ فروخت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس لئے کہ وہاں کی یہودی انتظامیہ کے کچھ قواعد و ضوابط ہیں کہ جب وہ کرائے پر دیتے ہیں تو پھر وہ کنٹرول بھی کرتے ہیں تاکہ انتظام قابو سے باہر نہ ہو جائے۔ چنانچہ وہاں پر ایک دوہرا سا انتظام کا معاملہ چل رہا تھا۔

میں جیسے ہی وہاں پہنچا تو مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ پورے ملک میں جوش و خروش بہت ہے اور کانفرنس کا بہت چرچا ہے۔ مخالفت میں' جیسا کہ میں نے عرض کیا' یہودی سب سے آگے تھے۔ عیسائی تنظیموں نے بھی کچھ مخالفت کی لیکن اتنی نہیں۔ یہودی بہت آگے تھے اور انہوں نے یہ پروپیگنڈہ کیا تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں اگر مسلمان یہاں جمع ہو گئے تو ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہمارے اداروں پر حملے کریں گے اور توڑ پھوڑ کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اسرائیل سے "خاد" کے ایجنٹ بھی بلا لئے تھے' تاکہ وہ یہودیوں کی املاک کی حفاظت کر سکیں۔ ادھر حکومتی سطح پر فرانس کی حکومت کا شدید دباؤ تھا کہ اس کو "ban" کیا جائے۔ میں پہلے کئی مرتبہ واضح کر چکا ہوں "WASP" یعنی (White Anglo Sexen Protestants) جو عیسائیوں میں یہودیوں کے سب سے بڑھ کر آلہ کار ہیں ان میں سے فرانس بہت نمایاں ہو گیا ہے۔ اس کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے کہ الجزائر میں

بنیاد پرست مسلمانوں کی ایک ابھرتی ہوئی تحریک ہے تو اس کی زد فرانس پر پڑ رہی ہے کیونکہ الجزائر فرانس کا مقبوضہ علاقہ اور اس کی نو آبادی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے الجزائری فرانس کے اندر موجود ہیں۔ جیسے ہندوستان برطانیہ کی نو آبادی تھا تو ہمارے بہت سے لوگ برطانیہ میں جا کر آباد ہو گئے۔ تو اس اعتبار سے ان لوگوں کو اپنا Colonization کا دور مہنگا پڑ رہا ہے، کیونکہ جو بھی "کالونی" جن کی تھی وہاں کے لوگ وہاں پر آکر آباد ہو گئے۔ اور اب ان کا ایک طرح کا حق ہے وہاں پر رہنے کا۔ ادھر الجزائر میں فرانسیسیوں کو بنیاد پرست مسلمان قتل کر رہے ہیں۔ کانفرنس سے دو دن پہلے وہاں پر چھ فرانسیسی قتل کر دیئے گئے۔ اس پر انہوں نے بڑا شور مچایا کہ ہمارے لوگوں کے ساتھ الجزائر میں یہ ہو رہا ہے اور برطانیہ کی حکومت اپنے ہاں اس طرح کے لوگوں کو کانفرنس کرنے کا موقع دے رہی ہے، لہٰذا ان کا شدید دباؤ تھا کہ اس کو بند کیا جائے۔

اس کانفرنس کے بارے میں مغربی پریس کا کہنا تھا کہ یہ انگلستان کے مسلمانوں کا تاریخ کا سب سے بڑا جلسہ ہو گا، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ قبل ازیں مسلمانوں کے اس سے کہیں بڑے بڑے جلسے اور اجتماعات یہاں ہوئے ہیں، خاص طور پر تبلیغی جماعت کے اجتماعات خاصے بڑے ہوتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ان کا کوئی اسی ہزار کا اجتماع بھی وہاں ہوا ہے۔ لیکن چونکہ تبلیغی جماعت کے اجتماعات کے اندر اس طرح کی ہلچل نہیں ہوتی اور ان کا کوئی سیاسی موقف نہیں ہے، اور ان سے کسی کو کوئی خاص اندیشہ نہیں ہے، ان کا مذہبی انداز کا اجتماع ہوتا ہے، لہٰذا ان کے اجتماعات کا کوئی چرچا اخبارات میں یا لوگوں میں یا میڈیا میں اس طریقے سے نہیں ہوتا۔ لیکن حزب التحریر چونکہ ایک ایسی تحریک ہے جس کا کہ ایک سیاسی آؤٹ لک ہے، عالمی سطح پر ان کی آراء ہیں اور یوں سمجھئے کہ بڑی ہی Aggressive قسم کی ان کی آراء ہیں، اس حوالے سے ایسے لوگوں کا اتنا بڑا اجتماع جو ہے، اس کا بہت بڑا چرچا وہاں موجود تھا۔ البتہ وہاں بالفعل حاضری اس اندازے کے مقابلے میں کم رہی تھی۔ ہال کے اندر آٹھ ہزار نشستیں پر تھی اور وہاں کے "پریس" نے بھی صحیح اعداد و شمار دیئے۔ متوقع حاضری میں کمی کے اسباب میں سے ایک تو یہ بات ہوئی کہ چونکہ شور بہت مچ گیا تھا کہ ہنگامہ ہو گا، فساد ہو گا، خاد کے ایجنٹ بھی آگئے ہیں، تو بہرحال

بہت سے لوگوں نے عافیت اسی میں سمجھی ہوگی کہ خواہ مخواہ اس طرح کے ہنگامے والی جگہ پر جاکر اندیشہ اور خطرہ کیوں مول لیا جائے۔ لوگوں کو دور دور سے آنا تھا اور دور سے آنے والے اس طرح کے معاملات میں خطرہ مول نہیں لیتے۔ البتہ کانفرنس کے آغاز کے وقت کثیر تعداد میں لوگ ایسے آگئے تھے جو اس وقت کہہ رہے تھے کہ ہمیں ٹکٹ دیجئے، ہم اندر جانا چاہتے ہیں۔ لیکن ایرینا کی یہودی انتظامیہ کا موقف تھا کہ صرف وہی لوگ جن کو پہلے سے ٹکٹ ایشو ہیں اندر جائیں گے، اب خواہ سیٹیں خالی رہ جائیں لیکن اب ہم کسی کو مزید اندر نہیں جانے دیں گے۔ اگر ان سب کو بھی اندر جانے دیا گیا ہوتا تو اندازہ یہ ہے کہ بارہ ہزار کا یہ ایرینا پر ہو گیا ہوتا۔ ٹکٹ نہ ملنے پر بہت سے لوگ مایوس ہو کر واپس لوٹ گئے۔ اس کے علاوہ ایرینا کے باہر جمع ایک بڑا ہجوم کسی بہت بڑے جشن کا سماں پیش کرتا تھا۔

میڈیا کی کوریج وہاں پر کانفرنس کے انعقاد سے پہلے بھی بہت ہوئی ہے اور بعد میں بھی۔ اس کی وجہ سے کچھ لوگوں کے ذہنوں میں اشکالات بھی پیدا ہوئے ہیں، چہ میگوئیاں ہوئی ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ میڈیا نے اسے اتنا اچھالا ہے؟ اس ضمن میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ خود برطانوی حکومت نے اس کانفرنس کی سرپرستی کی ہے۔ اگر ایسا ہوا ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟ یہ جو آراء ہیں یہ میں، ان شاء اللہ، بعد میں عرض کروں گا۔

جہاں تک اس کانفرنس کے اثرات کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے ذریعے سے پوری دنیا میں "خلافت" کا لفظ ایک دم بہت عام ہوا ہے۔ یہ پوری دنیا کے میڈیا پر آیا ہے۔ سی این این، بی بی سی ٹیلی وژن اور دوسرے نشریاتی اداروں پر اس کی خوب تشہیر ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں یہ لفظ اب عام نہیں رہا تھا، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے اس کانفرنس کے ذریعے اس دینی اصطلاح کا خوب چرچا ہوا ہے۔ "خلافت" کی اصطلاح کی سیاسی حیثیت بھی مسلم ہے، یعنی مسلمانوں کا ایک سیاسی نظام پوری دنیا کے اندر ہو۔ اس حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ پوری دنیا میں اس وقت اسلام کے احیاء کا جو ایک ہمہ جہتی عمل چل رہا ہے اس ضمن میں یہ ایک بہت بڑا "Break through" ہے کہ خلافت کے عنوان سے پوری دنیا میں ایک غلغلہ بلند ہوا ہے۔

پھر اس میں میری تقریر کو خصوصی کوریج دی گئی ہے۔ "CNN" نے بھی اسی کو سب سے زیادہ نمایاں کیا ہے اور بعض دوسرے اداروں نے بھی۔ میں یہ نہیں سمجھ پایا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ کیونکہ میرا نام پہلے سے کچھ معروف تھا اور ایک تنظیم اور تحریک کے حوالے سے میری شخصیت متعارف تھی، جبکہ باقی سب نوجوان تھے جن میں سے کسی کو کوئی جانتا ہی نہیں۔ "حزب التحریر" کا نام تو لوگ جانتے ہیں، لیکن ان میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا کوئی ذاتی تعارف بڑے پیمانے پر پہلے سے موجود ہو۔ یہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میری تقریر کی کوریج سپیشل دی گئی ہے۔ اور ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ "BBC" نے خاص طور پر نام لے کر کہا ہے کہ تنظیم اسلامی "یو۔کے اور یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ میں اب اپنے حلقہ اثر کو بڑھا رہی ہے، جس کی وجہ سے یہودیوں میں بڑی بے چینی اور تشویش پائی جاتی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری جو حیثیت ہے وہ "من آنم کہ من دانم" کے مصداق ہمیں معلوم ہے۔ احیاءِ اسلام کے لئے اپنی سی کوشش بہرحال ہم کر رہے ہیں، لیکن ہماری کوئی ایسی بڑی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ کسی جماعت کو دشمن کی نگاہ میں بڑا کر کے دکھا دیتا ہے اور کبھی کسی کو چھوٹا کر کے دکھا دیتا ہے، جیسا کہ غزوۂ بدر کے بارے میں قرآن حکیم میں "يُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ" کے الفاظ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کی حیثیت کو بڑھانا چاہتا ہے تو دشمن کی نگاہ میں وہ زیادہ نظر آنے لگتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ اس کانفرنس کے ذریعے تنظیم اسلامی کا تعارف بھی بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔ لیکن اس کا فوری ردِ عمل یہ ہوا کہ میرا داخلہ متحدہ عرب امارات میں بند کر دیا گیا، حالانکہ میرے پاس ویزا موجود تھا۔ میں جب دوبئی ائیرپورٹ پر پہنچا تو وہیں پر میرا ویزا کینسل کیا گیا اور مجھ سے کہا گیا کہ آپ واپس تشریف لے جائیے، یہاں آپ کا داخلہ بند ہو گیا ہے۔ یہ دونوں پہلو میں نے اس لئے بیان کر دیئے ہیں کہ قرآن مجید کہتا ہے "فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا"۔۔۔ تو اس طرح کے معاملات میں دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر کوئی ایک راستہ کھلتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ بعض جگہوں پر کوئی کمی بھی واقع ہو۔ بہرحال دعا یہ کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے دین کے

ام کو تقویت عطا فرمائے۔ اشخاص، تنظیمیں اور جماعتیں زیادہ اہمیت کی حامل نہیں وتیں۔ ان سب کا مقصد یہی ہے کہ دین کا بول بالا ہو، اور اقامتِ دین کے مقصد میں امیابی ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس کانفرنس کو اور جن لوگوں نے اس میں حصہ لیا ہے ان کی مساعی لو اس سلسلے میں بار آور فرمائے اور اس کے ذریعے سے احیائے دین کے عمل کو تقویت ماصل ہو۔

"حزبُ التحریر" کا تعارف

اب میں "حزب التحریر" کے حوالے سے کچھ باتیں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ بہت سے حضرات کے لئے یہ نام بھی بالکل نیا ہو گا اور انہوں نے شاید پہلی مرتبہ ان دنوں یہ فظ سنا ہو۔ "حزب التحریر" کے لفظی معنی "لبریشن پارٹی" کے ہیں۔ ہمارے یہاں "تحریر" کے ایک ہی معنی سمجھے جاتے ہیں۔ تحریر کرنا، لکھنا "to write" ----- لیکن عربی میں "تحریر" کے معنی ہیں "آزاد کرانا" (to liberate) ہمارے ہاں حُر اور حُریت کے الفاظ مستعمل ہیں۔ "حر" آزاد کو کہا جاتا ہے اور "حریت" آزادی کو۔ "تحریر" باب تفعیل سے مصدر ہے۔ اگرچہ میں نے ان حضرات سے کہا ہے کہ ایک دینی تحریک کے حوالے سے آپ نے یہ کوئی مناسب نام نہیں رکھا ہے، لیکن بہرحال ناموں کا معاملہ اتنا اہم نہیں ہوتا، نام تو علامتی ہوتے ہیں۔ اور ان کی طرف سے تو یہ بات نہیں آئی، لیکن اب میرے اپنے ذہن میں اس نام کا جو سبب آیا ہے وہ میں ابھی بیان کرتا ہوں۔

اس جماعت کی تاسیس ۱۹۵۳ء میں یروشلم میں ہوئی۔ اس کے بانی علامہ تقی الدین نبہانی رحمتہ اللہ علیہ تھے جن کا کافی عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کا پورا سوانحی خاکہ مجھے کوشش کے باوجود ابھی تک نہیں مل سکا۔ یہ فلسطینی مسلمان تھے اور "الاخوان المسلمون" سے تعلق رکھتے تھے۔ البتہ یہ معاملہ اس اعتبار سے اختلافی ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ "الاخوان المسلمون" میں باضابطہ طور پر شامل تھے اور حسن البناء شہیدؒ کے ساتھیوں میں سے تھے جبکہ "حزب التحریر" کے لوگ کہتے ہیں کہ الاخوان میں شامل نہیں تھے، البتہ ان کے ساتھ ان کے مراسم تھے۔ بہرحال یہ ان کے قریبی حلقوں میں سے

تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ حزب التحریر میں الاخوان کا ایک فکری اور تحریکی تسلسل برقرار ہے۔ علامہ تقی الدین نبہانیؒ اردن میں آباد ہوئے تھے، لیکن جب انہیں وہاں سے نکال دیا گیا تو عراق اور شرقِ اردن کے درمیان "No man's land" پر خیمہ لگا کر مقیم رہے اور وہاں بیٹھ کر تحریر کا کام کرتے رہے۔ یوں سمجھئے کہ آیت اللہ خمینی سے ان کا معاملہ اس اعتبار سے مختلف ہے کہ خمینی صاحب کا فکر تو کیسٹ کے ذریعے سے ایران میں پہنچا جبکہ وہ عراق میں تھے اور اس کے بعد فرانس چلے گئے تھے۔ لیکن علامہ نبہانیؒ نے اپنی کتابوں اور دوسری تحریروں کے ذریعے سے اپنے فکر کو نمایاں کیا۔ اور یروشلم میں وہیں "No man's land" ہی میں ۱۹۵۳ء ان کا انتقال ہوا۔

اردن اور شام میں کئی مرتبہ ان کے ہم خیال لوگوں نے "کو" (coup) کے ذریعے انتقالِ اقتدار کی کوشش کی۔ یہ چیز ان کے طریقہ کار میں باضابطہ طور پر شامل ہے اپنے طریقہ کار کو یہ "تـثـقـیـف" کا نام دیتے ہیں کہ پہلے اپنے فکر کو لوگوں کے ذہنوں میں اتارا جائے جس سے لوگوں میں اسلامی کلچر اجاگر ہو اور ان کی سوچ اس کے مطابق ہو جائے، پھر اس کے بعد اس تحریک کو منظر عام پر لانا، اور پھر "طلبِ نصرت" یعنی جو بھی طاقت اور حیثیت والے لوگ ہیں ان سے مدد حاصل کرنا تاکہ انقلاب برپا کیا جائے۔ عرب ممالک میں چونکہ اکثر و بیشتر فوجی حکومتیں اور ملٹری ڈکٹیٹرز ہیں لہٰذا بار بار اس نوعیت کی کوشش ہوئی ہے کہ کچھ فوجی آفیسرز جو اپنے ہم خیال ہو گئے ان کے ذریعے سے حکومت کا تختہ الٹ کر وہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس میں انہیں مسلسل ناکامی ہوئی ہے۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ ان کا کہنا ہے کہ عالمِ عرب میں ہماری تنظیم اور تحریک موجود تو ہے لیکن زیر زمین (Under ground) ہے۔ اس وقت ان کے امیر یا قائد ابو القدیر زلوم ہیں جن کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق وہ کسی عرب ملک میں زیر زمین کہیں چھپے ہوئے ہیں اور وہیں سے اس تحریک کی راہنمائی فرما رہے ہیں۔ البتہ جب عرب ممالک کے یہ مسلمان نوجوان امریکہ، انگلستان اور دیگر یورپی ممالک میں تارکینِ وطن کی حیثیت سے گئے تو وہاں پر چونکہ حقوق حاصل ہیں لہٰذا انہیں وہاں کام کرنے کا موقع ملا۔ طالب علموں کی حیثیت سے یہ وہاں یونیورسٹیوں کے

اندر کام کر سکتے تھے، جیسے ہمارے یہاں سے جماعت اسلامی سے منسلک لوگ، یا عرب ممالک سے اخوان سے منسلک لوگ باہر گئے اور انہوں نے وہاں جا کر کام کیا۔ وہاں چونکہ ہر طرح کے سیاسی حقوق حاصل ہیں لہٰذا آپ اپنی بات کہہ سکتے ہیں، تنظیم بنا سکتے ہیں۔ پھر بہت سے لوگوں نے وہاں کی شہریت اختیار کر لی، نیشنیلٹی لے لی تو اس کے بعد انہیں وہاں خوب کام کرنے کا موقع ملا۔ لیکن یورپ کے مختلف شہروں یا امریکہ میں کسی جگہ بھی وہ صورت ہرگز پیدا نہیں ہو پائی ہے جو برطانیہ میں ہے، جسے "Lily in bloom" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اگر آپ نے "حزب التحریر" کا پوری طرح کھلا ہوا پھول دیکھنا ہو تو وہ صرف انگلستان میں ہے۔ اس کے کوئی خاص اسباب ہوں گے۔ ان میں سے بعض چیزیں تو میرے سامنے ہیں، لیکن بعض کے بارے میں، میں ابھی مزید غور و فکر کروں گا کہ کیا خاص بات ہے کہ وہاں اس قدر تیزی کے ساتھ یہ بات بڑھی اور پھیلی ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ سمجھ لیں کہ اصل میں حزب التحریر کی نوعیت کیا ہے؟ یہ ایک نیا phenomenon ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، میں تو پہلے ہی سے ان سے متأثر تھا، لیکن اب جو میں ان کے نوجوانوں کا جوش و خروش اور ان کا جذبۂ عمل دیکھ کر آیا ہوں اس سے میں مزید متأثر ہوا ہوں، اگرچہ ان کے طریقہ کار اور بعض دوسری آراء سے متعلق مجھے اختلاف ہے، جو اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ دنیا میں صد فی صد اتفاق تو بہت آسان کام نہیں ہوتا اور خاص طور پر ہمارے اور ان کے حالات کا فرق بھی پیش نظر رہنا چاہئے۔ ہمارے اپنے ملکی حالات کا معاملہ، یہاں کا تاریخی پس منظر، برِعظیم پاک و ہند کا خصوصی پس منظر، علمی پس منظر، یہاں کے علماء دین اور ان کے اثرات اور پھر یہاں اٹھنے والی تحریک پاکستان اور اس کا صغریٰ کبریٰ، یہ سب کچھ ان کے حالات سے مختلف ہے۔ پھر یہاں بہرحال ہمیں جمہوری حقوق حاصل ہیں، ہم تنقید کر سکتے ہیں، جماعت بنا سکتے ہیں، اجتماعات کر سکتے ہیں، جب تک کہ ہم کوئی تخریبی کارروائی نہ کریں، توڑ پھوڑ نہ کریں۔ ہمیں یہاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر طرح کے حقوق حاصل ہیں، جب کہ عالمِ عرب کا معاملہ بڑا مختلف ہے۔ خاص طور پر اس اعتبار سے کہ وہاں پر کہیں بھی کوئی حقوق حاصل ہی نہیں ہیں۔ سعودی عرب میں آپ کوئی اجتماع نہیں کر سکتے، کہیں اپنا اظہارِ خیال نہیں کر سکتے،

کوئی جماعت نہیں بناسکتے۔ چنانچہ آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۷۹ء میں وہاں پر جو کچھ ہوا تھا وہ ایک ہنگامہ، فساد اور ایک "explosion" تھا، جبکہ کچھ لوگوں نے حرم پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس لئے کہ جہاں اختلافِ رائے اور اظہارِ رائے کے چینل نہیں ہوں گے وہاں کبھی تو کوئی آتش فشاں پھٹے گا۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حالات کی وجہ سے بھی یقیناً سوچ میں اور طریقہ کار میں فرق پڑتا ہے۔

احیائی عمل ـــ کچھ اصولی مباحث

"حزب التحریر" کی اصل نوعیت میں ذرا تجزیہ کر کے آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن آگے بڑھنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ امتِ مسلمہ کی تاریخ کے حوالے سے احیائی عمل کے بارے میں کچھ اصولی باتیں آپ کے گوش گزار کروں تاکہ ہم موجودہ احیائی تحریکوں اور خصوصاً حزب التحریر کا ایک وسیع تناظر میں جائزہ لے سکیں۔

امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے دوادوار

جو حضرات بھی مجھ سے اور میری سوچ سے واقف ہیں، اور جنہوں نے میری تحریریں پڑھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ میں تجزیہ کر کے یہ بتا چکا ہوں کہ امتِ مسلمہ کے دو عروج اور دو زوال کے دور آ چکے ہیں۔ پہلا عروج عربوں کی زیرِ قیادت ہوا، پھر زوال آیا تو پہلے صلیبیوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی اور پھر تاتاریوں کے ہاتھوں بڑی زبردست پٹائی ہوئی۔ دوسرا عروج ترکوں کی زیرِ قیادت آیا۔ ترکانِ صفوی، ترکانِ تیموری، ترکانِ سلجوقی اور ترکانِ عثمانی کی حکومتیں قائم ہوئیں اور خلافت عظیم سلطنتِ عثمانیہ میں منتقل ہو گئی۔ پھر دوسرا زوال یورپی استبداد اور نو آبادیاتی استعمار کے ہاتھوں آیا۔ ہمارا یہ دوسرا زوال اس صدی کے آغاز میں پہلی جنگ عظیم کے بعد انتہائی پستی کو پہنچا جب عظیم سلطنت عثمانیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی اور اس میں سے ایک چھوٹا سا ملک ترکی باقی رہ گیا۔ تمام عالم عرب اس طرح منقسم ہوا کہ یہ ملک برطانیہ کے پاس رہے گا اور یہ فرانس کے پاس۔ وَقِس علٰی ذٰلک۔ غرضیکہ دنیا نے وہ نقشہ پوری طرح دیکھ لیا جس کی پیشینگوئی

رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں فرمائی تھی کہ :

"یوشک الامم ان تَداعیٰ علیکم کما تداعَی الاکَلةُ الیٰ قصعَتِھا، فقال قائلٌ : مِن قلةٍ نحن یومئذٍ؟ قال : بل انتم یومئذ کثیر، ولٰکنکم غثاءٌ کغثاءِ السیل، ولینزعن اللہ من صدور عدوکم المھابةَ منکم، ولیقذفن فی قلوبکم الوھنَ۔ قیل : وما الوھنُ یا رسول اللہ؟ قال : حبُّ الدنیا وکراھیة المَوتِ" (رواہ ابوداود، عن ثوبان ﷺ)

(ترجمہ) "قریب ہے کہ اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی دعوت دیں گی جیسا کہ کھانا کھانے والے ایک دوسرے کو اپنے دسترخوان کی طرف بلاتے ہیں"۔ اس پر کسی نے کہا : "کیا اس روز ہم تعداد میں کم ہوں گے؟" آپ ﷺ نے فرمایا : "تعداد میں تو اس روز تم بہت زیادہ ہو گے، لیکن تمہاری حیثیت جھاگ سے زیادہ نہ ہو گی، جیسا کہ سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکال باہر کرے گا اور خود تمہارے دلوں میں وہن (کی بیماری) ڈال دے گا"۔ پوچھا گیا : "اے اللہ کے رسول (ﷺ) وہن کیا چیز ہے؟" آپؐ نے فرمایا : "دنیا کی محبت اور موت سے نفرت!"

یعنی دنیا کی محبت اور موت سے گریز، یہ دو چیزیں جب مسلمان میں آجائیں گی تو وہ پوری دنیا کی قوموں کے لئے لقمۂ تر بن جائے گا۔

اس صدی کے آغاز میں عالمِ اسلام کا نقشہ یہی تھا جو اس حدیث میں بیان ہوا۔ اور اسی کی ایک علامت یہ ہے کہ ۱۹۲۴ء میں خلافت کا وہ ادارہ بھی ختم ہو گیا جس کی حیثیت اگرچہ محض علامتی تھی لیکن بہرحال وہ عالمِ اسلام کی وحدت کا ایک نشان تھا۔ حالانکہ اس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا، اثر و رسوخ نہیں تھا۔ خلافتِ عثمانیہ اصلاً تو ایک مملکت تھی اور خلیفہ کی حیثیت اپنے مقبوضہ علاقوں کے لئے بادشاہ یا سلطان کی تھی، لیکن پھر بھی یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ "خلافت" پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے وحدت کا ایک نشان ہے۔ ۱۹۲۴ء میں یہ علامتی نشان بھی ختم ہو گیا۔ تو یوں سمجھئے کہ اس صدی کے ربعِ اول کے خاتمے تک ہمارا یہ دوسرا زوال اپنی منطقی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ میں امتِ مسلمہ کی پستی کا جو

نقشہ کھینچا گیا ہے اس کی ترجمانی اپنے اردو کے اشعار میں مولانا حالیؒ نے اس طرح کی ہے۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

یعنی ہمارا دریا تو اترتا ہی جا رہا ہے اور اس کے اندر چڑھاؤ کی کوئی صورت باقی ہی نہیں رہی۔ تو یہ کیفیت درحقیقت اُس وقت عالم اسلام کی تھی۔

احیائی عمل کے دو اہم گوشے

اس کے بعد سے ہمارے ہاں ایک احیائی عمل شروع ہوا ہے۔ اس احیائی عمل کے ضمن میں چار اصطلاحات اچھی طرح سمجھ لیجئے، کیونکہ اصطلاحات کے حوالے سے باتوں کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، جیسے کہ سورۃ البقرہ کے چوتھے رکوع کے شروع میں آیا ہے: "عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا" کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام نام سکھا دیئے۔ اصل میں ہر شے کے لئے کوئی عنوان ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر فن کی بھی بنیادی اصطلاحات ہوتی ہیں، جو اگر سمجھ میں آجائیں تو وہ فن آپ کی گرفت میں آجائے گا۔ تو میں چاہتا ہوں کہ یہ چار اصطلاحات آپ پہچان لیں۔ ایک تو یہ کہ اس احیائی عمل کے دو اہم گوشے کیا ہیں؟ ایک ہے "قومی اور سیاسی گوشہ" اور دوسرا ہے "اسلامی احیائی گوشہ"۔ مسلمان بہرحال ایک قوم ہیں۔ خواہ بھلے ہیں، برے ہیں، اچھے ہیں، بے عمل ہیں، باعمل ہیں، متقی ہیں، فاسق ہیں، فاجر ہیں، زانی ہیں، شرابی ہیں، چاہے شراب کے ٹھیکیدار ہیں، چکلے چلاتے ہیں، لیکن مسلمان تو ہیں۔ تو مسلمان قوم کی بہبود و بھلائی اور اس کے حقوق کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ اب ہندوؤں سے ہمیں اندیشہ تھا کہ وہ مسلم قوم کو دبا دیں گے، اس کا معاشی استحصال کریں گے، اس کے تہذیب و کلچر، اس کے تشخص اور اس کی زبان کو ختم کر دیں گے۔ چنانچہ اس خوف کے زیر اثر تحریک پاکستان شروع ہوئی اور پاکستان بنوایا گیا۔ یا اسی طریقے سے فلسطینی

مسلمانوں کا معاملہ ہے، جنہیں ان کے وطن سے نکال دیا گیا ہے اور وہ اپنے گھروں سے بے گھر کر دیئے گئے ہیں۔ تو ایک ہے قومی اور سیاسی سطح پر مسلمانوں کے حقوق اور ان کی بہبود و بھلائی کے لئے کوئی کام کرنا۔۔۔۔اور ایک ہے اسلام کے لئے اور اسلام کے احیاء کے لئے کوئی کام کرنا۔ یہ دو چیزیں علیحدہ ہیں۔ اگرچہ یہ باہم جڑ بھی جاتی ہیں اور علامہ اقبال کے ہاں یہ جامعیت نظر آتی ہے کہ انہوں نے ان دونوں کو عجیب انداز میں رکھا ہے۔ ایک طرف وہ کہتے ہیں۔

نشہ ہے کو تعلق نہیں پیمانے سے
تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے!

یعنی جس طرح پیمانے کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اصل شے تو شراب ہے جو اس کے اندر ہے، اسی طرح مسلمان کی حیثیت تو محض پیمانے کی ہے، اس کے اندر جو شراب ہے وہ اسلام ہے، لہٰذا اصل اہمیت اسلام کی ہے، اس شراب کی ہے جو اس پیمانے کے اندر ہے، پیمانہ کی اپنی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن دوسری طرف وہ کہتے ہیں۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے!
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے؟

اب یہاں دوسری بات کہی ہے کہ مسلمان کی حیثیت ساقی کی ہے جو اسلام کے جام کو گردش میں لاتا ہے۔ اگر ساقی اس جام کو گردش میں نہیں لائے گا تو اسلام کو دوسروں تک کون پہنچائے گا؟ تو اگرچہ علامہ اقبال نے ان دونوں چیزوں کو جمع بھی کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود، ان کے حقوق اور ان کی آزادی کے لئے محنت اور جد و جہد کے تقاضے کچھ اور ہوں گے۔ اس کے لئے تو یہ پیش نظر ہونا چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان جمع ہو جائیں۔ وہاں آپ یہ تحقیق نہ کیجئے کہ اس کا عقیدہ کیا ہے اور اس کے نظریات کیا ہیں، اس کا عمل کیا ہے اور اس کا کردار کیا ہے۔ بس مسلمان جمع ہوں، جمع ہوں گے تو طاقت بنے گی، طاقت ہو گی تو آپ دشمنوں سے اپنے حقوق حاصل کر سکیں گے۔ لیکن اس کے برعکس اگر اسلام کے لئے کام کرنا ہے تو پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ آپ نے خود اسلام پر عمل کیا یا نہیں کیا؟ اگر اپنی ذات میں اسلام نہیں ہے، خود اپنے گھر

ں اسلام نہیں ہے تو آپ اسلام کہاں قائم کرنے چلے؟ تو ان دو اصطلاحات کو ذہن میں کھیۓ کہ قومی اور سیاسی کام علیحدہ ہے اور احیائی اور اسلامی کام علیحدہ ہے۔ ان دونوں کی یت جدا ہے۔

دو اسلام" اور ان کا فرق

دوسرے یہ کہ اسلام بھی ہمارے ہاں دو ہیں، اور یہ اصل میں اہم تر مسئلہ ہے جو ڑا سا باریک بھی ہے۔ ایک ہمارا "روایتی مذہبی اسلام" ہے اور ایک ہمارا "دینی نقلابی اسلام" ہے۔ ان دونوں کا فرق بھی سمجھ لیجئے۔ روایتی مذہبی اسلام کیا ہے؟ ارکان لام یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی پابندی اور ظاہری وضع قطع اور روزمرہ کے معمولات ں اتباعِ سنت کی کوشش۔ یہ ہمارا مذہب کا تصور ہے جو زیادہ تر انفرادی زندگی سے متعلق ہے۔ اور ہمارے ہاں کا علماء، مدارس اور مساجد کا سارا نظام اسی روایتی مذہبی تصور سے لق ہے ---- اس کے علاوہ اسلام کا ایک انقلابی (Radical) تصور ہے۔ یعنی اسلام ہب نہیں دین ہے، یہ اپنا غلبہ اور اپنی حکومت چاہتا ہے، پورا نظامِ زندگی اپنے مطابق النا چاہتا ہے۔ یہ ایک بالکل دوسری بات ہے۔ ان دونوں تصورات میں ایک دوسرے ے بڑا فرق ہے۔ کچھ عرصہ قبل میں نے اس ضمن میں کچھ مضامین لکھے تھے جو "نوائے ت" میں چھپے تھے اور اب وہ "اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل" کے عنوان سے تابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں، ان میں میں نے واضح کیا ہے کہ اسلام کا اصل انقلابی ر کیا تھا۔ اسلام تو دین تھا، مذہب تھا ہی نہیں، یہ مذہب تو ہم نے اسے بنا دیا۔ لفظ ذہب" تو پورے قرآن میں کہیں آیا ہے نہ پورے ذخیرۂ حدیث میں۔ کمال تو یہ ہے کہ ری بنیادی اصطلاحات جو ہماری زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں وہ ہیں جن کا قرآن اور سنت ے کوئی تعلق نہیں، جیسے لفظ "عقیدہ" قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ اور لفظ "تصوف" کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ آیا کہاں سے ہے، یہ "مجہول النسب" ہے، اس کا مادہ ہی معلوم نہیں کہ "صوف" سے بنا ہے، "صفا" سے بنا ہے یا "Theosophy" سے بنا لیا گیا ہے۔ اب ں کا قرآن اور سنت سے کیا تعلق ہوتا، جبکہ اس کی عربی اصل بھی واضح نہیں ہے کہ اس

کی اصل جڑ بنیاد کیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں زیادہ تر گفتگو انہی اصطلاحات کے حوالے سے ہوتی ہے۔

بہرحال یہ سمجھ لیجئے کہ اسلام کا جو تصور بطور دین ہے وہ ایک مکمل نظام زندگی کا ہے اور مکمل نظام زندگی تو وہی ہوتا ہے جو نافذ ہو۔ اگر نافذ نہیں ہے تو وہ نظام کہاں ہے' وہ تو محض ایک نظریہ ہے۔ ایک "مذہب" تو کسی نظام کے تابع ہو کر رہ سکتا ہے لیکن ایک "دین" کسی دوسرے دین کے تابع نہیں ہو سکتا۔ دین تو ایک ہی ہو گا اور وہی غالب ہو گا' اور جو غالب ہو گا وہی دین ہو گا' جو مغلوب ہو گا وہ مذہب ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں اصل میں خلافتِ راشدہ کے بعد جو انحطاط شروع ہوا تو اس کے نتیجے میں سیاست اور مذہب علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ مذہبی قیادت علماء' فقہاء' مفسرین اور صوفیاء کے نام ہو گئی جبکہ سیاسی قیادت' سلاطین' حکمران' بادشاہ اور امراء کا حصہ قرار پائی۔ اس طرح یہ "Dichotomy" پیدا ہوئی جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری' ہوس کی وزیری

اس دوئی کے نتیجے میں مذہب سکڑتا چلا گیا کہ حکومت حکومت والے جانیں اور مذہب والے مذہب کی قیادت و سیادت پر قانع ہو کر بیٹھ گئے۔ اور صورتحال یہ ہو کر رہ گئی جس کی مثال میں نے بارہا دی ہے کہ اسی صدی میں انگریز کے دورِ غلامی میں ایک بہت بڑی دینی شخصیت نے یہ بات کہی کہ "ہمیں کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہئے جس سے ہمارے حکمرانوں کو تشویش ہو' اس لئے کہ انہوں نے ہمیں مذہبی آزادی دے رکھی ہے"۔ اس پر پھبتی چست کی تھی علامہ اقبال نے جو صد فی صد درست تھی کہ۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

یعنی نماز روزے کی یہ آزادی کیا اسلام کی آزادی ہے؟ تو یہ ہے اصل میں فرق دین اور مذہب میں۔

ہمارا روایتی مذہبی تصور سارے کا سارا عبادات اور وضع قطع تک محدود ہے۔ اس

میں "اتباعِ سنت" کے جذبے کا مظاہرہ تو یہاں تک کیا جاتا ہے کہ چونکہ حضورؐ پاجامہ نہیں پہنتے تھے بلکہ تہبند باندھتے تھے، لہٰذا تہبند باندھنے کا اہتمام کیا جائے اور حضورؐ کے اتباع میں سر پر پگڑی باندھی جائے جس کا رنگ بھی اقرب الی السُّنۃ ہو، لیکن اس طرف سے آنکھیں بند کرلی جائیں کہ اِس وقت غلبہ کس نظام کا ہے! آنحضور ﷺ کا لایا ہوا دین غالب ہے یا مغلوب!! یہ عجیب طرفہ تماشا ہے کہ اللہ کا دین پاؤں تلے مسلا جارہا ہے، اللہ کی حدود کی دھجیاں بکھیری جارہی ہیں اور ایک شخص اپنے اسی مزعومہ تقویٰ اور اتباعِ سنت کے نشے میں سرشار ہے کہ ہم نے تو نہ معلوم کتنی اونچی منزلیں طے کرلی ہیں۔ اسی تصور کو سینے سے لگائے ہوئے وہ مرشد بھی بن گئے ہیں اور لوگوں کا تزکیہ بھی فرمارہے ہیں۔ یہ اسی روایتی مذہبی تصور کا شاخسانہ ہے کہ کوئی صاحب انگریز کی عدالت میں بیٹھ کر غیراللہ کے قانون کے تحت فیصلے کررہے ہیں اور وہ کوئی بہت بڑے مربی بھی ہیں، مزکی بھی ہیں، کسی شیخ کے خلیفہ بھی ہیں، جبکہ قرآن کہتا ہے : "وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ" یعنی "جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں۔" یہ باتیں میں اس لئے سخت الفاظ میں کہہ رہا ہوں کہ میں جو اصطلاحی فرق آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں اسے آپ اچھی طرح سمجھ لیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ ایک روایتی (Traditional) اسلام ہے جس کا تصور مذہب کا ہے اور ایک انقلابی (Radical) اسلام ہے جس کا تصور دین کا ہے کہ اسلام دین ہے اور دین غلبہ چاہتا ہے۔ دین تو وہی ہے جو قائم ہے، باقی جو مغلوب ہے وہ دین نہیں مذہب ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت امریکہ کے اندر "دینِ جمہور" قائم ہے، یعنی حاکمیت جمہور کی ہے۔ یہ سیکولر نظام ہے۔ اس دینِ جمہور کے تحت وہاں مسلمان بھی رہ سکتا ہے، اسے مسجد بنانے کی آزادی ہے کہ ٹھاٹھ کی بنائے اور چاہے اس پر کروڑوں ڈالر لگا لے۔ ہندو وہاں جائے تو مندر بنالے۔ وہاں پر سکھ گئے تو انہوں نے گوردوارے بنالئے۔ سب کو اجازت ہے کہ وہاں مذہب کی حیثیت سے اپنی اپنی جگہ پر رہیں، لیکن اس ملک کے نظام کے بارے میں انہیں کوئی بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ تو یہ ہے سیکولرزم کا نظام جس کی طرف اب ہم بھی بڑی تیزی سے جارہے ہیں، کیونکہ "بریک" کھل چکے ہیں۔ دو

سال پہلے میں نے کہا تھا کہ اس ملک اندر جو مذہبی جماعتیں یہ سمجھتی ہیں کہ اگرچہ ہم یہاں اسلام نہیں لا سکے لیکن ہم نے سیکولرزم کو بھی تو قدم نہیں جمانے دیئے' یہ ان کی خام خیال ہے اور ان کی غلط حکمتِ عملی کے باعث وہ مرحلہ آگیا ہے کہ اب وہ بریک کھل گئے ہیں اور یہ ملک بڑی تیزی کے ساتھ سیکولرزم کی طرف جا رہا ہے۔

بہرحال اس وقت میں چار اصطلاحات کے حوالے سے اپنی بات سمجھانا چاہ رہا ہوں :

۱۔ قومی اور سیاسی عمل : یہ کسی اور شے کا نام ہے۔

۲۔ احیائی اسلامی عمل : اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ ۳۔ روایتی مذہبی اسلام : س کے تقاضے اور ترجیحات کچھ اور ہیں' اور

۴۔ Radical اور Revolutionary (انقلابی) اسلام' جس کی بنیاد دین کے صور پر ہے' یہ اور ہے۔

برِعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل

اب اس پس منظر کو یوں سمجھئے کہ برعظیم پاک و ہند میں علامہ اقبال اس اعتبار سے ہایت جامع شخصیت تھے کہ ایک طرف تو انہوں نے قومی اور احیائی دونوں میدانوں میں کام کیا۔ قومی اور سیاسی میدان میں وہ مسلم لیگ کے ساتھ رہے' وہ مصورِ پاکستان ہیں' لیکن س کے ساتھ ساتھ فکری میدان میں انہوں نے اسلام کے انقلابی تصور کو واضح کیا۔ میری بڑی خواہش ہے کہ میری کتاب "برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید ِ تعمیل" کا مطالعہ آپ سب حضرات ضرور کریں۔ برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید علامہ اقبال مرحوم نے کی ہے اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی نے اس کی تعمیل کی کوشش کی ہے۔ اس کا تاریخی پس منظر اور صغریٰ کبریٰ ہر شخص کے سامنے ہونا چاہئے۔ اس احیائی فکر کے دینے والے علامہ اقبال ہیں۔ اپنی شاعری کو انہوں نے اس کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

یہ کوئی گل و بلبل کی شاعری تو نہیں ہے، یہ ہجر و وصال کی باتیں تو نہیں ہیں۔ یہ تو ایک پیغام ہے، دین کے فکر کی تجدید ہے۔ چنانچہ میرے نزدیک علامہ اقبال فکرِ اسلامی کے مجدد ہیں۔

علامہ اقبال نے اسلام کے ایک وحدت اور ایک نظامِ زندگی ہونے کے تصور کو واضح کیا۔ پھر عملی شکل میں اس کی تعمیل کی پہلی کوشش مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے کی۔ علامہ اقبال میدان کے آدمی نہیں تھے بلکہ مفکر تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ میں کام کیا مگر صفِ اول میں نہیں، بلکہ ایک صوبے کی سطح پر کچھ کام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو جو صلاحیت دی ہے وہ اسی کے مطابق کام کرتا ہے۔ تو فکر کی تجدید میں میرے نزدیک وہ سب سے اونچی شخصیت ہیں۔ اس فکر کی تعمیل میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۳ء میں بیعت کی بنیاد پر "حزب اللہ" قائم کی، لیکن روایتی علماء کی مخالفت سے گھبرا کر میدان چھوڑ کر کانگریس میں جا کر بیٹھ گئے۔ لہٰذا مجھے دلچسپی ان کے صرف ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے آٹھ سال سے ہے، جو ان کا "الہلال" اور "البلاغ" کا دور ہے اور جب انہوں نے بیعت کی بنیاد پر "حزب اللہ" قائم کی تھی۔ میرے نزدیک وہ پہلی کوشش تھی جو ناکام ہو گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا کام اذان کے درجے میں تھا، انہوں نے کوئی غلغلہ تو بلند کیا تھا۔

اس کے بعد مولانا مودودی یہی انقلابی (Radical) اسلامی تصور لے کر میدان میں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی سیاسی تحریک سے ان کا راستہ علیحدہ ہو گیا۔ آجکل پھر ہمارے ہاں اخبارات میں یہ بحث چل نکلی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ پاکستان بنانے میں ان کا سب سے بڑا حصہ ہے اور کوئی کہتا ہے کہ نہیں، وہ پاکستان کے دشمن تھے۔ اصل میں دونوں باتوں میں کچھ حقیقت موجود ہے۔ وہ پاکستان کے مخالف تھے، اور انہوں نے مسلم لیگ اور قائداعظم پر شدید تنقیدیں کیں، اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن مسلم قومیت کے نظریئے کو جو تقویت انہوں نے دی تھی وہ انہی کا کام تھا۔ علامہ اقبال کے بعد مولانا مودودی کا قلم ہی ہے جس نے مسلم قومیت کو فروغ دیا، ورنہ مولانا مدنیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیتوں کے اثر کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں میں کوئی دوسرا صاحبِ قلم موجود نہیں تھا۔ اس دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا جو نظریہ پیش کیا جا رہا تھا اس کے خلاف جس کے قلم نے سب سے زیادہ جہاد کیا اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مولانا مودودی تھے۔ علامہ

قبال کا پیغام ان کی شاعری کے ذریعے سے عام ہوا اور انہوں نے مسلمانوں کو ایک جذبہ
یا، لیکن مولانا مودودی نے "مسئلہ قومیت" پر جو کتاب لکھی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔
س ضمن میں ان کی کتابیں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ اول اور دوم بہت اہم
کتابیں ہیں۔ اس کے بعد جب انہوں نے اپنا راستہ علیحدہ کر لیا کہ "ہم اسلام کا کام کرنا
چاہتے ہیں، مسلمانوں والا کام نہیں" تو پھر وہ تحریک پاکستان کے بھی مخالف تھے اور پاکستان
کے بھی۔ اسے تسلیم کرنا چاہئے۔ یہ حقائق ہیں جن کو کون چھپا سکتا ہے؟ میری کتاب
'تحریک جماعت اسلامی، ایک تحقیقی مطالعہ" دیکھ لیجئے، اس میں آپ کو سارے اقتباسات
ل جائیں گے۔

بہرحال اس وقت میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ علامہ اقبال نے "Radical" اسلام کا
و فکر دیا اس کی تعمیل کی پہلی عملی کوشش مولانا ابوالکلام آزاد نے کی، جو بہت جلد مایوس ہو
گئے۔ اس کے بعد دوسری کوشش مولانا مودودی نے کی لیکن پاکستان بننے کے بعد وہ بھی
یہاں کی انتخابی سیاست کی گرداب میں گھر گئے اور ان کی تحریک بھی دلدل کے اندر پھنس کر
رہ گئی۔

برعظیم پاک و ہند میں ہمارے روایتی مذہبی اسلام نے بھی ایک حرکت کی شکل اختیار
کی، اور وہ تبلیغی جماعت ہے۔ میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ عجیب بات ہے کہ یہ ساری
تحریکیں برعظیم پاک و ہند ہی سے ابھر رہی ہیں۔ تبلیغی جماعت کی حرکت اب پوری دنیا میں
دیکھی جا سکتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا کہ برطانیہ میں اسی اسی ہزار مسلمانوں کا اجتماع تبلیغی
جماعت کے تحت ہو جاتا ہے، یہ کوئی معمولی بات ہے؟ پاکستان اور ہندوستان میں ہونے
والے اجتماعات میں تو لاکھوں کی تعداد ہوتی ہے۔ بھوپال میں تبلیغی جماعت کا ایک اجتماع ہوا
تھا جس کے بارے میں بی بی سی نے خبر دی تھی کہ پچیس لاکھ آدمی جمع تھے، اگرچہ پھر تبلیغی
جماعت کے ذمہ دار لوگوں نے اس کی تردید کی اور بتایا کہ حاضری پچیس لاکھ نہیں، دس لاکھ
تھی۔ اسی طرح بنگلہ دیش میں ٹونگی کے مقام پر جو تبلیغی اجتماع ہوتا ہے اس میں پندرہ بیس
لاکھ سے کم آدمی نہیں ہوتے۔ یہاں رائے ونڈ کے سالانہ اجتماع میں آٹھ دس لاکھ سے کم
حاضری نہیں ہوتی۔ اور اس ساری حرکت کا آغاز دہلی میں بنگلے کی ایک چھوٹی سی مسجد سے

ہوا تھا۔

بہر حال اس احیائی عمل میں برعظیم پاک و ہند کا ایک خاص مقام ہے۔ بدقسمتی سے عالمِ عرب اس سے سرے سے ناواقف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں جن تحریکوں کے ذریعے سے یہاں کی تحریکوں کا تعارف ہوا ہے انہوں نے یہ پورا پس منظر سامنے رکھا ہی نہیں، بلکہ اس فکر کو ایسے بیان کیا گیا جیسے یہ بات آسمان سے براہ راست انہی پر نازل ہوئی ہے۔ ہر کام کے پیچھے اس کا کوئی پس منظر ہوتا ہے۔ اس کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ ابوالکلام بھی کبھی اس میدان کے اندر ہوتے تھے۔ ٹھیک ہے ایک وقت میں وہ یہ راستہ چھوڑ کر چلے گئے۔ علامہ اقبال کا جو مقام ہے اس کو تسلیم کیا جانا چاہئے۔ اس سے پیچھے جایئے تو شہیدین کی تحریک اور شاہ ولی اللہ دہلوی" کا نام آتا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری موجودہ تحریکوں نے اس پس منظر کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً جماعت اسلامی کے حلقے کے ذریعے سے مولانا مودودی کا تعارف تو ہوا ہے، لیکن اس انداز سے کہ شاید اس برعظیم پاک و ہند میں کوئی اور ہے ہی نہیں یا اس سے قبل کوئی اور تھا ہی نہیں اور یہ کام یہاں شروع ہوا ہے تو گویا ایک شخص ہی سے ہوا ہے۔ یہ چیز بحیثیتِ مجموعی دین کے مقصد کے اعتبار سے نقصان دہ ہے۔ اور اس طرح عالم عرب کے سامنے برعظیم پاک و ہند کی اہمیت سرے سے آئی ہی نہیں۔ بہر حال اس کے مقابلے میں مصر میں ریڈیکل اسلام "الاخوان المسلمون" کے ذریعے سے سامنے آیا۔

انقلابی تحریکوں کے بارے میں ایک قانونِ فطرت

اب یہ بات سمجھئے کہ انقلابی تحریکوں (Radical Movements) کے بارے میں یہ قانون فطرت ہے کہ وہ تیس چالیس سال کے اندر اندر کامیاب ہو جائیں تو ہو جائیں، ورنہ ان پر بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے، ان کا وہ جوش و خروش، جذبہ قربانی اور جوش عمل سرد پڑ جاتا ہے اور وہ مفاہمت اور مصالحت کا راستہ اختیار کر لیتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کے اندر جو "انقلابیت کا ڈنک" ہے وہ ٹوٹنا شروع ہو جاتا ہے اور لائحہ عمل یہ طے پاتا ہے کہ اب انتخابی میدان میں چلو، یا کوئی سماجی خدمت کر لو، کہیں کوئی ہسپتال بنالو، کہیں کوئی مدرسے تعمیر کر لو، کہیں کوئی اپنی خاص مساجد اور اپنے مراکز بنالو۔ مزید برآں اس کا سب سے برا

نتیجہ فرقہ واریت کی صورت میں نکلتا ہے‘ کیونکہ وہ تحریک ایک فرقہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے کہ ایک نسل نے تو اس تحریک کی دعوت کو شعوری طور پر قبول کیا تھا۔ اب اگلی نسل کو اس سے یہ تعلق ہوتا ہے کہ چونکہ یہ ہمارے باپ کا مسلک ہے اس لئے ہم نے اختیار کیا ہے‘ اور تیسری نسل میں آکر وہ بالکل ایک فرقہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اور اس کے بعد صرف محض عقیدتیں باقی رہ جاتی ہیں‘ لیکن جوشِ عمل اور جذبۂ قربانی بالکل ختم ہو کر رہ جاتا ہے‘ اور اپنے آپ کو بدلنے اور اپنی زندگی میں کوئی انقلاب لانے کے لئے آدمی تیار نہیں رہتا۔ یہ اس کا بدترین انجام ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی فرقے کی تاریخ اٹھائیں گے تو معلوم ہو گا کہ شروع میں یہ ایک تحریک تھی۔ کوئی بڑے صاحب عزیمت انسان اٹھے اور انہوں نے تصحیح عقائد اور ردِّ بدعات وغیرہ کے ضمن میں اصلاحی کام کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن ایک دو نسلوں کے بعد اب محض چند شعائر رہ گئے ہیں جن کے حوالے سے یہ فرقہ پہچانا جاتا ہے۔ "الاخوان المسلمون" اور "جماعت اسلامی" کے ساتھ یہی معاملہ پیش آچکا ہے۔

اس ضمن میں اخوان اور جماعت اسلامی کا ایک فرق نوٹ کر لیجئے۔ اخوان ایک عرب تحریک تھی اور عربوں میں جوش و جذبہ بے پناہ ہوتا ہے‘ یہ ایک فعال قوم ہے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ اخوان سے جو لوگ اب زوال کے دور میں علیحدہ ہوئے وہ اکثر و بیشتر دہشت گرد اور تشدد پسند قسم کے گروپ بن گئے۔ مثلاً سب سے پہلے "التکفیر والھجرۃ" بنی‘ جس نے مصر میں قتل و غارت گری کا معاملہ کیا۔ عمر تلمسانیؒ سے میری ملاقات ۱۹۷۹ء میں قاہرہ میں ہوئی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا یہ آپ کے لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا تھا کہ ہاں‘ یہ ہمارے لوگ ہیں‘ لیکن ہم سے علیحدہ ہو گئے ہیں اور اب ہمارے کنٹرول سے باہر ہیں۔ یہی شکل ایک علیحدہ گروپ "تنظیم الجہاد" کی ہے۔ اسی طرح "جماعہ اسلامیہ" بھی اخوان سے کٹنے والا ایک گروپ ہے۔ تو اخوان پر جب بڑھاپا آیا یعنی بحیثیت مجموعی جب تحریک پر پژمردگی طاری ہوئی تو زیادہ جوشیلے لوگ جو مطمئن نہیں رہے وہ علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے اس قسم کے گروپوں کی شکل اختیار کر لی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آج عرب ممالک میں زیادہ "بنیاد پرست" شمار ہو رہے ہیں۔ ورنہ باقی اخوان نے تو الیکشن‘ سماجی خدمت اور تعلیمی اداروں کے قیام وغیرہ کے وہ سارے راستے اختیار کر لئے ہیں جو میں نے ابھی

اور بات صرف رسمی گفت و شنید سے آگے کیسے بڑھ سکے گی؟

اس سلسلے میں امریکہ کے سابق صدر رچرڈ نکسن کی تازہ تصنیف "SEIZE THE MOMENT" کے عنوان کے حوالے سے عرض ہے کہ ابھی وقت ہے کہ دورِ نبوی ﷺ کے "خراسان" اور اس کے ملحقہ علاقوں کے مسلمان احیاء اسلام اور مزاحمت یہود و نصاریٰ کے لئے متحد ہو جائیں تو چونکہ تاحال مغربی استعمار کے سابقہ سیلاب کی طرح حالیہ سیلاب کی دستبرد سے بھی مشرق اقصیٰ بہت حد تک بچا ہوا ہے اور کم از کم ایک عظیم قوت یعنی عوامی جمہوریہ چین ایسی موجود ہے جس کے ساتھ مفاہمت اور باہمی تعاون کے ذریعے "سول سپریم پاور آن ارتھ" کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے لہٰذا پیش نظر مقصد کا حصول آسان ہے۔ ورنہ اگر یہ وقت گذر گیا اور چین امریکہ کی "گاجر اور چھڑی" کی دوہری پالیسی (CARROT AND STICK POLICY) کے سامنے خم کھا گیا تو معاملہ پہلے سے بہت زیادہ مشکل ہو جائے گا۔

اور اگر ایران اور پاکستان دونوں کی مفاہمت چین کے ساتھ ہو جائے تو امید ہے کہ بھارت کی قیادت کو بھی وہ بات جو کسی حد تک تو پہلے ہی سمجھ میں آ چکی ہے (اسی لئے اس نے چین کے ساتھ پینگ بڑھائی ہے!) پوری طرح سمجھ میں آ جائے گی اور وہ بھی "علاقائی سوچ" کے تحت اور ایک وسطی اور مشرقی ایشیائی اقتصادی بلاک کی تشکیل کی غرض سے کشمیر کے منصفانہ حل کے لئے آمادہ ہو جائے گا۔

تاہم اس کے لئے پاکستان کو اپنی خارجہ پالیسی کے ضمن میں اس انقلابی تبدیلی کے لئے آمادہ ہونا ہوگا کہ ہم امریکہ کے گھڑے کی مچھلی بنے رہنے کی بجائے مشرق کی جانب رخ کریں اور ایک جانب خود پاکستان میں ایک مثالی اسلامی معاشرہ اور ریاست قائم کرنے کے لئے تن من دھن وقف کر دیں اور دوسری جانب اپنی خارجہ پالیسی کا رخ مغرب سے مشرق کی جانب موڑ دیں۔

الھدیٰ قسط : ۹۳

نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں
قتال فی سبیل اللہ یا سلسلۂ غزوات کا آغاز
اور اس کا ہدفِ آخریں

(۲)

غزوۂ بدر --- یوم الفرقان

سورۃ الانفال، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، تقریباً پوری کی پوری غزوہ بدر ہی سے متعلق ہے۔ بعض ایسے مسائل جو غزوہ بدر کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے، مثلاً مال غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ، ان کا حل بھی اس سورہ میں تجویز کیا گیا اور اس غزوے کے دوران جو حالات پیش آئے اور مسلمانوں سے اگر کہیں کسی کوتاہی کا صدور ہوا، ان سب پر اللہ کی طرف سے ایک نہایت جامع تبصرہ اور آئندہ کے لئے اصولی ہدایات بھی اس سورہ مبارکہ میں شامل ہیں۔ گویا پوری سورہ غزوہ بدر کے گرد گھومتی ہے۔ غزوہ بدر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر کو یوم الفرقان قرار دیا۔ یعنی حق و باطل کے مابین تمیز والا دن۔ اس دن معلوم ہو گیا کہ اللہ کی نصرت و حمایت کس کے ساتھ ہے، ان کفار مکہ کے ساتھ کہ جو ایک ہزار کی تعداد میں ہر طرح کے ہتھیار سجا کر میدان بدر میں آئے تھے یا ان تین سو تیرہ بے سروسامان مسلمانوں کے ساتھ کہ جن کا رسالہ کل دو گھوڑوں پر مشتمل تھا اور جن میں سے سب کے پاس ہتھیار بھی مکمل نہ تھے۔ کسی کے پاس تلوار تھی تو نیزہ نہ تھا اور اگر نیزہ کسی کے پاس تھا تو تلوار نہ تھی اور ایسے بھی تھے جو نیزہ اور تلوار دونوں سے تہی تھے۔ پھر یہ کہ ان بے سروسامان مسلمانوں کی عظیم اکثریت ان انصار

پر مشتمل تھی کہ جن کو قریش جنگجو قوم ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کے بارے میں قریش مکہ کا یہ خیال تھا کہ یہ کاشتکار لوگ ہیں 'لڑنے بھڑنے سے انہیں کیا سروکار! وہ تین سو تیرہ' ایک ہزار کے کیل کانٹے سے لیس ہر طرح سے مسلح لشکر سے ٹکرا گئے اور اسے ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا۔ یوں سمجھئے کہ مکے نے اپنی اصل طاقت کو وہاں اگل دیا تھا' اس کی کل جمعیت میدان بدر میں موجود تھی۔ عتبہ ابن ربیعہ اور ابوجہل جیسے بڑے بڑے سردار کھجور کے کٹے ہوئے تنوں کی مانند میدان بدر میں پڑے تھے۔ وہ دن واقعی یوم الفرقان تھا' اس نے حق و باطل کے مابین تمیز کر دی' دودھ کا دودھ پانی کا پانی جدا کر دیا۔ اس شاندار فتح سے مسلمانوں کا مورال یقیناً بہت بلند ہوا۔ پورے علاقے پر مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو گیا۔ اس طرح ہجرت کے دو ہی سال بعد صورت حال ایک دم اس طرح تبدیل ہو گئی کہ وہ کسمپرسی اور مظلومیت کا دور گویا کہ ختم ہوا اور مسلمانوں کی دھاک پورے علاقے پر بیٹھ گئی۔ صورت حال کی یہ ساری تبدیلی دراصل نتیجہ تھا غزوہ بدر کا جسے اللہ تعالیٰ نے بجا طور پر یوم الفرقان قرار دیا تھا!

بندۂ مومن کی تصویر کے دو رخ

غزوۂ بدر کے جن حالات اور واقعات پر تبصرہ سورۃ الانفال میں آیا ہے ظاہر بات ہے کہ اس مختصر گفتگو میں اس کی اہم باتوں کی طرف بھی اشارہ ممکن نہیں ہے' البتہ سورۃ الانفال کے آغاز و اختتام پر وارد شدہ چند آیات کے حوالے سے بطورِ یاددہانی ایک ایسی حقیقت کی طرف توجہ مناسب رہے گی کہ جو ہمارے اس منتخب نصاب کے لئے گویا کہ عمود اور اس کے مرکزی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے بالکل شروع میں اور پھر اس کے اختتام پر ایسی آیات وارد ہوئی ہیں کہ جنہوں نے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کی مانند حقیقی ایمان کی تعریف کو پھر بہت مختصر اور جامع الفاظ میں اپنے اندر سمو لیا ہے اور ایمان کے دونوں اجزاء (یعنی یقینِ قلبی اور جہاد فی سبیل اللہ) کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ الگ الگ نمایاں کیا ہے۔ ایمان حقیقی کے کچھ اثرات تو وہ ہیں جن کا تعلق باطنی کیفیات کے

ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ کی یاد اگر دل میں تازہ ہو، اس کی عظمت اور دبدبہ و جلال سے اگر انسان کو کسی قدر آگاہی ہو اور ہر دم یہ احساس اگر اس کے دامن گیر ہو کہ اس کا ہر عمل اللہ کی نگاہ میں ہے تو اس کا طرزِ عمل ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتا ہے، اس کے صبح و شام کے انداز میں ایک خاص تغیر واقع ہوتا ہے جو اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہ جھوٹ موٹ کا مدّعیٔ ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان اس کے دل میں راسخ ہو چکا ہے۔ اور ایمانِ حقیقی کا دوسرا رکنِ رکین وہ ہے جس کے لئے سورۃ الحجرات میں "جہاد فی سبیل اللہ" کے الفاظ آئے ہیں اور جس کا ذکر اس کے بعد سورۃ الصف میں بھی ہمارے مطالعے میں آ چکا ہے۔ سورۃ الانفال میں ایمان کے ان دونوں ارکان کو ایک اچھوتے انداز میں جمع کیا گیا ہے۔ آغاز میں آیات ۲ تا ۴ میں فرمایا :

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا، لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَمَغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ۝"

"مومن تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز اٹھیں اور جب انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جائیں تو اس سے ان کے ایمان میں اضافہ ہو جائے اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے لگاتے اور کھپاتے رہتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جو حقیقتاً مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس اعلیٰ درجات اور بخشش اور نہایت اعلیٰ رزق ہے۔"

بندۂ مومن کی زندگی کا ایک رخ، یا یوں کہئے کہ بندۂ مومن کی شخصیت کی تصویر کا ایک پہلو ان تین آیات میں آگیا۔ اسی تصویر کا دوسرا رخ وہ ہے جو سورۃ الانفال کے بالکل آخر میں آیت ۷۴ میں آ رہا ہے۔ یہاں ذہن میں رکھئے کہ اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت کے بعد وہ تین آیات آئی ہیں جن کا مطالعہ ابھی ہم نے کیا، جن میں بندۂ مومن کی تصویر کا ایک

رخ سامنے آتا ہے اور اس سورہ کی آخری آیت سے پہلی (LAST BUT ONE) آیت میں دوسرے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے جس کا اب ہمیں مطالعہ کرنا ہے۔ فرمایا :

"وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝"

"اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ کہ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی، یہ ہیں وہ لوگ کہ جو حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے مغفرت بھی ہے اور بہت اعلیٰ رزق بھی۔"

معلوم ہوا کہ بندۂ مومن کی تصویر کے یہ دو رخ ہیں اور ان دونوں کے مجموعے سے ہی بندۂ مومن کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ ہمارے اس منتخب نصاب میں اس سے پہلے سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں اہل ایمان کی زندگی کا ایک نقشہ سامنے لایا گیا تھا اور وہاں ہجرت اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ والے پہلو کو اجاگر کیا گیا تھا۔ یہ وہی بات ہے جس کا تذکرہ یہاں سورۃ الانفال کے آخر میں آیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت کے الفاظ ذرا ذہن میں تازہ کیجئے :

"فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا"

دوسرا نقشہ یا بندۂ مومن کی تصویر کا دوسرا رخ وہ ہے جو اس سے قبل ہمارے زیر مطالعہ آچکا ہے :

"رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝"

ان دونوں کو جمع کرنے سے بندۂ مومن کی شخصیت کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ ع "اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں" کے مصداق ایک ہی حقیقت کو مختلف اسالیب میں بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کی مذکورہ بالا آیات اس کی واضح

ثال کا درجہ رکھتی ہیں۔

زوۂ احد۔ فتح کے بعد وقتی شکست

سورۃ الانفال کی ان ابتدائی اور آخری آیات کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے لہ اس سورۂ مبارکہ کے اول و آخر کے مابین بڑا گہرا معنوی ربط موجود ہے اور اس سے ں جانب بھی رہنمائی ملتی ہے کہ یہ پوری سورۂ مبارکہ بیک وقت ایک مربوط خطبے کی یثیت سے نازل ہوئی۔ آگے چلئے۔ غزوۂ بدر سے جو صورت حال پیدا ہوئی اس کی طرف شارہ کیا جا چکا ہے کہ آس پاس کے قبائل پر مسلمانوں کا رعب اور دبدبہ قائم ہو گیا اور سلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ لیکن اگلے ہی سال صورت حال اس کے برعکس ہو گئی۔ اہلِ لہ نے بدر کی شکست کے بعد مسلمانوں سے انتقام لینے کے لئے اپنی پوری قوتوں کو جمع کیا۔ تقام لینا عربوں کی گھٹی میں شامل ہے۔ اپنے ستر سربرآوردہ لوگ جن کی لاشوں کو وہ یدان بدر میں چھوڑ آئے تھے' ان کے انتقام کی آگ قریش مکہ کے سینوں میں اندر ہی ندر سلگ رہی تھی۔ پورے اہتمام اور پوری تیاری کے ساتھ اگلے ہی سال ۳ ہجری کے ، شوال میں تین ہزار کا لشکر جرار براہ راست مدینے پر حملہ آور ہوتا ہے۔ لشکر کی خبر ن کر آنحضور ﷺ مشاورت طلب فرماتے ہیں۔ حضورؐ کا اپنا رجحان یہ تھا کہ مدینہ نورہ کے اندر محصور ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ حسن اتفاق کہئے یا سوئے اتفاق کہ یہی رائے نافقین کے سردار عبداللہ بن ابی کی تھی۔ لیکن مسلمانوں میں سے کچھ نوجوان جن کے دل شوقِ شہادت اور جذبۂ جہاد سے معمور تھے' ان کا جوش اور جذبہ اس درجے تھا کہ انہوں نے اس پر زور دیا اور اصرار کیا کہ کھلے میدان میں جا کر جنگ کی جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے اس جذبۂ ایمانی کا لحاظ رکھا اور اپنی رائے پر ان کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے اہر نکل کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ صادر فرما دیا۔ دامنِ احد میں مقابلہ ہوا۔ اس موقع پر پہلی مرتبہ نفاق کا عملی ظہور ہوتا ہے۔ اگرچہ غزوۂ بدر کے بیان میں بھی قرآن مجید نشان دہی کرتا ہے کہ اُس وقت بھی ایسے کچھ لوگ موجود تھے جو یہ چاہتے تھے کہ لشکرِ کفار کا مقابلہ کرنے کی بجائے ابوسفیان جس قافلہ کو لے کر شام سے آ رہے تھے اس کا تعاقب کیا جائے۔ چنانچہ اس

۔ قرآن مجید نے اسی اعتبار سے تنقید بھی کی کہ ان لوگوں کو شاید دنیا زیادہ عزیز تھی' یا پھر اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینا ان کے نزدیک کچھ اتنا زیادہ خوش آئند نہ تھا۔ لیکن یہ بھی ابتدا تھی اور مرضِ نفاق ابھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوا تھا۔ ابھی تک جو معاملہ صرف ضعفِ ایمان کا تھا اگلے سال غزوۂ احد کے موقع پر وہ نفاق ایک ادارے کی حیثیت سے پوری طرح سامنے آتا ہے کہ عین اس وقت جب نبی اکرم ﷺ ایک ہزار کی نفری لے کر مدینہ منورہ سے نکلے اور ابھی میدان جنگ تک نہیں پہنچے کہ عبد اللہ ابن ابی ابن سلول اسی بات کو بہانہ بنا کر تین سو اشخاص کو لے کر مدینہ واپس چلا جاتا ہے کہ چونکہ میری رائے پر عمل نہیں ہوا' مدینے کے اندر رہ کر چونکہ مقابلہ نہیں کیا جا رہا لہٰذا ہم ساتھ نہیں دیں گے۔ اور اب دامنِ احد میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ہزار کی نفری میں سے سات سو افراد باقی رہ جاتے ہیں۔ اس جنگ کی تفصیل بیان کرنا یہاں ہمارے پیش نظر نہیں ہے' صرف بعض واقعات اور ان کے نتائج کی جانب مختصر اشارہ مقصود ہے۔ پہلے ہی ہلے میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گئی' کفار میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ لیکن پھر نبی اکرم ﷺ کے ایک حکم کی خلاف ورزی جو بعض مسلمانوں سے صادر ہوئی اس کا ایک فوری نتیجہ یہ سامنے آیا کہ فتح عارضی طور پر شکست میں تبدیل ہو گئی۔ ستر صحابہ رضی اللہ عنہم کا شہید ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ان ستر میں حضرت حمزہ بن عبد المطلب بھی شامل تھے اور حضرت مصعب بن عمیر بھی' رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ وہ مصعب کہ جن کی دعوت و تبلیغ اور قرآن مجید کی تعلیم و تدریس کے نتیجے میں اہل یثرب کی ایک بڑی تعداد ایمان لے آئی تھی اور مدینہ منورہ کو دار الہجرت بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ستر صحابہؓ نے میدانِ احد میں جام شہادت نوش کیا۔ خود آنحضور ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے' آپؐ پر کچھ دیر کے لئے غشی طاری ہوئی' یہ بات اڑا دی گئی کہ آنحضور ﷺ شہید ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کی ہمتیں جواب دے گئیں یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی تلوار پھینک دی۔ ان سارے حالات و واقعات کا' ظاہر بات ہے کہ' تفصیلاً بیان یہاں ممکن نہیں ہے۔ قرآن مجید نے غزوۂ احد کے حالات پر بڑا مفصل تبصرہ فرمایا ہے۔ ان میں سے بعض آیات کا مطالعہ ہم

ن شاء اللہ ابھی کریں گے۔ اس جنگ کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ غزوۂ بدر کے بعد قبائل عرب پر سلمانوں کی جو دھاک بیٹھ گئی تھی وہ جاتی رہی۔ میدانِ بدر میں تین سو تیرہ کو جو فتح مبین اصل ہوئی تھی اس کا وہ تاثر برقرار نہ رہا۔ اس لئے کہ غزوۂ احد کے بعد صورت یہ سامنے ائی کہ وہاں (بدر میں) ستر اگر کفار کے قتل ہوئے تھے تو یہاں (دامن احد میں) ستر مسلمان شہید ہو گئے۔ اس طرح وہ دبدبہ اور رعب جو مسلمانوں کا قائم ہوا تھا' وہ اب جاتا رہا۔ زیش مکہ آس پاس کے لوگوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہے کہ یہ فتح و شکست کا معاملہ تو تفاقی ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ایک فریق غالب آجاتا ہے اور کبھی فتح دوسرے کا مقدر بنتی ہے۔ س سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ محمد ﷺ واقعتاً اللہ کے رسول ہیں اور ان کو اللہ کی نصوصی تائید حاصل ہے۔ تو غزوۂ احد کے بعد کے ایک دو سال مسلمانوں کے لئے بڑی ہی آزمائش کے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اطراف و جوانب میں سب لوگوں کی ہمتیں بڑھ گئی ہیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں پر حملے ہو رہے ہیں' تاخت و تاراج ہو رہا ہے' ان پر چھاپے ارے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے یہ وقت بڑی سختی کا تھا۔ اور اس سختی کا نقطۂ عروج ہے غزوۂ احزاب جو غزوۂ احد کے دو سال بعد پیش آیا۔ (جاری ہے...)

دیوبندی بریلوی اور اہلحدیث کی طرح کیا آپ سیکولر ہیں یا مسلمان؟

ازقلم : مختار حسین فاروقی

آج کے حکمران طبقات اور مغرب زدہ لوگ اسلام کو اس کے اصل مقام سے بہت نیچے گرا کر عیسائیت کے تصور مذہب کی طرح اسے بھی محض خدا اور بندے کا ذاتی اور نجی معاملہ سمجھتے ہیں اور اجتماعی معاملات کو یہ غاصب اور استحصالی سرمایہ دار اور جاگیردار اپنی من مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔ قرآن مجید ایسے طبقات اور اس سوچ کے حامل افراد کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے افراد جو اپنے ماتحت لوگوں، رعیت یا علاقوں اور ریاستوں میں اپنا یا چند سو منتخب افراد کا (اللہ کی اطاعت سے آزاد ہو کر) بنایا ہوا قانون رائج کرتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں، ظالم و کافر ہی نہیں فرعون اور نمرودوں کی صف میں کھڑے ہیں اور اپنی اطاعت پر مبنی نظام کے نفاذ پر خدائی کے دعویدار ہیں۔ قرآن مجید ایسے خدائی کے دعویداروں کی سرکوبی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔

در حقیقت اسلام زندگی کی طرح ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے اور زندگی کے گوناگوں گوشوں کو ایک ہی اطاعت کے تحت لا کر استحصال کا خاتمہ چاہتا ہے اور اسی کا نام توحید ہے کہ اپنے مطاع کو (انفرادی اور اجتماعی زندگی میں) ایک ہی کر دو۔

آج کا حکمران طبقہ یہ چاہتا ہے کہ ہمارے علماء و صوفیاء اس اسلام کا پرچار کریں جو صرف ذاتی اصلاح، نکاح و طلاق اور غسل کے مسائل تک محدود ہو اور اگر کسی میں مزید ہمت ہو تو ایسے لوگ جولانی طبع کے لئے فروعی اختلافی مسائل میں الجھے رہیں تاکہ عوام بیدار ہو کر اپنے سیاسی آقاؤں، علماء سوء اور دنیا پرست کروڑ پتی روحانی پیشواؤں سے حساب نہ مانگیں۔ ایسے لادین بالاتر طبقات کی خواہش تو یہ ہے کہ نمازیں کسی طرح پانچ کے بجائے پچاس ہو جائیں تاکہ مذہبی عناصر اور علماء حق کو ان ہی سے فرصت نہ ملے اور وہ خود

کو بیوقوف بنا کر لوٹتے رہیں۔ اور افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے کچھ مذہبی activi اور علماء حق اور مخلص صوفیاء بھی' دین کے محدود مذہبی تصور کے پرچارک ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ وہ زندگی کے اجتماعی گوشوں میں تبدیلی لانے کے بجائے صرف روزہ وغیرہ کی تلقین پر مطمئن ہوئے بیٹھے ہیں اور ان کا یہ عمل شعوری یا غیر شعوری پر حکمرانوں ہی کے سیکولر تصور کی تائید کرتا ہے اور اس طرح وہ بالواسطہ طور پر عوام کو نے کے عمل میں حکمرانوں کے شریک ہیں۔ نتیجتاً آج ایسے علماء و صوفیاء بھی لوٹوں اور ں کے خلاف عوامی غیظ و غضب اور تعلیم یافتہ طبقہ کی بیزاری کے جذبات کا نشانہ بنے ئے ہیں۔

حالانکہ قرآن و حدیث میں اسلام کو مذہب نہیں "دین" کہا گیا ہے۔ اور اسلام دین ں ہے جب انفرادی اور اجتماعی گوشوں (سماجی و معاشرتی' معاشی اور سیاسی میدانوں) میں ں کی بالادستی ہو جو ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی تشریف آوری کا مقصد ہے۔

آج جو شخص اسلام کو دین کے طور پر پیش کرتا ہے امریکہ اور یہود اس کو بنیاد پرست (fundamentalis) کہہ کہ بدنام کرتے ہیں' اس لئے کہ دراصل یہی چند سر رے لوگ اور قرآن مجید کی یہ تعلیمات جو عدل اجتماعی کی ضامن ہیں' اس یہودی اختراع نیو ورلڈ آرڈر" کے راستے کا بھاری پتھر ہیں۔

آج ضرورت اس پیغام کو عام کرنے کی ہے آیئے حکمرانوں کے اسلام کے سیکولر تصور و رد کر کے حقیقی اور اصلی اسلام کے تصور کو سینے سے لگائیں اور اسلام کو بطور دین اپنی ندگی اور پھر ملکی اور عالمی سطح پر نافذ کرنے کی جدوجہد کریں۔ تاکہ ہمارا شمار محمد ﷺ کے مشن کے جان نثاروں میں ہو سکے۔

وما توفیقی الا باللہ

سیکولر سیاست دان اور مذہبی سیاسی جماعتوں کے زعماء کی خدمت میں چند گزارشات

از قلم: چوہدری رحمت اللہ بٹر

ہمارے مذہبی علماء جو مختلف مکاتب فکر کی بنیاد پر انتخابی سیاست میں دخل دے رہے ہیں اگر ابھی تک انہوں نے اپنے تعلیمی مدارس میں اس نظام تعلیم کو بھی اختیار نہیں کیا جو واقعی کسی اسلامی ریاست کو اسلامی سیادت و قیادت نصیب کر سکے تو مذہب کی بنیاد پر ان کا سیاست میں حصہ لینا بلاجواز ہے اور اس طرح وہ دین اسلام کو بدنام کرنے کے باعث بن رہے ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان میں سے اکثر کا تصور دین صرف عقیدہ، ارکان اسلام اور چند شرعی حدود تک محدود ہے اور وہ اسلام کے نظام عدل اجتماعی سے بے بہرہ ہیں۔ اس لئے وہ کبھی پیپلز پارٹی اور کبھی مسلم لیگ کے ساتھ ملکر سیاست کے میدان کے کھیل کھیل رہے ہیں۔ اگر ان کا دین کا تصور واقعی پورے نظام زندگی کا ہو تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان سیکولر جماعتوں کے اتحادی اور پشت پناہ نہیں۔ ہماری دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے قائدین کا تصور ہمیشہ سے سیکولر ہے اور وہ دین کو بھی محض عقیدہ اور چند عبادات و رسومات تک محدود سمجھتے ہیں اور ملک کو خالص سیکولر بنیاد پر چلانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے وہ علماء دین کو انتخابی اور انقلابی ہر نوع کی سیاست سے علیحدگی کا مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات یقینی ہے کہ اگر اس ملک میں حقیقی اسلام نظام نہ آیا تو یہ بات پاکستان کے خاتمہ کا ذریعہ بن جائے گی کیونکہ یہ ملک پھر اپنا جواز ہی کھو بیٹھے گا۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ یہ مذہبی سیاست دان سوچیں کہ اصل معاملہ یہاں پر اسمبلی کی سیٹوں کے ذریعہ سیاست میں دخل اندازی کا نہیں ہے بلکہ اصل معاملہ نظام اسلامی کے صحیح تصور کو عوام کے سامنے لانے کا ہے اور ضرورت ہے کہ اسلام کے عادلانہ نظام یا دوسرے الفاظ میں نظام خلافت راشدہ کے عدل اجتماعی کے تصور کو ملک میں رائج و قائم کرنے کے لئے وہی راستہ اختیار کریں جو ہمارے لئے واحد اسوۂ حسنہ ہے، جسے اختیار کرکے آنحضور ﷺ نے اس باطل فساد پرست اور سیکولر نظام کو بدلا تھا جو قریش نے

قائم کر رکھا تھا آپ ﷺ کے اختیار کردہ طریقے کو اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کے لئے اسوہ حسنہ قرار دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے اجتماعی نظام میں توحید کے عملی تقاضوں کو مانا جائے کہ یہاں کسی کو کسی پر نہ پیدائشی شرف ہے اور نہ کوئی یہاں مالک حقیقی ہے اور حکمران۔ بلکہ اصل حکمرانی صرف اللہ کی ہے اور باقی سب محکوم اور یہ زمین اور اس کے وسائل کسی خاص گروہ یا طبقے کی جاگیر نہیں' ان سب کا مالک حقیقی اللہ ہے اور ان پر تصرف کا حق سب کو یکساں طور پر حاصل ہے اور پھر اس نظریہ توحید کو اسلامی جمہوریہ پاکستان میں غالب کرنے کے لئے ایک لیڈر شپ کے تحت منظم جدوجہد کر کے نظام کو بدلا جائے۔ اب بھی علماء نے یہ راستہ اختیار نہ کیا تو صورت حال مزید بدتر ہوگی اور ون ورلڈ آرڈر کے تحت یہ ملک خالص سیکولر جمہوری ملک ہوگا اور یہاں کے حکمران اس کے "اسلامی" ہونے کا لبادہ جلد اتار پھینکیں گے۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

تنظیم اسلامی پاکستان کے تحت آئندہ مجوزہ پروگرام

○ حلقہ جنوبی پنجاب

☆ علاقائی اجتماع' ۹ تا ۱۱ ستمبر' بمقام ۲۵ آفیسرز کالونی' ملتان

(اس اجتماع میں ۱۰ ستمبر کو توسیعی مشاورت کا اجلاس ہوگا)

☆ مبتدی اور ملتزم تربیت گاہ' ۱۲ تا ۱۵ ستمبر بمقام ۲۵ آفیسرز کالونی' ملتان

○ حلقہ سرحد

☆ علاقائی اجتماع' ۳۰/ ستمبر تا ۲/ اکتوبر' ☆ مبتدی اور ملتزم تربیت گاہ' ۳ تا ۶/ اکتوبر

دیارِ مغرب میں ۵۸ دن

امیر تنظیم اسلامی کے سفر امریکہ انگلینڈ کی روداد

○

نیو جرسی، امریکہ میں قرآن بہار

مرتب : آصف حمید

۱۸ جون کو امیر تنظیم اسلامی پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق کراچی ایئرپورٹ سے امریکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن محترم سراج الحق سید صاحب کے علاوہ شکاگو کی تنظیم سے وابستہ ایک نوجوان تنویر عظمت جنہوں نے حال ہی میں قرآن کالج کے ایک سالہ کورس کی تکمیل کی ہے اور کراچی سے ہمارے ایک محترم رفیق محمود میاں صدیقی صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ امیر محترم کے اس دورے کا مقصد انگریزی زبان میں قرآن مجید کے "منتخب نصاب" کا درس دے کر اسے ریکارڈ کروانا تھا جس کا شدید تقاضا امریکہ میں مقیم ہمارے ساتھیوں کی جانب سے بار بار آتا تھا۔ اس لئے کہ اردو زبان میں "الہدیٰ" کے عنوان سے ۴۴ کیسٹوں پر مشتمل منتخب نصاب کے دروس کے sets تو بلا مبالغہ ہزاروں کی تعداد میں پاکستان میں اور اس سے کہیں زیادہ تعداد میں امریکہ، یورپ اور مشرق وسطیٰ میں پھیل چکے ہیں لیکن اس بات کی شدت کے ساتھ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ امیر محترم اس منتخب نصاب کو انگریزی میں بیان کریں تاکہ نہ صرف انگریزی دان مسلمان طبقہ بلکہ غیر مسلم بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

نیویارک ایئرپورٹ پر جناب اسرار خان صاحب جو تنظیم اسلامی نیویارک کے امیر بھی ہیں، استقبال کے لئے پہنچے۔ انہیں پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوئی جس کے باعث امیر محترم اور دیگر ساتھیوں کو کچھ دیر انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ قیام کا اہتمام جناب اسرار خان صاحب نے اپنے ہی مکان پر کیا تھا۔ ان کا گھر نیویارک سے متصل نیو جرسی اسٹیٹ کی ایک بستی Teaneck (ٹی نک) میں واقع ہے۔ گھر کے قریب ہی وہ جامع مسجد ہے جہاں درس قرآن کے پروگرام کے ساتھ ساتھ ایک ہفتہ پر مشتمل تربیتی کیمپ کا پروگرام ہونا طے تھا۔

امیر تنظیم کی نیو جرسی آمد کے اگلے ہی روز درس قرآن کے پروگرام اور تربیت گاہ کے ضمن میں اہم انتظامی امور طے کئے گئے۔ اسی دوران شکاگو سے جناب عطاء الرحمٰن صاحب جو نارتھ امریکہ کی تنظیم اسلامی کے امیر ہیں' تشریف لے آئے تھے۔ تربیت گاہ کے مہمانوں کے قیام وطعام کے انتظامات کو حتمی شکل دی گئی۔ طے یہ پایا کہ درس قرآن اور دیگر تربیتی پروگرام Teaneck کی جامع مسجد میں ہی منعقد ہوں گے جبکہ تربیتی کیمپ میں شریک رفقاء تنظیم کا قیام ایک مقامی یونیورسٹی کے پرسکون ہوسٹل میں ہو گا۔

تربیتی کیمپ کا آغاز تو یکم جولائی سے ہونا تھا لیکن امیر محترم چونکہ ۱۹ جون کو امریکہ پہنچ گئے تھے لہٰذا اس دوران نیویارک اور نیو جرسی میں امیر محترم کے خطاب جمعہ کے علاوہ دروس و خطابات کے متعدد دیگر پروگرام بھی ہوئے جن کے لئے روزانہ تقریباً ۳۰ سے ۴۰ میل تک کی مسافت طے کرنی پڑتی تھی۔ ان پروگراموں میں امیر تنظیم کے خطابات کا عنوان زیادہ تر عظمت قرآن رہا۔ اس حوالے سے اہالیان نیویارک اور نیو جرسی کو قرآن مجید کی جانب متوجہ کرنا۔ انہیں مجوزہ درس قرآن میں شرکت پر آمادہ کرنا مقصود تھا۔ دوسری طرف TWB (تھرڈ ورلڈ براڈکاسٹنگ) ٹی وی اسٹیشن سے جو کہ ہر weak end کو اردو دان طبقہ کے لئے اپنے پروگرام نشر کرتا ہے' گاہے بگاہے امیر محترم کے منتخب نصاب کے دروس کے مجوزہ پروگرام کا اعلان ہوتا رہا۔ اردو اخبارات میں مسلسل اشتہارات اور خبروں کے ذریعہ بھی اس پروگرام میں شرکت کی دعوت دی جاتی رہی۔ جوں جوں یکم تاریخ نزدیک آرہی تھی' پروگرام کی انکوائری کے لئے موصول ہونے والی ٹیلی فون کالوں کی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی دوران TWB نے امیر محترم کے دروس قرآن کے متعدد پروگرام ریکارڈ کر کے نشر کئے۔ رفقاء تنظیم بھی تربیتی کیمپ میں شرکت کے لئے امریکہ کے مختلف شہروں سے آنا شروع ہو گئے۔ Teaneck کی جامع مسجد "دارالاصلاح" میں گہما گہمی روز بروز بڑھنے لگی۔ مقامی تنظیم کے رفقاء نے اپنے اپنے شعبہ جات سنبھال لئے۔ ناظم اجتماع کی ذمہ داری جناب ممنون احمد مرغوب صاحب کے سپرد تھی جبکہ مکتبہ کا چارج عارف ضیاء انصاری صاحب نے سنبھالا اور پبلک ریلیشنگ کی ذمہ داری اظہر جیلانی نے قبول کی۔ یہ تسلیم کیا جانا چاہئے کہ ان حضرات نے اپنی اپنی ڈیوٹی پوری ذمہ داری سے نبھائی۔ اللہ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔

بالآخر یکم جولائی کا دن آ گیا۔ راقم السطور یکم جولائی کو والدہ محترمہ کے ہمراہ امریکہ پہنچا۔ (ہمیں اصلاً تو امیر محترم کے ساتھ ہی امریکہ کے لئے روانہ ہونا تھا لیکن ویزے کے حصول میں چونکہ تاخیر ہوئی لہٰذا بعد میں یکم جولائی کو نیویارک پہنچے۔ اس سے قبل کی رپورٹ محترم محمود میاں صدیقی صاحب سے حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہے)۔ امیر محترم کے منتخب نصاب کے

دروس کی آڈیو/ویڈیو ریکارڈنگ کا کام راقم کے ذمے تھا۔ اس روز جمعہ تھا اور امیر محترم کا خطاب جمعہ Teaneck کی جامع مسجد ہی میں تھا۔ سامعین کی بہت بڑی تعداد جس میں ہندوپاک کے علاوہ عرب اور افریقو امریکن (سیاہ فام) مسلمان بھی شامل تھے، مسجد میں جمع تھی۔ خطاب انگریزی زبان میں ہوا۔

اسی روز شام کو منتخب نصاب کے سلسلہ وار دروس کے پروگرام کا آغاز ہوگیا۔ ابتداء محترم ڈاکٹر صاحب نے "قرآن مجید کا تعارف" کے عنوان سے دو گھنٹے کا لیکچر دیا۔ پھر اگلے روز سے منتخب نصاب کا باقاعدہ درس شروع ہوگیا۔ ٹی نک کی جامع مسجد "دارالاصلاح" ہائی وے کے بالکل قریب واقع ہوئی ہے۔ یہ ایک خوبصورت مسجد ہے جو کہ سرسبز درختوں کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ مسجد کے دو طرف کار پارک ہے۔ ایک گنبد اور پچاس فٹ بلند مینار والی یہ مسجد دو منزلہ ہے۔ اوپر والی منزل کو باقاعدہ مسجد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جبکہ نچلی منزل کو سماجی تقریبات اور کیمونٹی سرگرمیوں کے لئے۔ دروس قرآن مسجد ہی میں ہوئے جبکہ نچلی منزل پر تنظیم کا مکتبہ لگایا گیا۔ ابتداء میں روزانہ دو گھنٹے امیر محترم کے دروس قرآن کے لئے مخصوص تھے۔ ایک گھنٹے کی نشست مغرب سے قبل اور ایک گھنٹہ مغرب کے بعد۔ روزانہ قریباً ایک گھنٹہ سوال جواب کی نشست رہتی۔ ان دروس میں حاضری ہفتے کے عام ایام میں پچاس اور سو کے درمیان اور Week end پر (یعنی بروز ہفتہ و اتوار) دو سو تک رہی۔ آخری دو دنوں میں اس سے بھی متجاوز تھی۔ محترم ڈاکٹر صاحب کی جسمانی صحت اگرچہ خراب رہی، گھٹنے کی تکلیف بہت بڑھ گئی، بلڈ پریشر میں بھی کچھ اضافہ ہوا اور کچھ روز اسہال کی بھی شکایت رہی لیکن آپ کی طبیعت میں انشراح بحمداللہ برقرار رہا بلکہ اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ ہی دن کے بعد وقت کی قلت کا احساس ہونے لگا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ یہی رفتار اگر برقرار رہی تو ایک ماہ میں منتخب نصاب کا درس مکمل نہ ہوسکے گا۔ لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ درس قرآن کی اب تک ہونے والی روزانہ دو نشستوں کی بجائے آئندہ ایک ایک گھنٹے کی تین نشستیں منعقد کی جائیں، دو نشستیں نماز مغرب سے قبل اور ایک نماز کے بعد۔ چنانچہ امیر محترم باقی ماندہ دنوں میں اسی طور سے درس قرآن مجید دیتے رہے۔ سوائے ۳۰ جولائی کے کہ اس روز اسہال کی شکایت کے باعث آپ مغرب سے قبل درس نہ دے سکے اور صرف بعد مغرب ہی دو گھنٹے کی نشست ہوئی۔

اتوار ۳۱ جولائی کو ڈاکٹر صاحب نے دن کے وقت مسجد دارالاصلاح ہی میں دو گھنٹے اردو میں خطاب فرمایا۔ سوال و جواب کے لئے اولاً بارہ بجے دن کا وقت مقرر کیا گیا تھا، لیکن یہ وقت چونکہ بالعموم لوگوں کی شدید مصروفیت کا ہوتا ہے اور ہفتہ اور اتوار کے علاوہ اس وقت میں لوگوں کا آنا محال ہوتا ہے لہٰذا اس پروگرام کو ختم کردیا گیا۔ لیکن پھر ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر

صاحب نے مزید بوجھ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور روزانہ درس کے بعد نصف گھنٹے کی سوال و جواب کی نشست بھی رکھ ڈالی۔ مزید بر آں عشاء کی نماز کے بعد سے رات گئے تک ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ چنانچہ رات کو آرام کے لئے بہت ہی کم وقت بچتا تھا۔ کچھ ملاقاتی فجر کے بعد بھی آتے۔ تاہم اس کے بعد امیر محترم کو آرام کا کچھ مزید وقت مل جاتا تھا۔ اس کے بعد آپ ناشتہ سے فارغ ہو کر درس کی تیاری کے لئے بیٹھتے اور بھرپور تیاری کرتے اور معمول کے مطابق نوٹس بھی تیار کرتے۔ امیر محترم کا تمام تر قیام' سوائے چند دنوں کے' امیر تنظیم اسلامی نیویارک جناب اسرار خان صاحب کے گھر پر ہی رہا۔ موصوف اور ان کی اہلیہ نے والد محترم (جناب ڈاکٹر صاحب)' والدہ محترمہ اور راقم کی میزبانی کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر سے نوازے۔ اسرار خان صاحب کے گھر جو کوئی بھی آتا ہے وہ ان کی طرف سے امیر محترم کی کوئی کتاب یا کیسٹ ہدیتاً ضرور لے کر جاتا ہے اور خور دونوش کی شکل میں خاطر مدارت اس کے علاوہ ہوتی ہے۔

درس قرآن مجید کے اس سلسلے کے ساتھ امریکہ میں مقیم رفقاء تنظیم اسلامی کے لئے دو تربیتی پروگرام بھی ترتیب دیئے گئے۔ پہلا یکم تا دس جولائی اور دوسرا سولہ تا چوبیس جولائی۔ رفقاء کو اپنی سہولت سے ان دونوں میں سے کسی ایک میں شریک ہونے کا پابند کیا گیا تھا۔ البتہ ذمہ دار رفقاء کو (یعنی مقامی امیر' نقباء اور ناظمین کو) پہلے کیمپ میں شرکت کی تاکید کی گئی تھی۔ تنظیمی امور پر گفتگو' مشوروں اور فیصلوں کے لئے اتوار ۲ جولائی کو دن کا وقت مجلس عاملہ کے اجلاس کے لئے مختص کیا گیا۔ اس میں دو ایسے امراء بھی بطور خاص شریک ہوئے جو کسی عذر کے باعث تربیت گاہ میں شریک نہیں ہو سکے تھے اور یہ تھے جناب محمد شفیق صاحب (مانٹریال) اور جناب معین بٹ صاحب (ہوسٹن)۔ مجلس عاملہ کے اجلاس میں ان دونوں حضرات کے علاوہ ناظم اعلیٰ بیرون پاکستان جناب سراج الحق سید صاحب' نائب ناظم اعلیٰ ڈاکٹر عبد السمیع صاحب' شمالی امریکہ کے جناب محمد عطاء الرحمٰن صاحب' امیر شکاگو و ناظم بیت المال برائے شمالی امریکہ جناب نصیرالدین محمود صاحب' معتمد جناب امین وارث صاحب' امیر نیویارک جناب اسرار خان صاحب' نقیب اسرہ ویسٹ ٹیکساس جناب سعید اختر اور نمائندہ کیلی فورنیا ڈاکٹر فرخ صاحب۔ ڈیٹرائٹ کی تنظیم کے امیر رفیع اللہ انصاری صاحب اور ناظم بیت المال جناب اعجاز چودھری صاحب' نیویارک کی تنظیم کے معتمد جناب راحیل ملک صاحب اور ناظم بیت المال جناب ابراہیم لونت صاحب اور جناب تنویر عظمت صاحب بھی شریک ہوئے۔

تربیتی پروگراموں کا آغاز روزانہ بعد نماز فجر ڈاکٹر عبد السمیع صاحب کے درس حدیث سے ہوتا اور ناشتے اور آرام کے بعد ۸ بجے ڈاکٹر عبد السمیع ہی تنظیمی امور سے متعلق ہدایات پر مبنی انتخاب از قرآن حکیم کا درس دیتے۔ اس کے بعد سراج الحق سید صاحب

Modern Organization اور Effective Communicati
and its Manageme پر لیکچر دیتے۔ پھر ڈاکٹر عبد السمیع کا "منہج انقلاب نبوی" کے
نوع پر لیکچر ہوا کرتا۔ شام چار تا پانچ بجے مختلف موضوعات پر ایک لیکچر ہوتا۔ اس کے بعد
ناء کے ساتھ تنظیمی امور اور دن بھر کے لیکچرز پر بھرپور Discussions کا سلسلہ ڈیڑھ
نہ تک جاری رہتا۔ نماز عصر کا وقت وہاں ساڑھے چھ بجے شام تھا۔ آڈیو / ویڈیو ریکارڈنگ
ضمن میں شکایات کا جائزہ لینے کے لئے راقم بھی ان نشستوں میں گاہے بگاہے شرکت کرتا رہا۔
دوسرے تربیتی کورس میں "منہج انقلاب نبوی" پر لیکچرز نوجوان رفیق تنویر عظمت نے
یئے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے "عصری افکار کے پس منظر میں تنظیم اسلامی"
موضوع پر دو لیکچر دیئے اور امریکہ کے نظام معیشت پر ایک لیکچر رفیق محترم وجیہ الدین حامد
حب نے دیا۔

اسی دوران نیو جرسی کے ایک معروف اخبار "The Recorder" میں جو اپنی
عت کے اعتبار سے سرفہرست ہے' امیر محترم کا ایک تفصیلی انٹرویو شائع ہوا۔ امیر محترم کے
س کے معاملہ میں Teaneck کی جامع مسجد کی کمیٹی نے حد درجہ تعاون کیا اور ہمیں یہ
ساس ہی نہ ہونے دیا کہ ہم یہاں پر مہمان ہیں بلکہ ہر لحہ یہی احساس ہوتا رہا کہ یہ گھر کی سی بات
۔ ان کے اس احسان کے ہم حد درجہ ممنون ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اجر عظیم عطا
ائے (آمین)۔ مسجد انتظامیہ کی طرف سے ہمیں فون' فیکس اور کمپیوٹر کے استعمال کی سہولت
ر تھی۔

امیر محترم کے دروس ہفتہ تا جمعرات جاری رہتے مگر جمعہ کے دن خطاب جمعہ اور نماز عصر
بعد عمومی خطاب کا پروگرام نیویارک شہر میں کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا رہا۔ اس نوع کے دو
گرام "Long Island" کی دو مساجد میں ہوئے' جو اپنی نوعیت اور حاضری کے لحاظ سے
ت ہی کامیاب رہے۔ جبکہ ۲۹/ جولائی کا جمعہ اس لحاظ سے مختلف رہا کہ اس روز امیر محترم کو بلند
الا عمارتوں کے مرکز مین ہٹن (Manhatten) جسکو دنیا کا قلب (of the world
Hear) بھی کہا جاتا ہے میں واقع ۹۶ سٹریٹ کی عالیشان مسجد میں خطاب جمعہ کی دعوت دی گئی
ی۔ وہاں امیر تنظیم کے خطاب کا دورانیہ پچاس منٹ تھا۔ یہ مسجد اس لحاظ سے مختلف نوعیت کی
ہ کہ جمعہ کے وقت یہاں اکثر مسلمان ممالک کے اعلیٰ سطح کے سرکاری افسر اور عہدیداران نماز
ہ ادا کرتے ہیں۔ مسجد میں حاضری تقریباً پندرہ سو کے قریب رہی۔ مسجد کے باہر عین سڑک پر
نبہ بھی لگایا گیا۔

اس پروگرام کے دوران مکتبہ سے متعلق نوجوان رفقاء کا جوش و ولولہ قابل دید تھا' خصوصاً

دو بھائیوں "طارق جاوید اور عبدالخالق" کو دیکھ کر ایمان تازہ ہوا۔ یہ دونوں ٹیکسی چلا کر اللہ کا "فضل" تلاش کرتے ہیں اور باقی ماندہ تقریباً سارا وقت آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کی تیاری اور ان کو لوگوں تک پہنچانے پر لگاتے ہیں۔ ان کا اپنا ریکارڈنگ سسٹم ہے۔ یہاں پر ٹورانٹو کے رفیق چوہدری عبدالغفور صاحب کے دو صاحبزادوں کا تذکرہ بھی مناسب ہو گا جنہوں نے ریکارڈنگ کا کام انتھک محنت سے کیا۔ ان تمام رفقاء کی کوششوں سے اس ایک ماہ کے دوران نیویارک، نیو جرسی میں لگ بھگ بارہ ہزار کیسٹ فروخت ہوئے۔

اتوار ۳۱ جولائی کو بعد نماز عصر سوال و جواب کی بھرپور اور آخری نشست "مسجد دارالاصلاح" ہی میں منعقد ہوئی جس کے اختتام پر ۳۰ نئے رفقاء نے بیعت کی۔ ان میں ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کے علاوہ دو ایفرو امریکن بھی شامل تھے۔ دو اگست کو امیر محترم نے تمام رفقاء کو مین ہٹن میں واقع تنظیم کے دفتر میں ایک تعارفی نشست کے لئے بلایا۔ تمام رفقاء حاضر تھے۔ امیر محترم نے ان سب سے تعارف حاصل کیا اور انہیں ضروری ہدایات دیں۔ اس ماہ کے دوران امیر محترم کے گھٹنوں کی تکلیف میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ بعض ڈاکٹروں سے مشورے کے بعد امیر محترم نے آپریشن کرانے کا خیال کیا مگر موصوف کے میڈیکل کالج کے ایک پرانے ساتھی ڈاکٹر رفیق جان کے مشورے پر آپریشن کو ملتوی کر دیا گیا کہ آپریشن کرانے کی صورت میں لندن میں ہونے والی عالمی خلافت کانفرنس میں شرکت مشکوک ہو جاتی کہ جس میں شرکت کا امیر محترم وعدہ کر چکے تھے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا والدہ محترمہ جو کہ تنظیم اسلامی حلقہ خواتین کی ناظمہ بھی ہیں، راقم الحروف کے ہمراہ امریکہ آئی تھیں۔ انہوں نے اس عرصے کے دوران خواتین کے متعدد پروگرام conduct کئے اور بحمد اللہ تقریباً ۴۰ کے قریب خواتین نے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔ خواتین کی علیحدہ رپورٹ میں محترمہ ناظمہ صاحبہ کے دورے کی تفصیل بیان ہو گی، ان شاء اللہ۔ امریکہ سے لندن کیلئے روانگی ۳/ اگست کو عمل میں آئی۔

ضرورت رشتہ

امریکہ میں مقیم ایک پاکستانی خاندان کی دو بیٹیوں، عمر ۲۲ اور ۲۴ سال کے لئے مناسب رشتے درکار ہیں۔ بڑی بیٹی اس سال امریکہ سے ان شاء اللہ بایو ٹیکنالوجی میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کر لیں گی جبکہ چھوٹی بیٹی نے امریکہ سے حال ہی میں ایجوکیشن میں بی۔ اے کیا ہے۔ بچیوں کے والدین مستقل طور پر پاکستان منتقل ہو رہے ہیں۔ دینی مزاج کے حامل خاندان رابطہ فرمائیں۔ پنجاب کی جاٹ برادری سے میڈیکل ڈاکٹر کے رشتے کو ترجیح دی جائے گی۔

برائے رابطہ : ایم اے چوہدری، معرفت ادارۂ تحریر 'میثاق' 36-K ماڈل ٹاؤن لاہور

دس دن لندن میں

امیر تنظیم کے دورہ لندن کی روداد

از قلم : ڈاکٹر ابصار احمد

امیر تنظیم اسلامی برادر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو پروگرام کے مطابق امریکہ سے واپسی پر دس روز کے لئے لندن رکنا تھا۔ اس قیام میں اہم ترین پروگرام جو کئی ماہ قبل طے پا چکا تھا مسلم یونٹی آرگنائزیشن اور حزب التحریر کے زیر انتظام منعقد ہونے والی عالمی خلافت کانفرنس میں شرکت اور خطاب کا تھا۔

لندن اور گردونواح میں تنظیم اسلامی کے متعدد رفقاء اور رفیقات ہیں، اگرچہ بوجوہ امیر محترم نے دو ماہ پہلے لندن تنظیم کو ختم کر دیا تھا اور رفقاء انفرادی طور پر وہاں تنظیم اسلامی کی دعوت پھیلا رہے تھے جن میں ڈاکٹر صاحب کے دروس و تقاریر کے ویڈیو اور آڈیو کیسٹ کی تقسیم و ترسیل سرفہرست ہے۔ راقم الحروف امیر محترم کے لندن میں قیام کے انتظامات اور بعض اداروں اور احباب سے رابطے کی غرض سے ۲۶/جولائی کی صبح امریکہ سے لندن پہنچ گیا تھا۔ گیٹ وک ایئرپورٹ پر جناب ظہور الحسن صاحب اور جناب محمد سعید احمد صاحب نے مجھے receive کیا اور میرا قیام حسن صاحب کے گھر پر ہوا جو نارتھ لندن کے علاقے Enfield میں واقع ہے۔ حسن صاحب کی اہلیہ محترمہ تنظیم اسلامی کے قرآنی دعوتی فکر کو خواتین کے حلقے میں جس تندہی اور جانفشانی سے پھیلا رہی ہیں وہ ناقابل بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو جزائے خیر سے نوازیں۔ آمین ثم آمین۔ انکے ہاں پاکستانی و غیر پاکستانی دینی بہن بھائیوں کی آمد کثرت سے دیکھنے میں آئی اور یہ میاں بیوی مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہیں چھوڑتے۔ کھانے اور مشروبات کے ساتھ ویڈیو پر ڈاکٹر صاحب کی تقاریر سنوانے کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ خود مسز حسن اکیلی کچن میں کھانا پکانے کے دوران مسلسل ڈاکٹر صاحب کے دروس کے ویڈیو چلائے رکھتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ موصوفہ نے نہ صرف لندن کی متعدد آبادیوں بلکہ لندن سے ڈیڑھ دو سو میل کے فاصلے پر واقع شہروں میں جا کر بھی قرآن کا ترجمہ پڑھانے کا اہتمام کیا ہے اور کئی جگہوں پر پورے قرآن کو ترجمے کے ساتھ پڑھا چکی ہیں۔ چنانچہ خواتین کے وسیع حلقوں میں قرآنی تعلیمات اور تنظیم اسلامی کو متعارف کرا چکی ہیں۔

لندن میں مکان بالعموم بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور باتھ روم کا اہتمام گراؤنڈ فلور پر نہیں

ہو تا۔ چونکہ امیر محترم کی گھٹنے کی تکلیف نیویارک میں قیام کے دوران خاصی بڑھ گئی تھی اس لئے ان کی خواہش تھی کہ لندن میں ان کے قیام کا انتظام ایسا ہو کہ وہ سیڑھی چڑھنے کی مشقت سے بچ جائیں۔ چنانچہ سبھی احباب اس بارے میں متفکر تھے۔ متعدد احباب کی طرف سے اس ضمن میں آفر موجود تھی۔ چنانچہ میرا کچھ وقت حسن صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ کے ساتھ رہائش گاہ کے انتخاب کے سلسلے میں بھی صرف ہوا۔ اس بھاگ دوڑ کا اضافی فائدہ یہ ہوا کہ بہت سے رفقاء سے ملاقات اور مختلف آبادیوں کی مساجد اور مسلمان حضرات کے بود و باش سے متعلق بہت سی نئی باتیں علم میں آئیں۔

لندن تنظیم کے سابق امیر جناب شبیر علی خان صاحب، حسن صاحب اور کچھ دوسرے رفقاء نے کوشش کر کے لندن کے وسطی علاقے فنزبری پارک کی مسجد کا ایک پورا فلور ڈاکٹر صاحب کے قیام کے دوران رفقاء تنظیم کے اجتماعات اور باہم ملاقات کے لئے حاصل کر لیا۔ راقم الحروف بیس بائیس سال قبل لندن میں تعلیم کے دوران اس علاقے میں جمعہ کی نماز ادا کرتا رہا تھا۔ لیکن اُس وقت نماز جمعہ کی ادائیگی ایک گھر کے بڑے کمرے میں ہوتی تھی۔ اب یہ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی کہ فنزبری پارک میں ٹیوب سٹیشن کے بالکل قریب چار منزلہ عمارت کی شکل میں باقاعدہ مسجد (Purposely built mosque) حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے جو مختلف اطراف سے بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ قریب ہی سڑک کے پار ایک عرب کلچرل سنٹر اور اسلامی کتب کی دکان بھی ہے۔ چنانچہ اس پورے علاقے میں مسلمانوں کی موجودگی سے دیار فرنگ میں اسلام کی نمائندگی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ میری لندن میں آمد سے دو ایک روز قبل شارجہ سے تنظیم کے ایک رفیق جناب فرخ ریاض صاحب بھی اپنی فیملی کے ہمراہ امیر محترم سے ملاقات اور جملہ پروگراموں سے استفادے کے لئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ ریاض صاحب نے اڑھائی ہفتے کرائے پر حاصل کی گئی آٹھ سیٹوں والی نئی ٹویوٹا ویگن اپنے ساتھ رکھی، جس کی وجہ سے لندن میں گھومنے پھرنے اور جملہ انتظامات کے سلسلے میں بہت مدد ملی۔

۲۷/ جولائی کو بعد نماز عصر فنزبری پارک مسجد میں رفقاء کی میٹنگ رکھی گئی، تاکہ ڈاکٹر صاحب کے دروس و خطابات کے پروگرام طے کر کے تشہیر کا مناسب انتظام کیا جا سکے۔ معلوم ہوا کہ لندن کی وسعت اور فاصلوں کے طویل ہونے کے باعث رفقاء کا میٹنگ میں بروقت پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ متذکرہ بالا میٹنگ میں بھی پانچ چھ رفقاء اور احباب ہی پہنچ پائے۔ تاہم مشورے کے بعد ۸/ سے ۱۳/ اگست کی شاموں کا پروگرام طے کر لیا گیا۔ دو تین پروگراموں کی تاریخیں اور عنوانات ڈاکٹر صاحب کو نیویارک Fax بھی کر دیئے گئے۔

حسب پروگرام ڈاکٹر صاحب مع اہلیہ محترمہ اور سراج الحق سید صاحب پی آئی اے کی فلائٹ سے براستہ فرینکفرٹ ۴/ اگست کی سہ پہر کو لندن کی ہیتھرو ایئرپورٹ پر پہنچے۔ ان سب کے

استقبال کے لئے متعدد رفقاء اور ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ کو خوش آمدید کہنے کے لئے بعض رفقاء کے اہل خانہ بھی ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ سراج الحق سید صاحب کو تو اپنے چھوٹے بھائی کے ہاں قیام پذیر ہونا تھا' اس لئے وہ ایئرپورٹ سے ہی ہم سے جدا ہو گئے اور باقی حضرات ایک کار اور ایک وین میں سوار ہو کر ولسڈن گرین میں واقع ایک مکان پر پہنچے' جہاں ڈاکٹر صاحب کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ تاہم کچھ مشورے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے حسن صاحب کے ہاں ہی قیام کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ دو دن حسن صاحب کے ہاں قیام رہا اور اس کے بعد ہم نارتھ لندن میں محمد اصغر چوہدری صاحب کے مکان ۱۰۔ ڈیل روڈ پر منتقل ہو گئے جہاں کچن' باتھ روم اور لاؤنج وغیرہ کا انتظام بہت عمدہ تھا۔ بالائی کمروں میں راقم الحروف اور جناب محمود میاں صدیقی نے قیام کیا۔ اصغر چوہدری صاحب نے ہمارے قیام کو ممکنہ حد تک آرام دہ بنانے کے علاوہ پھلوں' انڈوں اور دیگر اشیاء سے ریفریجریٹر کو مسلسل پُر رکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم ان کی اس مہمان نوازی کا کسی طور شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ اصغر چوہدری صاحب سے رابطے کا ذریعہ ایک دوست اعجاز قریشی صاحب بنے جن کی اپنی خواہش بھی تھی کہ ڈاکٹر صاحب ان کے گھر پر فروکش ہوں' لیکن وہاں چونکہ وہی مسئلہ تھا کہ باتھ روم آنے جانے کے لئے سیڑھیاں اترنی چڑھنی پڑتی تھیں لہٰذا اصغر چوہدری صاحب کی پیشکش قبول کی گئی۔ یہ دونوں حضرات طویل عرصے سے لندن میں مقیم ہیں اور ڈاکٹر صاحب سے کیسٹس کے ذریعے سے متعارف ہیں۔

۵/اگست کا جمعہ ڈاکٹر صاحب نے Enfield کی ایک چھوٹی سی مسجد میں پڑھایا اور انگریزی میں خطاب کیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام کیا اور پھر چند احباب ملاقات کے لئے آ گئے۔ جن میں قرآن سوسائٹی لندن کے ڈاکٹر صہیب حسن صاحب قابل ذکر ہیں۔ صہیب صاحب سے ملاقات مختصر رہی کیونکہ ہمیں فوراً ہی پونے دو سو میل کی مسافت پر واقع ڈان کاسٹر پہنچنا تھا جہاں بعد نماز مغرب ایک صاحب کے مکان پر ڈاکٹر صاحب کا خطاب تھا۔ ڈان کاسٹر کا سفر جناب مفتی صاحب کی دعوت پر پہلے سے طے شدہ تھا۔ ریاض صاحب کی آرامدہ نئی وین پر یہ سفر سوا تین گھنٹوں میں طے ہوا۔ راستے میں انگلستان کے countryside کے دلکش مناظر اور سرسبز و شاداب وادیاں بہت بھلی معلوم ہوئیں۔ مغرب کے بعد ایک گھر کے خاصے بڑے ڈرائنگ روم میں مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں کے موضوع پر پونے دو گھنٹے کا خطاب ہوا۔ خواتین کی بھی کثیر تعداد نے تقریر سنی۔ نماز عشاء کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوئی۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے شب مفتی صاحب کے دولت کدے پر واپسی ہوئی۔ صبح نماز فجر کے بعد صرف ایک کپ چائے پی کر تمام حضرات لندن کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہفتے کی صبح کو ویک اینڈ کی وجہ سے ٹریفک کا رش کم تھا اس لئے واپسی کا سفر فقط اڑھائی گھنٹوں میں طے ہو گیا۔

۷/اگست کو پورا دن حزب التحریر کے زیر انتظام منعقد ہونے والی عالمی خلافت کانفرنس میں

صرف ہوا۔ اس کانفرنس کی روداد اور ڈاکٹر صاحب کی تقریر کے اہم نکات قارئین کرام "ندائے خلافت" کے صفحات میں دیکھ سکتے ہیں (نیز زیر نظر شمارے میں شامل امیر تنظیم کے خطاب جمعہ میں بھی اس کانفرنس کا تفصیلی ذکر موجود ہے)۔ ۸/ اگست کی شام کو ولسڈن گرین کی زیر تعمیر مسجد میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر ہوئی۔ شرکاء کی خاصی بڑی تعداد نے انہماک سے تقریر سنی۔ بعد ازاں ملحقہ مسلم یوتھ کلب میں ایک مقامی انگریزی ہفتہ وار اخبار کے نمائندے نے ڈاکٹر صاحب کا مفصل انٹرویو ریکارڈ کیا۔ خاص طور پر تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت پاکستان کے حوالے سے بہت سے سوالات کے جواب دیئے گئے اور مفید وضاحتیں کی گئیں۔

اگلے روز یعنی ۹/ اگست کو بعد نماز عصر ساؤتھ لندن کی آبادی کرائڈن کی جامع مسجد میں خطاب طے تھا۔ چونکہ نارتھ لندن سے کرائڈن کا فاصلہ خاصا تھا اس لئے ڈاکٹر صاحب عصر کی نماز کے بعد آدھے گھنٹے کی تاخیر سے وہاں پہنچ سکے۔ راقم الحروف کچھ احباب اور خواتین کے ساتھ وہاں بروقت پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ نماز کے بعد بیس پچیس منٹ انگریزی میں تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت پاکستان کا تعارف راقم نے سامعین کے سامنے پیش کیا۔ اس خوبصورت اور وسیع مسجد میں گجرات (انڈیا) کے کاروباری اور کھاتے پیتے حضرات کا عمل دخل دیکھنے میں آیا۔ علاوہ ازیں افریقی اور کچھ دوسرے ممالک سے آئے ہوئے مسلمان بھی نظر آئے۔ ان سب نے ڈاکٹر صاحب کی تقریر بہت دلچسپی سے سنی جس میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا جائزہ اور اسباب کا ذکر تھا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب نے حزب التحریر کے موقف پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریر کے بعد سوال جواب کی نشست رہی۔ سامعین میں سے بعض حضرات نے بڑے عملی وعلمی سوال کئے جن کا تسلی بخش جواب دیا گیا۔

۱۰/ اگست کی شام اسلامک کلچرل سنٹر (ریجنٹ پارک) کے لئے مختص تھی۔ جہاں "اکیسویں صدی کے یورپ میں مثالی مسلمان عورت کا تصور" کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کو خطاب کرنا تھا۔ اس پروگرام کو خاصا advertise کیا گیا تھا اور اس تقریر کا انتظام بھی ایک مشفق دوست جناب حسینی صاحب نے مختلف تنظیموں کے تعاون و اشتراک سے کیا تھا۔ تقریر سننے کے لئے خواتین و مرد حضرات کی بڑی تعداد موجود تھی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ کلچرل سنٹر کے تہ خانے میں واقع پورا کانفرنس ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز علامہ اقبال کے اس شعر سے کیا ۔

زمانہ ایک ' حیات ایک ' کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید

اور کہا کہ چونکہ مرد اور عورت کی جسمانی ساخت ' نفسیات اور فطری تقاضوں میں مرورِ زمانہ سے

کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اس لئے قرآن حکیم میں دیئے گئے ستر و حجاب کے قوانین اور اخلاقی تعلیمات پر عمل کرکے ہی مسلمان عورت ہر جگہ اور ہر زمانے میں مثالی خاتون ثابت ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ضمناً ایمان کی ضرورت اور اسلام کے معاشرتی نظام سے متعلق اقدار کے احیاء پر بھی زور دیا۔

۱۱/ اگست بروز جمعرات گھر پر ڈاکٹر صاحب مختلف احباب سے ملاقات میں مصروف رہے، جن میں حزب التحریر سے دلچسپی رکھنے والے بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکستانی نوجوان وکلاء اور انجینئر تھے۔ ان میں جناب امیر سلطان، اقبال احمد، اختر ریاض راجہ اور نعیم رزاق خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی پاکستان کے حالات سے دلچسپی اور احیاء اسلام کے ضمن میں فکر دیدنی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بوجوہ ۱۱/ اگست اور ۱۳/ اگست کی شاموں کے طے شدہ پروگرام ختم کرکے رفقاء کو پابند کیا کہ وہ تین دن ڈاکٹر عبد السمیع صاحب کے قرآنی سٹڈی سرکل اور تربیتی پروگرام میں ہمہ وقتی شرکت کریں۔ جو فنزبری پارک کی مسجد میں جاری تھا اور جس میں فرانس سے آئے ہوئے رفقاء پہلے سے شریک تھے۔

۱۲/ اگست کو فنزبری پارک میں جمعے کا خطاب انگریزی زبان میں ہوا جو آدھے گھنٹے کے دورانیہ پر مشتمل تھا۔ خواتین کی بڑی تعداد نے بھی نماز جمعہ میں شرکت کی۔ سورۂ حجرات کی آیت ۱۴ کے حوالے سے محترم ڈاکٹر صاحب نے اسلام اور ایمان کے مابین فرق کو واضح کیا۔ سامعین میں مختلف قوموں اور ممالک سے تعلق رکھنے والے مسلمان شامل تھے اور اکثریت کے چہرے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ بات بہت واضح ہو کر دل میں اتر رہی ہے۔ آخر میں دین کے غلبے کی جدوجہد کے تقاضے مختصراً بیان کئے اور دعا پر یہ خطاب ختم ہوا۔ عربی خطبہ اور نماز کی امامت کے فرائض بھی امیر محترم نے انجام دیئے۔ اڑھائی بجے ہم نے قریب ہی واقع لندن کے ماہنامہ امپیکٹ انٹرنیشنل کے دفتر کا رخ کیا جہاں جناب حاشر فاروقی صاحب اور ایڈیٹر سید نیاز احمد سے امیر محترم کی ملاقات کے لئے وقت طے تھا۔ دفتر کے صدر دروازے پر پرانے شناسا دوست سلیم صدیقی صاحب نے استقبال کیا۔ بعد ازاں اہتمام کے ساتھ سوال و جواب اور افہام و تفہیم کی نشست کا آغاز ہوا۔ "امپیکٹ" گزشتہ دو دہائیوں سے شائع ہو رہا ہے اور مسلم دنیا میں اس کا شمار اہم ترین جرائد میں ہوتا ہے۔ حاشر فاروقی صاحب نے خاص طور پر عالمی خلافت کانفرنس کے حوالے سے سوالات کئے، بعض وضاحتیں چاہیں اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کھل کر کیا۔ بہرحال نقطۂ نظر کے فرق اور بعض بنیادی اختلافات کے باوجود دو گھنٹے طویل یہ ملاقات بہت دلچسپ رہی، اور تبادلۂ خیال سے مسائل کے بعض نئے گوشے سامنے آئے۔

امیر محترم نے پاکستان کے ۴۸ ویں یومِ استقلال کی مناسبت سے احباب سے مشورے کے

بعد ۱۳/ اگست کو ایک خطابِ عام کا پروگرام بنایا۔ لیکن وقت کی کمی کے باعث اس تقریر کے لئے کوئی مناسب ہال بُک نہ کروایا جاسکا۔ چنانچہ یہ پروگرام بھی فنزبری پارک کی مسجد میں ہی رکھا گیا۔ اس پروگرام کا اشتہار روزنامہ جنگ لندن میں ۱۲/ اگست کو شائع ہوا اور ہینڈ بل بھی کئی سو کی تعداد میں مختلف آبادیوں میں تقسیم کئے گئے۔ نماز عصر کے بعد شام ۷ بجے امیر محترم نے "پاکستان کا ماضی، حال اور مستقبل" کے عنوان پر نہایت جامع خطاب فرمایا جس میں پاکستانی اور بنگلہ دیشی مسلمانوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ خواتین کے لئے بھی علیحدہ نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ۱۳/ اگست کی صبح کو لندن کے نواحی علاقوں Buckingham shire اور ووکنگ (Surrey) بھی جانا ہوا۔ ووکنگ کی تاریخی مسجد میں نماز ظہر ادا کی۔ یہ انگلستان میں پہلی مسجد تھی جو بیگم صاحبہ بھوپال نے تعمیر کروائی۔ اس مسجد پر ایک عرصے تک قادیانیوں کا قبضہ رہا، اب چند برسوں سے یہ صحیح العقیدہ مسلمانوں کے زیر انتظام ہے۔ دوپہر کے کھانے پر ڈاکٹر صاحب کراچی کے لطف اللہ خان صاحب کے ہاں مدعو تھے، جو ووکنگ میں اپنی صاحبزادی کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ کھانے پر "امپیکٹ" کے سید نیاز احمد صاحب کے علاوہ برائٹن مسجد کے امام اور ڈائریکٹر ڈاکٹر عبد الجلیل ساجد صاحب بھی تشریف لائے جس سے پُر تکلف کھانے کا مزا دوچند ہو گیا۔

قبل ازیں تحریر کیا جاچکا ہے کہ پیرس (فرانس) سے متعدد رفقاء و احباب وہاں کے امیر جناب محمد اشرف صاحب کی زیر قیادت لندن آئے اور کئی روز یہاں کے پروگراموں میں شرکت کی۔ ان میں سے بعض حضرات نے بیعت کر کے تنظیم میں شمولیت اختیار کی۔ اسی طرح ۱۴/ اگست کو صبح اور دوپہر کا خاصا وقت بھی فنزبری پارک مسجد میں رفقاءِ لندن سے ملاقات میں صرف کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے عمومی ہدایات پر مبنی الوداعی خطاب بھی کیا اور پرانے رفقاء نے تجدید بیعت کے علاوہ کئی نئے احباب نے تنظیم کی رفاقت کے فارم پر کئے اور بیعت کی۔ قارئین کے لئے یہ بات خوش کن ہوگی کہ ان نئے رفقاء میں فنزبری پارک مسجد انتظامیہ کے بعض اہم حضرات بھی شامل تھے۔ اس سے اس امید کو خاصی تقویت ملی کہ انشاء اللہ اس مسجد کو آئندہ تنظیم اسلامی لندن کی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جاسکے گا۔ ان اہم حضرات میں سے بالخصوص جناب مرزا صاحب نے نماز ظہر کے بعد کچھ فاصلے پر واقع اپنے گھر پر دس پندرہ حضرات کے ساتھ ہم سب کو کھانے کی دعوت دی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں مسجد ہذا کی خدمت کے ساتھ ساتھ غلبۂ دین کی اس جدوجہد میں بھی بھرپور طریقے سے حصہ لینے کی توفیق عطا کریں جس کے لئے تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ آمین۔

جمعۃ المبارک ۱۲/ اگست کو ۵ بجے سے ساڑھے چھ بجے سہ پہر مسجد میں بنائے گئے تربیتی مرکز میں حزب التحریر کے بعض نوجوانوں سے بھی ملاقات ہوئی جن میں ڈاکٹر عبد الباسط اور جمال ہاروڈ

قابل ذکر ہیں۔ ۱۴/اگست کی شام کو متعدد حضرات ہمیں خدا حافظ کہنے کے لئے ایئرپورٹ تشریف لائے اور اس طرح دس روزہ دورۂ لندن تکمیل کو پہنچا۔ امیر محترم نے آئندہ تین ماہ کے لئے تمام رفقاء کو انفرادی حیثیت میں دعوتی و تنظیمی کام جاری رکھنے کی ہدایت کی ہے' بعد ازاں وہاں کے نظم کے بارے میں فیصلے کئے جائیں گے۔ محترم سراج الحق سید صاحب نے بھی اس دوران خاصا وقت تربیتی پروگرام اور رفقاء سے انفرادی ملاقاتوں میں لگایا۔ انہیں چونکہ مزید چار پانچ دن لندن میں قیام کرنا تھا اس لئے نئے رفقاء کی تعلیم و تربیت اور ہدایات کے ضمن میں ان پر اضافی ذمہ داری ڈالی گئی۔

ہمارے لندن قیام کے دوران رفیق تنظیم سید محمد ہاشم صاحب کی Fax مشین بہت کام آئی اور پاکستان اور امریکہ سے رابطے کا ذریعہ بنی رہی۔ ہاشم صاحب نے ایک صبح کے لئے پر تکلف ناشتہ بھی ہماری جائے رہائش پر بھجوایا جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ ساؤتھ انڈیا سے تعلق رکھنے والے اقبال صاحب نے بھی نہ صرف اپنی کار پر امیر محترم کو مختلف جگہوں پر پہنچانے کا انتظام کیا بلکہ عالمی خلافت کانفرنس کے دن وہ پورا وقت ان کے ساتھ رہے۔ جناب کرمانی صاحب سے بھی پہلی دفعہ راقم کا تعارف ہوا۔ تربیتی پروگراموں کے دوران گفتگو کا موقع ملتا رہا۔ جناب ولید صاحب اپنی ناسازیٔ طبع کے باعث مختصر وقت کے لئے بعض نشستوں میں آئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا کریں۔ آمین

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا یہ دورۂ انگلستان چار سال کے وقفے کے بعد ہوا تھا۔ گزشتہ دورے کے نتیجے میں تنظیم اسلامی لندن وجود میں آئی تھی۔ مجھے پوری توقع تھی کہ حالیہ دورے سے رفقاء تنظیم کا جوش و جذبہ کئی گنا بڑھ جائے گا اور وہ زیادہ تندہی اور نظم و ضبط کی پابندی کے ساتھ دعوت دین کا کام کر سکیں گے۔ انگلستان کی اہمیت کا اعتراف خود ڈاکٹر صاحب نے خلافت کانفرنس والی تقریر میں کیا' جب آپ نے لندن کو مغربی دنیا کا قلب قرار دیا۔ علاوہ ازیں اس مرتبہ ڈاکٹر صاحب کی ملاقات متعدد باصلاحیت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد سے ہوئی جن سے اگر آئندہ بھی تبادلہ خیال اور گفتگو جاری رکھی جائے تو بہت مفید نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے اور انگلینڈ میں اسلام کے انقلابی پیغام اور تنظیم کی دعوت کے فروغ کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔

امیر تنظیم کے دورۂ لندن کے دوران فنزبری پارک مسجد میں ایک پورے فلور پر تنظیم کی کتابوں' رسائل' کیسٹس اور ویڈیوز کی نمائش کا اہتمام اور فرشی نشست کے لوازمات اور چائے' پھل اور بسکٹوں کا انتظام جناب ظہور الحسن صاحب نے کیا۔ اس میں انہیں ریاض صاحب اور راقم کے علاوہ بعض دوسرے نوجوانوں کی مدد ملتی رہی' جن میں ساؤتھ آل کے جناب عبد الرشید صاحب اور ان کے چار نہایت صالح اور مستعد جواں سال بیٹوں کا ذکر ضروری ہے۔ رشید صاحب نے اپنے بڑے بیٹے سمیت تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ ان کی اہلیہ محترمہ پہلے ہی

سے تنظیم سے وابستہ ہیں۔ آخر میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ امیر تنظیم اسلامی کی اہلیہ محترمہ کی موجودگی کی وجہ سے خواتین کے متعدد پروگرام علیحدہ بھی ہوتے رہے جن میں سے دو ایک میں محترم ڈاکٹر صاحب اور سراج الحق سید صاحب نے بھی شرکت کی اور ضروری ہدایات دیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دینِ متین کی خدمت کی توفیق سے نوازیں۔ آمین۔

بقیہ "عرض احوال"

دشمنوں کے خلاف ہر وقت ہر طرح کی جنگی تیاری برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اس پر امریکہ اگر بگڑ جاتا ہے تو ایک ہی بار کر لے ہمارے ساتھ جو کرنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ نے پہلے ہمارے ساتھ اگر کوئی بھلائی کی تو اپنے مفاد میں کی تھی اور آئندہ بھی اگر اسے ہم سے سروکار رکھنا ہوا تو اپنی غرض سے رکھے گا ورنہ ہماری پرواہ اسے کبھی تھی نہ اب ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اخباری اطلاعات کے مطابق حکومت پاکستان نے کشمیر کے تنازع میں یو این او کے سیکریٹری جنرل بطرس غالی کی ثالثی قبول کر لی ہے جس کی تجویز خود بھارت نے اس وقت پیش کی جب حقوق انسانی کمیشن سے ہم نے کشمیر کے بارے میں اپنی شکایت واپس لی تھی۔ انہوں نے خبردار کیا کہ یو این خود امریکہ کا طفیلی ادارہ بن چکا ہے جبکہ اس کا سیکریٹری جنرل صرف نام کا غالی نہیں بلکہ اصلی غالی یعنی متعصب عیسائی اور اپنی بیوی کے واسطے سے صیہونی اثرات کا تابع بھی ہے۔ اس ثالثی سے خیر کی کوئی امید نہیں چنانچہ ہمیں تو ایران کی طرف سے ثالثی کی اس پیشکش کو قبول کرنا چاہئے جو حال ہی میں بھارت کا دورہ کرتے ہوئے ایرانی حکومت کے ایک ذمہ دار رہنما ڈاکٹر حسن روحانی کی طرف سے آئی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ایران پہلے ہی امریکہ کا ہدف تھا اور ہمارا شمار بھی پسندیدہ ممالک میں تو قبل ازیں بھی نہیں تھا' نواز شریف کے دھماکے کے بعد ہم بھی پوری طرح زیر عتاب آجائیں گے چنانچہ ایک مشترک درد ہمارے لئے اور اہل کشمیر کے لئے ایران کی ہمدردی میں یقیناً اضافے کا موجب ہوگا۔

امیر تنظیم اسلامی نے ملک کی سیاسی صورت حال پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھنا چاہئے۔ آج پاکستان کا ہر شہری حالات کی سنگینی سے پریشان ہے۔ حکومت اور اپوزیشن میں محاذ آرائی نے باقاعدہ دشمنی کی شکل اختیار کر لی ہے جس کے نتیجے میں اگر مارشل لاء کا نفاذ ہوا تو وہ پہلے مارشل لاؤں سے مختلف ہوگا کیونکہ باخبر حلقوں کا کہنا ہے کہ فوج کی اعلیٰ قیادت میں بھی اس دھڑے بندی کے اثرات سرایت کر چکے ہیں جس نے ملکی سیاست کو تقسیم کر کے تہہ و بالا کر دیا۔ اگر خدانخواستہ یہ بات درست ہے تو مارشل لاء خانہ جنگی کو بھی جنم دے سکتا ہے جس کے لئے بارود ملک کے گوشے گوشے میں پہلے سے ہی جمع ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بے نظیر بھٹو پر بھی اپوزیشن میں آکر ہی چودہ طبق روشن ہوئے تھے اور پی پی پی نے بھی آخر کار نواز شریف حکومت کے قدم اکھاڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ سابقہ اپوزیشن نے حکومت کو کام کرنے کا خاصا موقع دیا تھا جبکہ موجودہ اپوزیشن جس کے قائد نواز شریف ہیں' نئی

حکومت کو ایک دن کی مہلت دینے کی بھی روادار نہ ہوئی اور ان کا تازہ ترین ایٹمی دھماکہ بھی دراصل اسی محاذ آرائی کی انتہا ہے جس میں نواز شریف ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ جس اعتراف کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ سوچ سمجھ کر کیا اس پر ان کے دوست بھی حیران ہیں اور ہم بھی ان سے اس سوال کا حق رکھتے ہیں کہ یہ مجاہدانہ اعلان انہوں نے اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں کیوں نہ کیا جبکہ بھارت کی جنگی تیاریاں اور کشمیری مسلمانوں پر اس کے ظلم و ستم نے تو اس وقت بھی ہر حد کو پھلانگ لیا تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے فرقہ واریت میں کشیدگی کے روزافزوں اضافے اور قتل در قتل اور حملوں پر جوابی حملوں کو بھی خطرناک قرار دیا جبکہ قوم کو اخلاقی پستی اور کردار کے زوال کے ساتھ جس تیزی سے سیکولرازم کی طرف لے جایا جا رہا ہے اس کے نتیجے میں نفاق کا وہ مرض اور بڑھ جائے گا جو کم از کم ایک مسلمان معاشرے کو تو ضرور تباہی کے گڑھے میں گرا کر چھوڑتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ قاہرہ میں خاندانی منصوبہ بندی کے جس سیمینار میں پاکستان جوش و خروش سے حصہ لینے کی تیاری کر رہا ہے اس میں فحاشی کو ایک سائنس بنا کر پیش کیا جائے گا۔ مسلمانان پاکستان کو دعوت فکر دیتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ قوم جن امراض کا شکار ہو گئی ہے ان کا واحد علاج اسلام کی طرف پلٹنے میں ہے جسے اختیار نہ کیا گیا تو نتائج کی ہولناکی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری سزا میں شدت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ انہوں نے اس امر پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ اپنی غلط حکمت عملی کے نتیجے میں مذہبی طبقات بالکل غیر مؤثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کی نہ تو ایوان حکومت میں شنوائی ہوتی ہے اور نہ سیاست ہی میں ان کا کوئی وزن باقی ہے۔ OO

نقباء کی ایک روزہ تربیت گاہ' کراچی

ہر نظریاتی جماعت اپنے کارکنوں میں نظریہ کو زندہ رکھنے اور اسے پروان چڑھانے کے لئے مختلف کورسز کا اہتمام کرتی ہے تاکہ مقصد مستحضر رہے اور اس کی طرف پیش قدمی جاری رہے۔ تنظیم اسلامی بھی ایک نظریاتی جماعت ہے جس کا مقصد اعلائے کلمتہ اللہ ہے یعنی اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام کو نافذ کرنے کی کوشش۔ اسے اقامت دین' حکومت الہیہ اور اسلامی نظام کا قیام بھی کہتے ہیں۔ ایک مومن کی زندگی کا مقصد از روئے قرآن یہی ہے۔ نبیؐ کی سیرت سے ہمیں یہی راستہ ملتا ہے۔ آپ کی پوری زندگی جن کاموں میں صرف ہوئی وہی آپ کی سنت ہے وہی آپ کا طریقہ ہے اور اسی پر چلنے ہی میں نجات ہے۔

تنظیم اسلامی نے اپنے اندرونی نظام کو چلانے کے لئے نظام العمل کے نام سے ایک دستور ترتیب دیا ہے۔ اس دستور کی رو سے چھوٹے بڑے حلقے وجود میں آئے ہیں۔ سب سے چھوٹا حلقہ یا یونٹ جسے ہم "اسرہ" کا نام دیتے ہیں چند رفقاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور کئی اسرے مل کر یک تنظیم کو وجود میں لاتے ہیں۔ اسرہ کے افراد وہ اینٹ ہیں جس کی بنیاد پر تنظیم کی عمارت وجود ں آتی ہے' اینٹ کی پختگی پر ہی عمارت کی پختگی کا دارومدار ہے۔ اس لئے اسرہ پر سب سے زیادہ جہ دی جاتی ہے۔ ہر اسرہ کا ایک نقیب ہوتا ہے۔ یہ نقیب اپنے رفقاء کا نگران ہوتا ہے۔ یہ چھوٹا نٹ جتنا مستحکم ہوگا تنظیم بھی اسی اعتبار سے مضبوط ہوگی۔ اسی لئے تنظیم اسلامی پاکستان کے ناظم ملی جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے نقباء کی تربیت کا ایک روزہ پروگرام ترتیب دیا اور اس کے لئے آپ نے پورے پاکستان کا دورہ کیا۔ لاہور' فیصل آباد' ملتان' پشاور' راولپنڈی اور خری پروگرام کراچی میں تھا۔ نقباء کے ساتھ امراء تنظیم کو بھی مدعو کیا گیا تھا تاکہ وہ بھی انداز بیت سے آگاہ ہو سکیں۔ یہ پروگرام ۱۵ جولائی ۹۴ء ۸:۴۰ پر قرآن اکیڈمی کراچی میں شروع ا۔ ناظم حلقہ جناب نسیم الدین صاحب نے پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے سامعین کو متوجہ کیا کہ الجمعی اور توجہ سے شریک ہوں آپ نے کہا کہ تنظیم کے نظم میں نقیب ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت کھتا ہے' جس طرح گاڑی کے صحیح چلنے کا دارومدار گیئر پر ہے یہی حیثیت جماعتی نظام میں نقیب کی ہے۔ ناظم حلقہ نے کہا کہ ناظم اعلیٰ تشریف فرما ہیں لہذا آپ اپنی مشکلات ان سے بیان کریں وہ ان اءاللہ اس کا حل بتائیں گے اور رہنمائی فرمائیں گے۔ اس مختصر تمہیدی گفتگو کے بعد جناب یداحمد صاحب نے سورہ شوریٰ کی چند آیات کا درس دیا۔ آپ نے کہا کہ جن لوگوں نے دین کے لئے تن من دھن لگانے کا عزم کیا ہے ان کی کچھ اضافی صفات ان آیات میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ رض جسے ہم اقامت دین کا نام دیتے ہیں کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کی مشکلات کو سامنے کھتے ہوئے کمر ہمت کسنی چاہئے۔ اس دین کو غالب ہونا ہے' اس کی بنیاد میں ہمارا خون شامل

ہو جائے یہی ہماری کوشش ہے۔

درس قرآن کے بعد ناظم اعلیٰ متوجہ ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ ہماری اس تربیت گاہ میں مندرجہ ذیل عنوانات زیر بحث آئیں گے جن پر مل جل کر گفتگو کرنی ہے۔ نقباء پر نظام العمل کی ذمہ داریاں' نقباء اپنے ساتھیوں کو کیسے متحرک کریں' احتسابی رپورٹوں کے حوالے سے نقباء کی ذمہ داریاں' نقباء کا رفقاء سے انفرادی سطح پر تعاون' نقباء کو دیئے گئے ٹارگٹ کے حوالے سے گفتگو نیز تنظیم میں فکری اختلاف اور اس کا حل۔

ان عنوانات پر گفتگو کرنے سے پہلے آپ نے درس قرآن کے حوالے سے چند باتیں بیان کیں۔ آپ نے فرمایا ابھی جو درس دیا گیا ہے اس میں جو شرائط یا صفات بیان کی گئیں وہ اقامت دین کی جدوجہد کرنے والے افراد کے لئے کم سے کم شرائط ہیں۔ یہ دنیا ایک متاع ہے اور متاع برتنے کی چیز کو کہتے ہیں۔ یہ تصور ذہن کی سطح پر بالفعل واضح ہونا چاہئے کہ اصل گھر آخرت کا گھر ہے۔ اس زندگی میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ زائل ہونے والی شے ہے' جسے قرآن نے متاع کہا ہے۔ نیک اور صالح بیوی کو حضورؐ نے خیر المتاع کہا ہے۔ اقامت دین میں تعاون کرنے والی بیوی خیر المتاع ہے۔ وہ لوگ جو تنظیم میں کسی بھی عہدہ پر فائز ہیں اور رفقاء کو ساتھ لے کر چلنے کی ان پر ذمہ داری ہے ان کا ذہن تو اس دنیا اور متاع دنیا پر واضح ہو جانا چاہئے۔ بات بالکل صحیح ہے کہ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں جب تک یہ باہم مل کر ایک رخ پر سفر نہیں کریں گے منزل سر نہیں ہو گی۔ اس لئے اس پر ہمیں خصوصی توجہ دینی چاہئے۔ اس متاع بے بہا کو خیر المتاع بنانے کے لئے اپنے فکر سے ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہئے۔ اس کے بعد عنوانات پر گفتگو شروع ہوئی۔ نظام العمل کی رو سے نقباء کی ذمہ داریاں۔ "اسرہ" ہمارا بنیادی یونٹ ہے۔ نقیب کو اپنے رفقاء کے ذاتی حالات سے واقف ہونا چاہئے۔ ایک خاندان کے سربراہ کی طرح اپنے اسرہ کا نگران ہونا چاہئے۔ نقیب اسرہ رفقاء کے ذاتی مسائل میں دلچسپی لے' ان کے حالات سے باخبر رہے اور دوستوں کی طرح گھل مل جائے۔ دوران گفتگو آپ نے ایک حدیث قدسی بھی سنائی جس میں حضور ﷺ کی وساطت سے اللہ نے اپنے بندوں کو خوشخبری دی ہے کہ وہ لوگ جو میری وجہ سے آپس میں محبت کرتے ہیں' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انہیں نور کا منبر عطا فرمائے گا۔

رفقاء اور نقباء کا آپس میں ملنا تو لوجہ اللہ ہی ہے۔ اس عظیم مقصد کی طرف قدم ملا کر سفر کرنا اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے ہے۔ یہ بھاگ دوڑ یہ تگ و دو رضاء الٰہی کے حصول ہی کی طرف تو ہے۔ اس حدیث کا مصداق اقامتِ دین کی جدوجہد میں مل کر چلنے والوں سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ آپس کی ملاقات میں تکلف کو راہ نہ دینا چاہئے۔ بعض اوقات تکلفات رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ خاطر و مدارات میں دعوتِ "شیراز" کو مد نظر رکھے۔ ہر عنوان پر رفقاء آکر اپنا تجربہ' اپنی مشکلات یا اپنی تجاویز بیان کرتے۔ اس طرح یہ باہمی گفتگو چلتی

رہی تا آنکہ موضوع کی تکمیل ہو گئی۔
نقباء اپنے ساتھیوں کو کیسے متحرک کریں نیز علمی اور عملی تربیت کی نگرانی کس طرح ہو۔ اس کے لئے ایک "ٹارگٹ" یعنی ہدف نقباء کے ذریعہ رفقاء کو دیا جائے۔ ہمارا ہر رفیق دعوتی کام میں لگ جائے۔ یہ کام ذاتی رابطے کے حوالے سے ہونا چاہئے۔ کسی معین شخص سے وقت لے کر ملاقات کرے۔ پمفلٹ کے ذریعہ کیسٹ اور کتابوں کے ذریعہ دعوتی کام کو بڑھائے۔ ناظم اعلیٰ ۲۶/ اگست کو پھر تشریف لائیں گے اور وہ دیئے گئے ہدف پر جو کچھ کام ہوا ہے اس کا جائزہ لیں گے
نقیب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اسرہ کے ہر رفیق سے کم از کم ایک تفصیلی ملاقات کرے۔ اپنے اسرہ کے ہر رفیق کے کوائف فارم کا ضرور مطالعہ کرے۔ پھر ہر نقیب اپنے گھر میں بیعت فارم فریم کرا کر آویزاں کرے تاکہ اس کے عزیز و اقارب اس کے حوالے سے اسے جانیں۔ نیز یہ کتبہ اس کے خاندان میں دعوت کا نقطہ آغاز بنے۔
امیر محترم کی کتاب "اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل" ـــــــ کا مطالعہ ہر نقیب کے ذمہ ہے۔ ۲۶/ اگست کو ہونے والے اجتماع میں اس پر سوال و جواب ہوں گے لہٰذا اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ احتسابی رپورٹ کے حوالے سے بھی گفتگو رہی، نقباء اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے نیز اپنی مشکلات بھی بیان کیں بعض نے اپنے تجربات سے آگاہ کیا۔ تنظیم سے دلچسپی کا یہ ایک پیمانہ ہے۔ ایک شخص اگر یہ مختصر رپورٹ ہفتہ میں ایک بار پر نہیں کر سکتا تو یہ بڑی تشویش کی بات ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے یہ رپورٹ عریاں کر دیتی ہے۔ خصوصاً نمازوں کے بارے میں یا اوقات کار کے فراغت کے بارے میں۔ اسے سوچنا چاہئے کہ اس رپورٹ کی حیثیت ایک نگران یا چوکیدار کی ہے جو مجھے بیدار رکھتی ہے اور کام پر آمادہ رکھنے کا داعیہ ابھارتی ہے یہ تو میرے بڑے کام کی چیز ہے۔
عصر سے عشاء تک کا وقت "تنظیم اسلامی میں فکری اختلاف اور اس کا حل" کے موضوع پر صرف کیا گیا۔ دنیا کی کوئی اجتماعیت اختلاف رائے سے نہیں بچ سکتی۔ پتھر کی مورتیوں میں تو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ جہاں جہاں انسان پایا جائے گا وہاں وہاں اختلاف موجود ہو گا۔ خواہ وہ چھوٹے سے چھوٹا خاندان ہو یا بڑی سے بڑی اجتماعیت۔ صرف دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس اجتماعیت نے اختلاف کو حل کرنے کے لئے کون سی تدبیر اختیار کی ہے۔ تنظیم اسلامی وہ واحد انقلابی جماعت ہے کہ جس نے پہلے ہی دن سے اختلاف کے حل کے لئے چینل مقرر کر دیئے ہیں اور اپنے نظام العمل میں اسے شامل کیا ہے۔ نقیب سے لے کر ناظم اعلیٰ تک جتنے بھی درجات ہیں وہ یکے بعد دیگرے ہر شکایت کے ازالہ کے لئے ہمہ تن تیار رہتے ہیں۔ امیر تنظیم نے بھی اپنا دروازہ اس مقصد کے لئے ہر وقت کھلا رکھا ہے تاکہ جسے بھی کوئی شکایت ہو وہ آئے وہ اس کے لئے چشم براہ ہیں۔ اس کے علاوہ سال میں دوبار توسیعی مشاورت کے نام سے اجتماع بلایا جاتا ہے جس میں ہر

رفیق آزادی سے اپنی بات بیان کر سکتا ہے۔ وہ بات خواہ امیر محترم کے خلاف ہو، تنظیم کی پالیسی سے متعلق ہو یا اراکین مشاورت کے خلاف ہو۔ اس کے اظہار پر کوئی ملامت نہیں کی جاتی۔ سکون سے اس کی پوری بات سنی جاتی ہے اور امیر محترم اگر ضروری سمجھیں تو فوری طور پر یہ وضاحت کر دیتے ہیں۔ اس طرح اشکالات رفع ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ کار میری معلومات کی حد تک پاکستان میں کسی بھی جماعت نے اختیار نہیں کیا ہے۔ یہ کوئی آسان کام بھی نہیں ہے۔ اجتماعیت کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ایسا کرنا ازبس ضروری تھا۔ اس لئے کہ جس کام کے لئے یہ تنظیم قائم ہوئی ہے وہ بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ انبیاء کی راہ ہے۔ حضور ﷺ ہی کا تو یہ نقش قدم ہے جس پر چلنے کی یہ ادنیٰ کوشش جاری ہے۔ اجتماعیت میں قوت اسی وقت آتی ہے جب اس میں شامل ایک ایک فرد کا ذہن صاف ہو، یہ سودا ہی وہ ہے کہ جس کے سر میں سما گیا وہ کامیاب ہو گیا۔ رفقاء میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے خیالات کی صفائی ضروری ہے۔

مومن کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے۔ وہ ہاتھ پکڑ کر ہمیں راہ حق سے تو نہیں موڑ سکتا البتہ ذہن میں وساوس ڈالتا ہے اور دل میں پھونکیں مارتا ہے تاکہ اس راہ کا راہی بد دل ہو جائے۔ ان وساوس کو دور کرنے کے لئے یہ اجتماعات نہایت اہم ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں غلط افکار کی صفائی ہوتی ہے اور ساتھیوں کو ایک نیا عزم سفر ملتا ہے۔ جس طرح امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر کی حیثیت مسلم ہے اسی طرح غلط افکار کی کانٹ چھانٹ تنظیم کے ذمہ داروں پر واجب ہے۔

حضور ﷺ سے بڑھ کر نہ کوئی داعی ہو سکتا ہے نہ کوئی معلم، اس اخلاص کے پیکر کے ساتھ بھی لوگوں نے اپنے سینوں میں بدگمانیاں جمع کر لی تھیں تو اس دور کا بڑے سے بڑا مصلح کس گنتی شمار میں آتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بعد میں آنے والوں کے لئے رہنمائی کہاں سے ملتی۔ قرآن نے ایسے لوگوں کے بارے میں صرف اشارات ہی نہیں دیئے ہیں بلکہ بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ اس لئے کہ ایسے لوگ اجتماعیت کے لئے سم قاتل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کھلے دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ مارِ آستین کبھی ناصح کے روپ میں آتے ہیں۔ کبھی بڑے خیر خواہ بن جاتے ہیں۔ ان کے چہرے بشرے سے ان کا خبثِ باطن عیاں ہوتا ہے۔ یہ بے خبر لوگوں کا شکار کرتے ہیں، اس اجتماعیت سے بدظن کرتے ہیں اور اس عظیم مقصد سے انحراف کے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ اس سے بچنے کا ازبس طریقہ یہی ہے کہ ہمارا تصور واضح ہو۔ ہمارے فکر میں کوئی ابہام نہ ہو۔ کوئی بات ڈھکی چھپی نہ ہو اور رفقاء کو اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے اشکالات پیش کرنے کی کھلی اجازت ہو بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس طرح اس کا سدباب کیا جا سکتا ہے جس کے لئے تنظیم نے پہلے ہی سے ایسے چینل مقرر کر دیئے ہیں۔ ○○

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد: ۴۳
شمارہ: ۱۲
رجب المرجب ۱۴۱۵ھ
دسمبر ۱۹۹۴ء
فی شمارہ ۷/-
سالانہ زرِتعاون ۷۰/-

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرِتعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۴۵ سعودی ریال یا ۱۲ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔	۱۶ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۲۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر	۹ امریکی ڈالر

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰- فون: ۳-۸۵۶۰۰۴-۸۵۶۰۰۲

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی- فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

تنظیم اسلامی کا انیسواں سالانہ اجتماع حسب پروگرام ۲۱ تا ۲۴ اکتوبر قرآن اکیڈمی لاہور میں منعقد ہوا۔ شرکاء کی تعداد' نظم و ضبط کے عمدہ مظاہرے اور حسن انتظام کو دیکھتے ہوئے یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یہ اجتماع سابقہ تمام اجتماعات سے بہت بہتر تھا اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ بحمد اللہ ہمارے قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ اجتماع' خصوصی اور عمومی اجتماعات کے امتزاج کا ایک حسین مرقع تھا۔ اجتماع کے پہلے ہی روز شام کے اوقات میں جلسہ خلافت اور خلافت ریلی کے پروگرام نہایت متاثر کن اور بھرپور تھے۔ تنظیم کی تاریخ میں سالانہ اجتماع کے ساتھ اس نوع کے پروگراموں کا انعقاد پہلا تجربہ تھا جو اللہ کے فضل و کرم سے نہایت کامیاب رہا۔ رفقاء کا ذوق و شوق اور جوش و خروش دیدنی تھا۔ اجتماع کے دوران نوجوان مقررین کی تقریریں بھی نہایت ولولہ انگیز تھیں اور یہ بات نہایت قابل اطمینان ہے کہ ان کا تصور دین اور انقلابی فکر جو صد فی صد قرآن و سنت سے مستعار ہے' صحت' توازن اور پختگی کے معیارات پر پورا اترتا تھا۔ فالحمدُ للہ علیٰ ذٰلک!

عمومی نوعیت کا دوسرا پروگرام وہ تھا جس میں ان دینی جماعتوں کے قائدین اور سربراہان کو دعوت خطاب دی گئی تھی جو انتخابی سیاست سے کنارہ کش رہتے ہوئے پاکستان میں غلبہ و اقامت دین کے عظیم مشن کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ ان قائدین سے ہماری فرمائش یہ تھی کہ وہ اپنے اپنے منہج عمل کو واضح طور پر رفقائے تنظیم کے سامنے رکھیں تاکہ رفقاء کو ان کے خیالات کو سننے اور طریق کار کو جاننے کا موقع مل سکے۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ رفقاء کے قلب و نظر میں وسعت پیدا ہو' وہ اپنے طریق کار پر بھی از سر نو غور کریں' دیگر جماعتوں کے طریق کار سے اس کا موازنہ کریں اور اس موازنے کی روشنی میں اگر اپنے طریق کار میں اصلاح اور بہتری کی گنجائش نظر آئے تو بلا جھجک اس اصلاح کو قبول کریں۔۔۔ اور اگر یہ محسوس ہو کہ ہمارا اختیار کردہ طریقہ ہی دینی مزاج سے ہم آہنگ اور سنت و سیرت سے قریب تر ہے تو اس پر اللہ کا شکر بجا لائیں۔ الحمد للہ کہ اس پروگرام کے بہت اچھے اثرات محسوس کئے گئے۔ جن دینی جماعت کے قائدین نے تشریف لا کر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ان میں تنظیم الاخوان کے مولانا محمد اکرم اعوان' تحریک دعوت و ایثار کے حافظ محمد سعید' تحریک اسلامی انقلاب کراچی کے سید جمال الدین کاظمی اور

تحریک فہم قرآن کے میجر محمد امین منہاس کے علاوہ حزب التحریر کے قائدین میں سے جناب جمال ہارووڈ اور جناب فرید قاسم بھی شامل تھے۔ یہ دونوں حضرات ہماری دعوت پر برطانیہ سے تشریف لائے تھے۔ اس سالانہ اجتماع اور اس کے پروگراموں کی مفصل روداد ندائے خلافت کے ۱۵/ نومبر کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ تاہم زیر نظر شمارے میں بھی اس کی ایک مختصر رپورٹ شائع کی جاری ہے جسے تنظیم اسلامی پاکستان کے معتمد جناب چوہدری غلام محمد صاحب نے مرتب کیا ہے۔ علاوہ ازیں امیر تنظیم کا وہ مختصر تمہیدی خطاب بھی شامل اشاعت کیا گیا ہے جو انہوں نے اس عمومی نشست کے آغاز میں ارشاد فرمایا تھا جس میں دوسری دینی جماعتوں کے قائدین کو مدعو کیا گیا تھا' کہ اس سے اس پروگرام کی اہمیت اور اس کے مقاصد پر وضاحت سے روشنی پڑتی ہے۔

☆ ☆ ☆

سالانہ اجتماع اور اس سے متعلق مصروفیات سے فراغت کے بعد وسط نومبر میں امیر تنظیم اسلامی نے اپنے دائیں گھٹنے کا آپریشن کروالیا ہے جو گزشتہ کئی ماہ سے موخر ہوتا چلا آرہا تھا۔ گزشتہ کئی سالوں سے گھٹنے میں مسلسل تکلیف کے باعث یہ قدم اٹھانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اللہ کا فضل واحسان ہے کہ یہ مرحلہ خیریت سے گزر گیا۔ اس کے بعد بمشکل چند دن آرام کے بعد امیر محترم کی مصروفیات ع "رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور" کے مصداق یکلخت پھر بہت بڑھ گئی ہیں۔ آپریشن کے ایک ہفتے بعد ہی کراچی کا سفر درپیش ہوا۔ کراچی کے تین روزہ دورے کے بعد لاہور میں صرف ایک دن قیام رہا اور وہ بھی ہفتے کی شام کے درس قرآن کے لئے' اور پھر سکردو کے دو روزہ دورے کے لئے روانگی ہو گئی جہاں آرمی آفیسرز کے ایک تربیتی کیمپ سے خطاب کی پرزور دعوت موصول ہوئی تھی۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ امیر محترم کی صحت و سلامتی کے لئے خصوصی طور پر دعا کریں۔

☆ ☆ ☆

ملکی حالات کے بارے میں تنظیم اسلامی کے موقف اور امیر تنظیم کے تبصرے سے رفقاء و احباب کو آگاہ رکھنے کی خاطر ۴/ نومبر' ۱۱/ نومبر' اور ۱۸/ نومبر کے خطابات جمعہ کے پریس ریلیز زیر نظر شمارے میں شامل کر دیئے گئے ہیں جن سے ہمارے موقف کی صحیح صحیح عکاسی ہوتی ہے۔ مالاکنڈ میں نفاذ شریعت کی کوشش گزشتہ ماہ کا ایک اہم واقعہ تھا' اس پر امیر تنظیم اسلامی کا تبصرہ بھی ۱۱/ نومبر کے پریس ریلیز میں شامل ہے۔ OO

"انقلابی تحریک کے کارکنوں کے لئے

احیائی عمل کے مختلف گوشوں کا شعور

ضروری ہے"

اواخر اکتوبر میں منعقد ہونے والے تنظیم اسلامی کے انیسویں سالانہ اجتماع کے موقع پر شام کی نشستوں میں ان مختلف دینی جماعتوں کے سربراہوں کو بھی دعوتِ خطاب دی گئی تھی' جو انتخابی سیاست سے کنارہ کش رہتے ہوئے غلبۂ دین کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ اسی موقع پر امیر تنظیم اسلامی نے اپنے تمہیدی کلمات میں اس نوع کی مجالس کی اہمیت اور ان کے انعقاد کے مقاصد پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی۔ افادۂ عام کی خاطر امیر تنظیم کے ان تمہیدی کلمات کو ٹیپ کی ریل سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد فرمایا :

مہمانانِ گرامی' رفقائے تنظیم اسلامی اور معزز اراکین! ہمارے آج کے اس اجلاس کی ایک خصوصی نوعیت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے اس کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ تنظیم اسلامی کے انیسویں سالانہ اجتماع کا موقع ہے۔ اور یہ چیز عام روش کے خلاف ہے کہ کسی دینی تحریک یا جماعت کے اس طرح کے سالانہ اجتماع میں جہاں اس کے ارکان اور کارکن جمع ہوں کچھ دوسرے اصحابِ فکر یا اصحابِ دعوت کو خطاب کے لئے مدعو کیا جائے۔ لیکن بحمد اللہ کہ ہمارا یہ طرزِ عمل رہا ہے' بلکہ اگر میں یہاں "ہمارا" کے بجائے "میرا" کا لفظ استعمال کروں تو زیادہ صحیح ہو گا۔ میں نے جب سے لاہور میں اس اجتماعی کام کی داغ بیل ڈالی ہے اسی وقت سے میرا ذہن یہ رہا ہے' اور اس کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ہے' کہ ہمیں حتی الامکان کوشش کرنی چاہئے کہ ہم کسی ایک کنویں کے مینڈک بن کر نہ رہ جائیں کہ یہ سمجھ لیں کہ بس ہم ہی ہم ہیں' بلکہ پیش نظر یہ رہنا چاہئے کہ یہ امتِ مسلمہ بڑی وسیع و عریض ہے اور اس میں احیائی عمل کے بھی مختلف گوشے ہیں۔ ہمیں اس کا شعور ہونا چاہئے کہ کس کس گوشے میں کون کون سی

قوتیں بر سر کار ہیں۔ اگرچہ انسان کا اپنا ایک تنقیدی اور ناقدانہ جائزہ بھی ہوتا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ لاعلمی اور لاتعلقی کا نتیجہ تو جہالت ہے' اور وہ خود ان تحریکوں کے حق میں مضر ہے۔

ہم نے آج کے اس اجتماع کی تشہیر کے لئے جو ہینڈ بل تقسیم کیا ہے اس سے ہمارا ذہن پہلے ہی سامنے آچکا ہے' تاہم اس اجتماع کی جو افادیت میرے پیش نظر ہے میں اس کی طرف چند مزید اشارات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا ایک پہلو تو خارجی اور عوامی ہے' چنانچہ "ہینڈ بل" میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ عبارت کا آغاز ہی اس جملے سے ہوا تھا: "عوام کو شکایت ہے کہ مذہبی جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہوتیں"۔ اس تأثر کے ازالے کے لئے ہم اس نوعیت کے اجتماعات منعقد کر رہے ہیں۔ آپ کے علم میں ہے کہ ملکی و عوامی سطح پر عوام کو یہ شدید شکایت ہے' خاص طور پر انتخابات میں جب مذہبی جماعتیں ناکام ہوتی ہیں تو اس کے اسباب کے تجزیئے میں جو بات سب سے بڑھ کر سامنے آتی ہے وہ یہی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس تأثر کا ازالہ بھی احیائی عمل کے لئے بہت ضروری ہے۔ لوگوں کے سامنے یہ بات آنی چاہئے کہ ہم مل جل کر بیٹھ سکتے ہیں' ایک دوسرے کی بات سن سکتے ہیں' ہمارے مابین گفت و شنید اور افہام و تفہیم ہو سکتی ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر ایک خارجی مقصد کی حیثیت سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ لیکن میرے نزدیک ایسے اجتماعات کا اصل مقصد داخلی ہے۔ تنظیم اسلامی کے حوالے سے میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ میرے رفقاء کو "Exposure" ملے اور دوسرا فکر بھی ان کے سامنے آئے۔ انہیں معلوم ہو کہ دوسرے لوگ کیا کہہ رہے ہیں' ان کا نقطۂ نظر کیا ہے' ان کا تجزیہ کیا ہے' امت کے امراض کے ضمن میں ان کی تشخیص کیا ہے اور وہ ان کا کیا علاج تجویز کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھیوں کو دائیں بائیں' آگے پیچھے دیکھ کر چلنا چاہئے۔ اس سے تین مقاصد حاصل ہوں گے۔

اولاً یہ کہ ان کے اپنے ذہن کو وسعت حاصل ہوگی۔ ہوتا یہ ہے کہ ہر داعی' ہر امیر اور ہر لیڈر اپنے کارکنوں کو دوسروں کے نقطۂ نظر سے آگاہ کرنا پسند نہیں کرتا' بلکہ وہ تو انہیں الٹا بچا بچا کر رکھتا ہے کہ میری یہ بھیڑیں کسی اور بھیڑیئے کی زد میں نہ آجائیں' ان کے

کانوں میں کوئی اور خیال نہ پڑ جائے، کوئی اور فکر ایسا نہ ہو جو انہیں اپنے فکر سے غیر مطمئن کر دے، حالانکہ میرے نزدیک اس کے لئے سب سے ہلکا لفظ "کم نظری" یا "Short-Sightedness" ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

"دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید"

اگر ہمارے سامنے واقعتاً امت کی بہبود پیش نظر ہے، اسلام کا احیاء اور دنیا میں نظامِ خلافت کا دوبارہ قیام پیش نظر ہے تو ہمیں اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں ہر چہار طرف اچھی طرح دیکھ بھال کر افہام و تفہیم کے ساتھ چلنا چاہئے۔

ثانیاً یہ کہ بہرحال اب نبوت کو ختم ہوئے چودہ سو برس ہو گئے ہیں، اب جو کوشش بھی ہے وہ اجتہادی ہے۔ واضح رہے کہ یہاں میں لفظ اجتہاد فقہی اصطلاح کے طور پر نہیں بول رہا ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ ہر دور میں کچھ صاحبِ درد اشخاص اٹھتے ہیں۔ تو اپنے دل میں دین و ملت کا اور امت کا درد رکھنے والا ہر ایسا شخص سوچے گا، غور کرے گا تو کوئی تشخیص، کوئی تجویز پیش کرے گا، جیسا کہ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں بڑے سادہ انداز میں امت کے مرض کی تشخیص بھی کی ہے اور اصلاح کے لئے نسخہ بھی تجویز کیا ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اسی طرح ان کے فارسی اشعار میں تجزیہ بھی ہے، تجویز بھی ہے۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

تو ہر صاحبِ درد جو بھی امت کا بہی خواہ ہے، دین اور ملت کا خیر خواہ ہے اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وفادار ہے اس کی اپنی تشخیص اور تجویز ہو گی۔ اور ظاہر بات ہے کہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے، جس میں غلطی کا امکان ہے۔ بڑے سے بڑا مجتہد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میرا اجتہاد خطا سے پاک ہے۔ بلکہ اصول یہ ہے کہ مجتہد اگر مصیب ہے یعنی صحیح رائے تک

پہنچ گیا ہے تو اسے دوہرا اجر ملے گا' لیکن اگر کسی مجتہد نے واقعتاً اجتہاد کی شرائط پوری کی ہوں اور اپنی پوری کوشش کے باوجود اس سے خطا ہو گئی ہو تب بھی اسے اکہرا ثواب تو ملے گا۔ چنانچہ ہم میں سے کسی کو بھی اس امکان کو کبھی "Rule-out" نہیں کرنا چاہئے کہ ہمارے فکر میں خامی ہو سکتی ہے' محدودیت ہو سکتی ہے' لہٰذا کسی طرف سے ہمیں غذا مل جائے تو وہ ہماری ضرورت ہے' جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
"اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ ھُوَ اَحَقُّ بِھَا حَیْثُ وَجَدَھَا" یعنی "حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے' وہ اسے جہاں کہیں بھی پائے اس کا زیادہ حقدار ہے۔" اور اگر ہم اس سے اپنے کان بند کر لیں' آنکھیں بند کر لیں تو نقصان اپنا ہی کریں گے' کسی اور کا نہیں۔ بہرحال ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے فکر میں اگر کوئی کجی ہے' لائحہ عمل میں اگر کوئی غلطی ہے' تجزیہ و تشخیص میں ہم سے کوئی خطا ہو گئی ہے تو ہماری غلطی ہم پر واضح کی جائے۔ ہم ان حضرات کے ممنون ہوں گے جن کی توجہ دلانے کی وجہ سے ہم اپنی غلطیوں یا خامیوں سے متنبہ ہو جائیں اور ان کی اصلاح کر سکیں۔

ثالثاً یہ کہ بہت سے حضرات کو سننے کے باوجود بھی اگر ہمارے کارکن مطمئن ہوں اور اللہ کا شکر ادا کریں کہ ہماری بات صحیح ہے تو اس سے ان میں خود اعتمادی مزید بڑھے گی اور یہ خود اعتمادی ہمارے قدم آگے بڑھانے میں ممد ہو گی۔

بہرحال یہ تین داخلی مقاصد ہیں' جبکہ خارجی مقصد' جیسا کہ میں نے عرض کیا' وہ یہ ہے کہ امت میں جو یہ تأثر عام ہے کہ مذہبی جماعتیں تفرقے کے شکار ہیں اس کو زائل کیا جائے اور یہ کہ ہم لوگ مل جل کر بیٹھیں اور ایک دوسرے کی بات تحمل کے ساتھ سنیں۔ اس ضمن میں مَیں توجہ دلانا چاہتا ہوں اور بہت سے حضرات اس سے واقف ہوں گے کہ میں نے اجتماعی سطح پر پہلے قدم کے طور پر جب ۱۹۷۲ء میں انجمن خدام القرآن قائم کی تو اگلے ہی سال یعنی ۷۳ء میں سالانہ قرآن کانفرنسوں کا آغاز کیا' جن کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی تھی کہ دیوبندی' بریلوی' اہل حدیث غرض ہر مکتبِ فکر کے علماء کرام اور ان کے ساتھ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے علومِ اسلامیہ کے ماہرین اور جدید دانشور حضرات کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا گیا۔ اور یہ منظر سالہا سال تک ہماری قرآن کانفرنسوں کے اندر

یکھا گیا' حالانکہ اس کے سوا اگر یہ منظر کبھی نظر آیا ہو تو کسی سیاسی مہم کے اندر ہی ہو سکتا ہے جب مل جل کر کسی کی ٹانگ گھسیٹنی مقصود ہو۔ جیسا کہ ہمارے ہاں ایوب خان اور بھٹو ی ٹانگ گھسیٹنے کے لئے ہوا۔ ایسے مواقع پر تو ہماری مذہبی جماعتیں سیکولر قوتوں کے ساتھ ی ایک پلیٹ فارم پر نظر آسکتی ہیں' لیکن سب جانتے ہیں کہ کسی دینی کام میں اس طریقے سے ان مکاتبِ فکر کو کبھی جمع نہیں دیکھا گیا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ "یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری!" اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی یق عطا فرمائی فَلِلّٰہِ الحَمْدُ وَالمِنَّۃ۔

پھر خاص طور پر آج سے قریباً دس سال قبل تنظیم کے سالانہ اجتماع کے موقع پر میں نے مختلف مکاتیبِ فکر کے علماء کو جس طرح اپنا پلیٹ فارم مہیا کیا اس کی میری زندگی میں اور مت سے لوگوں کے کہنے کے مطابق شاید تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ یہ مارچ ۸۵ء کی بات ہے جب تنظیم اسلامی کے "دس سالہ اجتماع" کے موقع پر ہم نے مسلسل چھ روز تک شام کے اوقات میں محاضراتِ قرآنی کا انعقاد کیا' جس کا موضوع "فرائضِ دینی کا جامع تصور" غا۔ میرے نزدیک مسلمانوں کو ان کے دینی فرائض کے جامع تصور سے آگاہ کرنا بہت ہی ہم ہے۔ ہمیں ان میں یہ شعور پیدا کرنا چاہئے کہ ہمارے دینی فرائض صرف نماز روزہ تک ی محدود نہیں ہیں بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرض ہے' اقامتِ دین کی جدو ہد فرض ہے۔ بہرحال میں نے محاضرات کے انعقاد سے ایک ماہ قبل اس موضوع پر چھ فحات پر مشتمل ایک نہایت مختصر تحریر (جو اَب "تعارفِ تنظیم اسلامی" نامی کتابچے میں امل ہے) تقریباً ایک سو علماء کو اس درخواست کے ساتھ بھیجی کہ یہ میرے مطالعے کا حاصل ہے' اس میں آپ کو جو غلطی' خطا یا خامی محسوس ہو' محاضرات میں تشریف لا کر اس پر تنقید یجئے اور اگر اس میں کوئی صواب کی بات ہے' صحیح اور درست بات ہے تو اس کی تائید یجئے۔ چنانچہ یہ محاضرات چھ روز تک جاری رہے اور اس دوران میں اور تنظیم اسلامی کے رفقاء صرف سامع کی حیثیت سے موجود رہے۔ بعض ایسے حضرات بھی آئے جنہوں نے استہزاء کیا' خود میرے پلیٹ فارم سے' میری موجودگی میں' میرا مذاق اڑایا۔ لیکن یرے ساتھیوں نے ان سب کو پوری توجہ سے اور پورے تحمل سے سنا۔ مجال ہے کہ کوئی

آواز تک اٹھی ہو۔ اپنے لئے تو میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ میں کوئی سوال بھی نہیں کروں گا' البتہ ساتھیوں کو اجازت تھی تو صرف سوال کرنے کی' اس سے زائد کسی بحث یا اختلاف کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں یہ ہدایت تھی کہ یہ علماء کرام ہیں' اصحابِ قدر ہیں' اصحابِ علم ہیں' ان کی بات توجہ اور تحمل سے سنیں! ہاں اگر کسی کی کوئی بات سمجھ نہیں آئی ہے تو اس کے لئے خالصتاً استفہامی انداز میں سوال کریں۔ تو الحمد للہ چھ دن متواتر یہ کام ہوا ہے۔

آج بھی در حقیقت یہ اسی نوعیت کی ایک نشست ہے۔ البتہ اس کا "Format" یا "Scope" میں نے محدود کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اقامتِ دین یا نظامِ خلافت کے قیام کے لئے طریقہ کار کیا ہونا چاہئے! الحمد للہ امت کے معتد بہ طبقے میں اس کا شعور تو پیدا ہو چکا ہے کہ ہمارا دین صرف عبادات اور رسومات کا مجموعہ نہیں ہے' یہ پورا نظام زندگی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کا نفاذ کیسے ہو "How to bell the cat?" اگر بلی کے گلے میں گھنٹی باندھ دی جائے چوہوں کے سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ باندھے کون؟ باندھی کیسے جائے؟۔ اس اعتبار سے ہم نے مختلف تحریکوں کے قائدین کو دعوت دی ہے۔ ویسے تو مفکرین بہت سے ہیں' لاکھ حکیم سر بجیب' لیکن ہم نے دعوت انہی کو دی ہے جنہوں نے اس وادی میں کوئی عملی کام کیا ہے' اور کسی نہ کسی سطح پر کوئی نہ کوئی اجتماعی جدّوجہد شروع کی ہے' ورنہ اکھاڑوں کے کنارے بیٹھ کر داؤ پیچ بتانا بڑا آسان کام ہے۔ اسی طرح حکیمانہ انداز میں فلسفیانہ اور دانشورانہ گفتگو کرنا بھی آسان کام ہے۔ لہٰذا ایسے مفکرین سے دامن کش رہتے ہوئے ہم نے صرف ان اصحابِ فکر کو دعوت دی ہے جو اس عملی میدان میں اتر چکے ہیں اور کچھ نہ کچھ کام کر رہے ہیں' ان کا کام خواہ چھوٹا ہے یا بڑا ہے' محدود ہے یا وسیع ہے' اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔

پھر ہم نے ان حضرات کو بھی زحمت نہیں دی جو انتخابی سیاست کے ذریعے تبدیلی لانے کے خواہاں ہیں' کیونکہ میرے نزدیک یہ دونوں راستے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ انقلاب کے تقاضے کچھ اور ہیں' اس کے لئے پہلے افراد چاہئیں' ان کی کردار سازی اور سیرت سازی ہونی چاہئے' پھر ایک مضبوط جماعت چاہئے' جبکہ الیکشن کے لئے صرف ووٹ چاہئیں' جن کے حصول کے لئے عوام کو دکھانے کے لئے سبز باغ چاہئیں' جھوٹے وعدوں

کے طومار چاہئیں۔ کسی الیکشن میٹنگ میں جو لوگ آئے ہوں آپ ان پر تنقید کی جرأت کر سکتے ہیں؟ ان سے تو آپ نے ووٹ مانگنا ہے۔ تو یوں سمجھ لیجئے کہ یہ بُعد المشرقین والا معاملہ ہے، بلکہ بُعد المشرقین میں تو صرف فاصلہ سامنے آتا ہے، یہاں تو سمتیں ہی متضاد قسم کی ہیں۔ لہٰذا ہم نے صرف ان حضرات کو دعوت دی ہے جو اس کے مدعی ہوں کہ ہم انقلابی سطح پر کام کر رہے ہیں اور ہمارے سامنے ایک لائحہ عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے پاکستان سے ان چار اداروں یا جماعتوں کے سربراہوں، کو دعوت دی ہے جو انتخابی سیاست سے الگ رہ کر کام کر رہی ہیں۔ ان میں ایک تنظیم "الاخوان" حال ہی میں منظرعام پر آئی ہے۔ اس کے امیر مولانا محمد اکرم اعوان صاحب ہیں، جو اس سے پہلے صرف سلسلۂ تصوف کے حوالے سے معروف تھے، لیکن اب انہوں نے "تنظیم الاخوان" کا سلسلہ شروع کیا ہے، جس کا نعرہ ہے "رب کی دھرتی رب کا نظام۔" وہ ہماری دعوت پر ان شاء اللہ کل تشریف لائیں گے۔ مولانا مفتی صاحبزادہ سید جمال الدین کاظمی تشریف لاچکے ہیں، جو تحریک اسلامی انقلاب پاکستان کے امیر اور داعی ہیں۔ ان کی ایک دو کتابیں بھی میری نظر سے گزری ہیں اور ان کے بعض مضامین ہم نے میثاق میں بھی شائع کئے ہیں۔ معروف اعتبار سے اِس وقت دنیا میں ہمارے جو مسلکی عنوانات ہیں، ان کے اعتبار سے میں پورے یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا، لیکن شاید معروف یہ ہے کہ بریلوی مکتب فکر کے علماء میں سے ہیں۔ تیسرے اس کے بالکل برعکس جو اہل حدیث مکتب فکر ہے ان میں مرکز الدعوۃ والارشاد والے حضرات وہ ہیں جو کہ جمعیت اہل حدیث یا جماعت اہل حدیث کے برعکس انتخابی سیاست میں ملوث نہیں ہیں، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب جہاد کے ذریعے آئے گا۔ ان کے قائد پروفیسر محمد سعید صاحب بھی ان شاء اللہ کل آئیں گے۔ آج کی نشست میں پاکستان سے ہمارے دوسرے مقرر دراصل میجر محمد امین منہاس تھے، جنہوں نے تحریک فہم القرآن شروع کی ہے۔ پہلے میرا ارادہ انہیں بلانے کا نہیں تھا، لیکن حال ہی میں مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے بھی ایک تنظیمی سلسلہ شروع کر دیا ہے اور وہ بیعت بھی لے رہے ہیں، گویا جو Criteria میں نے مقرر کیا تھا اس پر وہ پورے اترتے ہیں، لہٰذا ہم نے انہیں بھی دعوت دی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج جس طیارے سے ان کی ریزرویشن تھی

وہ اس میں سوار نہیں ہو سکے' دوسری فلائٹ میں امید دلائی گئی لیکن جگہ نہیں ملی' پھر تیسری میں بھی جگہ نہیں ملی اور اب وہ سڑک کے راستے اسلام آباد سے روانہ ہو چکے ہیں اور اس وقت کہیں راستے میں ہیں۔ بہرحال اگر وہ آج پہنچ گئے تو آج ورنہ کل ان شاء اللہ وہ بھی خطاب فرمائیں گے۔

ان کے علاوہ بیرون ملک سے ہم نے "حزب التحریر" کے اصحاب کو شرکت کی دعوت دی تھی' اور ہماری دعوت پر لبیک کہتے ہوئے وہاں سے چار حضرات تشریف لائے ہیں۔ آپ کے علم میں ہے کہ میں نے ابھی ڈھائی ماہ قبل ۷/ اگست کو لندن میں حزب التحریر کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی عالمی احیاءِ خلافت کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ پاکستان واپسی پر میں نے اپنے دو خطاباتِ جمعہ میں حزب التحریر کے بارے میں اپنے تاثرات قدرے تفصیل سے بیان کئے تھے جو میثاق کے دو شماروں میں شائع بھی ہو گئے۔ ان میں مَیں نے جن تائیدی باتوں کا اظہار کیا وہ بھی آچکی ہیں اور جو تنقیدی باتیں ہیں وہ بھی آچکی ہیں۔ کل میں نے تقریباً ساڑھے چار ماہ بعد جنگ میں اپنا کالم اسی لئے شائع کروایا' کیونکہ یہ حضرات آرہے ہیں تو بڑے پیمانے پر ان کا تعارف ہو جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ شائع ہو گیا۔ لندن کی خلافت کانفرنس کی کچھ روداد اور تصویری جھلکیاں ندائے خلافت کے دو تین پرچوں میں شائع ہوتی رہیں۔ انہیں یکجا کر کے ندائے خلافت کی ایک خصوصی اشاعت کے طور پر بڑی جلدی سے تیار کیا گیا ہے' تاکہ آپ حضرات کے سامنے وہاں کا معاملہ بھی آجائے۔ بہرحال ان حضرات کے تفصیلی تعارف کی ذمہ داری میں نے اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد کی لگائی ہے جو اس سال بیرونی سفر میں میرے ساتھ تھے اور اس کانفرنس میں بھی شریک تھے' بلکہ وہ ان حضرات کے ساتھ اس پریس کانفرنس میں بھی موجود تھے جس کا فوٹو وہاں کے اخبارات میں چھپا ہے' اور ندائے خلافت کی اس خصوصی اشاعت میں بھی شائع کیا گیا ہے۔ یہ حضرات بھی تھے' فرید قاسم صاحب تھے' جمال ہاروڈ صاحب تھے' باقی جو حضرات تھے ان سب سے میں متعارف نہیں ہوں۔ ہمارے اِس اجتماع میں شرکت کے لئے چار حضرات کے یہ قافلہ انگلستان سے چل کر یہاں پہنچا ہے۔ میرے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کا عطیہ ہے۔ میں توقع نہیں رکھتا تھا کہ یہ لوگ اتنی ہمت کریں گے' کیونکہ میں اپنی

یثیت سمجھتا ہوں نہ اپنی جماعت یا تحریک کا یہ مقام سمجھتا ہوں۔ بہرحال میں ان حضرات
ِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں "مَن لَم یَشکُرِ النَّاسَ لَا یَشکُرِ اللّٰہَ" ۔ میرے
ں احساسات کو انگریزی الفاظ کا جامہ پہنا کر ان کی خدمت میں برادر عزیز ابصار احمد رکھ
ں گے۔

اب میں تین باتیں مقررین حضرات سے کہنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جہاں
۔ اسلامی انقلاب یا نظامِ خلافت کی اہمیت' اس کی ضرورت اور اس کے لئے ترغیب و
یق کا تعلق ہے اس پر وقت ضائع نہ کیا جائے 'کیونکہ یہاں وہ لوگ جمع ہیں جو اس قافلے
پہلے سے شریک ہیں' جنہوں نے اس منزل کو پہلے سے پا لیا ہے' لہٰذا اگر اس پر وعظ کا
ل چڑھا تو ہمارا وقت ضائع ہو گا' ہمیں Down to the ground بات کرنی
ہئے کہ اس کے لئے طریقہ کار کیا ہونا چاہئے۔ سارا زور اسی پر ہونا چاہئے اور ظاہر بات
، کہ جب ہمارے لئے ہر اعتبار سے اسوہ حضور ﷺ ہیں تو ہمیں پھر وہیں سے استنباط کر
، دکھایئے کہ یہ طریقہ ہے! چنانچہ گفتگو کے دوران ساری توجہ اسی پر مرکوز رہنی چاہئے
، طریقہ انقلاب کیا ہے۔ اسی کو ہم نے دعوت نامے میں شامل کیا تھا اور واضح کر دیا تھا۔

دوسری بات یہ کہ اپنی بات مثبت طور پر پیش کرنے کی کوشش فرمائیں' دوسرے
رین پر تنقید اور جواب الجواب کے سلسلے کی ضرورت نہیں۔ ہر مقرر کو اپنی ہی بات
احت کے ساتھ کہنی چاہئے۔

تیسری بات یہ کہ اس پروگرام میں میری حیثیت صدر کی نہیں' میزبان کی ہے۔ میری
ت' میرا فکر' میرا پیش کردہ طریق کار ان لوگوں کی اکثریت کے سامنے واضح ہے' لہٰذا اس
ست میں مَیں اپنے آپ کو مقررین کی فہرست میں بھی شامل نہیں کر رہا' بلکہ میں خود سامع
ں' میں خود راہنمائی اور مشوروں کا محتاج ہوں۔ چنانچہ میں آپ حضرات کو سنوں گا۔
ید کہیں ضرورت محسوس ہوئی تو کسی سوال کی جرأت بھی کر لوں۔ لیکن کوئی ایسا خیال نہ
یۓ کہ چونکہ صدر کے پاس ایک خاص استحقاق ہوتا ہے کہ آخر میں کھڑے ہو کر چاہے
رر کے جذبات کی نفی کر دے اور صدر کی بات کا تو جواب بھی نہیں دیا جا سکتا۔ تو یہ
"Radical" یہاں سرے سے نہیں ہو گا۔ اسی لئے میں نے یہ عرض کیا ہے کہ میری

حیثیت صدر کی نہیں ہے بلکہ صرف میزبان کی ہے۔

ان کے علاوہ آخری بات یہ کہ اس وقت ہمارا آڈیٹوریم کھچا کھچ بھر چکا ہے' اور وہ جو کہتے ہیں کہ تِل دھرنے کو جگہ نہ رہے بالفعل وہ صورت پیدا ہو چکی ہے' چنانچہ ہم نے برابر والے پلاٹ میں کلوز سرکٹ ٹی وی کا انتظام کر دیا ہے۔ اب جو لوگ آئیں گے وہ وہاں بیٹھ کر ہماری اِس دعوت میں شریک ہو سکیں گے۔ میں اپنی گفتگو کا اختتام اس دعا پر کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں خیر کی توفیق عطا فرمائے اور جس خیر کی توفیق عطا فرمائے اسے خالصتاً اپنی ہی توفیق سے شرفِ قبول بھی عطا فرمائے۔ اَقُولُ قَولی ھٰذا واستغفر اللّٰہ لی وَلکم وَلِسائر المُسلمین وَالمُسلمات OO

تنظیم اسلامی پاکستان کے زیر اہتمام
آئندہ دو ماہ کے لئے مجوزہ پروگرام

مبتدی / ملتزم تربیت گاہیں

1۔	مبتدی	16 تا 22 دسمبر 94ء	لاہور
2۔	مبتدی	6 تا 12 جنوری 95ء	کراچی
3۔	مبتدی	20 تا 26 جنوری 95ء	ملتان

(نوٹ : لاہور میں منعقد ہونے والی تربیت گاہوں میں حلقہ سرحد' پنجاب شمالی' آزاد کشمیر' گوجرانوالہ ڈویژن اور حلقہ لاہور کے رفقاء --- ملتان میں ہونے والی تربیت گاہوں میں حلقہ پنجاب جنوبی و پنجاب غربی کے رفقاء ---- اور کراچی میں ہونے والی تربیت گاہوں میں حلقہ سندھ و بلوچستان کے رفقاء شریک ہوں گے!)

خصوصی تربیت گاہ / اجتماع

خصوصی تربیت گاہ (برائے مسائل حکمت) 23 تا 27 دسمبر 94ء' لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

”خلافت“ کی جانب رجوع

اور اس کی حقیقت

جیسے کہ گذشتہ نشست میں عرض کیا جا چکا ہے ' اگرچہ ویسے تو مغربی دنیا میں حزب التحریر" کے عنوان کے تحت عرب آباد کاروں کی نوجوان نسل سے تعلق رکھنے والے بہت سے پُر جوش کارکنوں کے ذریعے "خلافت" کی منادی ایک عرصے سے جاری تھی اور اس میں کچھ عرصے سے پاک و ہند سے بر آمد شدہ نوجوان خون کی حرارت بھی زور و شور کے ساتھ شامل ہو چکی تھی ---- تاہم ۷ / اگست ۹۴ء کے ویمبلے ایرینا لندن کے عظیم الشان جلسے اور اس کی عالمی ذرائع ابلاغ خصوصاً سی این این اور بی بی سی ٹیلیویژن کے ذریعے تشہیر نے تو فی الواقع اس "اذانِ خلافت" کو ستر برس بعد عالمی سطح پر بلند کر دیا ہے جس کے نتیجے میں بالعموم پورے عالمِ مغرب اور خاص طور پر دنیا بھر کے یہودیوں میں تشویش اور سراسیمگی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے!

ادھر پوری اسلامی دنیا کے جس واحد ملک میں '۱۹۲۴ء میں خلافت کی تنسیخ کے بعد ہی نہیں ' بلکہ اس سے بھی بہت پہلے ' جبکہ ابھی یورپی حکومتیں خلافتِ عثمانیہ کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے جال کا تانا بانا بن ہی رہی تھیں ' زبردست احتجاجی تحریک چلی تھی ' اس میں اگرچہ احیاءِ اسلام کی مساعی کا تسلسل تو برقرار رہا لیکن بدقسمتی سے کچھ عرصے سے "خلافت" کا عنوان کچھ دوسری اصطلاحات کے پردے میں چھپ گیا تھا۔ تاہم بحمد اللہ گذشتہ چند سالوں سے اس برِّ عظیم کے بھی کم از کم مشرقی اور مغربی کونوں میں اس کی "ندا" دوبارہ بلند ہو گئی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اگرچہ اس صدی کے بالکل آغاز میں جب مولا: ابوالکلام آزاد مرحوم نے "الہلال" جاری کیا (۱۹۱۲ء) اور "حزب اللہ" قائم کی (۱۹۱۳ء) تو اس کے اہم نکات دو ہی تھے : ایک "حکومتِ الٰہیہ" کا قیام (جو اصلاً نظامِ خلافت ہی کی تعبیر ہے!) اور دوسرے خلافتِ عثمانیہ اور حکومتِ ترکی کی حمایت ' او ان کے مقابل یورپی اتحادیوں بشمول حکومت انگلستان کی شدید مخالفت و مذمت چنانچہ یہ اصلاً اسی مؤخر الذکر "جرم" کی پاداش تھی جو مولانا ابوالکلام آزاد کو ذاتی طو پر قید و بند کی سزاؤں اور اولاً "الہلال" کی ضمانتوں اور پریس کی ضبطی اور بالآخر اس کی بندش کی صورت میں ملتی رہی (جس کے نتیجے میں "الہلال" غروب اور "البلاغ" طلوع ہوا)..... پھر اس صدی کے دوسرے عشرے کے اواخر اور تیسرے عشرے کے اوائل میں جس عظیم احتجاج کا طوفان "تحریکِ خلافت" کے عنوان سے اٹھا اس کی کوئی دوسری نظیر نہ پورے عالمِ اسلام میں نظر آسکتی ہے ' نہ خود برِّ عظیم پاک و ہند کی رواں صدی کی تاریخ میں! یہاں تک کہ اس وسیع و عریض خطۂ ارضی کا پورا طول و عرض ۔

"بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دیدو!"

اور ۔

"ساتھ ہیں تیرے شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو!"

کے ترانے سے گونج اٹھا تھا۔ اور چشمِ فلک نے یہ تماشا بھی دیکھ لیا تھا کہ "خلافت" کی تحریک میں ہندو قوم اپنے عظیم قائد اور مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی سمیت شامل ہونے پر مجبور ہو گئی تھی! یہ دوسری بات ہے کہ اس سے ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ ہند کے دل جیت کر انہیں متحدہ ہندوستانی قومیت کے دامِ ہمرنگِ زمین میں کس لیا جائے -- اور یہ یقیناً "وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۚ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ"

(سورۂ آل عمران : آیت ۵۴) یعنی :"اور انہوں نے اپنی سی چالیں چلیں تو اللہ نے بھی اپنی تدبیر فرمائی۔ اور اللہ تو سب سے بہتر تدبیر فرمانے والا ہے ہی!" کے ابدی قانون کا ہی مظہر تھا کہ یہ جذبۂ حریت اکھنڈ بھارت کی بجائے تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان پر منتج ہو گیا۔

چنانچہ مسلم انڈیا کی حالیہ تاریخ سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کو جو محیّر العقول کامیابی حاصل ہوئی اس کے اسباب میں اس عامل کو بھی فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے کہ یہ تحریکِ خلافت ہی کا جذبہ تھا جسے صرف ایک نئے عنوان کی ضرورت تھی جو مفکر و مصورِ پاکستان علامہ اقبال نے بایں طور پوری فرمادی کہ ایک جانب مصطفیٰ کمال پاشا کا "مرثیہ" کہا کہ۔

"چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ ' اوروں کی عیّاری بھی دیکھ!"

اور دوسری جانب امتِ مسلمہ بالخصوص مسلمانانِ ہند کو للکارا کہ۔

"تا خلافت کی بِنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر!"

تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلم انڈیا کے خالص احیائی افق پر رواں صدی کے وسطی زمانے کے دوران یا تو کچھ ایسی خالص قرآنی اصطلاحات کا سکہ رواں رہا جو ٹھیٹھ علمی اعتبار سے تو یقیناً صحیح ترین بھی تھیں اور حقیقتِ دین سے قریب ترین بھی لیکن عوام کے ذہن و فکر کی عمومی سطح کے اعتبار سے ثقیل بھی تھیں اور ناقابلِ فہم بھی' جیسے اقامتِ دین ' اعلاءِ کلمۃ اللہ اور اظہارِ دینِ الحق علی الدّین کلّہٖ وغیرہ --- یا پھر جب عوامی سطح پر اترنے کی سعی ہوئی تو ایسی اصطلاحات کا رواج ہوا جو عام فہم تو تھیں لیکن چونکہ نہ ان کا براہِ راست اور نمایاں تعلق قرآن و حدیث سے تھا نہ تاریخی عوامل کی بنیاد پر وجود میں آنے والے اجتماعی تحت الشعور سے' لہٰذا وہ نہ خواص کو اپیل کر سکیں' نہ عوامی احساسات کو کماحقہٗ متحرک کر پائیں' جیسے مثلاً پہلے خود مولانا آزاد

اور خیری برادران کی اختیار کردہ اصطلاح "حکومتِ الٰہیہ" اور پھر پاکستان میں استعمال ہونے والی عام فہم اصطلاحات نظامِ اسلامی یا نظامِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم)

بہر حال اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر سال کے مہینوں کے شمار میں جو گڑبڑ قریش نے پیدا کر دی تھی اس کے خاتمے کے اعلان کے موقع پر فرمایا تھا کہ "اب زمانہ چکر لگا کر پھر اسی حساب پر لَوٹ آیا ہے جس پر اللہ نے اول یومِ تخلیق سے اس کی تقویم فرمائی تھی!" اسی طرح بحمد اللہ برعظیم پاک و ہند کے شرق و غرب میں بھی احیاءِ اسلام کی سعی و جہد نے۔

"پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!"

کے مصداق اپنے لئے قیامِ خلافت کی اصطلاح کو اختیار کر لیا ہے جو ایک جانب ٹھیٹھ علمی اور خالص قرآنی بھی ہے، اور دوسری جانب عام فہم بھی ہے اور مسلمانوں کے اجتماعی تحت الشعور کے لئے جانی پہچانی بھی!۔ چنانچہ سابق مشرقی پاکستان اور حالیہ بنگلہ دیش میں بھی کچھ ہی عرصہ قبل حافظ جی حضورؒ کی قیادت میں خلافت کی اذان زور و شور کے ساتھ بلند ہو چکی ہے ---- اور اِدھر مغربی پاکستان میں بھی گزشتہ تین چار سالوں کے دوران اس کا چرچا تدریجاً تو بڑھ ہی رہا تھا ---- کم از کم ارضِ لاہور کی حد تک حالیہ "کاروانِ خلافت" کے مظاہرے اور اس "جلسۂ خلافت" کے انعقاد نے "اذانِ خلافت" بلند کر ہی دی ہے جسے لاہور کے ایک اہم قومی روزنامے نے بھی "ایک بڑے جلسے" سے تعبیر کیا! ---- مزید بر آں اس موقع پر بالکل غیر متوقع طور پر انگلستان کی "حزب التحریر" کے قائدین کی آمد نے تو اس "اذانِ خلافت" کو ایک نیا ہی رنگ و آہنگ عطا کر دیا ہے! فَلِلّٰہِ الحَمدُ وَالمِنّۃ!!

تاہم اس موقع پر اس حقیقت سے اعراض ممکن نہیں ہے کہ خلافت کی اس نئی "اذان" نے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے سوال پیدا کر دیئے

ہیں۔ مثلاً اولاً یہ کہ خلافت کی حقیقت کیا ہے اور اس سے اصلاً مراد کیا ہے؟ ثانیاً یہ کہ نظامِ خلافت سے مراد صرف خلافتِ راشدہ کے زمانے کا نظام ہے یا اس میں امویوں' عباسیوں اور ترکوں کے دور کے نظام بھی شامل ہیں؟ ثالثاً یہ کہ اگر اس سے مراد صرف خلافتِ راشدہ کا نظام ہے تو کیا آج کی دنیا میں' جبکہ عیسوی تقویم کے حساب سے گذشتہ تیرہ سو تینتیس سالوں کے دوران وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے' جوں کا توں وہی نظام دوبارہ قائم کیا جائے گا یا اس میں ریاستی ڈھانچے (سٹیٹ کرافٹ) کے ضمن میں اِس طویل عرصے کے دوران جو ادارے نوعِ انسانی کے اجتماعی شعور کے ارتقاء کی بنا پر وجود میں آئے ہیں ان کو بھی شامل کیا جا سکے گا؟ (واضح رہے کہ خلافتِ راشدہ کا اختتام ۶۶۱ء میں حضرت علیؓ کی شہادت یا زیادہ سے زیادہ حضرت حسنؓ کی دستبرداری پر ہو گیا تھا!) اور رابعاً یہ کہ اگر آخری سوال کا جواب اثبات میں ہو تو یہ چیز جو بظاہر "اجتماعِ ضدّین" نظر آتی ہے کیسے ممکن ہو گی اور تیرہ صدیوں سے زائد کی اس خلیج کو کیسے پاٹا جا سکے گا؟ اور اس طرح جو سیاسی و دستوری' معاشی و اقتصادی اور سماجی و معاشرتی ڈھانچہ وجود میں آئے گا اس کے خدوخال کیا ہوں گے؟

بنابریں' اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق کے بھروسے پر یہ ارادہ کیا ہے کہ آج سے ان کالموں میں ان اہم سوالات کے ضمن میں وضاحت کے ساتھ گفتگو کا آغاز کر دیا جائے۔ وَاللّٰہُ الموفق وَالمُستعان!

جہاں تک خلافت کی حقیقت کا تعلق ہے' لُغوی اور تفسیری مباحث سے قطع نظر' ملکی دستور اور آئین کی سطح پر' اور علمِ سیاست کی اصطلاحات کے اعتبار سے "خلافت" حاکمیت کی ضد ہے۔ یعنی ان دونوں کے مابین نسبت باہم متضاد اور ایک دوسرے کے برعکس ہونے کی ہے!

اسلام کے اساسی نظریئے' یعنی عقیدۂ توحید کی ایک لازمی اور منطقی فرع کی حیثیت سے "حاکمیت" کا حق بالکلیہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے مختص ہے۔ اور اس میں کسی بھی پہلو سے کسی دوسرے کی شمولیت و شراکت بدترین شرک ہے جو توحید کی ضد

اور کامل نفی ہونے کے اعتبار سے از روئے قرآن ناقابلِ معافی جرم ہے (سورۃ النساء' آیات ۴۸ اور ۱۱۶)

اس بات کو مثبت انداز میں تو قرآن حکیم میں کم از کم ڈیڑھ درجن مرتبہ اس طور سے بیان کیا گیا ہے کہ "لِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ " یعنی " آسمانوں اور زمین کی کل بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے!"۔ اس کے علاوہ دو بار اللہ کو "اَلۡمَلِکُ الۡحَقّ " یعنی بادشاہ حقیقی قرار دیا گیا' جبکہ ایک مقام پر "مَالِکَ الۡمُلۡکِ " یعنی بادشاہت پر واقعتاً متمکن اور متصرف اور ایک جگہ "مَلِیۡکٌ مُقۡتَدِر " سے تعبیر کیا گیا' یعنی ایسا بادشاہ جو فی الواقع ہر چیز پر قادر اور مختارِ مطلق ہو۔ اسی طرح دو مقامات پر تو اللہ کے لئے صرف "اَلۡمَلِکُ " کا حد درجہ جامع اور پُر جلال لفظ استعمال ہوا' لیکن تین مقامات پر اس حقیقت کی تعبیر "لَہُ الۡمُلۡکُ " کے الفاظ سے کی گئی اور ایک مقام پر "بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ " کے الفاظ میں۔

اس مثبت تعبیر سے بھی کہیں زیادہ پر ہیبت اور حتمی و قطعی انداز منفی اسلوب کا ہے' جس کے ضمن میں سب سے زیادہ واشگاف الفاظ تو سورۂ یوسف کی آیت ۴۰ میں وارد ہوئے ہیں :"اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ" یعنی :"حکم یا حاکمیت کا اختیار اللہ کے سوا کسی اور کے لئے نہیں ہے!" پھر یہی بات حکمتِ قرآنی کے عظیم ترین خزانوں پر مشتمل دو سورتوں کے جوڑے میں اس طرح بیان ہوئی کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری اور شرک کی نفی کے ضمن میں حد درجہ جامع آیت میں تو یہ فرمایا گیا کہ : "وَقُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرۡہُ تَکۡبِیۡرًا ○" یعنی "کہہ دو کہ کُل حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے نہ تو کسی کو اپنی اولاد بنایا' نہ ہی کوئی بادشاہی میں اس کا ساجھی ہے' اور نہ ہی اس کی کسی سے کوئی دوستی کسی ضعف یا احتیاج کی بنیاد پر ہے---- پس اس کی بڑائی کرو جیسے کہ اس کی بڑائی اور کبریائی کا حق ہے!" اور سورۂ کہف کی آیت ۲۶ کے اختتام پر فرمایا کہ :"وَلَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا" یعنی

"وہ اپنے حکم (کے اختیار) میں کسی کو شریک نہیں کرتا!"

الحمد للہ کہ ان تمام آیاتِ مبارکہ کے خلاصے اور لبِ لباب کو علامہ اقبال نے نہایت سادہ اور عام فہم الفاظ میں اپنے اس شعر میں بیان کر دیا کہ۔

"سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری"

گویا اللہ کے سوا جس کسی کو حاکیت (Sovereignty) کا اہل یا حامل قرار دیا جائے گا اس کی حیثیت بتوں کے مانند جھوٹے اور مصنوعی "معبود" کی ہو جائے گی!

تمام مخلوقات سے "حاکیت" کی اس کلی اور قطعی نفی کے بعد، ظاہر ہے کہ، ان سب کے لئے۔

"ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی!"

کے مصداق سوائے تسلیم و اطاعت کے اور کوئی چارہ، اور سوائے مرتبہ عبدیت کے اور کوئی مقام باقی ہی نہیں رہتا۔ چنانچہ جملہ بے شعور اور بے ارادہ مخلوقات تو ع

"تقدیر کے پابند جمادات و نباتات"

کے مصداق طوعاً و کرھاً طبعی اور طبیعی قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، رہیں وہ تین مخلوقات جو خود شعوری اور محدود اختیار کی حامل ہیں تو ان میں سے بھی فرشتوں پر تو اس عبودیت کا اتنا شدید غلبہ ہے کہ سرتابی اور نافرمانی کا امکان ہی نہیں، بمصداقِ آئے: "لَا یَعْصُونَ للّٰہَ مَا اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُونَ مَا یُؤْمَرُونَ" یعنی "نہیں نافرمانی کرتے اللہ کی، جو حکم بھی وہ انہیں دے، اور کرتے ہیں وہی کچھ جس کا حکم انہیں دیا جاتا ہے!" (سورۂ تحریم : آیت ٦) رہ گئے جِنّات اور انسان تو ان دونوں کی بھی تخلیق کی اصل غرض تو سورۃ الذاریات کی آیت ۵٦ کے مطابق "عبادت" ہی معین کی گئی، یہ دوسری بات ہے کہ ان دونوں میں فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ نافرمانی کے داعیات اور رجحانات بھی پیدا کر دیئے گئے ---- اور اس کا ایک حد تک (یعنی خالص طبعی و طبیعی

اور وراثتی و "جینی" یعنی Genetic حدود کے سانچے یا شکنجے کے اندر اندر) اختیار بھی عطا کر دیا گیا۔

چنانچہ اللہ کی اس "حاکمیتِ مطلقہ" اور جملہ مخلوقات کی اس "عبدیتِ مطلقہ" کے بین بین ہے وہ درجہ "خلافت" جو۔

آسماں بارِ امانت نہ توانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند!"

کے مصداق صرف اشرف المخلوقات یعنی حضرت انسان کو عطا فرمایا گیا۔

نظامِ سیاست و حکومت میں اس خلافت کی حیثیت و نوعیت ہم پاک و ہند کے لوگوں کی سمجھ میں نہایت آسانی کے ساتھ آ سکتی ہے۔ اس لئے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوے برس ہم "تاجِ برطانیہ" کے محکوم رہے۔ اس زمانے میں تاج و تختِ برطانیہ کے والی "ملکِ معظم" یا "ملکۂ عالیہ" تو انگلستان میں "رونق افروز" ہوتے تھے' البتہ دہلی میں ان کا ایک "وائسرائے" مقیم ہوتا تھا۔ گویا ہندوستان کی "حاکمیت" کا مرکز سات سمندر پار انگلستان میں تھا جبکہ اس کی نیابت و خلافت کی ذمہ داری وائسرائے کے کاندھوں پر تھی --- اور ان دونوں کے مابین تعلق کی نوعیت یہ تھی کہ جو حکم یا فرمان "ہز میجسٹیز گورنمنٹ" یا "ہر میجسٹیز گورنمنٹ" سے صادر ہوتا تھا اس کی تو بے چون وچرا اور بلاکم و کاست تعمیل و تنفیذ وائسرائے پر لازم تھی۔ باقی جملہ معاملات میں وائسرائے مقامی حالات کی مناسبت سے اپنی صوابدید کے مطابق اقدامات کرنے کا مجاز و مختار تھا!

بالکل یہی معاملہ اللہ کی حاکمیت اور انسان کی خلافت کا ہے کہ بادشاہ حقیقی اور حاکمِ مطلق صرف اللہ ہے' جس کے اوامر و نواہی اور احکام و فرامین کی بے چون وچرا اور بلا کم و کاست پابندی اور تعمیل انسان پر لازم ہے۔ البتہ جہاں اور جس معاملے میں اللہ کا کوئی حکم موجود نہ ہو وہاں وہ اپنے غور و فکر اور تعقل و تدبّر کی صلاحیتوں اور اجتہادی قوتوں کو بروئے کار لا کر خود فیصلہ کرنے کا مجاز و مختار ہے۔

(جاری ہے)

نظریۂ انقلاب پر مخاطبین کا طرزِ عمل

انسانی تاریخ و جبلت کی روشنی میں

از: ابو عمیر مہرانی

الحمد للہ رواں صدی کے دوران ہونے والی احیائی جدوجہد کے باعث دین حق کے نظامِ عدل و قسط کے قیام کی ضرورت اب ایک تسلیم شدہ حقیقت بن چکی ہے۔ لیکن اس متبرک نظام کے قیام کے حقیقی طریقہ کار کو سمجھنے کی راہ میں تاحال کچھ ایسی رکاوٹیں حائل ہیں جو اپنوں کی سادگی اور دشمن کی عیاری کا شاخسانہ ہیں۔ وطن عزیز میں نفاذِ اسلام کے حوالے سے جن مذہبی و دینی جماعتوں کو نمائندہ خیال کیا جاتا ہے تقریباً وہ سبھی اسلامی انقلاب برپا کرنے کی داعی ہیں لیکن بدقسمتی سے ایسی تمام جماعتیں عملاً انتخابی سیاست میں بری طرح الجھی ہوئی ہیں۔ ان کی اس انتخابی جدوجہد کے باعث انتخابات اور انقلاب کی اصطلاحیں عوام الناس کے نزدیک مترادف الفاظ کے طور پر معروف ہو گئی ہیں۔ اس لئے اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ لفظ انقلاب کے مفہوم کو تاریخی و عملی شواہد سے ثابت کیا جاتا رہے تاکہ اس کشتِ ویراں میں پوشیدہ زرخیزی کے بار آور ہونے کا جب بھی وقت آئے تو منزل مقصود تک لے جانے والی شاہراہ اس قدر صاف اور واضح ہو کہ راہ حق کے مسافر پُرپیچ پگڈنڈیوں میں الجھنے سے بچ کر دین محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو اس کی اصل اور منقول شکل میں قائم کر سکیں۔

انقلاب کا اطلاق اس ہمہ گیر تبدیلی پر ہوتا ہے جو کسی ملک کے اجتماعی گوشوں میں رونما ہو کر پہلے سے مروجہ اقدار کو بالکلیہ بدل ڈالے اور نظام سابق کی جڑ بنیاد اکھڑ کر فنا ہو جائے۔ اس عظیم تبدیلی کے لئے اسی قدر عظیم اور طویل جدوجہد درکار ہوتی ہے جو نظامِ کہنہ سے

متصادم بالکل نئے نظریئے کی اشاعت سے شروع ہوتی ہے۔ پھر اس نظریئے کو دل کی آواز سمجھ کر لبیک کہنے والوں کو ایک مضبوط جمعیت میں ڈھالا جاتا ہے اور اس نظریئے کی مناسبت سے ان کی تربیت بھی کی جاتی ہے تاکہ موت کی وادی سے گزرنے والی اس جدوجہد کے دوران شرکاءِ قافلہ کے قدم نہ ڈگمگائیں۔ پھر جب ان سرفروشوں کی تعداد اس قدر مناسب ہو جائے کہ وہ طرزِ کہن پر اڑنے والوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں للکار سکیں تو تب رہبرِ قافلہ تصادم کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جو یا تو ان سرفروشوں کی کامیابی پر ختم ہوتا ہے یا ان کی جانیں اپنے نظریئے کے لئے قربان ہو کر تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انقلابات برپا ہوئے وہ اس معاشرے کی اکثریت کی جدوجہد سے ہرگز رونما نہیں ہوئے بلکہ ایک منظم اور مربوط جانفروش اقلیت ہی نے ہر انقلاب برپا کیا۔

دوسری طرف انتخابات پہلے سے قائم نظام کو درست سمجھنے والوں کے لئے موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ اس نظام کو بہتر انداز میں چلانے کے لئے ملکی عوام کی اکثریت کی حمایت حاصل کریں۔ اس طرح مروجہ نظام نے معاشرے کی تعمیر جن اصولوں کے مطابق کی ہوتی ہے اسی کا عکس انتخابات کے نتائج کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر وہ نظام عدل، مساوات اور خدا ترسی کے اصولوں پر مبنی ہے تو لامحالہ انتخابات کی صورت میں صالح ترین لوگ منتخب ہو کر آجائیں گے لیکن اگر وہ نظام غیر عادلانہ تقسیم دولت، طبقاتی اونچ نیچ اور ظلم و ستم کے اصولوں پر قائم ہے تو پھر وہی لوگ منصب قیادت پر فائز ہوں گے جو اس معاشرے میں عزت و شرف کے حامل ہوں گے۔

ان شاء اللہ العزیز سطور ذیل میں یہ بات واضح کرنے کی ادنیٰ سی کاوش کی جائے گی کہ مروّجہ نظام کو بدلنے کے لئے انقلاب کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ مقصود مکمل طور پر نظام کو تبدیل کرنا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان میں بہت سی ایسی عادات رکھی ہیں جو وقت و حالات کے ساتھ نئے روپ میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، لیکن چند خصائص ایسے بھی ہیں جو ہر دور کے انسان میں ایک ہی جیسے رہتے ہیں، مثلاً معاشرے کی بنیادی اکائی یعنی خاندان، مرد و عورت کے

ل کر رہنے سے وجود میں آتا ہے۔ اس اکائی کو مضبوط رکھنے کے لئے جن اخلاقی
ں کی ضرورت آج کے دَور کے جوڑے کو درکار ہے صدیوں پہلے بھی یہی اصول کسی
ے کے لئے قابل عمل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عائلی و خاندانی امور پر جس قدر مفصل
ت قرآن حکیم میں بیان کی گئی ہیں کسی اور انسانی مسئلے کے لئے ہرگز اتنی تفصیل موجود
'کیونکہ یہ شعبہ جبلت کے غیر مبدل حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی
ں تاریخ کے ہر دور میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ معاشرے کی اجتماعی اقدار
والے سے جب کبھی کسی شخصیت نے مروجہ نظام کے مقابلے میں کوئی نیا نظریۂ فلاح
یا تو معاشرے کی عظیم اکثریت آغاز ہی میں کبھی بھی اس کی حامی و ہمنوا نہیں بنی' کیونکہ

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

ر یوں کہا جائے کہ کسی نئے نظریئے کی حمایت و مخالفت کے نقطۂ نظر سے ہر دور کی
ی اجتماعیت تین گروہوں میں منقسم رہی ہے تو زیادہ موزوں ہو گا یعنی :

نئے نظریئے کے پرچارک
پرانے نظام کے محافظ
گروہِ منتظرین

ا گروہ عظیم خاموش اکثریت پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کے نزدیک معیارِ حق یہ ہے
و غلبہ حاصل کر لے وہی گروہ حق پر ہو گا جبکہ اول الذکر دونوں گروہ منظم اقلیت ہی
وتے ہیں۔

جب کوئی داعی نئے نظریئے کے لئے حمایت حاصل کرنے کی غرض سے صدا لگاتا ہے تو
ں پر شمار کئے جانے والے افراد یہ دیکھے بغیر داعی کی پکار پر لبیک کہتے ہیں کہ آیا یہ نظریہ
قائم ہو بھی سکے گا یا نہیں' بلکہ ان کا دل اس نظریئے کو انسانیت کے لئے مفید سمجھنے کی
ی دیتا ہے' اس لئے وہ داعی کے اولین انصار بن جاتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت یہ نظریہ

انسانیت کے لئے کُلی یا جزوی فلاح پر مشتمل ہو' نیز اس کا داعی استقلال و استقامت کی صفات سے متصف ہو تو وہ عدم موافقت کے باوجود نظریئے کا پرچار جاری رکھتا ہے۔ اس طرح انتہائی سست رفتاری سے اس نظریئے کی صداقت کی گواہی دینے والوں کی تعداد بتدریج بڑھتی رہتی ہے' لیکن جونہی مقتدر نظام کے محافظوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم نے جس دعوت کو غیر اہم سمجھے رکھا وہ تو معاشرے کے تمام طبقوں میں بالعموم اور مقہور طبقوں میں بالخصوص پذیرائی حاصل کرتی جا رہی ہے تو وہ اس ننھے منے قافلے کو منتشر کرنے کے لئے طنز و استہزا' تحریص اور تشدد جسمانی سمیت تمام ہتھکنڈوں کو حسب ضرورت آزمانا شروع کر دیتے ہیں۔ داعی اور اس کے ساتھی اگر پامردی سے ان مراحل سے گزرتے ہوئے اپنے نظریئے پر ڈٹے رہیں تو خاموش اکثریت میں سے کچھ مزید افراد ان کے دست و بازو بن جاتے ہیں۔ دراصل یہ افراد بھی اول الذکر افراد کی صنف سے ہی تعلق رکھتے ہیں لیکن ان میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ یہ نظریئے کو پرکھنے کے بعد حمایت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اب یہ گروہ پہلے سے زیادہ استقامت و جذبے کے ساتھ اپنے نظریات کا پرچار جاری رکھتا ہے تو لامحالہ نظامِ کہنہ سے مفاد حاصل کرنے والا گروہ پوری شدت سے ان اجنبیوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس مرحلے پر آبائی وطن سے اخراج تک کے اقدام سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ یہ مرحلہ واقعتاً انقلابیوں کے جذبے اور نظریئے سے ان کی محبت کا کڑا امتحان ثابت ہوتا ہے۔ اگر انقلابی مال' اولاد' کنبے' قبیلے سے جدائی کی قربانی دے کر بھی دیارِ غیر میں جا کر نظریئے پر قائم رہیں تو ابنائے نوع میں سے کچھ مزید اصحاب عزم و ہمت ان کے نظریئے کو مبنی برحق مانتے ہوئے اس قافلہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ تیسرا گروہ آزمائش کی بھٹی سے سرخرو ہو کر نکلنے کو معیارِ حق تسلیم کرتا ہے۔

اب چونکہ انقلابی معقول تعداد میں ہو جاتے ہیں' نیز آزمائش کے کڑے امتحانوں سے سرخرو ہو کر نکلنے سے کندن بن چکے ہوتے ہیں' اس لئے اب وہ مرحلہ آ جاتا ہے کہ جب انقلابی پہلے سے قائم نظام کے محافظوں کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑ کر تصادم کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ یہ مرحلہ انقلابی قیادت کے لئے انتہائی اہمیت و نزاکت کا حامل ہوتا ہے' کیونکہ

کا غلط اندازہ کرتے ہوئے قبل از وقت تصادم کا فیصلہ انقلابی جماعت کو کامیابی کی
سفحہ ہستی سے مٹا دینے کا باعث بن سکتا ہے۔ بہرحال درست فیصلے کی صورت میں
طاغوت سے ٹکرانے کے لئے جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آجاتے ہیں۔ تصادم کا
الات کی مناسبت سے مختصر بھی ہو سکتا ہے اور طویل بھی، لیکن ایک بات طے ہے کہ
ے کے نتیجے میں انقلابی نہ صرف منزل سے قریب ہوتے جاتے ہیں بلکہ ابتدائی دور کی
ے اس دور میں ان کے نظریئے کے ہمنوا مناسب تعداد میں بتدریج بڑھتے رہتے
ں جوں انقلابی جان و مال کی قربانیاں دے کر آگے بڑھتے ہیں منتظرین کے گروہ سے
ہمت ان سے جڑتے چلے جاتے ہیں۔
ی مراحل کے دوران دو طرح کی ذہنیت کے افراد اس قافلہ سخت جان میں مصلحتاً
جاتے ہیں۔ اولاً تو وہ دور اندیش لوگ جو مستقبل کی بو سونگھنے کی صلاحیت رکھتے
نہیں محسوس ہو جاتا ہے کہ جلد یا بدیر نظام کہنہ کا خاتمہ ہونے والا ہے اور قوت و
ن انقلابیوں کی جھولی میں آگرے گا۔ اس لئے وہ متوقع غلبے سے مستفید ہونے کے
ابیوں کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کچھ ایسے افراد جو اپنے کنبے قبیلے کی سطح پر
کے حامل ہوتے ہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ قبیلے کے باعزیمت و جواں ہمت لوگ طرزِ
ٹھوکر مارتے ہوئے آئینِ نو کے پرچارک بن گئے ہیں تو انہیں اپنا ماحول سونا سونا
ہوتا ہے، اس لئے وہ بھی اپنی سیادت کی خواہش لئے ہوئے انقلابی تحریک میں شامل
ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انقلابیوں کے مقاصدِ حیات بدل جانے کے باعث ان کے
رت و سیادت کی اہلیت کے معیار بھی بالکل نئے بن جاتے ہیں جس کے باعث ان
بندوں کے ہاتھ کچھ نہیں آسکتا۔ البتہ اس کے باوجود تحریک کی قوت بہرحال وہی
ن انقلابی ہی ہوتے ہیں جو بغیر کسی مفاد و مصلحت کے محض انقلابی نظریئے کی صداقت
کرتے ہوئے قافلہ سخت جاں میں شامل ہوئے ہوتے ہیں۔
قلابی، تصادم کے مختلف مراحل سے سرخرو ہوتے ہوئے بالآخر آخری معرکے میں
تے ہیں جو طاغوت کے تابوتِ نجس میں آخری کیل ثابت ہوتا ہے اور انقلابی کامیابی

سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اس آخری معرکے سے بالکل ماقبل بھی انقلا
لشکر معاشرے کی اکثریت پر مشتمل نہیں ہوتا۔ چونکہ عوام کا عظیم گروہِ منتظرین تو آخر
معرکے کے فیصلے کا منتظر ہوتا ہے' تو جونہی انقلابی فتح مند ہوتے ہیں تو اب یہ خاموش اکثر
اپنے پیمانے سے انقلابی نظریئے کی حقانیت کو تسلیم کر لیتی ہے' کیونکہ یہ خاموش اکثریت
بالواسطہ یا بلاواسطہ غالب قوت کے ساتھ ہی ہوا کرتی ہے خواہ وہ قوت جابرین پر مشتمل
خواہ عادل و خدا ترسوں پر۔

انسانی تاریخ کے ہر دور میں نئے نظریئے پر ردِ عمل کے حوالے سے یہ ایک اجمالی تج
ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اسے اس کی حقیقی کسوٹی پر پرکھیں' جدید تاریخ کے تین مش
انقلابات کے حوالے سے اس خاکے میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اقتدارِ شاہی کے مظالم و جبر کو ختم کر کے عوامی رائے پر مبنی حکومت کی تشکیل
نظریات تو بہت مدت پہلے روسو اور والٹیر نے دیئے تھے لیکن ان نظریات کی بنیاد پر ن
حکومت کی تشکیل کے لئے جب فرانس میں چند سرپھروں نے کوشش کرنا چاہی تو اسے ش
تقدس کے خلاف سازش ہی سے تعبیر کیا گیا۔ اور یہ دیوانے عزم مصمم سے جب اپنی
لگاتے رہے تو شاہی تشدد حرکت میں آگیا' لیکن عزیمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انقلابی آ
ہی بڑھتے چلے گئے اور بالآخر اٹھارہویں صدی کے آخر میں انہیں کامیابی نصیب ہو گئی
انقلاب اقلیت ہی نے برپا کیا تھا۔ تاریخ اس پر شاہد ہے۔

اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام کے چنگل سے نجات اور پرولتاری ریاست کے قیا
فلسفیانہ بنیاد تو اٹھارہویں صدی ہی میں ہیگل نے رکھ دی تھی اور انیسویں صدی
تیسرے عشرے تک فرانس میں کیمونسٹ تنظیم بھی قائم ہو چکی تھی' لیکن ہیگل کا فلسفہ
زیادہ تصوراتی تھا' اسے عملی اور قوتِ متحرکہ بنانے والے کارل مارکس اور فریڈرک ا
ہیں جنہوں نے ۱۸۴۸ء میں کیمونسٹ پارٹی کا منشور نامی پمفلٹ چھپوا کر کیمونزم کے قیا
ابتدائی کوششیں شروع کی تھیں۔ گو کہ ان دونوں فلسفیوں کی چالیس پینتالیس سالہ
توڑ کوشش کے باوجود انقلاب کے آثار کہیں نمودار نہ ہوئے لیکن اس کے باوجود ا

مسلسل ایک ملک سے دوسرے ملک جلاوطنی کی سزائیں ملتی رہیں' جس سے ثابت ہوتا ہے
کہ انقلابی عمل کا آغاز ہو چکا تھا اور بتدریج یہ نظریہ قبولیت عامہ کی حیثیت حاصل کرتا جارہا
تھا۔ ۱۸۸۸ء میں جب مارکس فوت ہوا تو اس وقت اس کے کمیونسٹ پروپیگنڈا کے اثرات
روس اور یورپ کے کئی ممالک کے مزدوروں اور کسانوں میں واضح طور پر محسوس ہو
رہے تھے۔ اس تحریک کو آگے چل کر روس میں لینن کی قیادت میسر آئی اور پے در پے
زبانیوں کے بعد ۱۹۱۷ء میں پہلا کمیونسٹ انقلاب ظہور پذیر ہوا۔ پھر کچھ ہی عرصے کے اندر
ندر مشرقی یورپ کے کئی ممالک میں مارکس کا لگایا ہوا پودا پھل لے آیا۔ یہ بات بہرحال
اضح ہے کہ روس میں تکمیلِ انقلاب کے بعد حتیٰ کہ اختتام تک بھی انقلاب کی اصل قوت
کیونسٹ پارٹی کبھی بھی اکثریت پر مشتمل نہیں رہی بلکہ ایک منظم اور سرفروش اقلیت ہی
تھی جو جان پر کھیل کر نظریئے کو بچانا جانتی تھی۔

اسی طرح پندرہ سال قبل ایران میں شاہ کے مظالم کو ختم کر کے انقلاب برپا کرنے
الے مجاہدین کی جدوجہد میں یہ مراحل محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ ایران میں طاغوتی نظام
کے خلاف پہلی آواز بلند کرنے والے سید جمال الدین افغانی" ہیں جو ۱۹۰۰ء میں ایران گئے
ر وہاں برطانوی حکومت کے طاغوتی نظام کو للکارا' نیز علماء کا کنونشن منعقد کر کے جدوجہد کا
غاز کیا' جس کے نتیجے میں قاچار کی مطلق العنان بادشاہت کی جگہ دستوری بادشاہت کا
غاز ہوا۔ پھر مختلف ناموں سے کئی جماعتیں برسرپیکار رہیں تا آنکہ علامہ طلیقانی کی
کوششوں سے ۱۹۴۳ء میں ایک مشترکہ انقلابی تنظیم وجود میں آئی۔ یہاں غور کیا جائے تو
علوم ہو گا کہ نظریہ تو ۱۹۰۰ء سے جاری تھا لیکن اس کے پھلنے پھولنے میں رکاوٹ کے
ث انقلابی منتشر قوتوں میں بٹے رہے۔ پھر ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۳ء تک انتہائی منظم انداز
ں نظریاتی تربیت کا کام ہوتا رہا۔ چونکہ ۴۳ء میں مختلف قوتیں متحد ہو کر ایک قوت بن چکی
یں اس لئے اب تربیت جیسے اہم انقلابی مرحلے کی طرف توجہ دی گئی اور ۱۹۶۰ء تک
یرزمین مزاحمتی تحریک پھیلتی رہی۔ ۶۰ء میں جب آیت اللہ خمینی اس تحریک کے سالار
نے تو اس میں ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا۔ ۶۳ء میں خمینی صاحب کو ملک بدر کر دیا گیا کیونکہ شاہ

کے خلاف انہوں نے مظاہراتی تحریک شروع کردی تھی جس میں شاہ کی فوجوں نے ہزاروں ایرانیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ لیکن سالارِ تحریک کی جلاوطنی کے باوجود تحریک روز بروز پھیلتی رہی۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۸ء تک مسلسل مظاہروں کا سلسلہ جاری رہا جس کے دوران لگ بھگ ستر ہزار نہتے عوام کو شاہی غنڈوں نے بھون ڈالا لیکن یہ ظلم بھی طاغوتی ایجنٹ کو قائم نہ رکھ سکے اور بالآخر انقلابی اپنی منزل پاکر رہے۔

تاریخ کے ان تینوں انقلابات میں جو چیزیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں وہ یہ کہ انقلابی نظریہ ابتدا میں بالکل اجنبی محسوس ہوتا تھا لیکن انقلابی قیادت کی استقامت اور کارکنوں کی سرفروشی کے باعث اسے بتدریج پذیرائی حاصل ہوتی گئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ تینوں انقلاب انسانی جانوں کی تلافی کی طویل داستانیں لئے ہوئے ہیں۔ تیسری یہ کہ تینوں جگہ انقلابی عمل بتدریج زینہ بہ زینہ مختلف جماعتوں اور قیادتوں کے تحت آگے بڑھا ہے اور آخری مرحلہ کسی اور کی زیرِ قیادت تکمیل پذیر ہوا ہے' جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انقلاب چند برسوں میں مکمل نہیں ہوا کرتے بلکہ صدی ڈیڑھ صدی اس عمل کے لئے درکار ہے۔

اب ہم اس تجزیئے کو اس کی حقیقی کسوٹی یعنی سیرت خیر البشر سید المرسلین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے رہنمائی حاصل کریں گے کہ آپ ﷺ نے جس انسانیت کی دنیوی و اخروی فلاح کا نظریہ توحید پیش فرمایا تو مخاطبین کا ردِ عمل کیا تھا۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ عزوجل نے پروانہ نبوت عطا فرمایا اور ابتدائی وحی کے کچھ عرصہ بعد جب "قُمْ فَاَنْذِرْ' وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" کا حکم فرمایا تو آپؐ نے دعوتِ توحید کا آغاز اس حلقے سے فرمایا جو قلب کی گہرائیوں سے آپؐ کے قول و فعل کے شاہد و شناسا تھے۔ اس طرح حضرت خدیجۃ الکبریٰ' حضرت ابوبکر صدیق' حضرت زید بن حارثہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اس قافلہ توحید کے اولین انصار بنے۔ کچھ تین سال تک چپکے چپکے آپؐ اور آپؐ کے جاں نثار ساتھی محنت کرتے رہے اور اکا دکا سلیم الفطرت ہستیاں پیغامِ توحید کو دل کی پکار سمجھ کر لبیک کہتے ہوئے دامنِ اسلام میں پناہ لیتی

رہیں۔ آغاز نبوت کے تقریباً تین سال بعد آپ ؐ کو اعلانیہ دعوت کا حکم ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام قبائل قریش کو کوہ صفا سے پکار لگا کر جمع فرمایا اور انہیں خدائے واحد پر ایمان لانے اور اس کے نتیجے میں عرب و عجم کا ان کے تابع ہونے کی نوید سنائی، لیکن اہل مکہ نے برملا انکار کر دیا۔ حالانکہ آپ ؐ کی صداقت اور عظمت کردار کے وہ خود مداح تھے لیکن چونکہ اس نظریئے کو مان کر مروجہ اقدار و نظام پر زد پڑتی تھی اس لئے وہ اس کی مخالفت پر ڈٹ گئے۔

کچھ ہی عرصہ بعد جبکہ اہل ایمان کی تعداد چالیس ہو چکی تھی آپ ؐ نے مرکز توحید کعبۃ اللہ میں کلمۂ توحید کی دعوت پیش فرمائی تو رؤسا نے ذات عالی پر حملہ کر دیا اور آپ ؐ کے ایک جاں نثار حضرت حارث ؓ بن ابی ہالہ آقا ؐ کو بچاتے ہوئے شہید کر دیئے گئے۔

قافلہ سخت جاں طنز و استہزا اور جسمانی تعذیب کی آزمائشوں سے گزرتا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا، لیکن ابھی تک اہل ایمان میں یا تو قبیلہ قریش کے شریف النفس اصحاب شامل تھے یا پھر زیردست غلام اس قافلہ کے دست و بازو بنے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے الہ العالمین کی جناب میں التجا کی کہ اے اللہ اس قافلے کو جلالت شان عطا کرنے کے لئے عمرو بن ہشام اور عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کو ایمان کی توفیق عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے نہ صرف عمر ؓ بن خطاب کو توفیق بخشی بلکہ عم رسول ؐ حضرت حمزہ ؓ کو دولت ایمان سے نواز کر دشمنان اسلام پر لرزہ طاری کر دیا۔ ان اصحاب جلال کے قبول اسلام سے اہل ایمان میں نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ نبوت کے چھ سال ہو چکے تھے اور اہل ایمان بھی چالیس پچاس کی تعداد میں تھے، لیکن تاحال اہل ایمان خفیہ عبادت کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر ؓ نے قبول اسلام کے بعد کعبۃ اللہ میں کھلے عام عبادت شروع کی تو دوسرے اہل ایمان بھی بیت اللہ میں عبادت کرنے لگے۔ اسلام کو قوت اور دوام حاصل کرتے دیکھ کر کفار نے داعی اسلام اور اہل ایمان پر ظلم و استہزا مزید تیز کر دیا۔

اہل ایمان کا تعذیب پر صبر اور دعوت کی لگن بتدریج سلیم الفطرت اصحاب ؓ کو اسلام کی

طرف لانے کا باعث بن رہی تھی، لیکن نظامِ کہنہ کے محافظ اپنے مفاد چھنتے دیکھ کر ظلم و بربریت کی انتہاؤں تک پہنچ رہے تھے۔ اس لئے نبی اکرم ﷺ نے سرزمین مکہ میں اسلام کے پھلنے پھولنے کے مزید آثار نہ پاتے ہوئے طائف کے سفر کا ارادہ فرمایا کہ شاید وہ زمین اس پیغام کے لئے موافق ثابت ہو جائے۔ لیکن سردارانِ طائف نے محسن انسانیت سے اس قدر گستاخانہ سلوک روا رکھا جس کے باعث آپؐ یوم طائف کو اپنی زندگی کا سخت ترین دن کہا کرتے تھے۔ طائف سے زخم کھا کر آپؐ مکہ واپس تشریف لائے تو سرداران مکہ نے آقائے دوجہاں کے شہر میں داخلے پر پابندی لگا دی۔ آپؐ ایک مشرک مطعم بن عدی کی پناہ لے کر داخل شہر ہوئے۔ آپؐ نے مطعم کے اس اہم موڑ پر کئے گئے احسان کو یاد رکھا اور غزوۂ بدر کے بعد فرمایا کہ اگر آج مطعم زندہ ہوتا تو اس کی سفارش پر میں تمام قیدی رہا کر دیتا۔

رسول اللہ ﷺ پیغام ہدایت کو انسانوں تک پہنچانے کے لئے ہر لحہ بے تاب رہا کرتے تھے۔ خواہ مضافات مکہ کے میلے ہوں یا قافلہ ہائے حج، آپؐ ہر جگہ فلاح حقیقی کا پیغام پہنچانے تشریف لے جاتے تھے۔ ۱۰ نبوی میں سفرحج کے موقع پر یثرب کے قبیلہ خزرج کے قافلے کو آپؐ نے دعوت ایمان دی تو چھ افراد نے آپؐ کے دست مبارک پر بیعت اسلام کی۔ یوں مکہ کی ناموافق فضا کے باعث طبیعت اطہر پر جو بوجھ تھا اللہ تعالیٰ نے مدینہ کی طرف توسیع دعوت کی کھڑکی کھول کر اس کا مداوا فرمایا۔ اگلے برس پھر اہل مدینہ میں سے بارہ افراد نے اسلام قبول کیا، نیز اپنے ہمراہ ایک معلم بھیجنے کی درخواست بھی کی۔ آپؐ نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اس اہم فریضے کے لئے منتخب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت اور المقری حضرت مصعبؓ کی محنت شاقہ کے باعث اگلے برس ایام حج میں بہتر افراد نے آپؐ سے بیعت اسلام کرتے ہوئے مشن توحید کی خاطر عرب و عجم سے ٹکر لینے کا عہد کیا۔

اب مسلمانوں کو مدینہ میں محفوظ پناہ گاہ میسر آ چکی تھی۔ آپؐ نے ظلم و ستم سے ستائے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ اکثر صحابہ موقع پا کر ہجرت کرنے لگے۔ مدینے میں اسلام کو جڑ پکڑتے دیکھ کر دشمنان اسلام غصے

سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ انہوں نے تمام اخلاق و مروت کو ایک طرف پھینکتے ہوئے انسانوں کے غم گسار محمد ﷺ کو قتل کر دینے کا ناپاک منصوبہ بنالیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اس سازش کی پیشگی اطلاع دے کر ہجرت کرنے کی اجازت فرمادی۔ یوں آپؐ نبوت کے تیرھویں سال کے آغاز میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ہمراہ رات کے پچھلے پہر کعبۃ اللہ پر محبت بھری نگاہ ڈال کر یہ کہتے ہوئے مدینہ کی طرف سفر ہجرت پر روانہ ہو گئے کہ "اے مکہ تو مجھے تمام دنیا سے عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے"۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں رک کر غور کرنا چاہیے کہ محمد ﷺ جو چالیس سال تک اپنی قوم کے درمیان صدق و صفا اور بلندی کردار کی بے مثل اور قابل تقلید علامت بن کر رہے لیکن جب آپؐ نے انسانیت کی دنیا و آخرت سنوار دینے والے پیغام حق کی صدا لگائی تو اپنی ہی قوم میں اجنبی بن کر رہ گئے اور سرداران قوم جن کے مفادات پر اس نور ہدایت کے عام ہونے سے زد پڑتی تھی آپؐ کے جانی دشمن بن گئے' جبکہ قوم کی اکثریت دل سے بتدریج قائل ہو جانے کے باوجود لاتعلق بنی رہی اور تیرہ سالہ جاں گسل' دن رات کھپا دینے والی جدوجہد اور کامل نصرت ربانی کے باوجود خیرالبشر ﷺ کو اس ام القریٰ مکہ سے ایک سو سے بھی کچھ کم جاں نثار ساتھیؓ ہی میسر آسکے۔ لاریب غور کرنے والوں کے لئے تو یہ داستان سرمۂ شفاء ہے کہ محمد ﷺ جیسے غم گسارِ انسانیت' مجسم صفات کمال نیز اللہ تعالیٰ کی ایک طرف سے ہر لحظہ رہنمائی و نصرت کے حامل جب نظام طاغوت و شرک کو بدل کر نظام عدل و توحید بپا کرنے کے لئے "مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ" کی پکار لگاتے ہیں تو اکثریت نے آپؐ کا ساتھ نہ دیا ---- تو پھر کون مائی کا لعل ہو گا جسے "اسی" کام کے کرنے کے لئے اکثریت کی حمایت حاصل ہو سکے۔ ایں خیال است و محال است و جنوں!

البتہ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی پہلے سے قائم فاسد نظام کے سائے میں حکومت حاصل کر کے نفاذ اسلام کا مصنوعی لیبل لگانے کا خواہش مند ہو تو ہو۔ چونکہ تاریخ انسانیت میں یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک نظام قائم ہو اور اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا نظام بھی متوازی طور پر قائم ہو جائے۔ نیا نظام قائم ہونے سے پہلے یہ کیفیت ہر دور میں پیدا ہوئی ہے کہ نئے

نظام کے جاں نثاروں کی جد وجہد سے نظام کہنہ خس وخاشاک میں ملتا ہے اور نظام کہنہ کے نابود ہونے سے خلا پیدا ہوا ہے اب انقلابی نئے سرے سے اپنے من پسند نظام کے اصولوں کے تحت تعمیر نو کرتے ہیں چونکہ۔

تخریب حسیں کر دیتی ہے تعمیر کے نقشِ ناقص کو
بت خانے کی قسمت کیا کہئے اجڑے تو حرم ہو جاتا ہے

اگر نظام باطل کو جڑ بنیاد سے اکھیڑے بغیر اسلام کا نظام عدل وقسط ثمر آور ہو سکتا تو اس کی پیشکش تو خیر البشرؐ کو سرداران قریش کی طرف سے آغاز نبوت کے بالکل ابتدائی برسوں ہی میں ہو گئی تھی جبکہ ابھی شجر اسلام ننھی منی کونپل کی مانند تھا' یعنی ابھی گنتی کے چند سلیم الفطرت اصحابؓ ہی نے اسلام قبول کیا تھا' لیکن دوربین نگاہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس دعوت توحید میں وہ زبردست قوت متحرکہ ہے کہ اگر اسے اسی مرحلے پر لگام نہ دی گئی تو جلد ہی ہمارے مفادات کے محل زمین بوس ہو جائیں گے' اس لئے سرداران قریش نے عتبہ بن ربیعہ کو ہر طرح کی پرکشش مراعات کی قیمت پر محمد ﷺ 'فداہ ابی وامی' سے معاملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ ان مراعات میں زن وزر کے علاوہ یہ اہم ترین پیشکش بھی شامل تھی کہ ہم آپؐ کو ریاست مکہ کا فرمانروا تسلیم کر کے مکمل اطاعت کرنے کے لئے آمادہ ہیں بشرطیکہ آپؐ اس دعوت کو بند کر دیجئے۔ عتبہ کو قوی یقین تھا کہ کوئی شخص ان مراعات کے سوا کسی اور مقصد کے لئے اس قدر مشقت ومصائب برداشت نہیں کر سکتا' لہٰذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لازماً یہ پیکج ڈیل کر لیں گے' لیکن نبی ﷺ کا ٹکا سا جواب اور کلام ربانی کا کچھ حصہ سن کر وہ مبہوت ہو گیا اور اس نے واپسی پر قریش کو یہ مشورہ دیا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی راہ میں رکاوٹ نہ بنو' وہ جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ کسی انسان کا کلام ہرگز نہیں۔

سوچنے کا مقام یہ ہے کہ اگر محض اختیار واقتدار کے ذریعہ دین حق کا غلبہ ممکن ہوتا تو آپؐ ہرگز انکار نہ فرماتے۔ لیکن آپؐ نے تخت حکومت کی بجائے شعب ابی طالب' طائف اور مکے کی گلیوں میں پیش آمدہ بے پناہ دکھ اور سلسلہ ہائے ظلم قبول کیا' کیونکہ اللہ کے کلمہ کی سربلندی جیسی عظیم منزل تک پہنچنے کے لئے درد والم کی اس وادی سے گزرے

بغیر کوئی اور چارہ ہرگز نہ تھا۔ مکہ میں محسن انسانیت اور آپ ؐ کے جاں نثاروں پر ظلم و ستم انتہا کو پہنچا تو اذن ربانی سے ہجرت مدینہ کا ہر لحاظ سے اہم موڑ آیا۔ ہجرت کے سبب مدینہ میں اہل ایمان کو محفوظ مرکز میسر آگیا تھا جس کے باعث توسیع دعوت میں نسبتاً آسانی پیدا ہو گئی اور مہاجرین و انصار پر مشتمل ایک مختصر لیکن منظم جماعت وجود میں آگئی، اس لئے اب باطل کو بر سر میدان للکارنے کا وقت آگیا تھا۔ چنانچہ چھاپہ مار مہموں کے سلسلے کا آغاز ہوا، جس کے نتیجے میں دشمن کو اپنی رگ حیات خطرے میں محسوس ہوئی تو ۲ھ میں وہ مسلح لشکر لے کر اہل ایمان کو مٹانے کی ناپاک خواہش لے کر نکلے۔ لیکن کفر و ایمان اور حق و باطل کا پہلا معرکہ میدان بدر میں باطل کی کمر توڑنے کا باعث بن گیا اور ابو جہل کی خواہش پر اللہ نے واقعی یوم بدر کو "یوم فرقان" بنا دیا، جہاں حق کا حق ہونا نصرت الٰہی اور اہل ایمان کی قلیل جماعت کی سرفروشی کے باعث ثابت ہو گیا۔ یہ معرکہ حق کی کامل فتح کی ابتدائی کڑی ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کو ایک ابھرتی ہوئی قوت منوانے کا باعث بنا۔ اور بلاشبہ منتظرین میں سے کچھ مزید اصحاب عزیمت کو قافلہ حق میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ معرکہ ہائے حق و باطل کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ماسوائے غزوۂ احد کے، تمام معرکوں میں اہل ایمان فتح کے جھنڈے گاڑتے نصرت الٰہی کے سائے تلے آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ غزوۂ احد کی عارضی شکست بھی فی الحقیقت فتح ہی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، کیونکہ اس کار عظیم کے لئے میر کارواں سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی جس درجہ اطاعت کلی درکار تھی اس میں کمی کے اندیشے کے باعث اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی میں ایک جھٹکا دے کر اصلاح فرما دی۔ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بحیثیت سپہ سالار اور رہبر انقلاب کا تذکرہ ہے، چونکہ یہی وہ اہم پہلو تھا جس کے لئے ختم المرسلین ﷺ کے بعد اس کام کو لے کر اٹھنے والے قافلوں کے لئے رہنمائی مہیا کرنا مقصود تھا۔

قافلہ سخت جاں مکہ میں تربیت کی وہ منزلیں طے کر چکا تھا کہ اب وہ کندن بن چکے تھے اس لئے ہر معرکے کے بعد ان کی ہیبت کفر پر گہری ہوتی چلی گئی اور قافلہ مضبوطی و وسعت کی منزلیں طے کرتا اس اہم موڑ پر پہنچ گیا جب دشمنان اسلام انہیں ایک قوت کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے ان سے معاہدہ کرنے پر آمادہ ہوئے۔ ۶ھ میں ہونے والی صلح حدیبیہ کئی لحاظ

سے فتح مبین ثابت ہوئی۔ (ا) دشمن نے اہل ایمان کو اپنی ہم پلہ قوت تسلیم کر لیا۔
(اا) صلح کے باعث مسلمانوں کو دیگر علاقوں اور قبائل عرب تک دعوت اسلام پہنچانے کی مہلت میسر آئی' نیز قبائل یہود سمیت دیگر فتنوں کی سرکوبی کے لئے موقع فراہم ہو گیا۔
(ااا) صلح کی بناء پر مکہ اور مدینہ میں جانبین کی آزاد آمدورفت شروع ہو گئی۔ اس طرح اہل ایمان کی عظمت کردار اور اسلامی تہذیب سے متاثر ہو کر اس وقفے کے دوران اس قدر لوگوں نے اسلام قبول کیا جس کی مثال ماقبل عرصے میں ہرگز نہیں ملتی۔ حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ بن العاص نے اسی عرصے میں اسلام قبول کیا۔ گویا یہ صلح قوت اسلام میں بے پناہ اضافے کا باعث بنی۔

جب قریش نے صلح کے باعث اہل ایمان کو ایسی کامیابیاں حاصل کرتے دیکھا جو زمانہ جنگ میں انہیں حاصل نہ ہو پائی تھیں تو انہوں نے صلح توڑنے کی نیت سے معاہدے کی خلاف ورزی کی' جس پر رہبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر آخری معرکے کے لئے فوج کشی کا حکم دے دیا۔ اس طرح آپؐ دس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ مکہ کی طرف عازم سفر ہوئے۔ مکہ کے مضافات میں لشکر حق نے پڑاؤ کیا تو سردار مکہ ابو سفیان رات کے وقت جائزہ لینے کے لئے اس طرف آئے تو اللہ تعالیٰ نے آخری مرحلے میں شان رحمت کا ظہور فرماتے ہوئے ان کے لئے قبولیت اسلام کے حالات پیدا فرما دیئے (رضی اللہ عنہ)۔ یوں کفر کی کمر بالکل ٹوٹ گئی اور وہ قافلہ جو مجبور ہو کر اس سرزمین سے نکل گیا تھا' آج ہادی دوعالم ﷺ کی رہبری میں عجز و انکساری کی مجسم تصویر بنے اسی بستی میں اللہ عزوجل کا شکر بجالاتے فاتحانہ داخل ہو رہا تھا۔ محسن انسانیت رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان کو ایذا پہنچانے والے سہمے ہوئے گروہ کے لئے عام معافی کا اعلان فرما کر ان کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ وہ مرحلہ تھا کہ خاموش اکثریت جواب تک آخری فیصلے کی منتظر تھی وہ دھڑا دھڑ اسلام کی آغوش سلامتی میں داخل ہونے لگی۔ قبولیت اسلام کا یہ سلسلہ فتح مکہ سے شروع ہو کر دو سال تک برق رفتاری سے جاری رہا' حتیٰ کہ ۱۰ھ میں جب ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم آخری حج کے لئے تشریف لائے تو اس وقت تک پورا عرب اسلام کے زیر نگیں آچکا تھا اور ملک میں کوئی مشرک باقی نہ رہا تھا۔

اب ہم اس تجزیئے کی صداقت کو مزید مبرہن کرنے کے لئے سرچشمہ ہدایت قرآن حکیم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ گو کہ قرآن اور مجسم قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) عملاً ایک ہی وحدت کا نام ہے' لیکن قرآن حکیم سے استشہاد گویا سیرت رحمتہ للعالمین کی گواہی کو لاریب بنانے کا باعث بنے گا۔

اللہ رب العزت اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشخبری دیتے ہوئے سورۃ النصر میں فرماتے ہیں کہ

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝

"جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور (اے نبیؐ) آپؐ دیکھ لیں کہ لوگ فوج در فوج اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔"
(النصر آیت ۱'۲)

یہ سورۂ مبارکہ فتح مکہ سے ماقبل نازل ہوئی اور تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں فتح سے مراد فتح مکہ ہے۔ علامہ حافظ ابن کثیرؒ' مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ' شاہ عبد العزیز دہلویؒ' مولانا اشرف علی تھانویؒ' شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ' مولانا عبدالحیؒ' مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی اپنی تفاسیر میں ان آیات سے جو مراد لی ہے ان سب کا مفہوم یہ ہے کہ گو آغاز نبوت سے لوگ اسلام قبول کرتے آرہے تھے لیکن اس طرح کہ ایک ایک دو دو آدمی اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ لیکن عموماً عرب قبائل اسی کے منتظر تھے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم قوم پر غالب آجائیں اور مکہ معظمہ ان کے زیر نگیں آجائے تو پھر انؐ کے نبیؐ ہونے میں ذرہ بھی شبہ نہ ہوگا۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں مکہ فتح کرادیا تو اب جو لوگ اس انتظار میں تھے وہ فوج در فوج دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے' حتیٰ کہ سارا عرب مسلمان ہو گیا۔

مفسرین کرامؒ کا مجموعی مفہوم بیان کر دینے کے باوجود اگر علماء کرام میں سے دو کا اقتباس بھی نقل کردیا جائے تو بات الم نشرح ہو جائے گی۔ ہندوستان کے مولانا عبدالحی جو

غالباً اس صدی کے عظیم مجاہد مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے تلامذہ میں سے ہیں' پارہ عم کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

"جب کوئی نئی تحریک یا نیا طرز فکر لوگوں کے سامنے آتا ہے تو ایک عرصے تک اسے ایسے لوگوں سے نمٹنا پڑتا ہے جو اپنی پرانی روش کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے' اور آخر وقت تک اپنے عقیدوں' اپنے رواجوں اور اپنے باپ دادا کے طریقوں سے چمٹے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی ایسے لوگ بھی برابر بڑھتے رہتے ہیں جو اس نئی تحریک کا ساتھ دیتے ہیں اور نئے افکار کو قبول کر لیتے ہیں۔ ایک عرصے تک دونوں میں کشمکش جاری رہتی ہے۔ اس مدت میں عام لوگوں کی ایک بڑی تعداد آخری نتیجوں کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ذہن اور مزاج کے اعتبار سے خود کسی فیصلے پر پہنچنے کے بدلے یہ انتظار کرتے رہتے ہیں کہ دیکھیں آخر میں کس کا پلہ بھاری رہتا ہے' چنانچہ جب اس کشمکش کے نتیجے میں کسی ایک گروہ کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے تو یہ سب اسی کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال اس وقت عرب میں بھی تھی۔ ایک طرف اسلامی عقیدے اور اسلامی افکار کی تبلیغ ہو رہی تھی' دوسری طرف لوگ اس کی مخالفت پر کمر باندھے ہوئے تھے اور ایک عرصے سے دونوں میں کشمکش جاری تھی۔ اسلام کا پلہ رفتہ رفتہ بھاری پڑتا جا رہا تھا اور اب وہ وقت آ گیا تھا کہ اسلام اور کفر کے درمیان آخری فیصلہ ہو جائے۔ یہ فیصلہ فتح مکہ کی صورت میں سامنے آیا۔ مکہ فتح ہونے کے بعد کفر نے میدان چھوڑ دیا اور وہ لوگ جو اس آخری فیصلے کے انتظار میں تھے اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ یہاں تک کہ پورے ملک سے شرک اور کفر کا نام و نشان تک مٹ گیا۔"

مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیعؒ اپنی تفسیر موسوم بہ "معارف القرآن" میں اس سورۂ مبارکہ کی تفسیر میں رقم طراز ہیں کہ :

"فتح مکہ سے پہلے بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی رسالت اور اسلام کی حقانیت پر تقریباً یقین ہو چکا تھا مگر اسلام میں داخل ہونے سے ابھی تک قریش کی مخالفت کے خوف سے یا کسی تذبذب کی وجہ سے رکے ہوئے تھے۔ فتح مکہ نے وہ رکاوٹ دور کر دی تو فوج در فوج ہو کر یہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔"

الحمدللہ عقلی و نقلی دلائل سے یہ بات برہان قاطع کی طرح نکھر کر سامنے آ چکی ہے کہ انسانی تاریخ میں کسی بھی معاشرے میں جب مروجہ اقدار سے متصادم نظریہ پیش کیا گیا تو ابنائے نوع کی عظیم اکثریت نے کبھی بھی اسے آغاز ہی میں قبول نہیں کیا بلکہ اکثریت تو نئے اور پرانے نظریئے کی حامی منظم اقلیتوں کے مابین ہونے والی کشمکش کے آخری فیصلے کا انتظار کیا کرتی ہے۔ اس کے نزدیک وہی گروہ حق پر ہوتا ہے جو اس کشمکش سے سرخرو ہو کر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ تو اس فیصلے کے بعد یہ خاموش اکثریت یا گروہ منتظرین وقت ضائع کئے بغیر نئی غالب قوت کی مطیع ہو جاتی ہے اور ان کی تہذیب و اقدار کو اختیار کر لیتی ہے۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کشمکش اور تصادم کے بغیر محض دعاؤں' خواہشات اور دعوت و اصلاح سے باطل اہل حق کے لئے کبھی راستہ نہیں چھوڑتا اور نہ ہی اکثریت اپنی روش بدل کر نئی دعوت قبول کرتی ہے۔

اب ہم ارض پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کے حوالے سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ان تمام مسلم ممالک میں جو نظام رائج ہیں وہ نظام اسلام کے اصولوں کے عین مطابق ہیں؟ یعنی کیا یہاں حاکمیت مطلقہ صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو حاصل ہے؟ نیز معاشی میدان میں ملکیت کی بجائے یہاں امانت کا اصول رائج ہو جانے کے باعث مترفین اور محرومین کے طبقات موجود نہیں ہیں؟ اسی طرح معاشرتی تشکیل اسلامی اصول تقویٰ کی بنیاد پر ہے؟ یہاں طبقاتی اونچ نیچ ہرگز نہیں؟؟

الحمدللہ نظام اسلام کی سربلندی کے لئے کوشاں تمام احزاب ان سوالات کا جواب نفی ہی میں دیتے ہیں' جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے' جس سے اغماض برتا جا رہا ہے' کہ ضرورت اولین تو نظام کی تبدیلی کی ہے' کیونکہ موجودہ تمام نظام کفر و شرک پر مبنی ہیں۔ اور ظاہر ہے' جیسا کہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے' کہ باطل کی گرفت توڑے بغیر' نظام

کفر دیے بغیر' حکومت و اقتدار کا حصول بے معنی بن جاتا ہے۔ چونکہ باطل نظام کے تحت حکومت اس نظام کی وفاداری کا دم بھرنے یا آج کے الفاظ میں اس کے تحفظ کا حلف اٹھانے ہی سے ملتی ہے اس لئے اسلام کے غلبے کے لئے انتخابی میدان بے سود ہی نہیں منزل سے دور کرنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی جماعتوں کی کوشش سے موجودہ نظام میں جزوی اصلاح اس کی عمر بڑھانے کا باعث بن رہی ہے۔ جبکہ انقلاب کے داعی نظام باطل کے لئے اصلاح کرنے والے ہرگز نہیں ہوا کرتے۔ انقلاب کی تو بنیاد ہی مروجہ نظام کو باطل اور انسانیت کے لئے ناسور ثابت کرتے ہوئے انسانیت کی فلاح والے نظام کی دعوت سے پڑتی ہے۔ گویا انقلابی' نظام باطل کے اولین باغی ہوا کرتے ہیں' جو اس کی اقدار سے سمجھوتہ ہرگز نہیں کرتے' جبکہ انتخاب تو مروجہ نظام کے آئین و قانون کی کامل اطاعت کر کے ہی لڑے جاتے ہیں۔ گویا انتخاب لڑنے والے اس آئین و قانون کو درست تسلیم کرتے ہیں۔ جبکہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں عملاً انتخابی میدان میں ہوتے ہوئے اس نظام کی تائید بھی کرتی ہیں لیکن قولی طور پر اس نظام کو بدل کر اسلام کا نظام قائم کرنے کے بلند و بانگ دعوے بھی کرتی ہیں۔ معذرت کے ساتھ' اس سے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بھئی یہ شجر تو کیکر کا ہے لیکن ہم اس کے اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم اس درخت پر آم کا پھل لگا دیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دل کی گہرائیوں سے التجا ہے کہ وہ ذات جس کی دو انگلیوں میں مخلوق کے قلوب ہیں' وہ ہمارے ان مخلص قائدین و کارکنان کو یہ فرق سمجھا دے کہ آم کا پھل حاصل کرنے کے لئے کیکر کا درخت جڑ سے اکھاڑو پھر آم کا تخم زمین میں دبا کر اس کی آبیاری کرو' گرم و سرد ہواؤں سے اس کی حفاظت کرو' پھر جب وہ درخت اپنے شباب پر پہنچ جائے تب اس کے شیریں پھل سے خود بھی مستفید ہوا کرو اور دیگر ابنائے نوع کو بھی اس پھل سے متمتع ہونے کا موقع فراہم کرو' جو خود اتنے کٹھن مراحل سے گزر کر یہ ثمر حاصل نہیں کر سکتے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق و بصیرت سے نوازے کہ ہم اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم'

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

نکار و آراء

علّامہ اقبال کے ایک شعر کی تشریح

از سید عبدالعزیز بخاری

"تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!"

محولہ بالا شعر میں علامہ اقبال علیہ الرحمتہ یہ ازلی حقیقت واضح کرتے ہیں کہ اس ئنات میں زندگی کا انحصار جدوجہد سے قوت حاصل کرنے میں مضمر ہے۔ جو بھی اس یقت سے صرفِ نظر کرے گا وہ زندگی کے مفہوم اور اس کی لذتوں سے نا آشنا رہے گا اور ت اس کا مقدر ہو گی۔ علامہ کے ہاں زندگی صرف سانس کی آمد و رفت کا نام نہیں بلکہ ندگی جدوجہد اور قوت کے اظہار کا دوسرا نام ہے۔ اسی طرح اقبال کے نزدیک موت رف سلسلۂ تنفس کا انقطاع نہیں بلکہ جمود کی کیفیت میں مبتلا اور خودی سے عاری وجود جس ں تخلیقی صلاحیتیں مفقود ہوں مردہ ہے۔ نیز وہ اپنے مقصد حیات اور عقائد کے مطابق عملی ندگی نہ گزار سکنے کی حالت کو بھی موت سے تعبیر کرتے ہیں :

۱) اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن ' فکاں ہے زندگی

۲) وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

گویا زندگی نام ہے قوت تخلیق کا' طاقت و جبروت کا ----- اور موت بے عملی' جمود' کمزوری یا ضعیفی کا نام ہے۔

اس نقطہ کو سمجھنے کے لئے اگر آپ مظاہر فطرت پر نظر دوڑائیں تو یہ حقیقت ہمارے

مشاہدے میں آتی ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگلتی دکھائی دیتی ہے۔ جنگل میں شیر اپنے سے کمزور و ناتواں جانوروں کو چیرتا پھاڑتا دکھائی دیتا ہے۔ باز اپنے پنجوں میں کنجشکِ فرومایہ کو دبوچتا نظر آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ندی نالے دریاؤں کا اور دریا سمندروں کا پیٹ بھرتے نظر آتے ہیں۔ الغرض یوں نظر آتا ہے کہ قدرت نے زندہ رہنے کا حق صرف اسے ہی تفویض کیا ہے جو کماحقہ' اس کی قوت اور صلاحیت رکھتا ہے۔

یہ تو ہیں تکوینی قوانین۔ انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اس لئے اس پر تشریعی قوانین کا بھی اطلاق ہوتا ہے جس کی وضاحت کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاہم جرمِ ضعیفی کی سزا سے انسان بھی بچ نہیں سکتا اگرچہ اس کا پیمانہ جدا ہے۔ انسان کے لئے ضعف یہ ہے کہ وہ اپنا مقصد زندگی' اپنے عقائد اور نظریات حیات کو یکسر فراموش کرکے اس کے مبادیات پر عمل کرنا چھوڑ دے اور بے عملی اور کہالت و جمود کی زندگی گزارے۔ ایسا انسان ایک چلتی پھرتی لاش کی مانند ہے۔

یہی اصول قوموں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ جو قوم بھی اپنے نظریۂ حیات پر عمل پیرا نہ ہو گی اور اس کے حصول کے لئے جدوجہد نہ کرے گی وہ بالآخر صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی اور موت اس کا مقدر ہو گی۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں کہ نظریۂ حیات کونسا ہو۔ وہ جو نظام حیات بھی اپنے لئے پسند کرے' خواہ وہ سرمایہ دارانہ نظام ہو' اشتراکی سوشلسٹ نظام یا کوئی اور ---- اس کے ساتھ صدق دل سے وابستگی اور اس کے اصولوں اور مبادیات پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونا ہی کامیابی اور حصول قوت کی دلیل ہے۔ جونہی کوئی قوم اپنے نظریہ حیات کا دامن چھوڑ دیتی ہے اس کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور وہ کرچی کرچی ہو جاتی ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ روس دنیا میں ایک سپرپاور کی حیثیت سے دندناتا پھرتا تھا مگر اپنے اشتراکی نظریات سے انحراف کی وجہ سے وہ سپرپاور اب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ضعف کا شکار ہو چکی ہے۔

اب آیئے امتِ مسلمہ کی طرف۔ ہم نے جب تک اپنے مقصدِ زندگی اور نظریۂ حیات کے ساتھ وابستگی قائم رکھی اور اس کے لئے جدوجہد کرتے رہے ہماری شان یہ تھی کہ ہم

نے عرب کے صحراؤں سے اٹھ کر ساری دنیا پر اپنی قوت و طاقت کا سکہ بٹھا دیا اور اپنی حشمت و شوکت کا دبدبہ قائم کیا' غیر مہذب دنیا کو ایک اعلیٰ تہذیب و تمدن سے روشناس کیا' اسے علم و ادب' سائنس اور تحقیق کی روشنی عطا کی۔ دنیا کو توحید' عدل و مساوات اور انسانی حقوق کا سبق پڑھایا اور اس طرح اسے انسانیت کی معراج دکھلائی۔ لیکن جب ہم نے اپنے مقصدِ زندگی اور نظامِ حیات سے روگردانی اختیار کی' علمی و عملی میدان میں جمود و تعطل کا شکار ہوئے' بے اتفاقی اور فرقہ پرستی کی لعنت میں گرفتار ہوئے تو ضعف و کمزوری میں مبتلا ہو کر بالآخر غیروں کی غلامی کا شکار ہوئے۔ وہ امتِ مسلمہ جس نے دنیا کو عدل و مساوات اور انسانی حقوق کے چارٹر سے روشناس کیا آج اس قدر کمزور اور لاچار ہو چکی ہے کہ آج ہمیں غیر اقوام انسانی حقوق کا درس دینے لگی ہیں اور آج ہم پر بنیاد پرستی کی پھبتی کسی جا رہی ہے۔ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ ہم تو اپنی بنیاد ہی بھلا بیٹھے ہیں مگر پھر بھی بنیاد پرست کہلاتے ہیں اور وہ جو شیطانی طاقت کے نشہ میں مست انسانیت کی بنیادوں کو ہی کھوکھلا کر رہے ہے انسانی حقوق کے داعی و پاسدار کہلاتے ہیں۔

ہمارے ملک پاکستان کی تو بنیاد ہی ایک نظریہ پر رکھی گئی ہے اور وہ ہے نظریہ نظامِ اسلام۔ اسی کا دوسرا نام نظریہ پاکستان ہے۔ افسوس کہ ہم تاحال اس نظریہ پر قائم نہ ہو سکے نہ ہی اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھال سکے' جس کے نتیجہ میں ہم کمزور سے کمزور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم اپنے نظریہ حیات پر مضبوطی سے قائم رہتے تو یقیناً آج ہم ایک طاقتور قوم ہوتے اور ہمارا ازلی دشمن بھارت بار بار ہمیں اپنی جارحیت کا شکار نہ بناتا۔ نہ وہ ہم سے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کر پاتا اور نہ ہی ہمارے کشمیری مسلمانوں پر جو ظلم و ستم وہ ڈھا رہا ہے اور بے گناہ مسلمانوں کا بے دریغ خون بہا رہا ہے اور پھر عصمت مآب بیبیوں کے دامن چاک کر رہا ہے اسے ایسا کرنے کی جرأت ہوتی اور مسئلہ کشمیر کب کا حل ہو چکا ہوتا۔

حسنِ اتفاق سے ہم نے تھوڑی سی ایٹمی صلاحیت حاصل کر لی ہے مگر دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ اور منی سپر پاور بھارت جو خود تو ایٹمی ہتھیاروں کے انبار لگا رہے ہیں' ہم پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ ہم اپنی حاصل کردہ ایٹمی صلاحیت کو رول بیک کر کے ختم کر دیں تاکہ ہم

امریکہ کے دست نگر بن کر رہ جائیں اور بھارت کے لئے تر نوالہ۔

میری مینائے غزل میں ہے ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ وہ بھی حرام ہے اے ساقی!

ہمیں اپنے دشمنوں کی چالوں سے باخبر رہنا چاہئے اور ہرگز ہرگز ایٹمی صلاحیت سے دستبردار نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ خدانخواستہ ؏ ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔ اگر ہم کمزور نہ ہوں گے تو کوئی دوسرا ہم پر اپنی شرائط مسلط نہ کر سکے گا۔

یاد رکھئے، کمزوری ہمیشہ جارحیت کو دعوت دیتی ہے! ہماری کمزوری اور ضعف کی دوسری بڑی وجہ اپنے دستورِ حیات یعنی قرآن حکیم کے احکامات سے روگردانی ہے۔ قرآن کریم نے سب مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بنا کر محبت و اخوت کا سبق دیا مگر ہم اپنے ہی بہن بھائیوں کے گلے کاٹ رہے ہیں اور قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں آپس میں اتحاد و اتفاق قائم کرنے اور تفرقہ بازی سے منع کیا ہے مگر ہم تفرقہ بازی، افتراق و انتشار اور صوبائی و لسانی تعصبات کا شکار ہو گئے۔ قرآن کریم نے ہمیں علم و حکمت کے حصول اور اس کائنات کو مسخر کرنے کی تلقین کی مگر کس قدر رنج و افسوس کا مقام ہے کہ علوم و فنون تو در کنار ہماری معمولی شرح خواندگی بھی دنیا کے تمام ممالک سے کم تر ہے۔ غرض ہم ہر قسم کی اخلاقی پستی، جہالت، بے راہ روی اور باہمی منافرت کا شکار ہو کر ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

ظاہر ہے کہ جب ہم ان تمام علمی، اخلاقی اور روحانی اقدار سے جن سے زندگی کے سوتے پھوٹتے ہیں دور ہوتے چلے جائیں گے تو پھر بقول علامہ اقبال مرحوم ہمارے اس جرم ضعیفی کی سزا بجز مرگِ مفاجات اور کیا ہو سکتی ہے؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر ہم نے اس مرگ مفاجات سے بچنا، زندہ رہنا اور زندہ قوموں میں شمار ہونا ہے تو پھر علمی، اخلاقی، روحانی اور مادی قوت کا حصول لازمی ہے جس

کے لئے کم از کم مندرجہ ذیل اقدامات ضروری ہیں:

۱۔ نظریہ پاکستان کے ساتھ سختی سے وابستگی اور اس کے مطابق انفرادی و قومی زندگی گزارنے کا عزم بالجزم۔
۲۔ ملک میں افراتفری اور انتشار ختم کر کے سیاسی و معاشی استحکام لانا۔
۳۔ صوبائی و لسانی تعصبات ختم کر کے اور مذہبی تفرقہ بازی سے نجات حاصل کر کے قائد اعظم کے اصولوں 'ایمان' اتحاد اور تنظیم پر عمل پیرا ہو کر ایک پاکستانی قوم بنا۔
۴۔ جدید ترین سائنسی' فنی اور ٹیکنیکل علوم کی ترویج کے لئے درسگاہوں کا فروغ اور انگریزوں کے دیئے ہوئے موجودہ نظام تعلیم کو ختم کر کے اپنے قومی و ملی تقاضوں کے مطابق جدید نظام تعلیم کا اجراء۔
۵۔ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے ساتھ ساتھ اس کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لئے' جس میں کشمیر بطور شہ رگ شامل ہے' افواج پاکستان کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کرنا اور اپنی بری' بحری' فضائی افواج کو ناقابل تسخیر بنانے کے لئے ہر قیمت پر ایٹمی طاقت کا فروغ تاکہ دشمن ہماری طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکے۔
۶۔ دوسرے ممالک پر انحصار کی بجائے خود انحصاری کی پالیسی اپنانا اور تمام اسلامی ممالک کے ساتھ ہر قسم کے برادرانہ روابط بڑھا کر انہیں متحد کر کے ایک مضبوط اسلامی بلاک بنانا تاکہ مسلم امہ اغیار کے چنگل سے نکل کر دنیا کی ایک سپرپاور بن سکے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

۷۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مغربی تہذیب کی بیخ کنی اور اسلامی تہذیب کا احیاء اور فروغ اور قرآنی تعلیمات پر عمل کرنا۔

یاد رہے کہ امتِ مسلمہ کے لئے مادی قوت کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی قوت کا حصول لازم و ملزوم ہے تاکہ اس قوت کے حصول سے ہم پہلے اپنے ملک میں اور پھر سارے جہان سے ظلم و جور مٹانے اور عدل اجتماعی کے فروغ میں مدد لے سکیں۔

یہی ہے نظریہ پاکستان کا تقاضا اور اسی سے تکمیلِ پاکستان وابستہ ہے۔
سبق پھر پڑھ صداقت کا' عدالت کا' شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

شرعی پردہ --- ایک قابلِ تقلید مثال

حلقہ خواتین تنظیم اسلامی کراچی سے منسلک ایک خاتون کا اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے نام خط جو بہت سی دوسری خواتین کے لئے مینارۂ نور بن سکتا ہے

محترم بھائی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں مسلمان گھرانے میں پیدا فرمایا اور ہمیں کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ پڑھنا نصیب فرمایا۔ دیکھا جائے تو یہ کلمہ ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے ہم پابند ہیں کہ اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند و ناپسند کو فوقیت دیں۔ اس کلے کو زبان سے ادا کرنے کے بعد ہم پر لازم ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکامات کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں اور ان کو بجالانے کی حتی الامکان کوشش کریں' چاہے ہمارا نفس انہیں پسند کرے یا ہمیں اپنے اوپر جبر کرنا پڑے' چاہے ان کی بجا آوری آسان ہو یا اس کے لئے ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے' چاہے ان احکامات پر عمل کرنے کی وجہ سے ہمارے رشتے دار ہم سے ناراض ہی کیوں نہ ہو جائیں اور چاہے زمانے اور برادری کا رواج ان کے بالکل برعکس ہی کیوں نہ ہو۔

محترم بھائی! جب سے میں نے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی ہے مجھ پر یہ بات دن بدن واضح ہوتی چلی گئی کہ قرآن حکیم کی رو سے ایک مسلمان عورت پر پردہ کرنا لازم ہے۔

کونسا پردہ؟ رواجی نہیں' بلکہ شرعی پردہ۔ (ایک مسلمان عورت کو کن کن مردوں سے پردہ کرنا چاہئے؟ اس کی تفصیل منسلکہ ہینڈ بل میں درج ہے)۔ ان تعلیمات پر اب تک عمل نہ کر کے میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا مجرم سمجھتی رہی ہوں۔ گو کہ اس سلسلے میں ایک رکاوٹ حالات کی عدم موافقت تھی لیکن اصل سبب میری اپنی کم ہمتی تھی۔

ایک حدیثِ قدسی کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے بندے تُو دنیا کو راضی کرنے کی خاطر مجھے ناراض کر دیتا ہے اور دنیا بھی تجھ سے راضی نہیں ہوتی۔ اگر تو مجھے راضی کرنے کے لئے دنیا کی ناراضگی کی پرواہ نہ کرے تو میں تو راضی ہوں گا ہی دنیا بھی تجھ سے راضی ہو جائے گی۔ چنانچہ اب میں نے عزم مصمم کر لیا ہے کہ حالات چاہے کیسے بھی ہوں میں اپنے رب کو مزید ناراض نہیں کروں گی' کیونکہ ہم میں سے ہر ایک کو مرنے کے بعد اللہ کے حضور انفرادی طور پر اپنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ وہاں کوئی بھائی کسی بہن کے کام آئے گا نہ کوئی باپ اپنی بیٹی کے۔ میں چاہتی ہوں کہ روز محشر جب میرا محاسبہ ہو تو میں عرض کر سکوں کہ یا اللہ تیرے دین کی خاطر جو کچھ بھی میرے بس میں تھا میں نے کیا۔ جہاں جہاں میرا اختیار تھا وہاں میں نے تیرے احکامات پر عمل کرنے کی امکان بھر کوشش کی تھی۔

مجھے احساس ہے کہ میرا یہ فیصلہ آپ کے لئے بہت ہی حیران کن اور بعض معاملات میں مشکلات کا باعث ہو گا۔ لیکن یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہی میں ہمارے لئے دنیا و آخرت کی فلاح مضمر ہے۔

اللّٰھم ثبّت اقدامنا علٰی دینک' اللھم ثبّت اقدامنا علٰی طاعتک

والسلام مع الاکرام

آپ کی دینی بہن

بے تیغ سپاہیو!

ضرب مومن کیلئے شمشیر قرآنی کا استعمال ضروری ہے

—— از : محمد سمیع 'کراچی ——

آپ کو اسلحے کی تلاش ہے؟ خوش آمدید! ضرور تلاش کیجئے!! جی ہاں میرے پاس ایک اسلحہ تو ہے لیکن اسے تلاش آپ کو کرنا پڑے گا۔ نہیں ملا وہ اسلحہ آپ کو؟ یقیناً آپ کو وہ اسلحہ مل ہی نہیں سکتا' حالانکہ وہ آپ کی نظروں کے سامنے ہے اور وہ خود دیدہ ور کی تلاش میں ہے کہ ہم لوگ اسے بھول چکے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ اسلحہ ہے کہ جس کے ضرب کاری سے شیطان لعین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ شیطان جو ہماری رگوں میں خون کی طرح گردش کر رہا ہے اور جس نے ہمارے خون کو اتنا گرم کردیا ہے کہ ہم آپے سے باہر ہو کر اپنے ہی کلمہ گو بھائیوں کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ بظاہر وہ ہمارے اسلحے سے ہلاک ہو رہے ہیں' لیکن اصلاً یہ ابلیس کے ضرب کاری سے لہولہان ہو رہے ہیں۔ ہماری رگوں میں شیطان کی گردش نے ہمارے دماغ کی شریانوں کو بھی متاثر کیا ہوا ہے۔ نتیجتاً ہمارے دماغ سازشوں کے اڈے بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا دماغ جو ایک مومن کا دماغ ہونا چاہئے تھا کہیں پنجابی کا دماغ بنا ہوا ہے تو کہیں سندھی کا' کہیں پٹھان کا دماغ بنا ہوا ہے' کہیں بلوچ کا اور کہیں مہاجر کا۔ اور ہر دماغ ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے۔ یہ بیماری پہلے بنگالی مسلمان کے دماغ میں پیدا ہوئی اور دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت دولخت ہوئی۔ اب کہیں سندھو دیش کی صدائیں ہیں تو کہیں مہاجر صوبہ کی "داز" ہے۔ اغیار تاک میں ہیں کہ کب انہیں موقع ملے اور کب وہ بقیہ ماندہ مسلم مملکت کے ٹکڑے کردیں۔ ہمارا اسلحہ جو دشمن کے خلاف استعمال ہونا چاہئے تھا ہمارے ہی گھروں میں اونچے اونچے مقامات پر منتظر ہے کہ اسے استعمال کیا جائے۔ لیکن ہم لوگ اس اسلحے سے

غافل ہیں۔ اتنا قیمتی اسلحہ جس کے استعمال سے نہ صرف یہ کہ ہم خود مومن بن سکتے ہیں بلکہ ایٹم بم کے استعمال کی دھمکی دینے والوں کو 'F-16 روکنے والوں کو' ایٹی توانائی سے ہمیں بہرہ ور نہ ہونے دینے والوں کو' بلکہ ان کو بھی جو ان سب کی پشت پر ہمارے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں' مسلمان بنا سکتا ہے۔ یہ اسلحہ ان لوگوں کے خلاف بھی استعمال ہو سکتا ہے جو اس ملک میں لسانی' علاقائی اور مذہبی فرقہ واریت پھیلانے میں مصروف ہیں اور ان کو بھی ہدایت کی راہ پر لگا سکتا ہے جو اس ملک کو سیکولرزم کی راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جی ہاں' ہمارا وہ اسلحہ یہ "قرآن کریم" ہی ہے۔ آپ خوب سمجھے۔ یہ قرآن کریم ہی ہے جو لوگوں کی فکر میں انقلابی تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ میرے فوجی بھائیو' میرے رینجرز کے نوجوانو اور میرے سپاہیو۔ اس اسلحہ کو استعمال کرنا سیکھو۔ اگر تم نے اس اسلحہ کو استعمال کرنا نہ سیکھا تو ہر آنے والی حکومت تمہیں اپنے ہی بھائیوں کے خلاف استعمال کرتی رہے گی اور تم نفرت کا نشانہ بنتے رہو گے۔ اس اسلحے کو پہلے اپنے سرکش نفس کے خلاف استعمال کرو۔ پھر اس اسلحے کو لوگوں میں بانٹو۔ اس سے محبت' اخوت اور صبرو تحمل اور رواداری کی گولی چھوٹے گی جس کے ذریعے معاشرہ فساد سے پاک ہو گا' تفرقہ سے پاک ہو گا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا" یعنی "اللہ کی رسی (قرآن کریم) کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔" اللہ تمہارا حافظ و ناصر ہو۔

بقیہ : نظریۂ انقلاب پر مخاطبین کا ردِ عمل

جو لاریب کل انسانیت کے لئے مینارۂ نور ہیں' کی سیرت پاک سے مراحل انقلاب سمجھیں اور ان پر عمل پیرا ہو کر دین حق کو غالب کر سکیں' تاکہ نظام باطل جو انسانوں کی عظیم تر اکثریت کو شکم کی فکر میں مبتلا کر کے ان کے خالق و مالک سبحانہ و تعالیٰ سے دوری کا باعث بنا ہوا ہے' خس و خاشاک میں مل کر نابود ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔ آمین یارب العالمین واحکم الحاکمین ○○○

خطوط و نکات

رفقاءِ تنظیم اسلامی کیلئے چند لمحاتِ فکریہ

اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک فعال کارکن کا خط

امیر تنظیم اسلامی کے نام

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'!

خدا کرے آپ ایمان و صحت کی بہترین حالتوں میں رہتے ہوئے رضائے الٰہی کے حصول کے لئے کوشاں ہوں۔

ماہ اپریل میں آپ سے ایک تفصیلی ملاقات ہوئی تھی جو آپ کی محبت کے سبب میرے لئے بڑی یادگار اور موثر رہی تھی۔ اس وقت آپ نے اپنی کچھ کتب ہدیتاً مجھے دی تھیں جن میں سے بیشتر کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اس دوران تسلسل سے دفتر تنظیم اسلامی ---- سے رابطہ بھی رہا اور ---- صاحب سے ڈسکشن بھی ہوتی رہی۔ "میثاق" اور "ندائے خلافت" کا مستقل قاری ہوں۔ اس وقت سے تحریک اسلامی اور اقامت دین کے کام کے بارے میں سوچ و بچار جاری ہے۔ جماعت اسلامی اور جمعیت کی کیفیت' دیگر دینی جماعتوں کی صورتحال' تنظیم اسلامی اور تنظیم الاخوان کے بارے میں سوچتا رہا۔ الحمد للہ کہ اس بات پر یکسوئی بڑھتی جا رہی ہے کہ اصولی انقلابی کام وہی ہے جو جماعت اسلامی نے ابتدائی سالوں میں کیا تھا اور جس سوچ اور فکر پر آج تنظیم اسلامی آگے بڑھ رہی ہے۔ جماعت اسلامی کی فکری اور عملی غلطیوں کے بارے میں آپ نے جو تجزیئے کئے ہیں ان پر خوب غور کیا ہے اور میں انہیں درست سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے جن غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور بعض اہم معاملات میں جو اجتہاد کیا ہے اگر جماعت کی قیادت انہیں سمجھے اور اس کے مطابق اصلاح کی کوشش کرے اور نیا لائحہ عمل تشکیل دے تو انشاء اللہ وہ پھر عالم اسلام کی نمائندہ تحریک اسلامی بن سکتی ہے۔ مجھے آپ کے تین اہم خیالات سے پورا اتفاق ہے

یعنی رجوع الی القرآن' منہج انقلاب نبوی ؐ اور آج کے دور میں امربالمعروف ونہی عن المنکر کا طریق کار اور رجوع الی الخلافت۔ اسی طرح انتخابات کو خیرباد کہنا اور بیعت کا طریقہ اختیار کرنا اور Cadres پر مبنی تنظیم' اقامت دین کے کام کی اہم ضرورتیں ہیں۔ یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی اپنے روایتی اور ٹھوس انقلابی فکر اور طریقہ کار کو تقریباً چھوڑ چکی ہے اور ایک طویل عرصہ گومگو کی کیفیت میں رہنے کے بعد اس نے اپنی نئی حکمت عملی مرتب کرلی ہے جو سیاسی نوعیت کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جماعت کی موجودہ قیادت اور بالخصوص خرم مراد صاحب قیام پاکستان کے بعد طریقہ کار کی تبدیلی اور اس کے نتائج کو سمجھ چکے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت جماعت سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں لیکن بدقسمتی یہ کہ چونکہ اب وہ ۳۰' ۴۰ سال کے کام کو غلط نہیں کہنا چاہتے لہٰذا اسی اصولی طریقہ کار کی طرف لوٹنے کے بجائے انہوں نے تحریکی مسائل میں "اجتہاد" کا راستہ اپنالیا ہے اور محترم خرم صاحب کا کہنا ہے کہ ۴۷ء کے بعد ہم نے طریقہ کار میں جو تبدیلی کی تھی یعنی انتخابی سیاست اور عوامی سطح پر کام کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کے لئے موجودہ تنظیمی ڈھانچہ درست نہیں ہے۔ بات ایک اعتبار سے تو درست ہے مگر افسوس یہ کہ ان کے نزدیک غلطی طریقہ کار کی تبدیلی نہیں بلکہ تنظیمی ڈھانچہ کی ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں گزشتہ ۴' ۵ سالوں سے قاضی صاحب اور ان کے رفقاء نے خاصی کوشش کی ہے کہ موجودہ تنظیمی ڈھانچے کو بدلا جائے اور کھول دیا جائے اور عوامی رابطہ کرکے اقتدار بہرصورت حاصل کیا جائے اور انتخابات سے نکلنے کے بجائے اپنے ڈھانچے اور طریقہ کار کو اس کے مطابق بنا کر فیصلہ کن سیاسی جدوجہد کی جائے۔ اسی بنا پر محترم طفیل صاحب' نعیم صدیقی صاحب اور دیگر پرانے اکابرین کا اختلاف چلتا رہا اور اس پر خوب لے دے ہوئی۔ بیانات واستعفوں کے بعد اب جماعت اس بحران سے نکل گئی ہے۔ کچھ لوگ خاموش ہوگئے ہیں اور کچھ باہر نکل گئے ہیں۔ تحریکی مسائل میں اجتہاد کا راستہ زیادہ تر سوڈان میں اخوان المسلمون کی ڈاکٹر حسن ترابی صاحب کے زیر قیادت اہم پالیسیوں میں تبدیلی کے باعث اختیار کیا گیا ہے۔ انہوں نے چار اہم فیصلے کئے ہیں۔

۱۔ اخوان المسلمون کا نام ختم کرکے نیشنل اسلامک فرنٹ بنایا گیا ہے۔

۲۔ درجہ بندی (Cadres) ختم کرکے ممبرشپ کو ہر خاص و عام کیلئے کھول دیا گیا ہے۔
۳۔ شوریٰ کے فیصلوں کو اخفاء میں رکھنے کے بجائے اس کے اجلاس و فیصلے اخبارات میں شائع کئے جائیں گے۔
۴۔ جمہوری نظام کی مخالفت کے بجائے اس سے ہم آہنگی پیدا کی جائے گی اور کامیابی کے لئے جمہوری ذرائع اختیار کئے جائیں گے۔

چنانچہ اب امیر کے بجائے سیکرٹری جنرل کا عہدہ بنایا گیا ہے اور مجلس شوریٰ کے بجائے ایڈمنسٹریٹر بیورو اور پولٹ بیورو کے ادارے بنائے گئے ہیں جو انتظامی اور سیاسی مسائل کو علیحدہ علیحدہ deal کریں گے۔ اگست ۹۶ء کے ترجمان القرآن میں سوڈان میں تحریک اسلامی کی نئی سیاسی حکمت عملی کے بارے میں مضمون چھپا ہے جو بڑا اہم ہے۔ اسی کی پیروی میں محترم خرم صاحب نے اسلامک فرنٹ اور پاسبان کے نقشے جماعت کے سامنے رکھے تھے۔ رکنیت اوپن کرنے کے معاملے میں شوریٰ میں خاصی مخالفت ہوئی اور ارکان بھی بمشکل یہ کڑوی گولی نگلیں گے اس لئے ارکان کے سامنے کھول کر اس فیصلے کو بیان کرنے کی ہمت نہ کی گئی اور متبادل پلیٹ فارم بنائے گئے ' جس پر اختلافات چلتے رہے مگر اب جماعت "تحریک بیداری ملت" کے نام سے نئی سیاسی حکمت عملی کا آغاز کر رہی ہے جس کے مطابق کھل کر سیاسی کام کیا جائے گا اور مختلف لوگوں کو نئے پلیٹ فارم پر جمع کرکے انتخابات میں حصہ لیا جائے گا۔ اگرچہ مجھے کامیابی کی توقع تو نہیں مگر بالفرض کامیابی کی صورت بن بھی گئی کہ قاضی صاحب بہت متحرک شخصیت اور پرعزم انسان ہیں تو بھی مکمل اسلامی انقلاب نہ آ سکے گا اور صرف ۵۰' ۶۰ فیصد مثبت تبدیلی آئے گی۔ بہرحال اس تفصیل کو بیان کرنے سے مقصد یہ تھا کہ جماعت بجائے انتخابات سے نکلنے کے مزید اس کی طرف بڑھ گئی ہے اور آئندہ شکست کی صورت میں مجھے اس بات کا خدشہ ہے کہ کارکنوں میں مسلح تصادم کے جذبات بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور بڑی تعداد میں عسکری تربیت یافتہ نوجوان بھی موجود ہیں۔ یہ سب کچھ اسی لئے ہوا ہے کہ سید مودودیؒ آخری مرحلے کی واضح تصویر پیش نہ کر سکے اور انتخابات کو آخری مرحلہ سمجھ بیٹھے جو جماعت کے لئے آج تک آخری مرحلہ ثابت نہ ہو سکا مگر کوئی متبادل راستہ بھی جماعت کو نظر نہیں آ سکا اور مولانا کے بعد اور کوئی مفکر بھی

دستیاب نہ ہو سکا اگر کسی درجے میں کوئی فکری رہنمائی دینے والا ملا بھی ہے تو وہ محترم جناب خرم مراد صاحب ہیں جو "اجتہاد" کر رہے ہیں مگر سیاسی حکمت عملی کے معمار ثابت ہو رہے ہیں نہ کہ اصولی' انقلابی طریقے کی طرف پلٹنے والے۔

میں نے یہ بات بھی محسوس کی ہے کہ جماعت اور جمعیت کی قیادت اور ارکان تک آپ کے افکار نہیں پہنچ سکے۔ عام طور پر تنظیم اسلامی کے افراد یہی سمجھتے ہیں کہ جماعت اور جمعیت کی قیادت ڈاکٹر صاحب کے بارے میں معاندانہ جذبات رکھتی ہے' میں نے اس بات کا خوب جائزہ لیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ معاندانہ جذبات جماعت کے وہی لوگ رکھتے ہیں جو ۵۷ء کے سانحہ کے وقت موجود تھے یا مزید چند سال بعد جماعت میں شامل ہوئے تھے۔ مگر جماعت کی موجودہ قیادت جو اسلامی جمعیت طلبہ سے آئی ہے اس کے آپ سے اختلافات میں وہ تلخیاں شامل نہیں ہیں جو پرانے لوگوں کی ہیں۔ میری خواہش رہی ہے کہ جماعت یا جمعیت کے حلقوں میں آپ کا تذکرہ ہو تاکہ مجھے ان حلقوں کے آپ کے بارے میں جذبات کا اندازہ ہو سکے مگر حیرت ہے کہ بہت کم آپ کا تذکرہ ہوتا ہے اور جب بھی تذکرہ ہوا معاندانہ نہیں بلکہ ناواقفانہ انداز میں ہوا ہے۔ جماعت کے لوگوں کو نہ تو اس بات کا پتہ ہے کہ آپ یا دیگر افراد جماعت سے کیوں نکلے تھے اور نہ ہی اس بات کا کہ اب آپ کے افکار و نظریت اور آراء کیا ہیں۔ صرف اتنا پتہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب بھی جماعت سے نکلے تھے اور اسی حوالے سے ہلکی سی ناقدانہ رائے موجود ہے کہ انہیں بیچ میں رہنا چاہئے تھا اور بس اس سے آگے کچھ علم نہیں۔ دراصل جماعت کے اندر بھی اب دوسری اور تیسری نسل آچکی ہے۔ شہروں کی اور بالائی قیادت جمعیت سے فارغ ہونے والے افراد پر مشتمل ہے جس کی آپ سے تلخیاں وابستہ نہیں ہیں مگر آپ کی فکر سے آگاہ بھی نہیں ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تنظیم اسلامی کی طرف سے بھی جماعت کے افراد کے ساتھ رابطے کی کوئی موثر کوششیں نہیں ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے آپ کا فکر دوسروں تک پہنچانا تو آپ کے کارکنوں کا کام ہے۔ لیکن دوسری غلطی اور لاپرواہی بہرحال جماعت کے لوگوں کی ہے کہ وہ اقامت دین کا بلند ترین کام سرانجام دینے جا رہے ہیں تو انہیں ارد گرد بھی نگاہ رکھنا چاہئے' رابطہ بھی رکھنا چاہئے وسیع القلبی کا مظاہرہ بھی کرنا چاہئے مگر افسوس جماعت

اور تنظیم اسلامی میں ابھی تک فاصلے موجود ہیں تعلقات استوار نہیں ہو سکے اور نہ ہی تبادلہ خیال ہو سکا اور اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ تنظیم کا لٹریچر جماعت کے حلقوں میں پہنچے۔ پھر یہ کہ اقامت دین کی سوچ رکھنے والی جو ۳ '۴ دینی جماعتیں پاکستان میں موجود ہیں انہیں قریب آنا چاہئے بالخصوص جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کو ایک دوسرے کے اجتماعات میں کارکنوں کی سطح پر شرکت اور قیادت کی سطح پر لیکچرز کا اہتمام کرنا چاہئے اس کی زیادہ ضرورت تنظیم اسلامی کو ہے کیونکہ اس کے پاس تازہ فکر موجود ہے جبکہ جماعت نسبتاً تنظیم کی طرف سے لاپرواہ ہے اسے اہمیت نہیں دے رہی۔ سوچتا ہوں کہ پاکستان میں انقلاب کیسے آئے گا تنظیم ابھی بہت پیچھے ہے' محدود ہے مگر صحیح فکر رکھتی ہے جبکہ جماعت بڑی وسیع اور پرانی ہے مگر فکری انتشار کا شکار ہے۔ تنظیم الاخوان اور دعوت وارشاد کے پاس ابھی تحریکی شعور کی کمی ہے۔ خود آپ کے ارشادات کے مطابق پاکستان کے ٹوٹنے کا خطرہ ہے اور آئندہ ۲ سالوں میں کچھ بھی ہو سکتا ہے آخر کیا صورت ہو سکتی ہے کہ چند سالوں میں یہاں ٹوٹ پھوٹ کے بجائے انقلاب آجائے! شاید یہی کہ دعوت کا کام کرنے والی جماعتیں قریب آجائیں اور کسی ایک شخصیت کے تحت اکٹھی ہو جائیں۔ میری شدید خواہش ہے کہ دعوت کا کام کرنے والی جماعتیں قریب آجائیں اور بالخصوص آپ کے افکار سے جماعت کے لوگ آگاہ ہوں۔ اسی ضمن میں کوئی کردار ادا کرنے کے حوالے سے سوچتا رہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ جمعیت کے افراد کو میں دعوت رجوع الی القرآن کی ترغیب دوں۔ منہج انقلاب نبویؐ سے آگاہ کروں اور خلافت کی اصطلاح استعمال کرنے کے لئے قائل کروں۔ اگر میں جمعیت سے استعفیٰ دے دوں تو یہ کام نہیں ہو سکے گا' اس طرح تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر سابقہ تجربات سے ثابت ہے کہ علیحدہ ہونے والوں کے موقف کا علم دوسرے افراد کو نہیں ہو پاتا کیونکہ ایسا ممکن نہیں ہوتا جب کہ نظم کے ساتھ کارکنان کا حسن ظن بھی موجود ہوتا ہے لہٰذا علیحدہ ہونے والا خواہ درست ہو مگر غلط وہی قرار پاتا ہے۔ یہی معاملہ ۵۷ء میں ہوا یہی اب محترم نعیم صدیقی صاحب کے ساتھ ہوا ہے ان کے موقف سے جماعت کے ارکان واقف نہیں ہیں اور ان کے پاس اس کا کوئی موقع بھی نہیں ہے کہ رابطہ تو امیر کا کارکنوں کے ساتھ رہتا ہے دوسروں کا نہیں۔ بہرحال میرے

جمعیت یا جماعت سے کوئی مفادات وابستہ نہیں ہیں۔ جمعیت کے ساتھ اس لئے منسلک رہنا چاہتا ہوں کہ اس کی اصلاح کر سکوں اور بالخصوص آپ کے فکر سے جمعیت کی قیادت اور ارکان کو آگاہ کر سکوں۔ اس لئے کہ بار بار غور کر کے اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کم از کم ایک دفعہ اصلاح احوال کی کوشش ضرور کرنی چاہئے یہ مجھ پر فرض بھی ہے۔ جماعت اسلامی کی اصلاح میرے بس کا روگ نہیں پھر وہ مصلحت پسند ہو چکی ہے مگر نوجوانوں میں انقلابیت زیادہ ہوتی ہے۔ آج بھی کچھ غلطیوں کے باوجود جمعیت میں انقلابیت موجود ہے اس کے ارکان انتہائی متحرک ہیں۔ دعوت کے کام سے محبت موجود ہے۔ ناظم اعلیٰ ناظم صوبہ ' ناظم ڈویژن ایسے ذمہ داران ہمہ وقتی کام کر رہے ہیں جبکہ وظیفہ بھی نہیں لیتے۔ ناظم مقام بھی بھرپور وقت دیتا ہے ارکان بھی فعال ہیں۔ اگر کسی چیز کی کمی ہے تو وہ فکری رہنمائی ہے جو آپ کی جانب سے انہیں مل سکتی ہے اگر کوشش کی جائے۔ میرے خیال میں جمعیت کی اصلاح کے مواقع اور امکانات موجود ہیں چنانچہ میری خواہش ہے کہ آپ اپنے تئیں رابطے کی کوشش ضرور کیجئے چاہے خط و کتابت ہی ہو۔ اس سیشن یعنی ۹۴۔۹۵ء کے لئے ---- کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی ہے۔ میں اصلاح کی ایک کوشش کا تجربہ ضرور کرنا چاہتا ہوں اگر کامیابی ہوئی تو پیش رفت جاری رکھوں گا ورنہ انشاء اللہ آپ کے ساتھ سفر کا آغاز کروں گا آپ میرے لئے دعا کیجئے گا اور حوصلہ افزائی کرتے رہئے گا۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ آپ کی کچھ کتب جمعیت کے نصاب میں شامل ہو جائیں یا کم از کم لائبریری میں ہی آ جائیں۔

ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ جماعت اسلامی مصلحت پسندی کا شکار ہو چکی ہے اور انقلابی رنگ چھوڑتی جا رہی ہے مگر اب بھی بڑی تعداد میں انقلابی مزاج رکھنے والے افراد موجود ہیں ' فعال لوگ موجود ہیں اور جمعیت میں تو ابھی انقلابیت کا غلبہ ہے اور فکری رہنمائی نہ ہونے کے سبب اس میں کچھ تشدد کا رجحان آ گیا ہے جو قابل اصلاح ہے لہٰذا ابھی جماعت اسلامی سے کچھ نہ کچھ توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ رہنمائی کی جائے۔ جبکہ دوسری طرف تنظیم اسلامی کے افراد کے پاس اگرچہ فکر تازہ موجود ہے مگر یہ خاصے غیر فعال ہیں دعوت کے کام میں سرگرمی اور انقلابیت نہیں دکھا رہے لہٰذا اس

معاملے پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ آخر میں کچھ تجاویز پیش خدمت ہیں۔

☆ میرے خیال میں خلافت راشدہ کا نعرہ مزید زور و شور سے عوامی سطح پر بلند کرنے کی کوشش کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے جلسے' چاکنگ ہو تاکہ نام سے تو آگاہی ہو سکے۔ مزید بر آں اگر تحریک خلافت' تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے چلائی جائے تو زیادہ موزوں ہو گا کیونکہ بہت سارے ونگ بن جانے سے قیادت کی فراہمی اوپر سے نچلے لیول (Level) تک خاصی مشکل ہوتی ہے اور کام تقسیم ہوتا ہے جبکہ تربیت یافتہ افراد کم ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہ عام لوگوں کو تنظیم اور تحریک خلافت کا باہمی تعلق سمجھانا بڑا مشکل ہوتا ہے ان کا شعور و فہم محدود ہوتا ہے اور الجھن کا شکار ہوتے ہیں پھر یہ بھی کہ وہ اس طرح تنظیم میں شامل نہ ہوں گے بلکہ تحریک کے معاون رہ کر غیر فعال رہنا ہی پسند کریں گے۔ لہٰذا میری تجویز ہے کہ خلافت کا پیغام تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے عام کیا جائے اور جو لوگ اسے قبول کریں انہیں معاون تحریک خلافت کے بجائے "معاون تنظیم اسلامی" بنایا جائے یوں پلیٹ فارم ایک رہے گا اور تنظیم اسلامی میں شمولیت آسان ہو جائے گی۔ پھر ان معاونین کو ہی مبتدی رفیق بنانے کی ترغیب دی جائے گی تو سہولت ہو گی ورنہ معاون تحریک بنالینے کے بعد انہیں نئے سرے سے تنظیم اسلامی میں شمولیت کی دعوت دینا پڑے گی جس سے وہ ذہنی الجھن کا شکار ہوں گے۔ یوں بھی تحریک کسی ایک پلیٹ فارم سے ہی چلا کرتی ہے۔ جماعت مسلم لیگ تھی اور تحریک پاکستان اس نے برپا کی جو علیحدہ پلیٹ فارم نہ تھا اسی طرح تحریک ختم نبوت اور نظام مصطفیٰؐ۔ یہ سب تحریکیں تھیں جو کسی جماعت نے برپا کیں علیحدہ فورم نہ تھے جیسے کہ آپ کے یہاں تحریک خلافت علیحدہ فورم ہے۔

☆ خلافت کے ساتھ ساتھ "اتحاد بین المسلمین" کا نکتہ بھی شامل کیجئے اگرچہ آپ کا فکر بھی مختلف لوگوں کو جوڑ رہا ہے۔ مگر باقاعدہ سے ایک نکتہ شامل کر کے لوگوں کو شعور دینے کی ضرورت ہے۔ اس کو خلافت کے ساتھ بھی نسبت دی جا سکتی ہے کہ جب تک خلافت قائم نہ ہو گی "اتحاد بین المسلمین" نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا اس نکتے کو باقاعدہ اجاگر کیجئے اور مختلف جماعتوں کے لوگوں کو اس موضوع پر اپنے اجتماعات میں خطاب اور شرکت کی دعوت دیجئے تاکہ باہم ربط پیدا ہو۔

☆ ایک اور گزارش یہ کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح آپ تحریک پاکستان کو احیائی عمل کا حصہ سمجھتے ہیں اسی طرح جہاد کشمیر کو بھی اسی نقطہ نظر سے لیجئے کہ وہ بھی گویا تحریک آزادی ہے مگر مسلم لیگ کی نسبت اس پر دینی رنگ غالب ہے کیونکہ اس کی قیادت ۵۰ فیصد سے زائد جماعت اسلامی کے پاس ہے۔ یہ درست ہے کہ کشمیر کی جنگ جہاد فی سبیل اللہ کے معیار پر پوری نہیں اترتی مگر بہرحال احیائی عمل کا حصہ تو ہے۔ اس ضمن میں آپ "جہاد حریت" کی اصطلاح استعمال کر سکتے ہیں جو بہت موزوں ہے اور غیر متنازعہ بھی۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جماعت کے لوگوں کے ذہن میں آپ کے حوالے سے یہ چیز موجود ہے کہ آپ جہاد کشمیر کے مخالف ہیں حالانکہ آپ کا نقطہ نظر کچھ اور ہے لیکن چونکہ وہ عملی نوعیت کا ہے لہٰذا کارکنوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا اس معاملے سے صرف علمی حلقوں میں بات ہونی چاہئے۔ مولانا مودودیؒ نے جو اصولی موقف اس وقت اختیار کیا تھا آج تک لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکا اس لئے ایک بات جو آپ کہہ بھی نہیں رہے وہ غلط طور پر لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ رہی ہے جس سے آپ کی دعوت متاثر ہو رہی ہے اس لئے میری گزارش ہے کہ اس حوالے سے اپنے موقف کو واضح کر دیجئے اور علمی مخالفت صرف علمی حلقوں میں کیجئے۔ یوں بھی جماعت کی شوریٰ نے اس بار جو قرارداد پاس کی ہے اس میں "جہاد آزادی" کی اصطلاح ہی استعمال کی گئی ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں یہ بحث چھیڑنا کہ جہاد کشمیر جہاد فی سبیل اللہ ہے یا نہیں غیر ضروری ہے اس کے لئے جہاد حریت کی اصطلاح موزوں ہے اور اسی مناسبت سے آپ اس کی کھل کر حمایت کیجئے تاکہ غلط بات ذہنوں میں نہ پنپ سکے۔

یہ چند گزارشات تھیں جو آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں' جواب کا منتظر رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اقامت دین کا کام ہمیشہ صحیح رخ پر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کام کو ترقی و استحکام بخش دے (آمین)۔ آپ کی جانب سے رہنمائی کا محتاج ہوں۔ براہ کرم رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائیے گا۔

رفتارِ کار

تنظیم اسلامی پاکستان کا انیسواں سالانہ اجتماع

منعقدہ ۲۱/ تا ۲۴/ اکتوبر ۱۹۹۴ء

الحمدللہ تنظیم اسلامی پاکستان کا انیسواں سالانہ اجتماع ۲۱/ اکتوبر ۹۴ء تا ۲۵/ اکتو ۹۴ء بحسن و خوبی انجام پذیر ہوا۔ سالانہ اجتماع کے بارے میں رفقاء کی ایک دیرینہ خوا اور مطالبہ یہ سامنے آ رہا تھا کہ اس موقع پر تنظیمی و تربیتی پروگراموں کے علاوہ کچھ عوا پروگرام بھی رکھے جائیں۔ دور دراز مقامات سے آئے ہوئے رفقاء و احباب مرکزی پر منظم کردہ ان پروگراموں سے استفادہ کریں گے۔ تنظیم اسلامی کے تعارف و اظہار کا ایک بہترین موقع ہو گا اور شرکاء کے اجتماع ایک جذبۂ نو اور ولولہ تازہ سے سرشار ہو گے۔ اس کے علاوہ پروگرام کی ترتیب کے موقع پر یہ بھی پیش نظر تھا کہ وہ دینی عنا جماعتیں جن کے پیش نظر اقامتِ دین یا غلبۂ اسلام کی منزل ہے اور اس تک رسائی کے۔ وہ انتخابی کشاکش میں ملوث ہونا مفید نہیں سمجھتے اور اس سے دست کش ہو کر محنت و کو ش کر رہے ہیں ان کے اکابرین کو اجتماع کے موقع پر اظہار خیال کی دعوت دی جائے۔ ا سے ایک طرف تو ان دینی قوتوں کے مابین باہم تعارف گفتگو اور افہام و تفہیم کا آغاز ہ جس سے بعد میں کسی بڑے خیر کے بر آمد ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف رفقا تنظیم اسلامی کے افقِ ذہنی میں وسعت پیدا ہو گی۔

انقلاب اسلامی کے لئے طریق کار ایک انتہائی اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ اس کو وا متعین اور قابلِ عمل صورت میں رفقائے تنظیم اسلامی کے دلوں میں پیوست ہو چاہئے۔ چنانچہ ہماری خواہش یہ تھی کہ اگر کسی جگہ کوئی کلمۂ خیر ہے تو ہم اس سے استف کریں اور اللہ تعالیٰ نے جس منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے د

کے لئے دوسرے فکر مند اہل درد کو اس طرف توجہ دلائیں۔

چنانچہ سالانہ اجتماع کا آغاز اگرچہ مورخہ ۲۱/اکتوبر کو جامع القرآن قرآن اکیڈمی میں امیر محترم کے خطاب قبل از نماز جمعہ سے ہو گیا لیکن اس اجتماع کا پہلا عوامی پروگرام بعد نماز عشاء باغ بیرون موچی دروازہ لاہور میں جلسۂ خلافت کا انعقاد اور اس سے قبل "کاروانِ خلافت" کی صورت میں رفقاء و احباب کا جلسہ گاہ میں پہنچنا تھا۔ دور دراز مقامات سے رفقاء کی آمد کا آغاز تو گزشتہ رات ہی سے ہو گیا تھا لیکن یہ سلسلہ صبح دس گیارہ بجے تک نقطۂ عروج تک پہنچ گیا۔ بیشتر رفقاء اپنی رہائش گاہوں کے تعین اور دیگر ضروری کاموں سے فراغت حاصل کر کے قبل از خطاب جامع القرآن پہنچ گئے۔ امیر محترم کا خطاب ڈیڑھ گھنٹہ پر محیط تھا اور پروگرام کے مطابق بعد نماز عصر رفقاء و احباب موٹر سائیکلوں، گاڑیوں اور بسوں کے ایک طویل قافلہ (جس کو "کاروانِ خلافت" کا نام دیا گیا) کی صورت میں جلسہ گاہ پہنچے۔ اس قافلہ میں بہت بڑی تعداد مقامی احباب، معاونینِ خلافت اور وابستگانِ انجمن خدام القرآن کی بھی تھی جو کہ صرف آج کے اس پروگرام میں قیام خلافت کی اس جدّوجہد سے اظہار یکجہتی کے لئے شریک ہوئے۔ جلسہ کے باقاعدہ پروگرام سے قبل بعد نماز مغرب تا عشاء لندن میں حزب التحریر کے زیر اہتمام بین الاقوامی خلافت کانفرنس میں محترم امیر تنظیم اسلامی کی تقریر بذریعہ ویڈیو کیسٹ دکھائی گئی۔

جلسۂ خلافت کا باقاعدہ آغاز بعد نماز عشاء ہوا اور ساڑھے گیارہ بجے تک یہ محفل جاری رہی۔ الحمدللہ یہ ایک بھرپور اور کامیاب اجتماع شمار ہوا۔ سامعین کی تعداد قریباً ساڑھے تین ہزار کے قریب تھی۔ امیر محترم کا خطاب قریباً دو گھنٹے تک ہوا اُس سے قبل نوجوان مقرر مرزا ندیم بیگ اور میجر جنرل (ریٹائرڈ) محمد حسین انصاری صاحب نے موجودہ ملکی و بین الاقوامی صورت حال کے تناظر میں مسلمانانِ عالم کی زبوں حالی اور بے بسی نیز مقتدر طبقات کی اخلاقی پستی اور دین بیزاری کا نقشہ کھینچا۔ امیر محترم نے نظام خلافت کی برکات اور قیامِ خلافت کی نوید احادیث نبویہ کی روشنی میں بیان کی۔

سالانہ اجتماع کا پہلا خصوصی اور باقاعدہ اجلاس ۲۲/اکتوبر صبح ساڑھے آٹھ بجے تا

ایک بجے دوپہر قرآن آڈیٹوریم قرآن کالج لاہور میں منعقد ہوا۔ اس نشست کے نصفِ اول میں ناظم اجتماع جناب عمران چشتی صاحب کی جانب سے استقبالیہ کلمات کے بعد درج ذیل سالانہ رپورٹس پیش کی گئیں۔

- تنظیم اسلامی پاکستان کی سالانہ رپورٹ ناظم اعلیٰ ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے پیش کی۔
- تنظیم اسلامی بیرون پاکستان کی سالانہ رپورٹ ناظم اعلیٰ برائے بیرون پاکستان سراج الحق سید صاحب نے پیش کی۔
- حلقہ خواتین کی سالانہ رپورٹ جناب حافظ عاکف سعید صاحب نے پڑھ کر سنائی۔

یہ تمام رپورٹس میثاق کے شمارہ برائے نومبر ۹۴ء میں شائع کر دی گئی تھیں۔ یہ شمارہ چند روز قبل از وقت تیار کر لیا گیا تھا اور رپورٹس طبع شدہ صورت میں سامعین کے سامنے موجود تھیں۔ اسی نشست کے نصفِ آخر میں ہمارے بعض نوجوان مقررین نے مختلف موضوعات پر مختصر تقاریر کیں۔ یہ سلسلہ تقاریر بھی اس سالانہ اجتماع کا ایک خصوصی پروگرام تھا۔ پیش نظر یہ تھا کہ نئے مقررین کا تعارف ہو اور رفقاء و احباب اس پہلو سے اعتماد کی کیفیت محسوس کریں کہ الحمدللہ نوخیز رفقائے تنظیم کی تعلیم و تربیت نتیجہ خیز ہو رہی ہے اور ہمارے نوجوان مقررین اپنے فکر و دعوت کو بہتر اسالیب میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس نشست میں درج ذیل رفقاء نے خطاب کیا :

- اقبال حسین صاحب' امیر تنظیم اسلامی لاہور شمالی — طاغوتی نظام کے تحت تقویٰ کی حیثیت
- شمس العارفین صاحب' امیر تنظیم اسلامی کراچی شرقی II — شہادت علی الناس
- حافظ محمد خالد شفیع صاحب' نقیب اسرہ صادق آباد — فکرِ آخرت

بعد نماز عصر تا مغرب بیرون پاکستان سے آئے ہوئے بعض رفقاء و احباب کا تعارف ہوا۔ انہوں نے اپنے اپنے مقامات پر تنظیمی و دعوتی کیفیت کا بھی مختصر تذکرہ کیا۔

سالانہ اجتماع کے موقع پر دو روز ۲۲/ اکتوبر اور ۲۳/ اکتوبر بعد نماز مغرب تا عشاء کی نشستیں دوسری دینی جماعتوں کے اکابرین کے اظہار خیال کے لئے مختص تھیں۔ اس حوالہ

سے شام کی یہ نشستیں حاضری کے اعتبار سے بہت بھرپور رہیں۔ دوسری جماعتوں کے وابستگان کی کافی تعداد شریک ہوئی۔ پُرہجوم عوامی اجتماعات کی کیفیت پیدا ہو گئی اور قرآن آڈیٹوریم کی تنگ دامانی کا احساس پیدا ہوتا رہا۔ ان دو دنوں میں مندرجہ ذیل مہمان مقررین نے خطاب فرمایا۔

۲۲/اکتوبر

۱۔ مولانا سید جمال الدین کاظمی صاحب	امیر تحریک اسلامی انقلاب
۲۔ برادر جمال ہارووڈ (کینیڈین نومسلم)	نمائندہ حزب التحریر
۳۔ برادر نواز خاں (پاکستانی نژاد برطانوی شہری)	نمائندہ حزب التحریر

۲۳/اکتوبر

۴۔ میجر محمد امین منہاس صاحب	امیر تحریک فہم القرآن
۵۔ مولانا محمد اکرم اعوان صاحب	امیر تنظیم الاخوان پاکستان
۶۔ پروفیسر محمد سعید صاحب	امیر تنظیم الدعوۃ والارشاد
۷۔ برادر فرید قاسم	نمائندہ حزب التحریر

۲۳/اکتوبر بروز اتوار کو اجتماع کی پہلی نشست کا آغاز حسب معمول صبح ساڑھے آٹھ بجے ہوا اور اس نشست کے نصف اول میں مندرجہ ذیل رفقائے تنظیم نے مختلف موضوعات پر مختصر تقاریر کیں :

O جناب عابد جاوید' نقیب اسرہ کراچی غربی	شرک کے ہمہ جہتی پہلو
O جناب سعید اظہر عاصم' نائب امیر تنظیم اسلامی ملتان	
O مرزا ندیم بیگ' نائب ناظم حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن	جمہوریت بمقابلہ خلافت
O جناب محمد اشرف وصی' امیر تنظیم اسلامی لاہور شرقی	ایمان اور حیا کا باہمی تعلق
O جناب خالد محمود عباسی' ناظم حلقہ آزاد کشمیر	فریضۂ اقامتِ دین کی جدوجہد میں رکاوٹیں

اس نشست کے نصف آخر میں تحریک خلافت پاکستان کی جنرل باڈی میٹنگ کا اہتمام

ہوا۔ اس میں قریباً بارہ سو معاونین تحریکِ خلافت پاکستان نے شرکت کی۔ ناظم اعلیٰ تحر
خلافت میجر جنرل (ریٹائرڈ) محمد حسین انصاری صاحب نے ایک سالہ کارکردگی کے اہم نکا
بیان کئے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے اجلاس میں تحریکِ خلافت کی موجودہ کیفیت اور آئ
لائحہ عمل پر غور و خوض کی تفصیل بتائی اور مرکزی خلافت کمیٹی کی قرارداد پڑھ کر سنائ
اس کے بعد داعیٔ تحریک خلافت امیر تنظیم اسلامی پاکستان نے اس موضوع پر مفصل خطا
فرمایا اور تحریک خلافت پاکستان کے آئندہ تنظیمی ڈھانچہ کی اہم تفصیلات سے معاو
تحریک کو آگاہ کیا۔

۲۴/ اکتوبر سوموار سالانہ اجتماع کا آخری دن تھا۔ صبح کو اجلاس کی پہلی نشست
ملتزم رفقاء کے لئے صبح ۸ بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک ایک خصوصی نشست کا انتظا
گیا۔ یہ نشست قرآن اکیڈمی لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس دوران مبتدی رفقاء' معاو
تحریک خلافت اور دیگر احباب کے لئے قرآن آڈیٹوریم میں ہی امیر محترم کے امریکہ
ایک خطاب کے ویڈیو پروگرام کا اہتمام ہوا۔ ملتزم رفقاء کے خصوصی اجتماع میں قریباً
سو ملتزم رفقاء نے شرکت کی۔ مختلف حلقہ جات اور مقامات کے ملتزم رفقاء کے
نمائندوں نے اظہارِ خیال کیا۔ مختلف مسائل تجاویز اور مشورے سامنے آئے جن پر
دار حضرات توجہ کریں گے۔

اجتماع کی آخری نشست قرآن آڈیٹوریم میں سوا گیارہ بجے شروع ہوئی۔ مرزا ایو
بیگ صاحب امیر تنظیم اسلامی لاہور وسطی نے "موجودہ ملکی اور بین الاقوامی حالات
رفیقِ تنظیم اسلامی کے فرائض" کے موضوع پر ایک وقیع تحریر پڑھ کر سنائی۔ اس کے
امیر محترم کے اختتامی خطاب پر اس سالانہ اجتماع کا اختتام ہوا۔ امیر محترم نے سالانہ اج
کی بحیثیت مجموعی کیفیت پر اطمینان بخش تاثر کا اظہار کیا۔ عوامی اجتماعات' دوسری
جماعتوں سے ربط و ضبط بالخصوص حزب التحریر کے ساتھ معاملہ میں اطمینان کا پہلو ہے۔
تعالیٰ اس سے خیر برآمد کرے۔ ملکی حالات کی دگرگوں اور ابتر کیفیت پر شدید اضطرا
اظہار کرتے ہوئے انہوں نے رفقاء کو ان کی ذمہ داری یاد دلائی۔ تنظیم اسلامی کی مجھ

کیفیت پر بھی انہوں نے اس پہلو سے اطمینان کا اظہار کیا کہ الحمدللہ پیش رفت ہو رہی ہے' اگرچہ بہت زیادہ نہیں' تاہم مسلسل اور پیہم ضرور ہے۔ قریباً ڈیڑھ بجے تک یہ خطاب جاری رہا۔ امیر محترم کے خطاب کے بعد اجتماعی بیعت ہوئی۔ نئے شامل ہونے والے رفقاء نے امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کی اور گویا ایک مرتبہ پھر تجدید عہد کیا۔

اس سالانہ اجتماع میں ۱۱۰۵ رفقاء و احباب شریک ہوئے۔ شام کے عوامی اجتماعات میں روزانہ ۳۰۰ احباب اور معاونین خلافت مزید شریک ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ تحریک خلافت کی جنرل باڈی میٹنگ میں شرکت کے لئے ۳۸ معاونین تحریک خلافت مزید تشریف لائے۔

مرتب : چوہدری غلام محمد

رفتارِ کار

چودھری رحمت اللہ بُٹّر صاحب کا دورۂ متحدہ عرب امارات

امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تقریباً گزشتہ سال متحدہ عرب امارات کے دورہ کے موقع پر العین میں رفقاء کے ایک اجتماع میں اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ چودھری رحمت اللہ بٹر صاحب کو امارات میں درس و تدریس اور تعلیم و تربیت کے لئے آنا چاہئے۔ چونکہ یہاں امارات میں مقیم پاکستانیوں کی اکثریت محنت کش اور فنی کام کرنے والوں کی ہے لہٰذا اس بات کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ مدرس و معلم ایسا ہو جو ان لوگوں کی ذہنی سطح سے قریب تر ہو اور انہی کے ماحول اور گرد و پیش سے مثالیں اور دلائل پیش کر کے اپنی بات کو انکے ذہن نشین کرا سکے اور چودھری صاحب کو اس معاملے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ پھر چونکہ چودھری صاحب مرکزی ناظم بیت المال بھی ہیں لہٰذا حلقہ امارات کے حسابات کی جانچ پڑتال کا کام بھی اس دورہ کا سبب بنا۔ چنانچہ چودھری رحمت اللہ بٹر صاحب مورخہ ۷/اگست کو بذریعہ پی آئی اے لاہور سے دبئی کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر صبح ساڑھے دس بجے تشریف لائے۔ ایئرپورٹ پر معزز مہمان کے استقبال کے لئے ناظم حلقہ جناب محمد خالد صاحب اپنے رفقاء کی معیت میں موجود تھے۔ ایئرپورٹ سے شارجہ مرکز کے لئے روانگی ہوئی جو کہ ۲۰ کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ دن آپ نے رفقاء واحباب سے تعارف و ملاقات میں گزارا۔ اگلی صبح یعنی ۸/اگست سے آپ نے حلقہ امارات کے حسابات کی جانچ پڑتال شروع کی۔ مغرب کی نماز کے بعد آپ نے شارجہ تنظیم کے ذمہ داران سے خصوصی خطاب فرمایا اگرچہ دیگر رفقاء بھی اس خطاب سے فیض یاب ہوئے۔ شارجہ مرکز میں ہر سوموار کو بعد صلوٰۃ العشاء درس قرآن مجید ہوتا ہے' آج کے درس کے بارے میں پہلے سے رفقاء واحباب کو اطلاع دی گئی تھی کہ رحمت اللہ بٹر صاحب درس قرآن دیں گے۔ معزز مہمان مقرر کو سننے کے لئے رفقاء واحباب کی کثیر تعداد جمع تھی۔ درس کا موضوع "عبادتِ رب" تھا۔ یہ خطاب تقریباً ایک گھنٹہ کا ہوا۔ حاضرین تقریباً ۷۵ تھے۔

۹/اگست کی صبح کے اوقات میں آپ نے شارجہ تنظیم کے حسابات دیکھے۔ عصر کی نماز کے بعد خالد صاحب کے ہمراہ ابوظہبی کے لئے روانہ ہوئے۔ شارجہ ابوظہبی کا تقریباً ۲۰۰ کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ مغرب کے وقت ابوظہبی مرکز میں آمد ہوئی جہاں پر ابوظہبی کے رفقاء معزز مہمان کے منتظر

تھے۔ نماز مغرب کے بعد تعارف اور ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا جو عشاء کے بعد تک جاری رہا۔
۱۰/ اگست کو آپ نے ابوظبی تنظیم کا آڈٹ کیا اور بعد العصر ابوظبی تنظیم کے ذمہ دار حضرات سے خطاب فرمایا۔
۱۱/ اگست : آج کے دن سے بعد عصر تربیتی پروگرام شروع ہونے والے تھے جن میں امارات میں مقیم تمام رفقاء کو مدعو کیا گیا تھا۔ رفقاء صبح سے آنے شروع ہو گئے تھے' اس لئے مرکز میں خوب گہما گہمی تھی۔
ٹھیک ۵ بجے تربیتی نشست کا آغاز ہوا۔ ناظم حلقہ جناب محمد خالد صاحب نے معزز مہمان اور رفقاء کا خیر مقدم کیا اور حلقہ امارات کی کارکردگی کا مختصر جائزہ پیش کیا۔
محترم رحمت اللہ بٹر صاحب نے اپنے پہلے لیکچر میں ایمان کو موضوع بنایا۔ آپ نے سورۃ البقرہ کے آخری رکوع کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی اور ایمانیاتِ ثلاثہ جو کہ بنیادی ایمانیات ہیں، یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ' ان کو تفصیل سے بیان کیا۔ اس کے لئے آپ نے بورڈ کی مدد بھی لی اور ایمان کے ایک ایک جزو کو بورڈ پر لکھ کر اس کی بحث کو سامعین کے ذہن نشین کرایا۔
دوسری نشست بعد مغرب شروع ہوئی۔ اس کی ابتدا میں پہلے تو آپ نے نئے رفقاء کے اصرار پر اپنا ذاتی تعارف کروایا' پھر عبادات کے ذیل میں فرائض و نوافل کی تقسیم کو بورڈ پر چارٹ بنا کر تفصیل سے سمجھایا۔ رفقاء کے لئے یہ پروگرام بہت معلوماتی اور دلچسپ تھا للذا رفقاء کی طرف سے سوالات بھی کافی آئے جن کے جوابات آپ نے قرآن و سنت کی روشنی میں دیئے۔ عشاء کی اذان پر یہ نشست ختم ہوئی' اگرچہ رفقاء کے کچھ سوالات باقی رہ گئے تھے جو اگلی نشست تک اٹھا لئے گئے۔ عشاء کی نماز کے بعد اجتماعی کھانا ہوا۔ کچھ رفقاء مقامی مسجد میں درس قرآن کے لئے رک گئے جہاں پر ہفتہ وار درس قرآن رفیق محترم امجد علی نیر صاحب دیتے ہیں۔
۱۲/ اگست : ناشتہ کے بعد تیسری نشست کا آغاز صبح سوا آٹھ بجے ہوا۔ معزز مہمان نے پہلے تو گزشتہ رات کے رفقاء کے بقایا سوالات کے تسلی بخش جوابات ارشاد فرمائے' پھر اس نشست کے اصل موضوع "عبادت رب" پر گفتگو فرمائی۔ عبادتِ رب: اپنے رب کی بندگی' انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی۔ اس کے مختلف عنوانات کو بورڈ پر لکھ کر اس کی تشریح و توضیح فرمائی۔ یہ نشست ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی۔ اس کے بعد ۱۵ منٹ کا وقفہ ہوا جس میں رفقاء کو چائے پیش کی گئی۔
۱۰ بجے صبح چوتھی اور آخری نشست شروع ہوئی۔ اس میں آپ نے معاشرے میں مروجہ رسم و رواج پر بحث کرتے ہوئے خوشی و غمی کے موقع پر صحیح مسنون طریقے پیش کئے۔ اس گفتگو

کے بعد رفقاء نے بھی کافی سوالات کئے جن کے جوابات مدلل طریقے سے دیئے گئے۔ گیارہ بجے اس تربیتی پروگرام کا اختتام ہوا۔ ناظم حلقہ نے مہمان مقرر اور تمام رفقاء کا شکریہ ادا کیا۔ بعد میں اجتماعی دعا ہوئی۔

اب معزز مہمان کی اگلی منزل العین شہر تھا۔ بعد عصر چند رفقاء کی معیت میں حلقہ کی کار میں العین روانگی ہوئی۔ یہ شہر ابوظبی کے مشرق میں منطقہ مشرقی کا صوبائی دارالحکومت ہے جو اپنی سرسبزی' خوبصورتی اور صفائی کے لئے مشہور ہے۔ ۱۶۰ کلومیٹر کا فاصلہ عصر اور مغرب کی نمازوں کے درمیان ہی طے ہوا۔ ٹھیک مغرب کی اذان کے وقت مسجد ہی میں وارد ہوئے جہاں پر بعد مغرب درس قرآن ہوناتھا۔ مقامی رفقاء واحباب مسجد کے باہر معزز مہمان کے منتظر تھے۔

مغرب کی نماز کے بعد درس شروع ہوا۔ حاضرین کی کثیر تعداد کو دیکھتے ہوئے معزز مہمان نے کھڑے ہو کر خطاب کرنا پسند فرمایا۔ آپ نے سورۂ یٰسین کی چند آیات تلاوت فرمائیں اور ان آیات کی شرح میں بندگیٔ رب پر خطاب کیا۔ آپ کا خطاب آسان الفاظ اور سادہ مثالوں پر مشتمل تھا جو کہ سامعین کو متأثر کر رہا تھا۔ شرکاء کی تعداد ۱۱۰ کے قریب تھی۔

درس قرآن کے بعد العین کے مرکز میں رفقاء اور احباب سے تعارف ہوا۔ یہ تعارف عشاء کی نماز کے بعد بھی جاری رہا اور پھر اجتماعی کھانا کھایا گیا۔ اس دوران العین مرکز کے اثاثہ جات کا حساب کتاب بھی دیکھا۔

۱۳/اگست : ہفتہ کو صبح دس بجے ابوظبی روانگی ہوئی۔ واپسی پر محمد خالد صاحب نے راستہ تبدیل کرتے ہوئے کار سویحان کی جانب موڑ لی۔ اگرچہ یہ راستہ طویل تھا لیکن اس راستے میں Humps (سپیڈ بریکر) بہت کم آتے ہیں۔ العین سے سویحان کی سڑک کے دونوں جانب بڑے بڑے سرسبز لہلہاتے ہوئے فارمز بڑا دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ پورا علاقہ صحرائی ہے لیکن جدید دور کی ترقی نے صحرا کو کافی پرے دھکیل دیا ہے۔ راستہ میں ریگستان کا تحفۂ عام یعنی کھجوریں سڑک کی دونوں جانب پورے راستے میں ہیں۔ ان درختوں میں سے مختلف قسم کی کھجوروں کو توڑ کر جمع کیا گیا جن میں میٹھی' رسیلی اور بغیر گٹھلی والی کھجوریں بھی تھیں۔ ابوظبی مرکز پہنچ کر انہیں دھو کر صاف کر کے سب ہی ساتھیوں نے کھایا۔

آج مغرب کے بعد مرکز ابوظبی میں درس قرآن کا وقت مقرر تھا لہٰذا مہمان مقرر ہی نے درس قرآن دیا اور قرآن حکیم اور ہماری ذمہ داریوں کے موضوع پر عشاء کی اذان تک خطاب فرمایا۔ درس کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگ دوسرے کمروں اور راہداری میں بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۱۰۰ تھی۔ ۱۴/اگست صبح ۱۰ بجے صبح راس الخیمہ کے لئے روانگی ہوئی۔ راس الخیمہ میں بھی چودھری رحمت اللہ بٹر صاحب نے خطاب فرمایا۔ یہاں پر حاضری تقریباً

۵۰ تھی۔ رات ہی وہاں سے شارجہ مرکز مراجعت ہوئی۔

۱۵/ اگست سوموار کے دن شارجہ مرکز کا مرکزی درس معزز مہمان نے دیا جس کا عنوان تھا "دین کے کام میں ناامیدی سے بچنا۔"

۱۶/ اگست کو معزز مہمان پھر ابوظبی تشریف لائے اور یہاں پر رفقاء سے صبر و استقامت کے موضوع پر گفتگو فرمائی۔ بعد ازاں ارکان شوریٰ ابوظبی تنظیم سے میٹنگ کی۔

۱۷/ اگست کو آپ پھر شارجہ تشریف لے گئے اور وہاں بھی ارکان شوریٰ کے ساتھ ایک مجلس کی۔

۱۸/ اگست کو معزز مہمان کی لاہور واپسی مقرر تھی' لہٰذا دبئی ایئرپورٹ پر محمد خالد صاحب اور دیگر رفقاء ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہنے اور رخصت کرنے کے لئے گئے۔ اس طرح چودھری رحمت اللہ بٹر صاحب ناظم بیت المال و ناظم تربیت کا دورہ مکمل ہوا۔ یہ دورہ کئی لحاظ سے رفقاء نے مفید پایا اور رفقاء کے یہ تاثرات سننے کو ملتے رہے کہ اسی طرح گاہے بگاہے پاکستان سے معلم و مدرس یہاں آتے رہنے چاہئیں جن سے یہاں مقیم رفقاء و احباب مستفید ہوتے رہیں۔

(مرتب : آصف علی رضوی)

☆ ☆ ☆

تنظیم اسلامی کراچی کا ماہانہ اجتماع

منعقدہ ۴/ نومبر ۱۹۹۴ء

ماہانہ اجتماعات تنظیم اسلامی کے معمول کا حصہ ہیں۔ ہر ماہ کے پہلے جمعہ کو مرکز سے جناب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کراچی تشریف لاتے ہیں۔ ان کی آمد سے ہمارے پروگرام اگرچہ میں جان پڑ جاتی ہے اور اس کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ اس مرتبہ کا پروگرام ہلکا پھلکا تھا مگر تاثیر سے پُر تھا۔ جمعہ سے ایک دن قبل ایک رفیق کے گھر پر ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے فرائض دینی کے جامع تصور پر خطاب کیا تھا۔ راقم الحروف وہاں موجود نہ تھا لیکن متعدد رفقاء نے اس کے بارے میں اپنے بہت ہی اچھے تاثر کا اظہار کیا' جس پر راقم نے دل سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس خلاء کو پر کر دیا ہے جس کے لئے طبیعت بے چین رہا کرتی تھی۔ ان شاء اللہ اب چراغ سے چراغ جلیں گے اور یہاں اللہ کے دین کا بول بالا ہو کر رہے گا۔

ماہانہ پروگرام کی ابتداء تلاوتِ کلام پاک سے ہوئی۔ قاری مقبول صاحب نے تلاوت کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اقامتِ دین کا کام کرنے والی جماعت اور اس کے افراد کے اوصاف قرآن مجید کے حوالے سے بیان کئے۔ آپ

نے فرمایا "دنیا اور سامانِ دنیا تو عارضی برتنے کی شے ہے' اصل شے تو وہ ہے جو اللہ کے پاس ہے جہاں ہر بشر کو پہنچنا ہے' جہاں کی زندگی ابدی ہے' وہ زندگی ایسی ہے جس کی شام کبھی نہ ہو گی۔ دنیا کا صحیح تصور ایک مجاہد کے ذہن میں' جو اقامتِ دین کا جہاد کر رہا ہو' واضح ہونا چاہئے۔ حضور ﷺ کی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا: جان لو' جو کچھ تمہارے پاس ہے اس کی قیمت تمہارے دل میں اس سے زیادہ نہ ہو جائے جو آخرت میں اللہ کے پاس ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی آیات کے حوالے سے فرمایا کہ "اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ خیر ہے اور وہ خیر ان لوگوں کے لئے ہے جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس پر ایمان پختہ رکھتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو بڑے بڑے گناہوں سے بچتے ہیں' فواحش سے کلی اجتناب کرتے ہیں اور جب کبھی غصہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہیں' ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں اور وہ اللہ کے عطا کردہ رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔" اللہ کا رزق صرف پیسہ ہی نہیں' وہ تمام توانائیاں جو اللہ نے عطا کی ہیں رزق ہیں' ان کا مصرف اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ ہوں۔ اس گفتگو کے بعد چائے کا وقفہ ہوا۔

اس کے بعد ناظم حلقہ جناب نسیم الدین صاحب تشریف لائے' ان کی حیثیت حلقہ کی تمام تنظیموں کے نگران کی ہے۔ جس شخص پر ایسی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی مساعی بڑھ جاتی ہے' حس تیز ہو جاتی ہے' ہر گوشے میں اس کی نگاہ ہوتی ہے' وہ جہاں کمی یا کمزوری دیکھتا ہے بیان کرتا ہے اور توجہ دلاتا ہے' رفقاء کو تیز کرنے کی راہیں تلاش کرتا ہے' اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہر رفیق کو دعوت کے اس مقام پر دیکھے۔ وہ مالی کی طرح ایک ایک پودے کی رکھوالی کرتا ہے۔

ناظم حلقہ نے اپنی بات موت کی یاد' اس کی اہمیت' اس کا شدنی ہونا اور اچانک کسی بھی وقت کسی بھی شخص سے موت کا سابقہ پیش آ جانے سے شروع کی۔ یہ ایسی اٹل حقیقت ہے کہ جس سے بڑی کوئی حقیقت نہیں۔ دن رات ہم اپنی آنکھوں کے سامنے یہ منظر دیکھتے ہیں۔ آج کل کراچی میں تو اس نے اپنا گھیرا تنگ کر رکھا ہے۔ بقول شاعر ؎

"قزاقِ اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ"

آج کل یہ لوٹ مار کلاشنکوف کے برسٹ سے ہو رہی ہے۔ اس حقیقت کے بعد تو اہل کراچی کو رجوع الی اللہ میں سب سے آگے ہونا چاہئے تھا مگر لہو و لعب کے وہی انداز دیکھنے میں آ رہے ہیں' خوف ہے مگر خوفِ خدا نہیں!

ناظم حلقہ نے مقاصدِ زندگی کا ذکر کیا اور کہا کہ تمام مقاصد میں بلند ترین مقصد اقامتِ دین کے لئے جدوجہد' دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں جان و مال کھپانا ہے۔

اس کام کے لئے جس نظم اور ڈسپلن کی ضرورت ہے ہمارے ہاں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے الاخوان المسلمون کی مثال دیتے ہوئے ایک عبرت آموز واقعہ سنایا۔ رپورٹوں کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ یہی وہ بیرومیٹر ہے جس سے قوت اور ڈسپلن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مطالعہ لٹریچر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تحریک کا لٹریچر اس کے کارکنوں کے مطالعہ میں رہنا چاہئے، فکری ہم آہنگی، وابستگی اور جذبہ پیدا کرنے میں اس سے مدد ملے گی گویا یہ ایک ایسا پاور ہاؤس ہے جس سے وابستہ رہنا تنظیمی حیات کے لئے انتہائی ضرورت ہے۔ ماہانہ اعانت میں باقاعدگی کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ تنظیم کے تمام اخراجات رفقاء کے ایثار اور ان کی ادا کردہ اعانت پر چلتے ہیں، اس طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ آئندہ سال کی طرح یہ سال بھی ذاتی رابطہ کا سال ہے، لہٰذا اس کے لئے انفرادی ملاقاتوں کو دعوت کا ذریعہ بنایا جائے اور اس کی رپورٹ لازماً متعلق شخص تک پہنچنی چاہئے۔ دعوتی مقاصد کے لئے تنظیم نے جو کتابچے شائع کئے ہیں انہیں انفرادی دعوت کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس راستے میں خوف کو رکاوٹ نہیں بننا چاہئے۔ خارجی خوف کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اصل خوف تو وہ داخلی خوف ہے جو آخرت کی جوابدہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ خوف انسان کی قوت عمل کے لئے محرک ثابت ہوتا ہے۔ خارجی خوف ایمان کی کمزوری کی علامت ہے اور داخلی خوف ایمان کی توانائی کی۔

انہوں نے خواتین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کا جذبہ قربانی ہی مردوں کو تن من دھن لگانے پر مجبور کرے گا۔ اس ضمن میں ان بہادر خواتین کا حوالہ دیا جو جنگِ احد میں اپنے جوش و جذبے سے تاریخ کے افق پر قیامت تک جگمگاتی رہیں گی۔ آخر میں سالانہ اجتماع کے موقع پر رفقاء کو سمع و طاعت کی ایک کمزوری پر توجہ دلائی۔ ناظم حلقہ کے خطاب کے بعد نماز جمعہ کی تیاری کے لئے وقفہ دیا گیا۔

خطاب جمعہ حسب معمول ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے کیا جو مہینے کا پہلا جمعہ کراچی میں ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے بیعت سمع و طاعت فی المعروف کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا اور اسے ایک اسلامی جماعت کے لئے لازمی قرار دیا۔ حضور ﷺ کی سیرت سے اس کا حوالہ دیا اور پھر سمع و طاعت کی اہمیت کو جنگ احد کے حوالے سے اجاگر کیا۔ اگر کسی جماعت میں سمع و طاعت نہ ہو تو وہ محض ایک نظریاتی کلامی جماعت بن کر رہ جاتی ہے۔ کسی بھی مہم کو اس کے بغیر سر نہیں کیا جا سکتا چہ جائیکہ اسلامی نظام کا قیام۔ اس کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اپنے سے کمتر آدمی اگر اس کا امیر بنا دیا جائے تو پوری آمادگی کے ساتھ اس کی اطاعت کی جائے۔ یہی نبی ﷺ کی تعلیم ہے اور آپ ﷺ نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ تم پر اگر کالا حبشی بھی امیر بنا دیا جائے تو تم اس کی اسی طرح اطاعت کرو۔

(مرتب : نجیب صدیقی)

ضرورت رشتہ

لڑکی عمر ۲۱ سال، تعلیم انڈر ایف اے، ایک سالہ دینی کورس سے فارغ، خاندان رانا راجپوت۔ ذات پات کی قید نہیں۔ شادی سادگی سے کرنا چاہتے ہیں۔ تنظیم سے وابستہ خاندان کو ترجیح دی جائے گی۔

ضیاء الدین

فون : 7833949

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

سالانہ اجتماع کے بارے میں کراچی کی ایک رفیقہ تنظیم کے تاثرات

"لاہور میں سالانہ اجتماع ہو رہا ہے' چار روزہ تربیتی پروگرام بھی ہے" اس بات کا ہماری رفیقات میں ذکر ہوا۔ دل ہمارا ابھی چاہا مگر سوچا کہ ابھی چند ماہ قبل ہی چھٹیوں میں لاہور گئے تھے' اب اجازت نہ ملے گی۔ مگر صاحب جب آب و دانہ کسی مقام سے اٹھ گیا ہو تو کوئی بھلا کب تک اس جگہ رہ سکتا ہے۔ لہٰذا اچانک صاحبزادی نے اطلاع دی کہ ابو نے اجازت دے دی ہے۔ بس پھر کیا تھا تیاری میں مصروف ہو گئے۔ چار سال قبل سفر حج کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ گروپ کے ساتھ رہنے کے جو فوائد اور لطف تھے سب یاد آئے۔ ساتھ ہی نئے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے میں جو مزاجی مشکلات ہوتی ہیں وہ بھی سامنے آئیں۔ الغرض ہلکا ہلکا خوف مگر انجانی سی خوشی تھی ان لوگوں سے ملنے کی جو ہماری طرح اس کشتی کے مسافر ہیں جو حالات کے مخالف رخ پر رواں دواں ہے اور جس کے امیر نے ایک ایسے رخ پر ناؤ ڈالی ہے کہ مسافروں کو یقین ہے کہ باوجود حالات کی بے یقینی کے یہی راہ منزل کو جاتی ہے۔ اور اگر خلوص نیت ہو تو فلاح ان کا مقدر ہو گی۔

تحریکی جماعتوں کا اپنے قائد کے ساتھ کیا دلی تعلق ہوتا ہے اس کا بیان ممکن نہیں۔ فکری ہم آہنگی اور جذبہ تشکر مل کر داعی کے لئے جو مقام متعین کرتے ہیں وہ ماورائی نوعیت کا ہوتا ہے مگر ہماری تحریک کے ساتھیوں کا یہ حال ہے کہ جن طاغوتی نظریات و خیالات اور رسومات کو ہم نے ترک کیا ہے اور جن اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی ہم کوشش کر رہے ہیں اس کے لئے عملی نمونہ ہم ان کی زندگی سے لیتے ہیں اور خود کو اس طرز زندگی سے میچ کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اس وقت تو ان کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقعہ مل رہا تھا (کیونکہ امیر محترم لاہور میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں)

الغرض روانگی کا وقت آیا۔ ایئرپورٹ پر کراچی سے جانے والے چند اصحاب بھی تھے۔ یوں میں اور میری بیٹی اس چھوٹے سے قافلے کے ہمراہ لاہور پہنچے۔ لاہور میں قرآن اکیڈمی میں نماز جمعہ سے قبل امیر محترم کا خطاب تھا اور وہیں سے نماز عصر کے فوراً بعد خلافت ریلی کا آغاز ہونا تھا۔ خواتین کے لئے حلقہ خواتین کے آفس کے ساتھ ٹھہرنے کا انتظام تھا جس کا معاملہ اسی طرح

سادہ تھا جیسے حج پر گروپ کے ساتھ جانے والے افراد کا ہوتا ہے۔ شام کو موچی دروازے میں جلسے کا اہتمام تھا۔ اس سے قبل چائے پر امیر محترم کی اہلیہ محترمہ' بہوؤں بیٹیوں اور رفیقات سے ملاقات ہوئی۔ کچھ تنظیم کے مستقل اور پورے کے پورے وابستہ افراد کی شریکات حیات تھیں۔ سب خواتین دین کے ذریعے جلسہ گاہ میں گئیں' جہاں ان کے لئے علیحدہ باپردہ انتظام تھا۔ اس کے اندر سے جلسہ کی کارروائی سنی۔

جلسے تو کئی دیکھے تھے' سنے تھے۔ مگر اس دینی جلسے میں 'اسلام کے نام پر الیکشن لڑنے والوں کے جلسوں کی طرح یہ عالم نہ تھا کہ تقریریں تو فحاشی و عریانی کے خلاف ہوں لیکن عمل کا یہ عالم ہو کہ مرد و عورت شانہ بشانہ بیٹھے ہوں اور اگر کہیں ایک حد بندی بھی ہو تو وہ بھی پردہ سسٹم کو قائم رکھنے اور اس کی مثال بننے سے یکسر قاصر۔ ذرا غور کریں کہ جو لوگ اسلام کے دعوے کریں وہی اگر عورت کو سجا بنا کر مرد کی دلبستگی کے لئے اس کے ارد گرد پھیلا کر اس نظام کی دہائی دیں جو ان کی ہربات کی نفی کرے تو ایسے میں تو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کیا ہم عقل سے پیدل ہیں یا کودن؟ کیا ہمارے یہ دانشور اتنا بھی نہیں جانتے کہ منطق کی رو سے "نقیضین ایک جگہ یکجا نہیں ہو سکتے۔"

خیر چھوڑیئے' ان پر وقت ضائع کر کے ہم اپنی منزل کیوں کھوئی کریں۔ اپنے قافلے کی رفتار کے مطابق احتساب کے ساتھ چلتے ہوئے کھوے والی کامیابی کی طرف بڑھیں۔ خوب سے خوب تر بلکہ اتباع رسول ؐ کے بلند ہدف کے حوالے سے اقامت دین کے لئے بلند تر طریقہ کار کو اپناتے ہوئے چلتے جائیں۔ انشاء اللہ ہماری زندگی میں نہ سہی اگلی نسلوں کو یہ کامیابی ضرور ملے گی۔

اگرچہ رات کے جلسے کی تھکان تھی (جو بعد نماز عشاء شروع ہو کر رات گیارہ بجے ختم ہوا تھا) مگر فجر میں شرکت سے گریز کا کوئی جواز نہ تھا' جب کہ عام جلسوں کے نعرہ باز شرکاء رات تھک جانے کے بعد صبح دیر تک سوتے ہیں' بلکہ دیر سے ہونے والے پروگرامز کا یہی مزاج ہے۔ مگر یہ قافلہ جس قائد کی سالاری میں چلا ہے اس نے اپنی فکر کو جس منبع سے مستعار لیا ہے اس میں تو فجر کے وقت کی اہمیت بنیادی ہے۔ موذن کے اس وقت کے اضافی الفاظ "الصلوہ خیر من النوم" (نماز نیند سے بہتر ہے) اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ وقت کتنا قیمتی ہے اور اس راہ کے مسافروں کے لئے اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے!

نماز فجر سوا پانچ بجے ہوئی۔ خواتین نے بھی امیر محترم کی امامت میں نماز ادا کی۔ کمرۂ خواتین میں آواز لاؤڈ سپیکر کے ذریعے آ رہی تھی۔ امیر محترم کی امامت اور اس پر سونے پر سہاگہ سورہ الحدید کی طویل قرات (واضح رہے کہ یہ سورت پورے قرآن کا عمود ہے) سب مل جل کر ایک یادگار نماز فجر کی صورت حافظے میں مدتوں کے لئے محفوظ ہو گئے۔

نماز کے بعد ناشتہ کا دور چلا۔ ایک عدد انڈا' ایک بن اور چائے.... سادگی کے ساتھ بھرپور

غذائیت سے آغاز (واضح رہے کہ انڈا دودھ کے بعد بہترین غذا ہے)۔ اللہ اللہ ایک طرف سادگی کا یہ عالم اور دوسری طرف ذہن ان تکلفات و لوازمات کی طرف منتقل ہوا جو ہمارے ایک طبقے میں راہ پا گئے ہیں جو چار' پانچ ستاروں والے ہوٹلوں کا دلدادہ ہے۔ ہم نے اپنے نبی ؐ کی سنت کو نہ اپنا کر کتنے نت نئے طریقے اختیار کئے ہیں جو انسانی فطرت سے مناسبت نہ رکھنے کی بناء پر کتنے سادگی پسند ذہنوں کو تکلفات کے بوجھوں میں دبائے رکھتے ہیں۔

اس سادہ اور غذائیت سے بھرپور ناشتہ کے بعد ہم تیار ہو کر بذریعہ وین قرآن کالج آئے' جہاں سالانہ اجتماع کے باقی پروگرام ہونے تھے۔ خواتین کے لئے قرآن آڈیٹوریم میں ایک پورشن اس طرح بنا ہوا تھا کہ پردے کا مکمل انتظام بھی ہے اور وہ اسٹیج پر تقریر کرتے ہوئے مقرر کو دیکھ بھی سکتی ہیں اور سن بھی سکتی ہیں۔ خواتین کے پورشن کے سامنے کے رخ پر اس طرز کا شیشہ ہے جو ایک سمت سے blind ہے۔ لہٰذا اس شیشے کے کمرے میں ہم نے پروگرام کا پہلا مرحلہ (نو بجے تا ڈیڑھ بجے) دیکھا اور سنا۔ درمیان میں چائے علیحدہ کمرہ میں پی۔ یوں صبح کی نشست برخاست ہوئی۔

نشست کے اختتام پر مرد حضرات نماز ظہر میں معروف ہو گئے اور خواتین واپس قرآن اکیڈمی آئیں جہاں ان کے ٹھہرنے کا بندوبست تھا۔ قرآن اکیڈمی ہی میں امیر محترم کی رہائش مع فیملی ہے۔ ساتھ ہی کچھ رفقاء کی فیملیز بھی اسی احاطے میں رہتی ہیں۔ دوپہر کے کھانے میں وہی صبح والی سادگی تھی۔ ایک اضافی بات یہ کہ ایک ڈش تھی۔ یہ روایت ہمارے امیر کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور وہ اس لئے کہ جس امیرالامراء کی وہ پیروی کرتے ہیں اور ہم کو' اپنے اہل و عیال کو اور رفقاء کو کروانا چاہتے ہیں اس کی سنت یہی تھی---- سادگی۔ لہٰذا روٹی اور ٹھنڈے گوشت کا یہ لطف اور اس کے ساتھ اس سنت سے وابستگی کی سرشاری میں کھانے کا اختتام ہوا۔ پھر نماز ظہر کے بعد بعض خواتین نے آرام کیا اور بعض نے باہمی تبادلہ خیال۔ اور پھر سب نے چائے پی۔

اجتماع کے دوسرے مرحلے کے لئے بعد عصر دوبارہ قرآن کالج گئے۔ اگرچہ اجتماع کی ایک بھرپور نشست مغرب کے بعد تھی لیکن بعض خواتین اس میں شریک نہ ہوئیں' چنانچہ ہم نے قرآن اکیڈمی واپس آکر نماز مغرب ادا کی' پھر کھانا کھایا اور بعد عشاء سونے کی تیاری کی۔

تیسرا دن بھی اسی طرح گزرا۔ چوتھے دن امیر محترم کے ساتھ کراچی اور لاہور کی خواتین کی میٹنگ تھی' چنانچہ ان کے گھر گئے۔ ان کی بچیوں اور بہوؤں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے اہل و عیال کی سادگی' خلوص اور اتباع سنت نے بہت متاثر کیا۔ ان ماؤں کی گودوں میں ہر عمر کے بچے تھے' بچوں کے نام بھی زیادہ تر صحابہ کرامؓ کے ناموں پر تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ بیس پچیس سال بعد جب یہ نسل بڑی ہو گی تو اس ماحول میں تربیت پانے والے یہ بچے کتنے مختلف ہوں گے۔

یہ ان ماؤں کے بچے ہوں گے جو خود اپنے لئے امہات المومنین ؓ کی زندگی سے نمونہ لیتی ہیں اور ان کی پرورش صحابہ کرام ؓ کے طرز پر کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے "ان کی گودوں میں اسلام کا مستقبل ہے"۔ بیشک

ع ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہ معاملے صبر طلب ہیں' محنت طلب ہیں' ہر لحظہ امتحان' ماحول کی آلائشوں سے ان پھولوں اور کلیوں کو محفوظ رکھنا کتنا کٹھن ہے یہ اس کی دیکھ بھال کرنے والے مالی کو پتا ہے۔ مخالف ماحول میں یہ صبر اتنا طویل ہو جاتا ہے کہ بے صبر دل ہمت ہارنے لگتا ہے۔

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی

خم آئے گا' صراحی آئے گی' تب جام آئے گا

مگر قرآن واضح طور پر کہتا ہے "اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" تو یہ تھی روداد اس چار روزہ تربیت گاہ کی۔ الغرض اس چار روزہ ساتھ کی یادیں لے کر ہم بعد عصر ایئرپورٹ پہنچے اور رات اپنے گھر واپس پہنچے۔۔۔ اور یوں ان تاثرات کو آپ تک پہنچانے کی سبیل ہوئی۔

از طرف

(فریدہ بنت اشتیاق)

میثاق مدینہ کو اسلامی ریاست کے آئین کا حصہ قرار دینا غلط مبحث ہے

۱۴/ نومبر کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز

لاہور۔ ۱۴/ نومبر: ۔ میثاق مدینہ کو درمیانی مدت کا عارضی اور وقتی دستور تو قرار دیا جا سکتا ہے اس کو اسلامی ریاست کے مستقل آئین کی حیثیت ہرگز حاصل نہیں۔ یہ بات ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی نے مسجد دارالسلام باغ جناح میں خطاب جمعہ کے دوران کہی۔ اپنی بات کی وضاحت کے لئے ڈاکٹر اسرار احمد نے میثاق مدینہ کے متن کا حوالہ بھی دیا۔

قیام پاکستان کی جدوجہد کے حوالے سے امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ پاکستان کے قیام کے لئے لاکھوں جانوں اور عصمتوں کی قربانی محض اس لئے دی گئی تھی کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور انہیں ایک الگ ملک اس لئے درکار تھا کہ وہ اسلام کے مطابق وہاں زندگی بسر کر سکیں ' بلکہ عہد حاضر میں اسلام کے اصول حریت اخوت اور مساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اور یہ اس وقت ہوا جب پوری دنیا میں مادہ پرستی ' سیکولر نظام حکومت اور وطنی قومیت کا غلبہ تھا۔ گویا اسلام کی بنیاد پر علیحدہ قومیت کے حوالے سے پاکستان کا قیام دراصل پہلے دن سے عالمی سطح پر رائج تصورات کے یکسر خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی یہاں دینی اور سیکولر طاقتوں کی رسہ کشی کا آغاز ہو گیا جو آج تک جاری ہے۔ ایک طرف مذہبی جماعتیں اور علماء کا طبقہ ہے جو یہاں اسلام کی بالادستی کا خواہاں ہے اور دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ اور دانش ور حضرات ہیں جو سیکولرزم کے علمبردار ہیں اور جن کا ملکی معاملات میں اثر و رسوخ اس درجے ہے کہ حکومتی معاملات بالفعل انہی کے ہاتھوں میں ہیں۔ عوام کا معاملہ بین بین کا ہے ' جذباتی لگاؤ اسلام کے ساتھ ہے مگر عملاً دنیاوی مفادات حاوی ہیں۔ اس رسہ کشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں مسلسل جمود کی کیفیت طاری ہے جو ملکی ترقی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ یہاں دینی سیاسی جماعتوں کی غلط حکمت عملی اور پھر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے نیم دلانہ اور معذرت خواہانہ اقدامات کی وجہ سے مذہبی طبقات کی سیاسی حیثیت بالکل ختم ہو کر رہ گئی ہے اور ملک بڑی تیزی سے سیکولرزم کی راہ پر چل نکلا ہے۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر بعض دانش ور حضرات جو سیکولرازم کے حامی ہیں اب کھل کر اپنے لادینی نظریات کا پرچار کرنے لگے ہیں اور قائداعظم اور علامہ اقبال کو سیکولر ثابت کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلام کی من مانی تاویلیں بھی کرنا شروع کر دی ہیں۔ ان میں علامہ اقبال کے فرزند ہونے کے ناطے ڈاکٹر جاوید اقبال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ حرکت ہمارے نزدیک نہایت قابل تشویش ہے۔ وہ اگر یہاں اسلام نہیں چاہتے نہ سہی ' مگر اسے مسخ کرنے کی کوشش تو

نہ کریں۔ جہاں تک معمار پاکستان قائداعظم کا تعلق ہے انہیں اگر کوئی شخص سیکولر قرار دے تو میرے نزدیک اس کا کسی قدر جواز موجود ہے۔ تاہم نظریہ پاکستان کے لئے ان کا حوالہ دینا صحیح نہ ہو گا۔ وہ یقیناً ایک کھرے انسان تھے' انہوں نے کبھی مصنوعی طور پر مذہب کا لبادہ نہیں اوڑھا۔ مگر وہ ایک مدبر اور سیاستدان تھے۔ ان کے پیش نظر مسلمانوں کو ہندوؤں اور انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانا تھا۔ احیاء اسلام کا کام ان کے پیش نظر نہیں تھا۔ اس لئے نظریات کا جہاں تک تعلق ہے ان کے لئے علامہ اقبال کا حوالہ لانا ہو گا جو مفکر و مصور پاکستان تھے۔ اور یہ کون نہیں جانتا کہ علامہ اقبال بیسویں صدی میں احیاء اسلام کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔

انہوں نے کہا شخصیات سے بھی آگے بڑھ کر قرآن و حدیث پر طبع آزمائی میرے نزدیک سخت تشویشناک ہے۔ سیرت سے میثاق مدینہ کو بنیاد بنا کر پورے اسلام کے اصل تصور کی نفی کر دینا ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ جبکہ میثاق مدینہ کی حیثیت اسلام کے انقلابی مراحل میں محض ایک وقتی حکمت عملی کی تھی۔ اسے اسلام کے ایک مستقل قانون کے طور پر پیش کرنا سوائے مغالطہ آمیزی کے اور کچھ نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس انقلابی جدوجہد کے مراحل کے اعتبار سے مختلف اوقات میں مختلف فیصلے کئے گئے جن کی حیثیت محض عارضی اور وقتی ہوتی تھی۔ مکہ میں مسلمانوں کے لئے اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانا منع تھا' جبکہ مدینہ میں مسلسل جنگیں لڑی جا رہی تھیں۔ حدیبیہ میں بظاہر دب کر صلح کی گئی' لیکن ایک وقت آیا کہ مشرکین مکہ خوشامدیں کرتے رہے لیکن نبی ﷺ نے صلح کے معاہدہ کی تجدید فرمانے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے کس کو آپ مستقل قانون کہیں گے؟ مزید برآں میثاق مدینہ سے مخلوط قومیت کے لئے دلیل لانا بھی قطعی غلط ہے' اس لئے کہ اس کے پہلے جملے میں ہی واضح طور پر مسلمانوں کو ایک علیحدہ امت قرار دیا گیا ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کفار کے بارے میں قرآن کا آخری اور ابدی حکم سورۂ توبہ میں آیا ہے جو ۹ھ میں نازل ہوئی تھی۔ اس کی ابتدائی آیات میں صاف اعلان کر دیا گیا کہ اب تمام سابقہ معاہدے منسوخ کئے جا رہے ہیں۔ اس سورت میں واضح طور پر کفار اور مشرکین کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسلامی ریاست میں بسنے والے یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے جزیہ ادا کرنے اور چھوٹے ہو کر رہنے کا حکم ہے۔ اس کی عملی صورت وہی تھی جو خلافت راشدہ میں صحابہ رضوان اللہ علیہم نے اختیار کی' یعنی اسلام قبول کر لو تو تم ہمارے برابر کے مسلمان ہو گے۔ یہ نہیں تو نظام اسلام کا ہو گا' اسلام کی بالادستی قبول کرو اور جزیہ ادا کرو۔ اس صورت میں ہر شخص کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہو گی۔ اور اگر یہ بھی نہیں تو پھر کھلی جنگ ہو گی' ہم بزور شمشیر اسلامی نظام قائم کریں گے۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ مسلمان کمزور ہوں' دبے ہوئے ہوں' اتنی طاقت نہیں کہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے میدان میں آسکیں تو طاقت کے حصول

کی خاطر مہلت حاصل کرنے کے لئے وقتی طور پر کفار کے ساتھ معاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کفر اور اسلام کے مابین گٹھ جوڑ اور مستقل مفاہمت' یہ تو سرے سے اسلام کی نفی ہے۔

"پرامن اور منظم احتجاجی مظاہروں کے ذریعے کسی بھی نظام کو تلپٹ کیا جا سکتا ہے"

۱۱ نومبر کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز

لاہور ۱۱/نومبر۔ صوبہ سرحد کے شمالی علاقوں میں نفاذ شریعت کے لئے جو لوگ خلوص کے ساتھ اپنی جان اور مال قربان کر رہے ہیں وہ یقیناً اللہ کے ہاں سرخرو ہوں گے اور یہ قربانیاں بالآخر رنگ لائیں گی۔ یہ الگ بات ہے کہ شریعت کے نفاذ کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کے باعث فوری طور پر شاید کوئی مثبت تبدیلی عمل میں نہ آ سکے۔ وجہ یہ ہے کہ خلوص اور جوش و جذبے کی بلاشبہ اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے لیکن جب تک اس جوش و جذبے کو منظم طور پر بروئے کار نہیں لایا جائے گا اس دنیا میں کامیابی حاصل ہونا محال ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر اسرار احمد' امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت' پاکستان نے آج مسجد دارالسلام باغ جناح میں اپنے خطاب جمعہ میں کیا۔ انہوں نے کہا کہ تشدد کی راہ اپنانے کی بجائے پرامن اور منظم احتجاجی مظاہرے اس ضمن میں زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوئے ہیں۔ اس کی ایک مثال ایرانی انقلاب ہے۔ انہوں نے کہا کہ انقلاب کے لئے قربانی تو بہرطور دینی پڑتی ہے لیکن اگر ایک انقلابی جماعت خود پرامن رہ کر بھرپور انقلابی مظاہروں کے ذریعے نظام کو چیلنج کرے تو کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ انہوں نے نفاذ شریعت کے ضمن میں حکومت کے تاخیری حربوں اور ناعاقبت اندیشانہ اقدامات کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ اس اخباری اطلاع پر تشویش کا اظہار کیا کہ امیر تحریک صوفی محمد صاحب کی جانب سے ہتھیار ڈال دینے کے اعلانات کے باوجود بعض علاقوں میں مسلح جدوجہد ابھی تک جاری ہے۔ جس سے اندیشہ ہے کہ یہ تصادم کہیں پھیل کر قابو سے باہر نہ ہو جائے جو نہ صرف مزید قیمتی جانوں کے ضیاع کا باعث ہو گا بلکہ ملک کے لئے بھی خطرناک ثابت ہو گا جو پہلے ہی کوئی قابل رشک حالت میں نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اس سے قبل افغانستان میں لاکھوں جانوں کی قربانی دی جا چکی ہے۔ ان میں کثیر تعداد میں وہ لوگ شامل تھے جنہوں نے خلوص کے ساتھ صرف اور صرف اسلام کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں۔ یہاں تک کہ دنیا کے کونے کونے سے مسلمانوں نے آ کر افغان جہاد میں حصہ لیا۔ اس کے باوجود تاحال دنیا میں کہیں دینی قوتوں کو کامیابی حاصل ہوتی نظر نہیں آ رہی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اسلام کے نفاذ کے لئے ہمیں اپنے سامنے بالعموم دو ہی راستے کھلے نظر آتے ہیں۔ یعنی الیکشن کا راستہ یا مسلح تصادم کی راہ۔ حالانکہ ایک تیسرا راہ بھی

موجود ہے اور وہ ہے عدم تشدد کا راستہ۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ اگرچہ میرے نزدیک طاقت حاصل ہونے پر حکومت کے خلاف مسلح بغاوت یا خروج حرام نہیں ہے لیکن تمدنی ترقی کے نتیجے میں حاصل ہونے والے تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پرامن مظاہروں کے ذریعے کسی بھی نظام کا موثر طور پر مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کسی ایک قیادت میں ایک منظم طاقت فراہم کی جائے جو عدم تشدد پر مبنی ایک احتجاجی تحریک شروع کر کے مروجہ سیکولر نظام کا راستہ روک دے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ یہ عدم تشدد یک طرفہ ہو گا۔ حکومت جو کسی بھی نظام کی محافظ ہوتی ہے اس نظام کو بچانے کے لئے تشدد سے گریز نہیں کرے گی۔ لہٰذا جان اور مال کی قربانی تو یہاں بھی دینی پڑے گی مگر یہ قربانی اس سے کہیں کم ہو گی جو کیمونسٹ طرز کی چھاپہ مار کارروائیوں میں دینی پڑتی ہے اور یہ نتیجہ خیز بھی ہو گی۔ انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ کشمیر میں ساٹھ ستر ہزار مجاہدین اب تک اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں جس کا تاحال کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہوا' جبکہ ایرانی انقلاب میں کل دس بارہ ہزار جانوں کی قربانی نے شہنشاہ کو تخت چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک بار پھر پاکستان کی ذلت آمیز ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اس کا اصل سبب ہماری اپنی کمزوری ہے جو دراصل نتیجہ ہے قوت ایمانی کی کمی کا۔ اور یہ ایک آفاقی اصول ہے کہ "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات"۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کمزور کا ساتھ کوئی نہیں دیتا۔ مسلم ممالک نے ایودھیا میں بابری مسجد کے جنونی ہندوؤں کے ہاتھوں انہدام پر کون سا ردعمل ظاہر کیا تھا جو اب کشمیر کے مسئلہ پر وہ ہمارا ساتھ دیں گے!! جو خود آج امریکہ کے رحم و کرم پر ہیں جو پورے طور پر یہودیوں کا آلہ کار بنا ہوا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے بھارت کی بے پناہ جنگی قوت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ افواج پاکستان کے اس بیان سے کہ اگر بھارت نے حملہ کیا تو اس کا منہ توڑ جواب دیا جائے گا' حالات کی بہت حد تک صحیح عکاسی ہوتی ہے۔ جو لوگ آگے بڑھ کر بھارت پر حملہ کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں وہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ نہیں کر رہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ درست ہے کہ قوت ایمانی سے بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ایمانی قوت ہو بھی تو سہی! انہوں نے کہا کہ پاکستان اب بھی اسلام کا ایک مضبوط قلعہ ثابت ہو سکتا ہے اگر ہم صحیح معنوں میں یہاں اسلامی نظام نافذ کریں

چاہے پورا عالم اسلام مان لے' پاکستان اسرائیل کو ہرگز تسلیم نہ کرے

لاہور' ۱۸/ نومبر۔ امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ چاہے سب عرب ممالک کیا پوری مسلم دنیا اسرائیل کو تسلیم کر لے' پاکستان تب بھی ا

تسلیم نہیں کرے گا اور ہم اس سلسلے میں رائے عامہ کو بیدار رکھیں گے تاکہ کسی کمزور لمحے میں ہماری حکومت کسی دباؤ کے سامنے جھک نہ جائے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں اجتماع جمعہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمارے سرکاری موقف کے بیک وقت دو متضاد مظاہر سامنے آئے ہیں۔ اقوام متحدہ میں ہمارے نمائندے نے کہا ہے کہ پاکستان کسی صورت اسرائیل کو تسلیم نہیں کرے گا جبکہ اسلام آباد سے وزارت خارجہ کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ اگر فرنٹ لائن عرب ریاستیں اسرائیل کو تسلیم کرلیں تو ہم بھی اس پر غور کریں گے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مرض ایسا پیدا نہیں کیا جس کا علاج نہ نکالا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے دریافت کرنے میں ہمیں دیر لگ جائے۔ اسرائیل کی ناجائز و منحوس پیدائش سے ایک سال پہلے مشیت الٰہی نے پاکستان کی ولادت باسعادت کا انتظام کیا۔ چنانچہ عالم اسلام میں اس صیہونی ریاست کا توڑ صرف پاکستان ہے جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا اور آئینی طور پر کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں قرارداد مقاصد کی شکل میں حاکمیت الٰہی کے اقرار اور عوام کے حق نیابت کو قرآن و سنت کی مقرر کردہ حدود کے اندر اندر استعمال کرنے کی پابندی کے باعث اصولی طور پر خلافت کا نظام طے شدہ ہے جسے عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک انقلابی جدوجہد درکار ہے۔

ایک قومی اخبار میں شائع ہونے والے تحریک نفاذ شریعت کے سربراہ مولانا صوفی محمد کے انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے امیر تنظیم اسلامی نے بتایا کہ دو سال قبل وہ ان سے خود جاکر ملے تھے اور ان سے درخواست کی تھی کہ نفاذ شریعت کو علاقائی مسئلہ نہ بنائیں بلکہ اس سوال کو قومی سطح پر اٹھائیں جس کے لئے لاہور میں وہ خود انہیں ایک پلیٹ فارم مہیا کرکے دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے انکشاف کیا کہ مولانا صوفی محمد کی اس پختہ رائے کو بھی انہوں نے بدلنے کی کوشش کی تھی کہ انتخابات میں حصہ لینا بلکہ ووٹ ڈالنا بھی حرام ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں خود انتخابی راستے کو پاکستان میں اسلام کے نفاذ کا ذریعہ نہیں مانتا، تاہم چونکہ ہمارا ملک آئینی طور پر ایک اسلامی ملک ہے لہٰذا ان لوگوں سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے جو نظام کی تبدیلی کے بغیر انتخابات کے ذریعے اسلام کا راستہ نکالنے کی امید رکھتے ہیں تاہم ان کے کام کو حرام کہنے کا کوئی جواز نہیں۔ اپنا تبصرہ جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مولانا صوفی محمد خود بھی جماعت اسلامی کے رکن رہے ہیں اور اب اس جماعت پر ان کی شدید ترین الزام تراشی ہرگز کوئی پسندیدہ بات نہیں۔ جماعت کی قیادت پر جن لوگوں کا قبضہ ہوگیا ہے ان پر صوفی محمد صاحب کی فرد جرم صادق آسکتی ہے تاہم جماعت میں دین سے خلوص و اخلاص رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد آج بھی موجود ہے جو حصول اقتدار کی کشمکش، مال سمیٹنے اور دھوکہ دہی میں شریک نہیں بلکہ اپنے کام کو اقامت دین کی جدوجہد سمجھتی ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ صوفی محمد صاحب کی اس جرات پر البتہ

خراج تحسین پیش کیا جانا چاہئے کہ انہوں نے اپنے علاقے میں بیٹھ کر وہاں کے فساد میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے والوں کو شہادت کا مرتبہ الاٹ نہیں کیا، بلکہ تسلیم کیا کہ یہ قربانیاں ضائع ہوئی ہیں۔

دنیا میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں اور اس خطے میں نیو ورلڈ آرڈر کی پیش قدمی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے جس میں پاکستان واقع ہے، ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ یہ دراصل اولاد آدم اور ابلیس کی ذریت کے درمیان ازل سے جاری کشمکش کا نقطۂ عروج ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن مجید میں آٹھ مقامات پر قصہ آدم و ابلیس کسی نہ کسی انداز میں دہرایا گیا ہے جس سے اس معرکے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جو قیامت تک جاری رہنے والا ہے، ان دنوں اس میں گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ زمانہ خیر و شر کی کشاکش میں تیزی و تندی کا دور ہے اور ہمیں یہ شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ کٹھ پتلیوں کی ڈور کون ہلا رہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اصل مقابلہ سوا ارب مسلمانوں اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ کروڑ یہودیوں کے درمیان ہے جو پروٹسٹنٹ عیسائیوں سے راستہ لے کر اب کیتھولکس میں بھی جا گھسے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ عیسائی جو یہودیوں کے اصل دشمن ہیں، صیہونیت کے ہاتھوں پوری طرح مفتوح ہو چکے ہیں۔ یہود نے دنیا کی مالیات پر قبضہ کر کے سود، کاغذی کرنسی اور مالیاتی اداروں کے ذریعے پہلے فرنگ کو اپنے شکنجے میں جکڑا اور علامہ اقبال خود دیکھ آئے تھے کہ فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے اور اب وہ نیو ورلڈ آرڈر میں امریکہ کو واحد سپریم پاور بنا کر خود اس پر سوار ہو گئے ہیں۔

ضرورت رشتہ

پردہ کی پابند اور صوم و صلوٰۃ کی پابند ۲۰ سالہ لڑکی ایف۔ اے کے لئے رشتہ درکار ہے۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں۔ تاہم راجپوت خاندان کو ترجیح حاصل ہوگی۔ غیر اسلامی رسومات سے مجتنب اور اسلامی ذہن رکھنے والے گھرانے کو ترجیح دی جائے گی۔

- C/ORana. P.O.Box167 C.C.843. Jeddah21231

لاہور میں مقیم تنظیم اسلامی کے ایک رفیق، عمر تقریباً ۲۵ سال، تعلیم گریجویشن، ۴۰۰۰ روپے سے زائد ماہوار تنخواہ پر برسر روزگار کے لئے صوم صلوٰۃ اور پردہ کی پابند، ٹیلی ویژن اور غیر اسلامی رسومات سے مجتنب، پڑھی لکھی عفت مآب کا رشتہ درکار ہے۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں ہے

آر۔ جی۔ مبارک معرفت : ادارہ "میثاق" ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

نماز قائم کریں ' اسی میں نجات اور سکون ہے۔

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

REG. No L. 736
Vol. 43 No 12
Dec. 1994